دلچسپ اور سنسنی خیز کہانیوں کا مجموعہ

ماہنامہ

جاسوسی ڈائجسٹ کراچی

دسمبر 2011

نگران اعلیٰ

معراج رسول

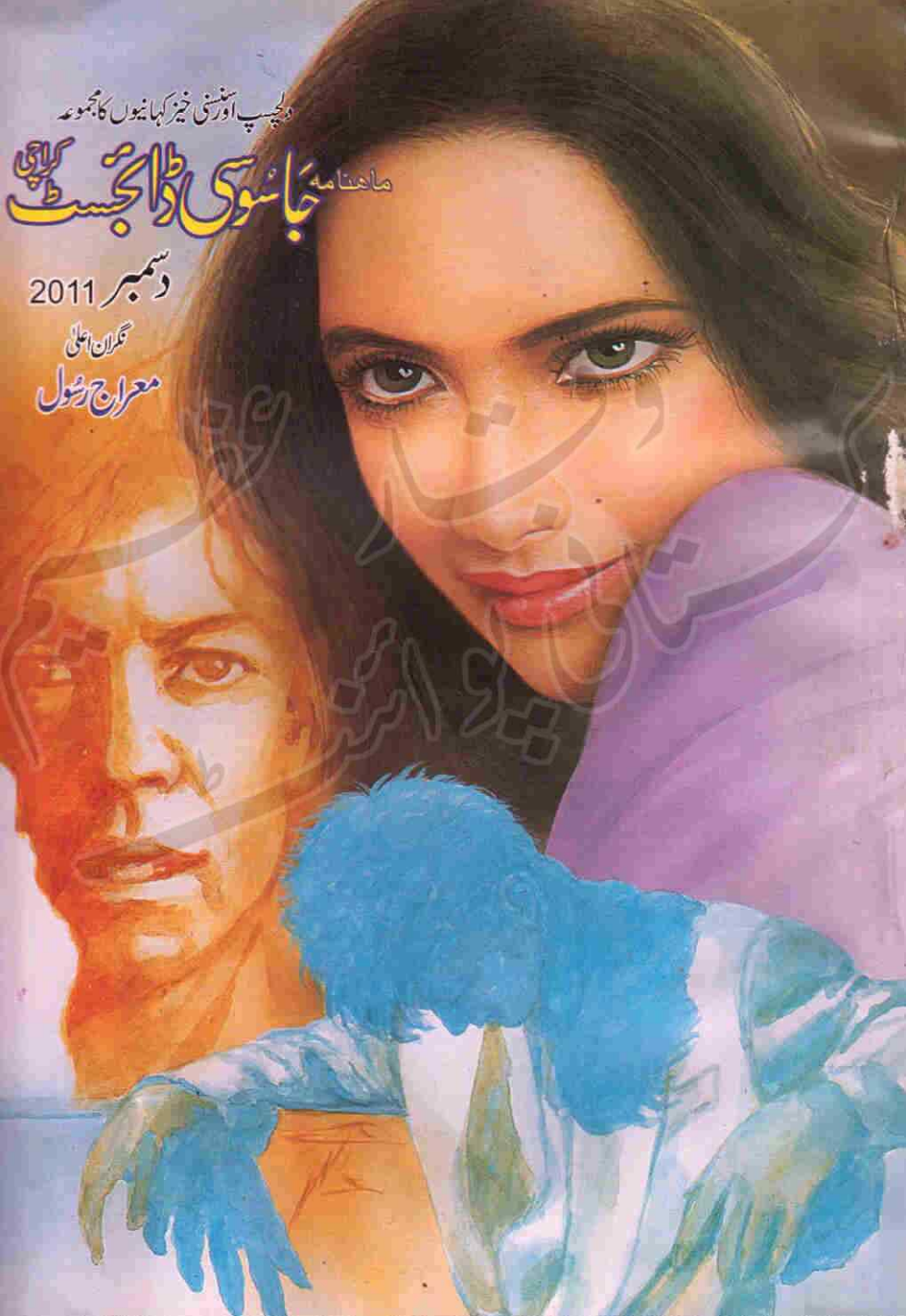

11 — چینی نگلنا چینی — مدیر اعلیٰ

قارئین کی گرافرمائیاں، کج ادائیاں
نامہ پیام، محبتیں عنایتیں اور شکایتیں

18 — خود کردہ — نشور جلالی

اس کلاکار کی داستان جو تہذیب
آدم کو ایک نیا آہنگ دینا چاہتا تھا

61 — واردات — عطاء الرب بٹشی

ذہانت کا لاجواب استعمال
کرنے والے شخص کا پُر انتقام المیہ

69 — دوسری عورت — سلیم انور

مختصر پیرائے میں ایک سلگتی
بھڑکتی ناقابلِ فراموش کتھا

71 — انصاف — تنویر ریاض

مغرب سے برآمد تازہ شاہکار جس میں
مشرقی معاشرے کی جھلک نمایاں ہے

79 — قدر شناس — بابر نعیم

ہر دفعہ کامیابی سے ہمکنار ہونے
والے چوروں کی دلچسپ کہانی......

88 — للکار — طاہر جاوید مغل

محبت کے محاذ پر کھڑے ہوئے شخص کی جدوجہد
اسے اپنے تحفظ کی جنگ کا سامنا تھا

131 — قاتل مسیحا — منظر آزاد

اپنائیت اور حساسیت کے جذبات
میں گندھی ایک دل گداز تحریر

مدیر اعلیٰ
عذرا رسول

145 — شیطان کی موت — قمر عباس

اس شخص کا قصہ جس کی ذات افواہوں
کی گہری دھند میں لپٹی ہوئی تھی

157 — صبح بخیر — مریم کے خان

اس شخص کا ماجرا جس نے حصول
مقصد کے لیے طویل انتظار کیا تھا

168 — گرداب — اسما قادری

تقدیر کی ستم گری، قسمت کی چالبازی، مقصد
کا کھیل ملانے اور بچھڑ جانے والوں کی کہانی

195 — نشانہ — کاشف زبیر

قتل کی ایک سنگین واردات... قتل
اور قاتل دونوں معما بن چکے تھے

209 — نسب نما — منظر امام

ایک ہی لڑکی کی چاہت میں مبتلا ہو
جانے والے دو دوستوں کی کیفیات

213 — برائے فروخت — آصف ملک

ایک سودے کی آڑ میں رونما ہونے
والے خونی کھیل کا دلچسپ انجام

225 — گمان بے گمان — سرور اکرام

اس لڑکی کے گرد گھومتی کہانی... جس کی
زندگی مسلسل حادثات کا شکار ہو رہی تھی

254 — ریگ رواں — سلیم فاروقی

فتح اور شکست کے درمیان ڈوبتی، ابھرتی
تلخ کہانی جس میں کئی راز پوشیدہ تھے

جلد 40 • شمارہ 12 • دسمبر 2011 • زرِسالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
خط وکتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 229 کراچی 74200 • فون 35895313 (021) فیکس 3502551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

گزشتہ نمبر کی بھرپور پذیرائی اور قارئین کے اصرار پر

ماہنامہ **سرگزشت**

پراسراریت نمبر II

نئے سال کا نیا رنگ ۔ خاص نمبر خاص شمارہ

ہر کہانی خاص کہانی، ہر واقعہ یادرہ جانے والا

ہر تحریر اس معیار کی جو سرگزشت کا خاصہ ہے

ایسے حیران کن واقعات جو عقل کو ماؤف کردیں

جن کا کوئی جواز ہو یا نہ ہو مگر جو زندگی کی اٹل حقیقتیں ہوں

سحرزدہ کردینے والی پراسرار، انوکھی اور محیر العقول سچ بیانیاں

سچے قصے، تاریخی شواہد

ایسا خاص شمارہ جو صرف ماہنامہ **سرگزشت** ہی پیش کرسکتا ہے

آج ہی نزدیکی بک اسٹال پر اپنی کاپی محفوظ کرالیں

عزیزانِ من... السلام علیکم!

2011ء کا بارہواں کھلاڑی... دسمبر آپ کے سامنے آپہنچا... کچھ ہماری تقدیر ہی ایسی ہے یا کہ تدبیر... یا پھر ہماری ایسی کرنی ہے جو اب تک بھرنی پڑرہی ہے۔ ہر وقت تغیر ہمارے ہی دَر پر دستک دیتا ہے۔ لمحہ بھر کے لیے ثبات کو سانس لینا بھی محال ہے۔ ایک مسئلہ ختم نہیں ہوتا کہ دوسرا چلا آتا ہے... اس سے نمٹنے بھی نہیں پاتے کہ کچھ اور گلے پڑجاتا ہے... پاکستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے... ہر صفحے پر ایک نہیں بحرانوں کے ایسے اَن گنت افسانے ملیں گے کہ بس پڑھتے جائیں اور کڑھتے جائیں... اب یہی خط کا معاملہ دیکھ لیں... جسے امریکی تاریخ کے مشہور 'واٹرگیٹ اسکینڈل' کے وزن پر 'میموگیٹ اسکینڈل' لکھا اور پکارا جارہا ہے۔ سفیرِ پاکستان اور پاکستانی نژاد امریکی شہری کے درمیان ہونے والے مبینہ رازونیاز وطنِ عزیز کے افق پر ایک اور سیاسی بے چینی کے بادلوں کو مزید گہرا کرتے جارہے ہیں... امریکا سے چل کر پاکستان تک پہنچنے والے اس افسانے کی حقیقت کیا ہے؟ اربابِ اختیار کہتے ہیں کہ تحقیقات ہوں گی تو پتا چلے گا۔ اب تک کئی سانحات گزر چکے... سب کی تحقیقات ہوئیں مگر عوام کے کان حکمرانوں کے منہ سے سچ سننے کے منتظر ہی رہے... سچ جو اوپر سے نیچے تک، شاید نہ تو کوئی بولنا چاہتا ہے اور نہ ہی ہم من حیث القوم سننے کے خواہشمند ہیں۔ سچ بہت کڑوا اور تکلیف دہ ہوتا ہے... تاریخ بتاتی ہے کہ سقراط پہ سچ کا جرم ثابت ہونے پر زہر کا پیالہ پی گیا۔ کہتے ہیں کہ اس کے شاگردوں نے کہا تھا کہ تم بے گناہ مارے جارہے ہو۔ سقراط نے تاریخ کو جواب دیا کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں گناہ گار ہو کر مارا جاؤں۔ اُسی رات کسی پہر پیالۂ سم اس کے لبوں کو چھو گیا...

تاریخ کا ایک اٹل اور لازوال باب... سچ اور حق کے لیے کربلا کے میدان میں نبی آخرالزماں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے خانوادے نے سب کچھ قربان کردیا۔ نتیجہ... سچ آج بھی زندہ ہے۔ سچ کو فتح درکار ہے اور نہ ہی شکست اس کا مقدر ہے۔ سچ خود فتح ہے اور شکست اس کے سامنے آہی نہیں سکتی۔ اسے تو صرف ایک شے درکار ہے اور وہ ہے سچ کہنے کی ہمت۔ یہی وہ ہمت ہے جو کربلا کے میدان میں خاندانِ نبوت کے لہو سے دینِ اسلام کو سرخروئی عطا کرگئی۔ اللہ تعالیٰ میرے دیس کے لوگوں میں سچ کہنے کی ہمت پیدا کرے اور سچ برداشت کرنے کا حوصلہ بھی کہ یہی محرم الحرام کا درس ہے۔

آئیں، چلتے ہیں آپ کی بزم میں اور دیکھتے ہیں کہ کیا کہہ رہے ہیں باتوں کی مہک سے مہکتے آپ کے سندیسے...

سموٹ راولپنڈی سے عامر رسول کی تیکھی باتیں "جاسوسی کے ساتھ تعلق تو کافی پرانا ہے لیکن خط لکھنے کی ہمت تیسری دفعہ کررہا ہوں۔ دو دفعہ پہلے ہمتِ مرداں کے باوجود مددِ خدا نامعلوم مصلحتوں کی نذر ہوتی رہی لیکن پھر بھی ارادہ ہے کہ

عزم ٹکرائیں گے چٹانوں سے
حشر اٹھتا ہو درمیاں چاہے

جہاں ماہتا وہاں ڈالڈا کی طرح سو فیصد خالص اور ذاتی شعر ہے پسند کرلیجیے پلیز (کرلیا) نومبر کا شمارہ حسبِ معمول تین تاریخ کو ملا۔ سرورق پر نئے ماڈل کی سلور کلر گاڑی شعلوں کی نذر ہورہی تھی اور صنفِ ہمت ہاتھ میں پستول تھامے متوقع خطرات سے نمٹنے کے چکروں میں تھی جبکہ قریب ہی حسن کچھ ایسی بے فکری اور بے نیازی کے ساتھ محوِ خواب تھا کہ جیسے اس نے اپنے حصے کے تمام کام سرانجام دے ڈالے ہوں اور اب باقی سارے دکھ درد جانیں یا بے چارے مرد جانیں۔ تبصرے کا آغاز کرتے ہیں کہانیوں کی ماں "للکار" سے۔ کیا جادو ہے بھئی مغل صاحب کے لفظوں میں۔ تمام کردار جیتے جاگتے سانس لیتے محسوس ہوتے ہیں زبردست، شاندار۔ اس ماہ سلطانہ تو سلطانہ ڈاکو بنی رہی اور آفتاب خاں کی کھوپڑی بھی خوب گرم رہی۔ جہاں خان بھائی کی کھوپڑی گرم ہوئی، وہاں میرے خیال میں اسے کول ڈاؤن کرنے کے لیے جنت کی ہوائیں درکار ہوتی ہیں۔ (بڑا تجربہ ہے) للکار کے بعد سیدھے جا پھنسے گرداب میں کیونکہ عملی زندگی میں بھی اکثر ہر للکار کے بعد کوئی نہ کوئی گرداب منتظر ہی پاتے ہیں مگر اس ماہ کے گرداب میں کناروں کا سا ٹھہراؤ اور سکون محسوس ہوا۔ کوئی خاص ہلچل نظر نہ آئی۔ نہ جانے اپنے چودھری صاحب کو ایک دم کڑک، تیز اور کراری مرچیں کب لگیں گی کہ پڑھنے والوں کو تھوڑا سواد آئے گا۔ ماسٹر صاحب اور کشور بھی غائب ہیں اور اسلم جو ایک نیک ڈاکو تھا بلکہ ہے عالمِ انتخاب ماہ بانو کے خوب صورت ساتھ کو فری میں خوامخواہ ہی بلکہ ایویں ای انجوائے کررہا ہے۔ (آپ کیوں جل رہے ہیں؟) اولین صفحات پر ایچ اقبال کی گھر کا چراغ درمیانے درجے کی کہانی رہی جبکہ ہماری سوچ تھی کہ کہانی نہایت اُلجھی ہوئی اور سسپنس سے بھرپور ہوگی مگر توقع کے برعکس انتہائی سیدھی سادی کہانی ثابت ہوئی۔ شمعون اس حوالے سے خوش قسمت رہا کہ اسے سمیرا اور رفعت کی صورت میں دو دو مل گئیں۔ اس نازک ترین دور میں سمیرا اور رفعت نے ایک دوسرے کے لیے سگی بہنوں سے بڑھ کر محبت کا اظہار کیا۔ اس قسم کی صورتِ حال کو ہضم کرنے کے لیے انتہائی مضبوط بالکل زیرومیٹر اور امپورٹڈ معدے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ (آپ کے پاس تو موجود ہوگا؟) رنگ دونوں ہی خوب تھے۔ پہلا رنگ کاشف زبیر کی طے شدہ محبت مزہ دے گئی۔ جوجی کی معصومیت کے پیشِ نظر شیطان کے گھر ولی کی پیدائش والا محاورہ یاد آگیا۔ تیمور اور شامی کی ملاقات سے عید کی خوشیوں کا لطف دوبالا ہوگیا۔ دوسرا رنگ اتنی اُلجھی ہوئی تحریر تھی کہ اس کے اُلجھاؤ نے ہمیں ایسی اُلجھنوں

میں ڈالا کہ ساری الجھنیں بھی اسی الجھن میں پڑی رہیں کہ کوئی صاحب اس انتہا تک بھلا کیسے الجھ سکتے ہیں۔ خیر مختصر یہ کہ... الجھنیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ سلجھان ہوگئیں۔ چھوٹی کہانیوں میں منظر امام نے طویل عرصے بعد استاد محبوب نرالے عالم سے ملاقات کروائی۔ ماضی کی کئی یادیں تازہ ہوگئیں۔ اس کے علاوہ سلیم انور کی بے باق پڑھی جو بالکل پھیکی اور ڈل سی لگی۔ منڈی بہاؤالدین سے جہانگیر اسلم گوندل کا تبصرہ اچھا لگا۔ انہیں رہائی کی خوشیاں مبارک ہوں، آصفہ صداقت وکٹری اسٹینڈ پر رہیں۔ اگرچہ تھوڑی سی ہمت کے بعد ہمایوں سعید راج فرسٹ پوزیشن حاصل کر سکتے تھے۔ آتش خان کا مشورہ ہمیں بھی پسند آیا کہ کہانی کے ساتھ ہر رائٹر کی تصویر بھی ہونی چاہیے بلکہ ہمارے دل سے پوچھیں تو تصویر کے بجائے ایک آدھ منٹ کی ویڈیو اگر جاسوسی کے صفحات میں نظر آجائے تو کتنا مزہ آئے گا؟ لیکن ساتھ ہی ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ یہ ذرا مشکل کام ہے۔ دعا ہے میدانِ جاسوسی کی وسعتوں میں اضافہ ہوتا رہے۔" (شکریہ)

حسنین عباس بلوچ کی ڈسٹرکٹ جیل سرگودھا سے خوشی "اس ماہ کا شمارہ تین کو ملا۔ ٹائٹل پر دوشیزہ کا ادھورا چہرہ بھی قابلِ دید تھا، مکمل ہوتا تو کیا کہنے۔ آصفہ صداقت کرسیِ صدارت پر موجود تھیں، بھئی مبارکباد ہو آصفہ جی! چشتیاں سے ٹیکسلا منتقل ہو جائیں آپ کی خواہش پوری۔ ہمایوں سعید راج صاحب دوسرے نمبر پر راج فرما رہے۔ جناب نے بڑا اعلیٰ تبصرہ کیا۔ دیگر تمام دوستوں نے محفل میں چار چاند لگائے۔ ماہا ایمان اور دلنشین بلوچ غائب تھیں اگر آپ ہوتیں تو مزہ دوبالا ہو جاتا تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ سلطانہ کی مردانگی کی داد دیے بنا نہ رہ سکے۔ اپنے ہیرو بھائی بھی اسے قابو کرنے سے قاصر نظر آئے۔ بڑا مزہ دے رہی ہے ہم سب اسیروں کو یہ اسٹوری۔ گرداب میں ماہ بانو بے چاری کے دکھوں کا کوئی حساب نہیں ہے۔ ہاں، یہ کہنا بجا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی مدد فرما دیتے ہیں۔ اے سی صاحب بھی دل دے بیٹھے ہیں۔ دیگر تمام کہانیاں بھی اعلیٰ تھیں۔ آخر میں تمام اسیرانِ پنجاب بھر کی جیلوں سے اس اسیر بھائی کا سلام و دعا۔"

فتح پور لیہ سے آمنہ پٹھانی کی شمولیت "نومبر کا خوب صورت شمارہ یکم کو ہی بک اسٹال پر دستیاب ہونے سے جو مسرت ہوئی، وہ بیان سے باہر ہے۔ (بیان کر دیں۔ ہم پڑھ لیں گے) ٹائٹل پر ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے اور اشتہارات کو پھلانگتے ہوئے اپنی محفل میں پہنچے۔ آصفہ صداقت، ہمایوں سعید بھی اپنے خوب صورت تبصرے کی وجہ سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ میرے ننھیال (تونسہ) سے کاشف عباس شاملِ محفل ہوئے، خوش آمدید۔ محی الدین اشفاق جی! آپ کا پورا تبصرہ شکایت نامہ لگا۔ ارے صبا گل! کیا ہوا بھئی آپ کو اتنی گرم مزاجی۔ سید شکیل کاظمی! اتنی خودستائشی اور خودآرائی اچھی نہیں ہوتی۔ اس بار صنفِ نازک کی کم حاضری کی وجہ سے محفل قدرے پھیکی پھیکی سی لگی۔ (یہ تو سچ ہے) اب آتے ہیں کہانیوں کی طرف۔ خلافِ معمول ابتدا پہلی کہانی سے کی۔ گھر کا چراغ، انتہائی پرتجسس کہانی ثابت ہوئی۔ ایچ اقبال اپنے مخصوص انداز میں بہت پیاری کہانی لکھنے میں کامیاب رہے۔ للکار کی موجودہ قسط نے کچھ خاص مزہ نہیں دیا۔ پہلا رنگ کاشف زبیر طے شدہ محبت لے کر آئے۔ تحریر کاشف زبیر کی ہو اور کردار تیمور اور شامی کا، بہت مزہ آیا پڑھ کر۔ شکیل صدیقی کی چاہِ درپیش پڑوسی ملک کے مخصوص حالات پر مبنی تحریر بھی، بہت اچھی رہی۔ مختصر کہانیوں میں مریم کے خان کی وفادار اور عکسِ فاطمہ کی یومِ تقدیر دل کو بھا گئیں۔"

مالاکنڈ ایجنسی سے صبا گل کی خفگی "ڈائجسٹ اس دفعہ پشاور سے 1 نومبر کو مل گیا تھا۔ سرورق کی لڑکی شاید کسی نشہ آور دوا کے زیرِ اثر تھی۔ کیونکہ اسے نیچے والے لوگوں کی دھینگا مشتی کی قطعی خبر نہ تھی۔ چیں، نکتہ چینی کی محفل میں پہنچی تو اپنے خط کو موجود تو پایا لیکن بری حالت میں۔ صدارت کی کرسی پر آصفہ صداقت براجمان تھیں بہت مبارک ہو۔ آپ کا خط بہت اچھا تھا۔ ام ثمامہ صاحبہ! آپ کا خط پسند آیا۔ آمنہ پٹھانی! میں آپ کے خطوط بڑے شوق سے پڑھتی تھی لیکن آپ پتا نہیں کہاں لاپتا ہو گئیں تو مجھ سے بھی بھول ہو گئی سوری۔ باقی بہن بھائیوں کے خطوط بھی اچھے تھے۔ للکار سب سے پہلے پڑھی۔ بڑی زبردست دھینگا مشتی ہو رہی ہے۔ اپنے ہم منصب آفتاب جو کہ پٹھان بھی ہیں، سے ہمدردی بھی ہے اور غصہ بھی آرہا ہے کیوں اچھے لوگوں کو تکلیف میں ڈال دیا ہے۔ اب خوں ریزی ہوگی اور خوب ہوگی۔ گرداب پڑھ کر اسلم اور ماہ بانو پر پھر غصہ آیا پھر ایک ہو گئے۔ اب تو شکر ہے کہ پولیس آگئی۔ اللہ کرے دونوں الگ ہو جائیں۔ میں واضح طور پر کہتی ہوں کہ مجھے ان دونوں کا ساتھ پسند نہیں۔" (آپ کیوں تکلیف میں مبتلا ہیں... اسلم... پسند آ گیا ہے کیا؟) گھر کا چراغ بھی اچھی کہانی تھی۔ پہلا رنگ بھی مزے دار تھا۔ محبت کرنے والے ایک ہو گئے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ منظر امام صاحب کی کہانی سفرنامہ بھی اچھی تھی۔ لیکن فلسفیانہ انداز سے لکھی ہوئی تھی۔ وفادار بھی اچھی کہانی تھی۔"

اوکاڑہ سٹی سے تصویر العین کی تصویر کشی "ٹائٹل پر بند آنکھوں والی لڑکی کا چہرہ تھا اور ساتھ ہی چیکو بھیا والی عینک لگائے ایک شخص پی ٹی وی کے پرانے ڈرامے کے ہیرو کی یاد دلا رہا تھا۔ اور دوسرا شخص گاڑی کا دروازہ کھلا چھوڑ کر پستول لے کر بھاگتا ہوا جانے کس کو شوٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ ٹائٹل کے بعد پہنچے نکتہ چینی کی محفل پر۔ صدارت کی کرسی آصفہ صداقت کے حصے میں آئی مبارکاں جی مبارکاں۔ ہمایوں سعید راج ہمیشہ کی طرح لڑکیوں پر زیادہ تبصرہ کرتے نظر آئے۔ احسان سحر کا تبصرہ مختصر تھا مگر اچھا تھا۔ طارق محمود راہی ٹائٹل پر اتنا غور تو ہم بھی نہیں کرتے جتنا کہ آپ۔ لگتا ہے کہ لڑکیوں کا فیشن آپ کو ہم سے زیادہ ہی پتا ہے۔ آتش خان! آپ سب ایک بات بتائیں کہ تمام لوگ دوشیزہ کے بُندوں کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہیں؟ کاشف عباس! آپ صرف 15 سال سے جاسوسی پڑھ رہے ہیں۔ ہمیں دیکھیں، ہمارے گھر جاسوسی پچھلے اٹھارہ سالوں سے آرہا ہے۔ سید شکیل حسین کاظمی! جتنا لمبا آپ کا نام ہے نا اسے لیتے لیتے تو آدمی اوکاڑہ سے کراچی پہنچ جائے۔ ایسا کریں کوئی نک نیم ہی رکھ لیں۔ آمنہ پٹھانی! آپ کو دیکھ کر اور تبصرہ پڑھ کر بہت خوشی ہوئی اور اس خوشی کو میں بیان نہیں کر سکتی۔ عاطف گجر! ہمیں کیا کہنے کی ضرورت ہے کہ آپ دماغی طور پر کمزور ہیں جبکہ آپ خود واقف ہیں۔ محی الدین اشفاق، محمد نعمان اور سید عبادت کاظمی کے تبصرے بھی اچھے تھے۔ ایچ اقبال کی کہانی گھر کا چراغ اچھی تھی۔ مگر میں کیا کروں کہ دوسری شادی کرنے والے آدمی مجھے سانپ سے بھی زیادہ زہریلے اور برے لگتے ہیں۔ (کیوں بھئی! سب خیریت تو ہے...) ساری کہانی میں مجھے شمعون زہر لگا اور غصہ کر کر کے تو میرا بی پی بھی ہائی ہو گیا۔ للکار کی اس قسط میں کہانی

ایک جگہ رکی رہی۔ البتہ یہ اندازہ ہو رہا ہے کہ سلطانہ کا وقت بھی قریب آرہا ہے آخر کو اب مغل انکل نے تابی کو ثروت کے پاس بھی تو پہنچانا ہے نا مل پانی سے نکال کر۔ گرداب میں ماہ بانو کی مشکلات کا اب تک خاتمہ نہیں ہوا۔ ایک مشکل سے نکلتی ہے دوسری پہلے ہی سامنے کھڑی ہوتی ہے۔ واللہ اعلم۔ کاشف زبیر کی طے شدہ محبت میں شامی اور تیمور کے ایکشن نے مزہ دیا، وہاں جوجی کے بھولے پن نے خوب ہنسایا۔ کترنیں ہمیشہ ہی کی طرح مزے دار تھیں۔ امید ہے اس دفعہ ضرور شامل کریں گے کیونکہ میری 19 نومبر کو برتھ ڈے جو ہے۔" (جی بالکل۔ سالگرہ مبارک۔ اللہ آپ کو ڈھیروں خوشیاں نصیب کرے، آمین)

سید محی الدین اشفاق کی اجازت ضلع لیہ سے "اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے میں نے ایم اے میں ایڈمیشن لے لیا ہے۔ (مبارک ہو... کس مضمون میں کرنے کا ارادہ ہے؟) جاسوسی 2 تاریخ کو مل گیا۔ ٹائٹل کچھ خاص نہیں تھا۔ آصفہ صداقت صاحبہ! آپ نے بھی صنفِ وجاہت کو غور سے نہیں دیکھا۔ ام ثمامہ! اب اتنا بھی برا ٹائٹل نہیں تھا۔ کاشف عباس! ویلکم۔ سرکش کہانی میری بھی فیورٹ رہی ہے۔ لائبریری سے حصوں میں لے کر پڑھی ہے۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! ویلکم بیک۔ شاید آپ نے گزشتہ چند جاسوسی نہیں پڑھے، ہم آپ کو اپنے خطوط میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ صبا گل صاحبہ! یہ انکل اور آنٹی جی بڑے وہ ہیں، صرف اپنے چہیتوں کے خطوط مسلسل لگاتے ہیں۔ (دیکھ لیں ثبوت حاضر ہے) للکار سب سے پہلے پڑھی۔ محترم مصنف کی ایک بات سے ہمیں اختلاف ہے۔ ایک اس دور میں جبکہ مسلمانوں پر انتہا پسندی کا الزام لگایا جاتا ہے تو میرے فیورٹ مصنف نے سلطانہ اور اس کے ساتھیوں کو انتہا پسند اور چند ہندوؤں کو اچھا دکھایا ہے جو اچھا نہیں لگا۔ باقی کہانی اچھی جا رہی ہے۔ عمران اور تابی کے کردار بہترین ہیں۔ پہلا رنگ طے شدہ محبت شامی اور تیمور اس دفعہ کوئی خاص کارنامہ سرانجام نہ دے سکے۔ باقی رسالہ زیرِ مطالعہ ہے۔ کیا ہمیں انعامی مقابلے میں کہانی لکھنے کی اجازت ہے؟" (کیوں نہیں)

لفظوں کے کھلاڑی تفسیر عباس بابر کا جاندار کھیل "اب کی بار جاسوسی نے 2 نومبر کو درشن دیے۔ سرورق کا محل وقوع اور دوشیزہ سرورق کے چہرے کا حدود اربعہ کافی سے کچھ زیادہ وسیع و عریض محسوس ہوا۔ یقیناً محترمہ نے کسی کو دل میں بٹھا کے آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ ساتھ ہی شرپسند عناصر کی تخریبی کارروائی۔ بزمِ یاراں کا رخ کیا۔ مسندِ صدارت پر چشتیاں سے آصفہ صداقت، آپ نے اپنے دل تک پہنچنے کے لیے بہت عجیب طریقہ اور راستہ بتایا ہے اور کوئی باذوق انسان تو اس راستے پر آنے سے رہا۔ خیر، مبارک باد وصول کیجیے۔ بنوں سے ہمایوں سعید! بھئی مبارک ہو آپ کو تو خدا بھی مل رہا ہے اور وصالِ صنم بھی۔ گجرات سے طارق محمود راہی! ممکن ہے کہ گھٹنوں کے بل جھکے وہ صاحب... آصفہ صداقت کو ہی ڈھونڈ رہے ہوں۔ جھڈو سے ام ثمامہ! آپ دیر سے آتی ہیں مگر درست آتی ہیں۔ اسلام آباد سے سید شکیل حسین کاظمی! ہم تو بمشکل فرصت نکال کر حاضر ہونے کی اپنی سی کوشش میں مجو عمل رہتے ہیں مگر... وہی ظالم سماج اور آہنی دیواریں... لیہ سے آمنہ پٹھانی! آپ کی غیر حاضری کی طوالت میں یقیناً ذہنی علالت بھی جزو لازم ہے۔ فتح پور سے سید محی الدین اشفاق! سالگرہ کے لیے ازحد مبارکاں۔ یہ بھی بتا دیتے کہ اس عمر میں... آپ کس عمر میں ہیں؟ حافظ آباد سے ماہا ایمان! آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے؟ پشاور سے جاسوسی و سسپنس کی مستقل اور دیرینہ قاری... طاہرہ گلزار صاحبہ کو ادارے سے شکایت ہے کہ انہیں مسلسل چھ ماہ سے نظرانداز کیا جا رہا ہے بقول ان کے... وہ مسلسل خطوط لکھ رہی ہیں اور مسلسل نظرانداز ہو رہی ہیں۔ بالآخر انہوں نے ہم سے کہا کہ ہماری گزارشات ادارے کے گوش گزار کر دیں۔ (آپ سے کیوں اور کیسے؟) لہٰذا آپ سے گزارش ہے کہ نئے قارئین کی جانب بھرپور توجہ مبذول فرمائیں۔ ابتدائی صفحات پر ایچ اقبال کی پراثر و شاندار تحریر گھر کا چراغ انسانی سرشت اور جبلت کے دلچسپ و حیرت آمیز تماشے۔ انسان اگر راہِ راست پر ہے تو اشرف المخلوقات ہے اور اگر راہ سے گمراہ ہے تو... ننگِ انسانیت ہے۔ تقدیر کے فیصلے اور ارادے انسانی سوچ سے مختلف اور اٹل ہوتے ہیں۔ شمعون اور رفعت نے گئے دنوں کا سراغ پا لیا۔ کہانیوں کے مغلِ اعظم کی للکار پھر زبردست اور شاندار... سلطانہ اور آفتاب کی انتہا پسندی قابلِ مذمت ہے۔ اسما قادری کی گرداب قدرے بہتر ہو رہی ہے اور مختصر بھی۔ افتخار چودھری کا ظلم و جبر... انتہا کو جا پہنچا ہے۔ ہر فرعون کے لیے موسیٰ ضرور ہے۔ اسلم اور ماہ بانو مصائب و آلام کی زد میں ہیں۔ شہریار کا تذکرہ و کارکردگی نہ ہونے کے برابر ہو گئی ہے۔ آفتاب اور کشور بھی منظر سے غائب ہیں۔ سرورق کا پہلا رنگ... کاشف زبیر کی طے شدہ محبت، محبتیں، شوخیاں اور شرارتیں... تیمور اور شامی کی تازہ کارروائی... دلچسپ اور زبردست... شفقت کو انتقام نے اندھا کر دیا۔ اور انتقام اور غصہ عقل کو... ماؤف کر دیتا ہے۔ انقلابِ ایران کے تناظر میں لکھی گئی شکیل صدیقی کی دلچسپ کوشش۔ چاہِ درپیش بھی کامیاب رہی۔ سائرس قدیر کی ہمت و استقامت قابلِ داد ہے۔ تنویر ریاض کی دلچسپ تحریر۔ انعام نے بھی بور نہیں کیا۔ وجودِ زن سے کائنات کے رنگوں میں ایک پرفسوں رنگ۔ بابر نعیم کا پراثر ماجرا۔ سودا بہت مناسب رہا۔ کچھ کرنے کی دھن ہو تو... انسان بہت کچھ کر جاتا ہے سو... استھ بھی کر گزرا... ازدواجی حیات کی تلخیوں سے عبارت سلیم انور کی متاثر کن روداد... بے باق... گاڑی کا ایک پہیہ خراب ہو تو یہی کچھ ہو سکتا ہے لیکن لیلیٰ نے پہیہ ہی تبدیل کر لیا۔ زبردست انسانی سازشوں سے بیزار ایک وفادار کتے کی دلفریب کہانی... مریم کے خان کی زبانی، باکس آفس پر سپرہٹ رہی۔ دلچسپ لہجے کا منفرد مصنف منظر امام... استاد محبوب نرالے عالم کا جناتی زبان میں دلچسپ نامہ سفرنامہ۔ عکسِ فاطمہ کی اثر انگیز تحریر، یومِ تقدیر... عمل... ردِعمل اور قانونِ مکافاتِ عمل کا احاطہ کرتی ہوئی عبرت اثر روداد... ایک غلط راہوں کا مسافر تھا اور ایسے بے سمت مسافروں کا انجام یہی ہوتا ہے۔ آخر میں منڈی بہاؤالدین سے جہانگیر اسلم گوندل کو تہِ دل سے رہائی مبارک ہو۔"

مانسہرہ سے ایم اے انجم کی حاضری "اس ماہ کا شمارہ 2 نومبر کو دستیاب ہوا۔ ٹائٹل اس دفعہ جاسوسی کی شان کے مطابق تھا۔ فہرست بھی اچھی رہی۔ اولین صفحات پر ایچ اقبال صاحب کو دیکھ کر خوشی ہوئی۔ اگرچہ کہانی ابھی تک نہیں پڑھی، کیا کریں تعلیمی مصروفیات ہی اتنی ہوتی ہیں کہ رسالہ پڑھنے کے لیے فرصت ہی نہیں ملتی۔ (یہ تو نکالنی پڑتی ہے) چیں، نکتہ چینی میں پہنچے جہاں نووارد آصفہ صداقت آنٹی کرسیِ صدارت کے مزے لوٹ رہی تھیں۔ آنٹی جی! مبارکاں۔ ہمایوں سعید راج برادر! ماہا کی اتنی تعریف،

خیریت تو ہے؟ ام ثمامہ جی! پلیز ریگولر آتی رہیے گا۔ آپ کی سلجھی ہوئی باتیں ہمیں بہت اچھی لگتی ہیں۔ یقیناً ہم آپ سے بہت کچھ سیکھ سکیں گے۔ آمنہ پٹھانی جی! سید محی الدین اشفاق جی! سالگرہ مبارک۔ جہانگیر اسلم گوندل! بہت خوشی ہوئی آپ کی رہائی کا سن کر۔ تفسیر عباس بابر، مرزا اسٹرز اور علی آتش صاحب بلیک لسٹ میں استراحت فرما رہے تھے۔ (گرتے ہیں شہ سوار ہی...) کہانیوں میں پہلے گرداب پڑھی۔ شکر ہے ماہ بانو مل گئی، کسی نے اغوا نہیں کیا۔ ادھر چودھرائن بھی اپنے انجام کو پہنچ گئی۔ حالانکہ چودھرائن نے خود بھی بہت ظلم کیے تھے لیکن جس طرح اس کا انجام ہوا اور جو بُرے دن اس پر گزرے، نہ جانے کیوں ہمیں یہ سب دیکھ کر بھی خوشی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں یہ انسان اتنا ظالم کیوں بن جاتا ہے؟ للکار بھی بہت زبردست جارہی ہے۔ عمو اور تابی کا ساتھ بہت ہی اچھا لگ رہا ہے۔ ویلڈن مغل انکل۔ پہلا رنگ کاشف زبیر صاحب، تیمور اور شامی کے ساتھ حاضر ہوئے۔ دونوں نے دو مافیا والوں کو ملایا اچھا لگا۔ یقیناً باقی کہانیاں بھی اچھی ہوں گی۔"

محمد اسحاق انجم کی کنگن پور سے لفظی جادوگری "چھینی نکتہ چینی کی تو بات ہی چھوڑو جی۔ جب گھر کا چراغ ہی انعام کے لالچ میں سودا کرے اور وہ بھی بے باق اور للکار کے ساتھ تو اس گھر کا تو اللہ ہی حافظ ہوگا... یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ وفادار، ہوگا وہ تو انتقام، لے رہا ہے۔ نامۂ سفر نامہ کا جوا سے گرداب کے قریب لے گیا اور یہی اس کا یوم تقدیر تھا۔ دلدل، میں ڈوبا کیا کرے جب چاہ در پیش ہو ورنہ صدیقی صاحب کیوں باور کراتے کہ وہ خوش جمال و خوش خصال ہیں اور کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے کئی ناول ریکارڈ قائم کر چکے ہیں۔ پبلشرز کی تو کوشش ہوتی ہے ایسا رائٹر ان کے ادارے سے منسلک رہے۔ وہ منہ مانگا معاوضہ وصول تو کر رہے ہیں اور کیا چاہیے؟ اسی لیے تو کچھ لوگ کہتے ہیں گھر کا چراغ ہے کوئی بات نہیں۔ ورنہ ایران کہاں اور پاکستان کہاں۔"

ضلع چنیوٹ، بھوانہ سے جعفر حسین کا تجزیہ "ڈاکٹر انکل نوجوانی کی پتا نہیں کون سی خطا کا کفارہ آج تک صنفِ نازک کو ہوش رُبا پوزوں میں متعارف کروا کے کر رہے ہیں۔ فہرست کی تبدیلی پسند آئی۔ اداریہ معاشرے میں روز بروز بڑھتی مادیت پرستی کو نمایاں کر رہا تھا۔ آصفہ صاحبہ! آپ کو میری طرف سے مزے دار مبارکباد۔ کہانیوں کی ابتدا شارٹ اسٹوریز سے کی۔ انعام کچھ خاص نہیں لگی۔ یادِ ماضی عذاب ہے یا رب... کی تفسیر انتقام، محبت اور نفرت کے بین بین سفر کرتی معیاری تحریر تھی۔ جانوروں کے لطیف احساسات کو زبان دیتی اور انسانوں سے غیر مشروط وفاداری کو بیان کرتی وفادار زبردست رہی۔ نامہ سفرنامہ تھوڑی سی واقعاتی تبدیلی اور معمولی سے ردوبدل کے ساتھ ہم پہلے بھی شاید سرگزشت میں پڑھ چکے ہیں۔ انسانی ذہن کو جلا بخشتی اور اس یقین کی طرف مائل کرتی کہ ہم اپنی سوچ اور عمل میں محدود ہیں۔ یوم تقدیر الگ ڈگر کی منفرد تحریر لگی۔ اپنی حماقت کی وجہ سے بلیک میلر کے ہتھے لگ جانے والے فرینک کی داستان دلدل معاشرے کے ان ناسوروں کے متعلق تھی جو کسی سے ایک دفعہ چمٹ جائیں تو جونک کی طرح خون کا آخری قطرہ تک چوس کر جان چھوڑتے ہیں۔ (بجا فرمایا) ہمایوں اقبال کی گھر کا چراغ کا پلاٹ کافی کمزور تھا۔ پلاٹ کے لحاظ سے انسانی فطرت کی پیچیدگیوں اور حالات و واقعات کے مطابق مخصوص مدوجزر والی کیفیت بھی نہیں تھی۔ سب کرداروں کا رویہ روبوٹ کے مانند تھا۔ رنگوں میں 70 کی دہائی کے ایرانی انقلاب اور دو بڑی متحارب قوتوں کے مفادات کے ٹکراؤ میں پنہاں گوشوں سے پردہ اٹھاتی چاہ درپیش موضوع کے تنوع کے لحاظ سے بہترین رہا۔ آپ سے پوچھنا تھا کہ کیا یہ کہانی ماخوذ تھی؟ ہلکے پھلکے لطیف پیرائے میں لکھا گیا پہلا رنگ طے شدہ محبت نے کافی محظوظ کیا۔ جہاں اس تحریر نے لبوں پر بے ساختہ ہنسی کھلا دی، وہیں پرانی قدروں اور روایات کی مسلمہ اہمیت اجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ نئی نسل کی روشن خیالی سے بھی شگفتہ انداز میں چوٹ کی گئی۔ قاری کی نبض پکڑ کر اس کے پہلو بہ پہلو چلتی تحریر للکار ہر زاویے سے جاسوسی کی پچھلے کچھ سالوں میں بہترین تحریر ہے۔ حقیقت سے قریب ترین منظر نگاری ہو یا کردار نگاری، مغل صاحب کوئی پہلو تشنہ نہیں چھوڑتے۔ لاہور میں ایک ڈیک نالے کی طرف سفر کرتے تابی کو جیب سے ملنے والی جیبی ڈائری کی جانب طاہر انکل نے کچھ نہیں بتایا۔ (انتظار) اسما صاحبہ کی گرداب ہر لحاظ سے فضول کہانی ہے۔ مصنفہ دو تین کہانیوں کو ساتھ لے کر چلنے کے باوجود کسی ایک کہانی سے بھی انصاف نہیں کر پا رہی ہیں۔ مکالمے طویل اور بے مقصد اور ان میں پس منظر اور پیش منظر زیادہ ہوتا ہے۔ کہانی کے بہت سے کردار اور مرکزی خیال بھی شاید گرداب کی نذر ہو گیا ہے۔ کہانی کٹی پتنگ کے مانند کئی ماہ سے ادھر اُدھر بے مقصد ڈولتی پھر رہی ہے۔"

سید عبادت کاظمی کی ڈیرہ اسماعیل خان سے تعریف "بھیگے بھیگے موسم کے ساتھ جاسوسی اس دفعہ خلافِ معمول 2 تاریخ کو ملا۔ ٹائٹل اس بار بالکل پسند نہیں آیا۔ اس دفعہ کرسیِ صدارت کی حق دار آصفہ صداقت ٹھہریں۔ ہماری طرف سے مبارک ہو۔ اس ماہ تبصروں کی محفل کے تمام خاص ستارے غائب تھے۔ کہانیوں میں سب سے پہلے گرداب پڑھی، بہت مزہ آیا لیکن ماہ بانو کی پریشانیاں کب ختم ہوں گی؟ لگتا ہے پھر چودھری کے کارندے ماہ بانو کے پاس پہنچ چکے ہیں، خدا خیر کرے۔ للکار نے اس دفعہ ہمیں بہت بڑا جھٹکا دیا۔ آفتاب خاں چھپا رستم نکلا اور یہ سلطانہ کو کیا ہوا؟ معاملہ خاصا گمبھیر ہے لیکن اس سارے قصے میں عمران کی ہمت کو داد دینی چاہیے۔ گھر کا چراغ ایچ اقبال نے بہت اچھا لکھا۔ دولت کی ہوس بھی انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ دوسرے رنگ نے کچھ خاص متاثر نہ کیا۔ البتہ کاشف زبیر کی کہانی ہمیشہ کی طرح میٹھا لڈو لگی۔ مریم کے خان کی اسٹوری بہت اچھی ہوتی ہے۔ مریم جی! میں آپ کا بہت بڑا فین ہوں۔ پلیز! کوئی سلسلہ وار اسٹوری بھی لکھیں نا۔ اور آخر میں کہنا تھا کہ جاسوسی میں پلیز کوئی شعروسخن کی محفل منعقد کریں پلیز۔" (فی الحال تو جاسوسی کو اس سے دور ہی رکھیں)

ٹیکسلا سے دلنشین بلوچ کی عجلت "نومبر کا جاسوسی 3 تاریخ کو جلوہ افروز ہوا۔ محفلِ یاراں میں جھانکا۔ آصفہ صداقت شان و شوکت سے صدر بنی بیٹھی تھیں۔ پیاری آصفہ، نام کی پسندیدگی کا شکریہ۔ میری سب فرینڈز کو میرا نام پسند ہے۔ ہمایوں سعید! کیوں ہر وقت جل ککڑے بنے رہتے ہو؟ کبھی کوئی خیر کا جملہ بھی بول دیا کریں۔ محی الدین! کم آنے کی وجہ میں نے ہزاروں بار لکھی۔ جہانگیر اسلم! رہائی مبارک، مٹھائی کب کھلائیں گے خوشبو لگا کے۔ صبا گل! کیوں آتش بنی ہو خیر تو ہے۔ سید شکیل کاظمی! مان گئے ہم کہ آپ سے زیادہ نرم

دل کوئی نہیں دیکھا۔ کہیں رسالے کی تلاش میں کباڑیوں کو نہ کھنگالنا شروع کر دینا۔ ام ثمامہ! ہمارے بھانجے بھانجیاں کتنے ہیں؟ محمد جاوید بلوچ! محفل میں آتے رہیں۔ کہانیوں میں سب سے پہلے للکار پڑھی۔ ہمیشہ کی طرح شاندار، دل بہار تھی۔ اچھوتی، منفرد، زبردست، تیز رفتار۔ جاوید مغل صاحب، ہر ماہ اتنی شاندار اسٹوری دینے پر شکریہ۔ سلطانہ ڈاکو مشکل ہے زندہ رہے۔ خیر ابھی تو ہم دم سادھے حالات و واقعات میں مگن ہیں، آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ جاسوسی کے اولین صفحات میں ایچ اقبال ایک تیز رفتار اسٹوری لائے۔ گھر کا چراغ جس نے ہمیں شروع سے آخر تک اپنے ساتھ دوڑائے رکھا کہانی ہمیشہ کی طرح بہت ہی اچھی تھی، خاص کر اینڈ۔ ایچ اقبال صاحب اتنی اچھی تحریر پر مبارکباد کے حق دار ہیں۔ سلیم انور کی بے باق کچھ خاص نہ تھی، یونہی فضول تحریر۔ باقی ڈائجسٹ زبردست لگ رہا ہے۔"

کوئٹہ سے ابنِ قرن کی تجزیاتی رپورٹ "آنکھیں موندے گہری نیند میں سپنے دیکھتی خوب صورت لڑکی۔ گاڑی کا کھلا دروازہ ہاتھ میں پسٹل تھامے بھاگتا مرد۔ ٹیڑھے دانتوں کی نمائش کرتا شخص۔ موٹے عدسوں کی چوڑی کمانیوں والی عینک اس کی بدصورتی میں اضافہ کر رہی تھی۔ (سیدھے سیدھے نام لکھ دیتے کہ آپ ہمایوں سعید راج کی تصویر کشی کر رہے ہیں) ایچ اقبال کی تحریر گھر کا چراغ ایک ایسی تحریر تھی جسے قاری تو چھوڑنا چاہتا ہے مگر وہ قاری کو نہیں چھوڑتی۔ اتنی بور بھی نہیں کہ بندہ چھوڑ کر آگے بڑھ جائے۔ اتنی دلچسپ بھی نہیں کہ پڑھ سکے۔ خدا خدا کر کے کہانی ختم ہوئی۔ (شکر ہے) مگر انجام اس طرح کا ہوگا۔ عورت کی فطرت میں رقابت ہے اور خاص طور پر شوہروں کے معاملے میں تو خواتین بہت حساس ہوتی ہیں اور ہمارے معاشرے میں تو یہ حساسیت عروج پر ہے۔ نہ جانے ایچ اقبال صاحب رفعت اور یمیرا کہاں سے ڈھونڈ لائے۔ (آپ بھی ڈھونڈیں... مل جائیں گی دو دو اور پھر مزے...) طے شدہ محبت، کاشف زبیر صاحب کی دلچسپ تحریر تھی۔ بلاشبہ مکالمہ نویسی پر انہیں ملکہ حاصل ہے۔ کیا زبردست نوک جھونک رہتی ہے ان کے کرداروں کے درمیان۔ پوری کہانی کے دوران ایک تبسم ہونٹوں پر ٹھہرا رہتا ہے۔ (شکر ہے۔ ورنہ ہم تو سمجھے آپ کڑھتے ہی رہتے ہیں) کوچۂ طاہر جاوید مغل کی تو کیا بات ہے۔ اس مرتبہ عمران اور تابش کو کھیتوں کے درمیان ٹھٹھرتے پایا۔ (آپ کمبل لے کے پہنچے کیوں نہیں؟) چاہ درپیش سربستہ رازوں کی کتھا تو بالکل بھی نہیں لگی بلکہ چشم بندش تحریر تھی۔ پڑھتے پڑھتے کب آنکھیں بند ہو گئیں معلوم ہی نہ ہوا۔ (آنکھ کیسے کھلی، یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا...) منظر امام صاحب کی نامۂ سفرنامہ پڑھی۔ اب یہ میری بدذوقی ہے یا کیا ہے کہ کچھ عرصے سے منظر صاحب کی کہانیاں مجھے بالکل متاثر نہیں کر پاتیں۔ اس مرتبہ کی کہانی نے بھی وقت کے زیاں کا احساس دلایا۔ مختار آزاد کی انتقام ایک بہتر کاوش تھی۔ داد نہ دینا ناانصافی ہوگی مگر مجھ سے انصاف کی توقع صرف مرغن کھانا ہی کر سکتا ہے۔ (اچھا جی، کھانا آپ سے انصاف کرتا ہے۔ اور ہم تو سمجھے تھے کہ...) سودا میں جس انداز سے اسمتھ کی تعریف کی گئی تھی، لینڈ کروزر میں بیٹھ کر مہم کی طرف نکلتے بتایا گیا تھا اور بعد میں جو کہانی پڑھی تو بے اختیار منہ سے نکلا، کھودا پہاڑ نکلا چوہا اور وہ بھی مرا ہوا۔ باقی کہانیاں زیرِ مطالعہ ہیں۔ تنقید کا ہرگز مقصد کسی کی دل آزاری نہیں بلکہ تعمیر کا کام لینا مقصود ہے۔ ایک عام سی تحریر لکھنا بھی کتنے جوکھم کا کام ہے مجھ سے زیادہ کوئی نہیں جانتا کہ میں اکثر عام تحریریں لکھتا رہتا ہوں۔" (چلیں جی شکر ہے... آپ کو یہ تو معلوم ہے کہ یہ کام آسان نہیں)

سارہ راجپوت کی مصروفیت راولپنڈی سے "جاسوسی حسبِ معمول 3 تاریخ کو ملا۔ اشتہارات کو کراس کر کے چیٹی دان میں پہنچی۔ آہا... ہماری صنفِ نازک کی ترجمان پیاری سی آصفہ صداقت کرسیِ صدارت پر بڑی شان سے براجمان ہیں۔ سب کے تبصرے بھرپور تھے۔ خود کو بلیک لسٹ میں دیکھ کر سخت صدمہ ہوا لیکن تفسیر عباس بابر کو بھی اپنے ساتھ پا کر دل کی تھوڑی ڈھارس بندھی۔ کہانیوں میں سب سے پہلے طاہر جاوید مغل کے قلم کی للکار پڑھی۔ پوری قسط ایک ہی منظر میں جیسے ٹھہر گئی تھی۔ ادھر گرداب میں بھی صورتِ حال کچھ مختلف نہ تھی۔ رنگوں میں کاشف زبیر کے قلم سے شامی اور تیمور کی شرارتوں بھری کہانی طے شدہ محبت پڑھی۔ دیکھ لیں جوجی سے تو ہماری صنفِ نازک کی صوبی عقل مند نکلی۔ اس سے ثابت ہوا کہ خواتین مردوں سے زیادہ عقل مند ہوتی ہیں۔ باقی کہانیاں ابھی زیرِ مطالعہ ہیں۔"

حلبہ سے محمد نعمان پیارے خوشبو لگا کے لکھتے ہیں "اس مرتبہ کا رسالہ عیدالاضحیٰ سے پانچ دن پہلے ملا۔ اس دفعہ کا سرورق انتہائی شاندار تھا۔ ٹائٹل حسینہ ایک آنکھ بند کیے ہوئے نظر آئی۔ اور اس کی دوسری آنکھ ڈاکٹر انکل جگہ کی کمی کی وجہ سے بنا نہ سکے... دل لگا کے۔ ٹائٹل گرل کے نیچے ایک انتہائی خوب صورت کار بغیر نمبر کے نظر آئی جس پر نمبر پلیٹ تو تھی مگر نمبر غائب تھا۔ ڈاکٹر انکل اس کی کوئی خاص وجہ؟ اور تھی بھی بالکل نئی۔ محفل میں پہلے نمبر پر آصفہ صداقت اپنے تلخ تبصرے کے ساتھ حاضر تھیں۔ ہمایوں سعید صاحب! ایسا کیا ہے؟ جو آپ نے کم ہی دوستی کا ہاتھ دوسروں کی طرف بڑھایا ہے دل لگا کے۔ طارق محمود جی! موسٹ ویلکم۔ سید محی الدین صاحب! سالگرہ مبارک ہو۔ کتنے کے ہو گئے ہیں آپ؟ اب لڑکیوں کی طرح عمر مت چھپائیے گا کہ ابھی تو بیس کا ہوں۔ صبا گل! اتنا غصہ نہ کریں دماغ لگا کے۔ جاسوسی میں خط نہ پا کر سب کو ہی دکھ ہوتا ہے اور میں خود اس سعادت سے کئی بار مستفید ہو چکا ہوں۔ کہانیوں کی ابتدا تنویر ریاض کی انعام سے ہوئی۔ یہ بہت ہی دلچسپ تھی۔ بابر نعیم کی سودا ایک الجھا دینے والی داستان تھی میرے خیال میں ڈینس کو لازمی سزا ملنی چاہیے تھی اور لائم کو بھی ایسے ہی نہیں چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ بے باق ایک اچھی کاوش تھی۔ للکار اپنے سفر کی جانب گامزن ہے۔ آفتاب خاں اور سلطانہ نے عجب کام شروع کیے ہوئے ہیں اور اوپر سے آفتاب، جارج کی بہن ماریا کو بھی اٹھا لایا۔ سب ایک دوسرے سے انتقام لینے پر تلے ہوئے ہیں۔ لڑائی، مار کٹائی اور سسپنس کے بیچوں بیچ عمران کا مزاحیہ اور ہر فن مولا والا کردار بھی ساتھ ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں، خوشبو لگا کے۔ مریم کے خان کی وفادار ایک کتے کی وفاداری سے لبریز ایک بھرپور داستان تھی۔ کتے یعنی رومیو نے بروقت اور ٹھیک فیصلہ کر کے شیلا کو تباہی سے بچایا۔ واقعی اگر ایک کتا کسی انسان کو قتل کر دے تو اس کا

الزام اس پر کیسے آئے۔ جبار آزاد صاحب کی انتقام ایک عمدہ کہانی تھی۔ پال اور ایڈی کو اپنے کیے کی سزا ملی مگر ہمارے ہیرو کا افسوس جن سے اس کی محبت چھن گئی، خوشبو لگا کے۔ منظر امام کی نامۂ سفرنامہ ایک دلچسپ اور لاجواب داستان تھی۔ استاد نے اچھا سفرنامہ مرتب کیا دل لگا کے۔ ہمارے فیورٹ رائٹر کا پہلا رنگ طے شدہ محبت بہت ہی زبردست اور چلبلا تھا۔ اور کیوں نہ ہوتا، تیمور اور شامی جی کے کارنامے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں۔ خوشبو کا تڑکا لگا کے۔“

ایم اے ہاشمی فرام بونیر حاضرِ خدمت ہیں ”نومبر کا شمارہ خلافِ معمول 2 تاریخ کو مل گیا۔ اس دفعہ سرورق کو غور سے دیکھا۔ سرورق کچھ الجھا ہوا سا تھا۔ اشتہارات کو پہلا انکار رہا مگر وہ تو ختم ہی نہیں ہو رہے تھے۔ بالآخر چیچنی، نکتہ چینی تک پہنچے۔ صد افسوس کہ چیچنی، نکتہ چینی کا ایک صفحہ اشتہارات کھا گئے۔ لو بھئی ہمیں صفحات بڑھانے کی توقع تھی اور وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہو رہے ہیں۔ اس دفعہ آصفہ صداقت ملکہ بنی ہوئی تھیں، مبارکباد۔ محترمہ زیادہ ہنسیے گا مت۔ بتیسی گر جائے گی۔ ویسے میرے خیال میں آپ اپنے بیوقوفانہ اندازِ بیان پر ہنس رہی ہیں۔ ہنسنے سے پہلے حسینہ سے پوچھیں کہ وہ گٹر کے اندر کیا کر رہی تھی۔ آمنہ بی بی! خوش آمدید۔ قدرت اللہ نیازی صاحب! خانیوال میں بھی ایک رات گزارنے کا اتفاق ہوا تھا لیکن ٹرین میں ہاہاہا۔ اور اپنے ہمایوں کے بارے میں ایسا مت کہو۔ اونچا بولنے والے اپنا منہ چھپائے رکھتے ہیں۔ بہن صبا گل! اتنی ٹینشن مت بڑھاؤ۔ محفل کے سب بہن بھائیوں کا یہی حال ہے۔ اپنے ملک میں سب کچھ جائز ہے۔ سب سے پہلے گرداب کا جائزہ لیا۔ دل نہ چاہنے کے باوجود میں سب سے پہلے گرداب پڑھتا ہوں۔ گرداب میں دلچسپی کا کوئی سامان نہیں رہا۔ اسماجی! آپ کے لیے عرض ہے کہ گرداب اتنی بری کہانی نہیں۔ لیکن اس میں واقعات کا تسلسل، سلوموشن ایک قاری کو مایوس کرتا ہے، بلاشبہ کہانی لکھنا مشکل کام ہے۔ آپ ہر کسی کی تنقید مثبت لیں۔ ایچ اقبال صاحب کی گھر کا چراغ ایک اچھی کہانی تھی۔ للکار... جی ہاں للکار اپنے اسلوب بیان، واقعات کے تسلسل، الفاظی سے عاری لہجے اور مقامی ماحول کی وجہ سے بلاشبہ ہر قاری کو شکار کر چکی ہے۔ اس کی سحرکاریاں، فتنہ انگیزیاں اپنے عروج پر ہیں۔ آفتاب اور ہاشم پر بے حد غصہ آرہا ہے کہ دونوں اپنی زبان سے پھر گئے۔ میں تو چاہتا ہوں کہ گولیوں سے بھون ڈالیں تو اچھا ہے۔ طے شدہ محبت پڑھ کر مزہ آیا۔ محبت بھی گھر آباد کرتی ہے اور کبھی برباد، سو ان کے گھر آباد ہو گئے۔ ان کی شادی قابلِ رشک تھی کیونکہ ایسی شادی قسمت والوں کو نصیب ہوتی ہے۔ مصروفیات کی وجہ سے باقی رسالہ ابھی زیرِ مطالعہ ہے۔“

سانگھڑ سے عبدالسلام کی آمد ”عرصہ دراز کے بعد محفلِ دوستاں میں حاضری ہو رہی ہے۔ مصروفیت اتنی بڑھ گئی تھی۔ ڈائجسٹ مکمل کرتے کرتے 20 تاریخ گزر چکی ہوتی ہے۔ لہٰذا حاضری کا موقع نہ مل سکا۔ وضاحت اس لیے کی کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ شاید جاسوسی سے تعلق ختم کر لیا۔ عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ کے درمیان سندھ بالخصوص سانگھڑ اور میرپور خاص، بدین سیلاب کے زیرِ نگیں رہے۔ طوفانی بارشیں، مواصلات، ذرائع آمد و رفت کا زمینی راستہ سانگھڑ سے کٹ گیا۔ اربوں روپے کی فصلیں تباہ ہو گئیں۔ جانوروں کی ہلاکت اور چاروں طرف پانی میں گھرے لوگوں کی آہ و پکار... اُف قلم بیان کرنے سے قاصر ہے۔ آپ بھی اور قارئین اور سب دوست دعا گو رہیں کہ اللہ اپنا رحم فرما دے اور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے، آمین۔ (اللہ تعالیٰ ہماری عوام پر رحم اور اعلیٰ حکام کو ہدایت عطا فرمائے) ذاکر انکل ہمیشہ آپ سے شکوہ ہی رہا ڈائجسٹ کے سرورق کے پورے تین حصوں پر آپ صنفِ نازک بنا دیتے ہیں۔ (اس میں شکوے کی بات کیا ہے؟ کائنات میں اسی سے رنگ ہے) آصفہ صاحبہ کو مبارک باد بہت بہت۔ تبصرہ تو بس الویں تھا، پر پتا نہیں نام کی وجہ سے انعام کی حق دار ٹھہر گئی ہوں۔ (یہ زیادتی ہے) بھائی جہانگیر اسلم گوندل! آپ کی خوشبو لگا کر خوش خبری نے دل باغ باغ کر دیا۔ اللہ کرے اگلا شمارہ آزاد فضاؤں میں ہی آپ کے ہاتھ میں آئے۔ 9 سال بہت بڑا عرصہ ہے جو آپ نے گنوا دیا۔ اللہ تعالیٰ اس کا نعم البدل عطا فرما دے، آمین۔ قدرت اللہ صاحب! آپ لوٹے نہ بنا کرو آپ کو بڑی ہمدردی ہوتی ہے نا صنفِ نازک سے۔ پھر مرغا بنتے ہوں گے آپ ہم نہیں۔ ویسے میں پورا مہینا خانیوال رہ کر آیا ہوں ابھی۔ آمنہ پٹھانی صاحبہ! ویلکم۔ میرے خیال میں آپ بوڑھی ہو گئی ہیں، نظر بھی کم ہو گئی ہے اور کمر بھی جھک گئی ہے۔ شاید اس وجہ سے خط نہیں لکھ سکی ہوں۔ پوتے، پوتیاں، نواسے نواسیاں ہوں گے ان کی مدد لے لینی تھی۔ ام ثمامہ! ہم مرد بڑے پڑھے لکھے اور قابل ہوتے ہیں اس لیے ہمارا تبصرہ بھی اچھا ہوتا ہے نا۔ دشمن بھی تعریف پر مجبور ہوتا ہے۔ اس مہینے اپنی صنف کا بھی تبصرہ آپ نے پڑھ لیا ہوگا۔ ایچ اقبال کی گھر کا چراغ ہی کہانی پڑھی ہے۔ اُف دولت، لالچ، ہوس انسان کو پاگل کر دیتی ہے۔ رشتے ناتے سب کی تمیز بھی ختم کر دیتی ہے۔ ایک باپ یوں بیٹے اور بہو کے ساتھ کر سکتا ہے، اُف، بہت اچھی کاوش تھی۔“

بنوں سے ہمایوں سعید راج کی یادآوری ”اس دفعہ سرورق بے تحاشا کشش کا حامل تھا۔ (کیوں؟) لڑکی جب محوِ خواب ہوتی ہے تو بے تحاشا معصوم اور خوب صورت لگتی ہے کیونکہ خاموش ہوتی ہے۔ (تصویروں سے دل بہلایا کریں... ہمیشہ خاموش رہتی ہیں...) لہٰذا اس بار ہم بار بار کہانی روکتے اور پلٹ کر ٹائٹل کو دیکھتے رہے۔ انکل نے بھی ہماری محفل کا ایک صفحہ میڈی کیم کو دے کر ہمیں ڈسٹرب کرنے کی کوشش کی۔ (معذرت چاہتے ہیں اس کے لیے...) یہ جان کے بے حد دکھ ہوا کہ آصفہ صداقت کے ہاں کسی حسینہ کے دل تک پہنچنے کا راستہ گٹر سے ہو کر گزرتا ہے۔ کاظمی صاحب! گرد آلود کپڑوں اور الجھے بالوں سمیت پاگلوں کی طرح الماریوں میں سعدیہ مہارانی کے لیے کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ اشفاق میاں! یہ ٹرنک کے کاروبار والوں کا المیہ ہے کہ انہیں تحفے میں الماری، صندوق اور سیف وغیرہ ہی ملتے ہیں۔ واہ انجم صاحب! کیا اسٹائل ہے تمہارا۔ فہرست دیکھ کر تبصرہ لکھ مارا۔ گوندل صاحب! ہماری طرف سے بہت بہت مبارک ہو۔ بس پلیز باہر نکل کے خوشبو ذرا کم لگائیے گا کیونکہ زیادتی کسی بھی چیز کی اچھی نہیں ہے یار۔ قدرت اللہ بھائی! ہم نے کسی بھی دھڑ کی بازی نہیں لگائی۔ میں نے صرف ایک دوست کی بات کا جواب دیا تھا۔ ویسے بھی سورج میں روشنی ہے، چاندنی میں فرحت ہے۔ پھولوں میں خوشبو ہے، ایسا ثابت کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ (کمال ہے، کیا کیا انکشافات ہو رہے ہیں آج) صبا گل! شکر ہے کسی وجہ سے تو آپ ہنسیں۔ (حالانکہ آپ کا نام بھی کافی ہے) ورنہ پورے شمارے نے آپ کو جوالا مکھی بنا دیا تھا۔ عبادت

صاحب! بڑے بھولے واقع ہوئے ہو آپ۔ اگر میں تنفیر صاحب کو منع کر رہا ہوں تو اس کی لازماً کوئی خوب صورت وجہ ہوگی نا۔ (ہمیں بھی معلوم ہو... وہ خوب صورت وجہ!) آتش صاحب! تمہارا نام اتنا بھی حیران کن نہیں ہے کہ ہمیں پریشان کر دے۔ اوئی ام ثمامہ! ہم آپ کا درد سمجھ سکتے ہیں۔ آپ نے تو دل کے تاروں سے بڑی مشکل سے خط لکھا تھا۔ ہم تو چین سے لکھتے ہیں پھر بھی اگر راستے میں کھو جائے تو اداسی ٹھہر جاتی ہے۔ للکار میں وفا پرست سلطانہ کا بھیانک روپ دیکھ کر حیرت ہوئی۔ کسی بھی جگہ پر کرداروں کا قبضہ اور باہر ہجوم، مختلف قسم کے مطالبات اور مختلف طریقوں سے مقبوضہ جگہ میں انٹری یہ لگتا ہے مغل انکل کا فیورٹ سین ہے۔ بہرحال، عمران کے پُرمزاح اور حقیقت کے قریب تر جملوں کو بے حد انجوائے کیا۔ بات ہو گرداب کی تو وہ پوری دل میں پیوست ہو چکی ہے۔ اسلم کے کردار کی مضبوطی متاثر کن ہے۔ راؤ فیملی کو شاید شدید مشکلات درپیش ہونے کے امکانات ہیں۔ دوسری طرف شہریار بھی اپنے وجود کا احساس دلا رہے ہیں۔ اچھا ہے کہ وہ اب گندگی صاف کرنے کے لیے قانونی دائرے سے باہر نکلنے کو بھی تیار ہو گئے ہیں۔ کاشف زبیر کی طے شدہ محبت لاجواب رہی۔ شکر ہے شامی کسی حسینہ سے نہیں ٹکرایا۔ اس دفعہ وہ مخصوص مزاح ناپید تھا جو ان کرداروں کا خاصہ ہے مگر پھر بھی کہانی بے حد شاندار رہی۔ چاہ درپیش قطعی طور پر غیر متاثر کن رہی۔ اولین صفحات پر ایچ اقبال نے شاندار تحفہ دیا۔ بیٹے نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہی کیا جو اسے صحیح لگا۔ تو باپ نے بھی وہی کیا جو انہیں صحیح لگا۔ ایک محبت سے مجبور تو دوسرا لالچ سے۔ سمیرا کی محبت واقعی متاثر کن تھی۔ آج کے زمانے میں کون سوکن قبول کرے گی۔ بے باق میں لیلیٰ نے بڑے دلکش انداز میں لالچی شوہر سے جان چھڑائی۔ نامۂ سفرنامہ میں استاد کی جناتی زبان نے بے حد اپ سیٹ کیا۔ مریم کے خان کی وفادار مختصر کہانیوں میں پہلے نمبر پر رہی۔ ایک بے زبان کے جذبات اور احساسات کی بھرپور ترجمانی کی گئی۔ کہانی پڑھ کے شکر ادا کیا کہ اب میں رومیو نہیں رہا۔“ (ہاہاہا)

وہاڑی سے انجینئر محمد شاہد عالم کی سرخوشی ”اس ماہ یکم نومبر کو ہی جاسوسی کے درشن ہو گئے۔ ٹائٹل گرل ہمیں دیکھ کر مدہوش ہو گئی۔ کوئی بات نہیں، ہمیں صنفِ نازک کے نازک دل کا ازحد خیال ہے۔ اشتہارات کو سرسری دیکھتے ہوئے اپنی پسندیدہ کہانی گرداب پر جا پہنچے۔ شروع والی اقساط تو میں نے ازحد دلچسپی سے پڑھی تھیں لیکن اب کچھ اقساط سے یہ کہانی چکردار بنتی جا رہی ہے۔ کہانی اپنی ڈگر سے ہٹ کر کہیں کی کہیں جا پہنچی ہے۔ اتنا تو ہم چار سال انجینئرنگ کو پڑھتے ہوئے نہیں الجھے تھے، جتنا اب گرداب کی کچھ اقساط نے الجھا اور چکرا دیا ہے۔ مصنفہ سے درخواست ہے کہ کہانی کو اِدھر اُدھر گھمانے کے بجائے اس کے مین پوائنٹ پر لے آئیں۔ گھر کا چراغ اور طے شدہ محبت پیاری کہانیاں تھیں۔ انگلش ترجمہ شدہ بھی پسند آئیں۔ چٹکلے بھی اچھے تھے، پڑھ کر بے اختیار ہنس پڑے۔“ (جزاک اللہ)

تحریم نکوکر، خوشاب سے ”مجھے اس بات کی سمجھ نہیں آئی، آخر جاسوسی ڈائجسٹ والوں کو میرے پتر شامل نہ کر کے کون سی راحت ملتی ہے۔ میں ہمیشہ جتنی چاہت اور شوق سے لکھتی ہوں، اتنی بے دردی سے کوڑادان میں پھینک دیتے ہیں۔ آپ کو کیا دشمنی ہے خوشاب والوں سے؟ بس اس کا جواب دے دیں۔ جب آپ نے پتر شامل ہی نہیں کرنا تو کہانیوں پر تبصرہ کیوں کروں؟“ (آپ کا غصہ بلاوجہ ہے۔ خط شائع نہ ہونے کی وجہ خط کا وقت پر نہ ملنا ہے۔ خوشاب کے بھی تمام قاری ہمارے لیے قابلِ احترام ہیں۔ ہمیں آپ کے تبصرے کا انتظار رہے گا)

اطہر حسین کی خیال آرائی کراچی سے ”یوں تو ہم پہلی بار خط لکھ رہے ہیں... کسی پرچے کے لیے... ورنہ خط تو... خیر، امید ہے کہ ہمارا خط شاملِ اشاعت ضرور ہوگا۔ پہلی بار خط لکھنے کی وجہ دیکھی جائے تو یہ ہے کہ ہمیں جاسوسیت پر مبنی کہانیاں پڑھنے کا ازحد شوق ہے اور اس شوق کی تکمیل ”جاسوسی“ کی حسین صورت میں ہوئی۔ ٹائٹل پر تبصرہ نہیں کریں گے کیونکہ یہ ہمیں فضول لگتا ہے۔ محفل بزم میں شامل سب دوستوں کو اس انجان دوست کا سلام۔ یوں تو خوبیاں اور خامیاں دونوں چیزیں ساتھ ساتھ ہیں مگر خامیوں سے زیادہ خوبیوں پر توجہ مرکوز رکھنا چاہیے کسی بھی معاملے میں۔ ویسے تو جاسوسی بہت پرانا پرچہ ہے مگر ہم اتنے پرانے نہیں۔ جب سے پڑھنا شروع کیا ہے، اس کے سحر میں کھوسے گئے ہیں۔ اس سحر میں مضبوطی سے جکڑے رہنے والی کہانی للکار ہے جو اپنے تیکھو کی وجہ سے واقعی پڑھنے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ طاہر جاوید مغل حالات و واقعات کی منظرکشی نہایت عمدگی سے کرتے ہیں۔ جاسوسی کا دوسرا سلسلہ گرداب یوں تو بہتر ہے مگر کہانی اپنی سست رفتاری کی وجہ سے زیادہ مزہ نہیں دے رہی۔ باقی چھوٹی کہانیاں کافی معیاری ہوتی ہیں جو پڑھ کر مزہ آتا ہے۔ جاسوسی کی تمام ٹیم کو مبارکباد اور دعا۔“

م الف کراچی کی محفل میں شامل ہونے کی پہلی کوشش ”خط تو ہمیں یاد نہیں کہ ہم نے آخری کس کو اور کب لکھا تھا اور جاسوسی میں خط لکھنے کی وجہ کچھ اس طرح بنی کہ دورانِ سفر بذریعہ ٹرین حیدرآباد جاتے ہوئے برابر میں بیٹھے صاحب کے ہاتھ میں جاسوسی ڈائجسٹ دیکھا جسے وہ بہت انہماک سے پڑھ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ اتنے انہماک سے کیا پڑھ رہے تھے اس میں۔ انہوں نے بہت پُرجوش انداز سے بتایا کہ اس میں ایک سلسلہ وار کہانی پڑھ رہا ہوں۔ کہانی تھی للکار۔ اور جناب جب ہم نے للکار شروع کی تو حیدرآباد آ گیا اور ہمیں معلوم بھی نہ ہو سکا۔ کہانی ادھوری رہ گئی تھی ان صاحب کا نام جنید ملک تھا انہوں نے ہماری دلچسپی کو محسوس کرتے ہوئے جاسوسی ڈائجسٹ تحفتاً ہمیں دیا جسے ہم نے شکریے کے ساتھ قبول کیا اور پورا رسالہ پڑھ ڈالا۔ بلاشبہ اس ڈائجسٹ میں بہت معیاری اور جاسوسی سے بھرپور کہانیاں شامل تھیں۔ للکار کے بارے میں ان صاحب کی تعریف غلط نہیں تھی۔ اب ہمیں للکار شروع سے پڑھنے کے لیے اس کے پرانے شمارے خریدنے ہوں گے اور ہاں، طاہر جاوید مغل صاحب نے کہانی پر اتنی مضبوط گرفت رکھی ہے کہ پتا ہی نہیں چلا کہ کب ختم ہوئی۔ یہ شمارہ تھا نومبر 2011ء کا۔ اس کے علاوہ دوسری سلسلے وار کہانی گرداب پڑھی جو اسما قادری لکھ رہی ہیں، یہ کچھ ہلکی لگی۔ ایچ اقبال کی گھر کا چراغ، کاشف زبیر کی طے شدہ محبت، شکیل صدیقی کی چاہ درپیش عمدہ کہانیاں تھیں۔“

ان قارئین کے نام جن کے نامے شاملِ بزم نہ ہو سکے۔

محمد بلال حیدر، ضلع خانیوال (کہانی مل گئی ہے)۔ علی کاشف آفاقی، میرپور آزاد کشمیر۔ مونا گل، بنوں۔ صبا سحر، کراچی۔ اجمل شیخ، سرگودھا۔ مہتاب شیروانی، حیدرآباد۔ محمد امین، کراچی۔ ثمرین شاہ، کراچی۔ شہانہ خان، بہاولپور۔ عاصم خان، کوئٹہ۔ معراج اختر، نواب شاہ۔

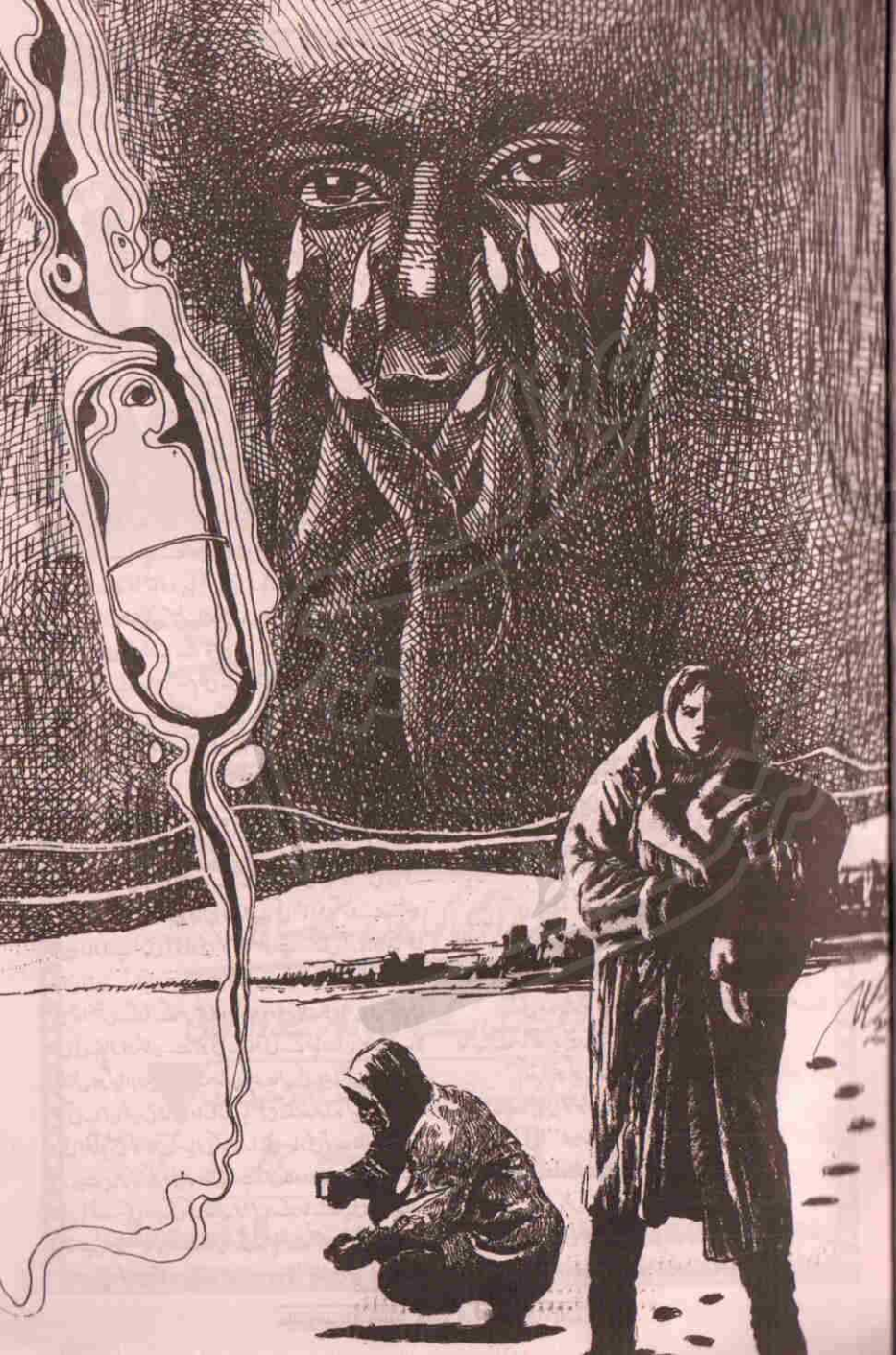

اس کلاکار کی داستان جو تہذیب آدم کو ایک نیا آہنگ دینا چاہتا تھا

خود کردہ

نشور ہادی

مشہور کہاوت ہے "خودکردہ را علاجے نیست" اور یہ بات بار بار عمل کی کسوٹی سے گزر کر ثابت ہو چکی ہے۔ دوسروں کی بوئی ہوئی فصل کاٹنا آسان ہوتا ہے لیکن اپنا ہی بویا ہوا بیج جب ایک تناور درخت کا روپ دھار کر اپنے سائے میں آنے والے ہر سبزے کو بے رحمی سے نگلنا شروع کر دیتا ہے تو بونے والا خود ہراساں ہو جاتا ہے۔ درخت ہی کاٹ دے یا سبزے کو اجڑنے دے، فیصلہ کرنا بہت مشکل ہو جاتا ہے... وہ بھی بہت محنت اور لگن سے اس کی آبیاری کرتا رہا۔ شاخیں تراش کر، پتے سنوار کر اسے منفرد سانچے میں ڈھالنے کی کوششیں کرتا رہا... اپنی کاوشوں کا ثمر دیکھ کر اسے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ اپنے خواب کی تعبیر پالے گا... پھر وہ ہوا جو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

یوں تو کافرستان کی سرسبز و شاداب وادی، چترال سے زیادہ دور نہیں ہے لیکن پہاڑی علاقہ ہونے کی وجہ سے راستہ انتہائی خطرناک ہے۔ یہ راستہ صرف گھوڑوں اور خچروں ہی پر طے کیا جا سکتا ہے اور منزل تک پہنچنے والے تھکن سے چور چور ہو جاتے ہیں۔ یہی حالت اس قافلے کی بھی تھی جو اب وادی میں داخل ہونے والا تھا۔

عام طور پر لوگ یہ راستہ زیادہ سے زیادہ آرام کرتے ہوئے طے کرتے ہیں مگر خان داراب نے کم سے کم آرام کرنے کی پالیسی پر اس لیے عمل کیا تھا کہ برف باری کا زمانہ سر پر آ چکا تھا۔ کسی وقت بھی برف باری شروع ہو سکتی تھی۔ اس صورت میں ان سب کی زندگی کے لالے پڑ جاتے۔ پھر نہ تو لوٹنا ممکن ہوتا اور نہ آگے بڑھا جا سکتا تھا کسی مناسب جگہ خیمے گاڑ کر وہ لوگ خود تو کسی حد تک امان پا سکتے تھے مگر ان کے تمام خچروں اور تینوں گھوڑوں کی موت یقینی ہوتی۔

"آخر اس موسم میں یہ سفر کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟" ارسلان نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔

وہ اور عالیہ اپنے اپنے گھوڑوں پر قافلے میں سب سے پیچھے چل رہے تھے۔

عالیہ نے مسکرا کر کہا۔ "باوا جانی سے ہی پوچھ لو۔"

"ان سے بھی پوچھ سکتا ہوں۔"

"اسی لہجے میں جس لہجے میں مجھ سے پوچھا ہے؟"

"نہیں، لہجہ تو بدلنا ہی پڑے گا۔" ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "دراصل مجھے تمہارے باوا جانی کے غصے سے زیادہ ان کے نکل نچوں سے ڈر لگتا ہے۔"

عالیہ ہنس تو دی لیکن تھکے تھکے سے انداز میں۔ پھر بولی۔ "تم جانتے ہو کہ باوا جانی فطرتاً مہم جو واقع ہوئے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کے دس سال، خطرناک درندوں سے بھرے ہوئے افریقی جنگلوں میں اور برف پوش پہاڑوں کی چوٹیاں سر کرنے میں گزارے ہیں۔ اگر ان کے بابا نے زبردستی ان کی شادی نہ کر دی ہوتی تو غالباً وہ اب بھی اسی قسم کی زندگی گزار رہے ہوتے۔"

"اچھا ہی ہوتا۔" ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔ "نہ وہ شادی کرتے، نہ تم پیدا ہوتیں، نہ تم سے میری قسمت پھوٹتی اور نہ آج....."

"اچھا۔" عالیہ اس کی بات کاٹتے ہوئے منہ پھلا کر بولی۔ "میرے ساتھ قسمت پھوٹی ہے تمہاری؟"

"اور نہیں تو کیا؟" ارسلان نے غرا کر کہا لیکن دوسری طرف منہ پھیر کر اپنی مسکراہٹ چھپالی۔

"تو پھر توڑ دو منگنی!" عالیہ نے کہا۔ "ابھی شادی تو نہیں ہوئی ہے نا۔"

"کیسے توڑ دوں؟" ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ابھی تک ہمارے معاشرے میں منگنی توڑنے کا کوئی

مہذبانہ ہتھوڑا ایجاد نہیں ہوا۔''

''لیکن اس راستے میں پتھر بہت ہیں جن سے میں تمہارا سر توڑ سکتی ہوں۔''

''توڑ دو تو سکون مل جائے۔ کم بخت درد کا پھوڑا بن گیا ہے، اس سر میں۔''

ان دونوں میں وقتاً فوقتاً اس قسم کی چونچیں لڑا ہی کرتی تھیں اور ان دونوں کے خیال میں یہ ان دونوں کی شدید محبت کی علامت تھی۔ انہوں نے پنجاب یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی دوران میں ان کی محبت کا قد بڑھا تھا مگر ان دونوں نے لیلیٰ مجنوں ٹائپ کے مکالموں میں کبھی گفتگو نہیں کی تھی۔

خان داراب چترالی ہونے کے باوجود اس زمانے کا فرد تھا جسے عرفِ عام میں ماڈرن زمانہ کہا جاتا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ نوجوانی ہی میں اپنی سوتیلی ماں کے ناروا سلوک سے گھبرا کر چترال سے نکل گیا تھا۔ اس نے کئی سال امریکا اور یورپ میں تعلیم کے بہانے سے گزارے تھے۔ دس سال تک باپ سے صرف خط و کتابت رہی اور اخراجات کے لیے بے تحاشا روپیا بھی ملتا رہا۔ چترال میں اس کے باپ کی امارت ایک مسلمہ امر تھی۔

خان داراب نے بچپن ہی سے مہم جویانہ فطرت پائی تھی۔ اس نے زمانۂ تعلیم ہی میں کوہِ البرز کے سلسلے کی دو بڑی چوٹیاں سر کی تھیں اور تعلیم حاصل کرنے کے بعد افریقا چلا گیا تھا۔ افریقا ہی میں خان داراب کو اپنی سوتیلی ماں کے انتقال کی خبر ملی تھی لیکن اس نے واپسی کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا، تاہم جب اسے اپنے باپ کی شدید علالت کا علم ہوا تو اس نے تڑپ کر وطن کا رخ کیا۔ اس وقت باپ کی زندگی ختم ہونے میں چند دن رہ گئے تھے اور اس کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی ہی میں خان داراب کی شادی کر دے۔ خود خان داراب اپنی آزادی کو ''مصلوب'' نہیں کرنا چاہتا تھا لیکن اس نے ایک سعادت مند اولاد کی طرح لبِ گور باپ کی خواہش کے آگے سر جھکا دیا۔ دو دن بعد ہی اس کی شادی اس کی چچا زاد بہن سے ہو گئی۔ شادی کے چار دن بعد باپ کا انتقال ہو گیا اور بیوی ایک سال بعد عالیہ کی پیدائش کے ساتھ مر گئی۔ اس طرح خان داراب بالکل بندھ کر رہ گیا۔ اس نے اپنی افتادِ طبع کو طاقِ نسیاں کیا اور اپنی ساری توجہ عالیہ کی تعلیم و تربیت پر مرکوز کر دی۔ عالیہ سے اس کا رویّہ ہمیشہ ہی دوستانہ سا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عالیہ کو اس کے سامنے اپنی ''پسند اور انتخاب'' کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔

''کہاں کا رہنے والا ہے وہ؟'' خان داراب نے

ڈپٹ کر پوچھا تھا۔

عالیہ اس سے ذرا بھی مرعوب نہیں ہوئی تھی۔ ''وہ گلگت میں پیدا ہوا تھا۔'' عالیہ اطمینان سے بولی۔ ''لیکن جب ایک سال کا تھا تب ہی اس کے باپ نے پنجاب جا کر تجارت شروع کر دی۔ اس کے انتقال کو پانچ سال گزر چکے ہیں اور اس کی تجارت ارسلان کے بڑے بھائی نے سنبھال رکھی ہے۔ بھائی اور بھاوج ارسلان کو اپنی اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔''

''وہ ہے کیسا؟'' خان داراب نے پوچھا اور پھر اپنی بائیں آنکھ دبائی۔ ''میرا مطلب ہے... خوب صورت ہے نا؟''

''ہاں آں! خوب صورت تو ہے لیکن مجھ سے ذرا کم ہے۔'' عالیہ نے بڑی بے پروائی سے جواب دیا۔

''گڈ!'' خان داراب نے اپنے ہاتھ میں مستقل رہنے والی چھڑی سے عالیہ کی زلفیں بکھرائیں۔ ''اگر تجھ سے کم خوب صورت ہے تو ضرور چلے گا۔ ویسے بھی اگر وہ تیری پسند ہے تو میں کون سا طرم خاں ہوں کہ اڑنگا لگاؤں لیکن... مجھے بھی ایک نظر دکھا دے نا۔''

چنانچہ عالیہ کا ٹیلی گرام ملتے ہی ارسلان چترال پہنچ گیا۔ اسے دیکھ کر خان داراب کی آنکھوں میں تحسین کی چمک نظر آئی۔ ارسلان کسی طرح بھی عالیہ سے کم خوب صورت نہیں تھا۔

''چترالی زبان آتی ہے؟'' خان داراب نے اس سے انگریزی میں پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ارسلان نے چترالی زبان میں جواب دیا۔

''وہ کیسے آ گئی؟'' خان داراب بھی چترالی بولنے لگا۔ ''عالیہ بتا رہی تھی کہ تُو ایک سال کی عمر میں پنجاب چلا گیا تھا۔''

''جی وہ کچھ تو بھائی بھاوج کی وجہ سے آ گئی اور کچھ عالیہ کے ساتھ یونیورسٹی میں رہ کر سیکھ لی۔''

''گڈ! تو گویا عالیہ تیری استانی ہوئی۔ یہ بہت اچھی بات ہے۔ بیوی کو شوہر سے کچھ بلند ہونا چاہیے۔''

''جی!'' ارسلان شپٹا سا گیا اور عالیہ منہ دبا کر ہنسنے لگی۔ اس نے ارسلان کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا باپ اپنے چھوٹوں سے کس طرح بات کرتا ہے۔

''اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے گھامڑ لڑکی۔'' خان داراب نے اسے گھور کر دیکھا۔ ''اور ہاں... اسے

لڑکے!... کیا نام ہے تیرا؟ ہاں... ارسلان... تُو نے اس گھامڑ لڑکی کو پسند کرلیا ہے۔ گویا تُو بھی گھامڑ ہے... چل ٹھیک ہے۔ دو گھامڑ مل بیٹھیں گے تو اچھی گزرے گی۔ منگنی کی انگوٹھی نکال جیب سے۔''

''جی!'' ارسلان بھونچکارہ گیا۔

''واقعی گھامڑ ہے۔ منگنی کی انگوٹھی بھی لے کر نہیں آیا۔ چل کوئی بات نہیں۔ عالیہ کی ماں کی ہیرے کی انگوٹھی میرے پاس محفوظ ہے۔ میں وہ لاکر تجھے دے دیتا ہوں۔ تو اسے پہنا دے۔''

''لل... لیکن......''

''ہاں آں۔'' خان داراب نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''میں بھی جانتا ہوں کہ منگنی کی انگوٹھی لڑکے کی طرف سے آتی ہے لیکن عالیہ نے بتایا تھا کہ تیرا باپ مرچکا ہے لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ آج سے تُو میرا بیٹا ہے۔ میں ایک باپ کی حیثیت سے وہ انگوٹھی لاکر تجھے دے دیتا ہوں اور برادری کے لوگوں کو بھی بلوا لیتا ہوں۔ آج شام کو تیری منگنی ہو جانا چاہیے۔''

اور اس عجیب و غریب انداز میں ان کی منگنی ہوگئی۔ ارسلان وہاں ایک دن رک کر واپس جہلم چلا گیا جہاں اس کا گھر تھا۔ اس کے بھائی اور بھاوج یہ سن کر بے حد خوش ہوئے کہ ارسلان کی منگنی ایک ایسی لڑکی سے ہوئی ہے جو چترال کے سابق فرماں رواؤں کے خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

اس منگنی کو چھ ماہ گزر چکے تھے اور شادی ہونے میں ابھی اتنا ہی عرصہ باقی تھا۔ خان داراب کی خواہش تھی کہ ان دونوں کی شادی عالیہ کے نانا کی موجودگی میں ہو جو علاج کی غرض سے امریکا گئے ہوئے تھے اور ان کی واپسی چھ ماہ بعد متوقع تھی۔

پچھلے دنوں ارسلان کو پھر عالیہ کا ٹیلی گرام ملا تھا کہ وہ فوراً پہنچے اور جب وہ پہنچا تو عالیہ نے اسے یہ بات بتائی تھی کہ خان داراب نے اچانک کافرستان دیکھنے کا پروگرام بنایا ہے۔

''وہ مجھے بھی ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔'' عالیہ نے کہا۔ ''لہٰذا میں نے سوچا کہ تمہیں بھی بلالوں۔ سفر بھی دلچسپ ہو جائے گا اور یہ پکنک بھی۔''

لیکن عالیہ کا یہ خیال قطعی غلط تھا کہ خان داراب کو محض پکنک کی سوجھی تھی۔ ارسلان کو اصل بات کا علم خان داراب سے سوال کرنے پر ہوا۔

''یہ ایک خاصا دلچسپ معاملہ ہے۔'' خان داراب نے کہا۔ ''شاید تجھے معلوم ہوگا کہ اس وادی کے لوگ قدیم یونانی اور ہندو رسم و رواج میں جکڑے ہوئے ہیں اور ابھی کچھ دنوں سے انہوں نے ایک برفانی دیوی کی پوجا شروع کر دی ہے۔ پچھلے دنوں کچھ غیر ملکی سیاح یہاں آئے تھے۔ ان کا خیال ہے کہ وہ کوئی برفانی عورت ہوگی جسے ان لوگوں نے دیوی مان لیا ہے۔ وہاں کے بیشتر لوگوں کا دعویٰ ہے کہ وہ خود اس دیوی کو دیکھ چکے ہیں اور میں برفانی انسان کے قصے سن سن کر بہت بور ہو چکا ہوں۔ برف سے ڈھکے ہوئے کئی پہاڑوں کی چوٹیاں میں نے اسی لیے سر کی تھیں کہ شاید مجھے بھی کوئی برفانی انسان نظر آجائے لیکن مجھے کوئی نظر نہیں آیا۔ اب اپنے ہی ملک میں ایک برفانی عورت کے وجود کی کہانیاں سننے میں آئیں تو میں نے سوچا کہ چل کر خود اس کی تصدیق کی جائے۔ متوقع برف باری کی وجہ سے میں نے اس سفر کی تیاری بہت عجلت میں کی تھی۔ برف باری کے بعد تو راستے بند ہو جاتے اور مجھے اتنے دن تک برف پگھلنے کا انتظار کرنا پڑتا جبکہ میں بڑا عجلت پسند واقع ہوا ہوں۔''

اس طرح عالیہ کو بھی یہ بات ارسلان سے معلوم ہو گئی۔

''برفانی عورت!'' عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ''اگر واقعی وہ ہوئی تو میں اس سے ضرور دوستی کروں گی۔''

''اور میرے ہونے والے بچوں کی روحیں عالمِ بالا ہی میں بلکتی رہ جائیں گی۔'' ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''کیا مطلب؟''

''ارے وہ تمہیں چیر پھاڑ کر رکھ دے گی۔'' ارسلان نے آنکھیں نکالیں۔

''ایسا تر نوالہ نہیں ہوں میں۔'' عالیہ نے بُرا سا منہ بنایا۔ ''صرف بارہ سال کی عمر میں مجھے باوا جانی نے ریوالور وغیرہ چلانا اور گھڑ سواری سکھا دی تھی۔ اس کے علاوہ نیزہ پھینکنا، شمشیر زنی اور تیر اندازی بھی سکھا دی تھی۔ وہ خود تو تیر اندازی میں حد درجہ مشاق ہیں۔ انہیں قدیم ہتھیاروں اور طریقۂ جنگ سے عشق ہے۔ تم نے ہمارے گھر میں اس قسم کی چیزیں دیواروں پر جگہ جگہ لگی ہوئی دیکھی ہوں گی؟''

''میں انہیں محض ڈیکوریشن پیس سمجھا تھا۔''

''ان میں سے کوئی ہتھیار بھی مصنوعی نہیں ہے۔''

''تو کیا باوا جانی وہ ہتھیار بھی ساتھ لے کر آئے ہوں گے؟''

''اس کا قوی امکان ہے۔''

''اس عہد میں وہ مضحکہ خیز معلوم ہوں گے۔ لوگ انہیں دیکھ کر ہنسیں گے۔''

''باوا جانی کو کسی کے ہنسنے و نسنے کی پروا نہیں ہوتی۔''

عالیہ کی یہ بات سو فیصد درست تھی۔ خان داراب بڑے ٹھنڈے مزاج کا آدمی تھا لیکن یوں بھی تھا کہ بعض اوقات اسے نہایت ہی معمولی بات پر اتنا غصہ آتا کہ وہ غیظ و غضب کا پیکر بن جاتا۔ اس وقت اس سے یہ توقع بھی کی جا سکتی تھی کہ وہ کسی کو ہلاک کرسکتا ہے۔

☆☆☆

کافرستان اس لیے اسم بامسمّٰی ہے کہ وہاں کی آبادی صرف کافروں پر مشتمل تھی لیکن اب ان میں بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں اور اس کا سہرا والیِ کابل کے سر جاتا ہے۔ یہ سارا علاقہ قبل از مسیح سے موجود ہے لیکن صدیوں تک پردۂ اخفا میں رہا۔ 1890ء میں ایک انگریز رابرٹسن نے اسے دریافت کیا اور تب سے اب تک یہ جنت نظیر علاقہ، سیاحوں اور محققین کی آماجگاہ بنا ہوا ہے۔

سر بہ فلک سفید پوش پہاڑیوں میں گھری ہوئی ان سرسبز و شاداب وادیوں میں رہنے والے اتنے خوب صورت ہیں کہ انہیں پریوں اور دیوتاؤں کی اولاد سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ بڑے ملنسار، مہمان نواز اور امن پسند واقع ہوئے ہیں۔ صدیوں سے وہ ایک پُرسکون زندگی گزارتے چلے آرہے ہیں۔ بس کبھی کبھار بے تحاشا بارش اور سیلاب ان کی زندگی کو درہم برہم کر دیتے ہیں یا طویل طویل عرصے کے بعد ان کا آسمانی دیوتا ان پر اپنا قہر نازل کرتا ہے اور وہ لوگ اپنی اپنی عبادت گاہوں میں جن کو ''جسنک ہان'' کہا جاتا ہے، قربانیاں دے دے کر آسمانی دیوتا کا غصہ ٹھنڈا کرتے ہیں۔

لگ بھگ اٹھارہ سال پہلے بھی ان کی زندگی میں ایک ایسی ہلچل ہوئی جس کا آغاز اس علاقے میں ایک اجنبی کی آمد سے ہوا۔ اس کے پاس ایک رائفل تھی اور وہ نہایت گرم کپڑوں میں ملبوس ایک جگہ برف پر بے ہوش پڑا ہوا ملا تھا۔ مقامی لوگ اسے اٹھا کر لے آئے تھے۔ اس کا جسم بخار سے تپ رہا تھا۔ اسے مقامی لوگوں کی زبان نہیں آتی تھی اور مقامی لوگ اس کی زبان نہیں سمجھتے تھے، لہٰذا اس کے علاج کے لیے ایک سیاح ڈاکٹر سے درخواست کی گئی جو ایک سال سے یہاں تھا اور مقامی زبان سے کچھ کچھ آشنا ہوگیا تھا۔

جب وہ کچھ تندرست ہوگیا تو سیاح ڈاکٹر نے مقامی لوگوں کو بتایا کہ اس شخص نے اپنا نام گردیزی بتایا ہے اور یہاں پر کسی شخص کی تلاش کے لیے اسے قبیلے کے سردار کا تعاون درکار ہے۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی بات نہیں بتائی۔ وہ لوگ اس بات کے لیے تیار ہوگئے کہ جب وہ پوری طرح تندرست ہو جائے گا تو وہ اسے اپنے قبیلے کے سردار کے پاس لے چلیں گے۔

پھر جب وہ مکمل تندرست ہوگیا تو طے پایا کہ اسے اگلے دن قبیلے کے سردار کے پاس لے جایا جائے گا جو قریب کی دوسری وادی میں رہتا تھا لیکن اسی رات وہاں کے لوگوں کے خیال کے مطابق ان پر قیامتِ صغریٰ ٹوٹ پڑی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کسی بھی لمحے آسمان سے آگ برسنے لگے گی۔ آگ تو نہیں برسی لیکن کئی پہاڑ خوف ناک انداز میں گڑگڑانے لگے اور برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر وادی میں گرنے لگے۔ ان میں سے ایک تودہ اس مکان پر بھی گرا جہاں گردیزی کو رکھا گیا تھا۔ مکان مکمل طور پر برباد ہوگیا لیکن گردیزی حیرت انگیز طور پر زندہ بچ گیا۔ بس اس کے سر پر شدید ضرب لگی تھی لیکن اس ضرب نے اس کی شخصیت کو بالکل بدل کر رکھ دیا۔ سیاح ڈاکٹر نے اس کے سر کا زخم بھی ٹھیک کیا لیکن اس کے بعد گردیزی ایسا بن گیا تھا جیسے اسے کچھ بھی یاد نہ رہا ہو۔ اب وہ نہ تو بول سکتا تھا اور نہ اسے اپنا نام یاد رہا تھا۔ وہ حیرت سے اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا تھا جیسے وہ سب کچھ اس کے لیے بالکل اجنبی ہو۔ اس کے منہ سے ''غوں غاں'' جیسی آوازیں نکلنے لگی تھیں جیسے وہ کوئی نوزائیدہ بچہ ہو۔ سیاح ڈاکٹر کے خیال کے مطابق سر پر لگنے والی ضرب نے اس کی یادداشت کو اس حد تک مفلوج کر دیا تھا کہ اسے اپنی زبان بھی یاد نہیں رہی تھی۔

مقامی لوگوں کی سمجھ میں یہ بات تو نہیں آسکی کہ انسان اپنی یادداشت بھی کھو بیٹھتا ہے مگر ان توہم پرست لوگوں نے اسے ''منحوس'' قرار دے دیا۔ اب وہ لوگ چاہتے تھے کہ گردیزی کو جلد از جلد اپنے علاقے سے رخصت کر دیں لیکن شیما ان کے آڑے آیا۔

شیما ایک ایسا نوجوان تھا جسے توہم پرستی چھو کر بھی نہیں گزری تھی۔ وہ اپنے لوگوں کے رسوم و رواج اور عقائد سے بھی اختلاف رکھتا تھا مگر لوگوں کی مخالفت کے ڈر سے اپنے خیالات کا برملا اظہار نہیں کرتا تھا۔ قابلِ رحم لوگوں کے لیے اس کے دل میں بہت جگہ ہوتی تھی چنانچہ وہ گردیزی کو اپنے گھر لے آیا۔

لوگوں کو یہ بات بہت بُری لگی لیکن وہ اپنے جذبات کا اظہار اس لیے نہیں کر سکے کہ شیما ان کے مذہبی پیشوا کا بیٹا تھا۔ یہ لوگ اپنے مذہبی پیشوا کو ''بٹیان'' کہتے ہیں۔ بٹیان کو

بھی اپنے بیٹے کی یہ حرکت اچھی نہیں لگی تھی لیکن شیما اس کا اتنا لاڈلا تھا کہ اس نے اپنے بیٹے کا یہ اقدام جبراً و کرہاً برداشت کرلیا۔

شیما کے اس ذہنی انقلاب کا سبب وہ سیاح اور محققین تھے جن کا اس کے علاقے میں آنا جانا لگا رہتا تھا۔ اسے سات آٹھ برس ہی کی عمر سے ان لوگوں سے عقیدت ہوگئی جو اس کی دانست میں ''عظیم بیرونی دنیا'' سے تعلق رکھتے تھے۔ جہاں کا ہر انسان اس کے خیال میں افلاطون و ارسطو کا درجہ رکھتا تھا۔ وہ اپنے وقت کا زیادہ سے زیادہ حصہ ان لوگوں کے ساتھ گزارتا اور جب وہ ان لوگوں کی زبان کچھ کچھ سمجھنے لگا تو بیرونی دنیا کی ترقی کے بارے میں اس کی واقفیت بھی بڑھنے لگی۔ پھر اس نے ان لوگوں سے پڑھنا بھی شروع کر دیا۔ اس کا یہ ذوق وشوق دیکھ کر لوگ اسے تحفتاً کتابیں بھی دینے لگے جن کا اب شیما کے پاس ڈھیر لگ چکا تھا اور وہی کتابیں اس کے نظریات وخیالات میں انقلاب کا باعث بنیں۔

شیما نے گردیزی پر اپنی ساری توجہ مرکوز کردی اور خود کو گردیزی کا مستحق سمجھنے لگا۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ گردیزی کون ہے؟ یہاں کیوں آیا تھا اور اس کی زندگی کا پس منظر کیا ہے؟ مگر یہ سب کچھ جاننے کے لیے ضروری تھا کہ گردیزی کو بولنا آتا لیکن وہ تو سب کچھ بھول چکا تھا لہٰذا شیما نے سب سے پہلے اسے بولنا سکھانا شروع کیا۔ وہ اسے نہ صرف اپنی زبان بلکہ خود اس کی زبان بھی سکھانے کی کوشش کرنے لگا جو اس نے بیرونی دنیا سے آنے والوں سے سیکھی تھی۔

☆☆☆

جب خان داراب کا قافلہ وادی کی حدود میں داخل ہوا تو ارسلان نے محسوس کیا جیسے وہاں کی فضا نے آہستہ آہستہ اس کی تھکان نچوڑنا شروع کر دی ہو۔ ہر طرف پہاڑ، برف کے سفید کفن میں لپٹے ہوئے تھے۔ کئی ہزار فٹ کی بلندی پر گھنے جنگل پھیلے ہوئے تھے۔ شاہ بلوط اور صنوبر کے حسین جنگل بھی تھے۔ جگہ جگہ ''نل نل'' کرتی ہوئی ندیاں، بے شمار اقسام کے جنگلی پھول بوٹے، ہری بھری گھاس اور سیب، ناشپاتی، انار، زیتون اور انناس کے درخت جن پر خوب صورت ننھے منے پرندے چہچہاتے پھر رہے تھے۔ شاداب وسرسبز گھاس پر بھیڑوں کا ریوڑ بھی چرتا ہوا نظر آرہا تھا۔

جب وہ آبادی کے قریب پہنچے تو وہاں کے لوگوں کو دیکھ کر بھی رشک کے جذبات کو انگیخت ملی۔ عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی بہت خوب صورت تھے مگر ان کے لباس میں بے حد سادگی تھی۔ عورتیں زیادہ تر تانبے کے زیورات پہنے ہوئے تھیں اور کچھ نے چاندی کے زیورات پہنے ہوئے تھے۔ مکانات لکڑی، گارے اور اینٹوں کے بنے ہوئے تھے۔ وہاں کے لوگ ان کے قافلے کو دیکھ کر خوش اخلاقی سے مسکرائے اور انہوں نے بھی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ دو تین جگہ خیمے بھی گڑے ہوئے نظر آئے جو مکی یا غیر ملکی سیاحوں کے تھے۔ خان داراب نے بھی ایک مناسب جگہ کا انتخاب کر کے ملازمین کو خیمے لگانے کا حکم دے دیا۔

''باوا جانی!'' ارسلان بول پڑا۔ ''اس وادی میں آکر تو یکا یک ساری تھکن دور ہوگئی۔ جی چاہ رہا ہے فوراً گھومنے کے لیے نکل جاؤں۔''

''واقعی بہت خوب صورت جگہ ہے۔'' خان داراب نے تائید میں سر ہلایا۔ ''لیکن مجھے ابھی یہاں رکنا ہوگا۔ خیمے لگ جائیں تو میں اپنی نگرانی میں ہی سارا سامان بھی رکھواؤں گا۔ اس کے بعد اپنا اسلحہ وغیرہ ٹھیک کروں گا۔''

''رائفل تو آپ کے شانے سے لگی ہوئی ہے۔''

''میرے پاس کچھ اور اسلحہ بھی ہے یار!'' خان داراب نے اپنے مخصوص بے تکلفانہ انداز میں کہا۔ ''نیزہ اور تیر کمان وغیرہ... مجھے ان چیزوں سے شکار کھیلنے میں زیادہ مزہ آتا ہے۔ تجھے اگر فوراً ہی گھومنے کا شوق چرایا ہے تو چلا جا۔''

''تم بھی چل رہی ہو عالیہ؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''اگر تم درخواست کرتے ہو تو چلی چلتی ہوں۔''

''میں آپ سے مجرزورالتجا کرتا ہوں۔'' ارسلان نے منہ بنا کر کہا۔

خان داراب دوسری طرف منہ کر کے خفیف سا مسکرایا۔ وہ بھی ان دونوں کے اس طریقِ گفتگو سے لطف اندوز ہوا کرتا تھا۔

''لیکن اتنی دور نہ نکل جانا کہ بھٹک ہی جاؤ۔'' وہ بولا۔

ارسلان اور عالیہ نے اپنے گھوڑوں کا رخ موڑا اور انہیں دلکی چلاتے ہوئے ایک طرف بڑھنے لگے۔ خان داراب دو گھنٹے تک مصروف رہا اور جب وہ اطمینان سے بیٹھ کر اپنے پائپ میں تمباکو بھرتے ہوئے برفانی عورت کے بارے میں سوچ رہا تھا تو ارسلان اور عالیہ واپس آگئے۔

''کہو... کیسی رہی تفریح؟'' خان داراب نے پوچھا۔

''بہت شان دار باوا جانی۔'' عالیہ کی آنکھیں جواب دیتے ہوئے چمکنے لگیں۔ ''بلاشبہ یہ ایک جنتِ نظیر علاقہ ہے۔

یہاں کے لوگ بھی بہت اچھے ہیں۔''

''میں نے تو یہاں کے ایک آدمی کو اپنا دوست بھی بنا لیا ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اس کا نام شیما ہے۔ بہت ہمدرد انسان ہے۔ اس کے ساتھ گردیزی نام کا ایک شخص بھی تھا لیکن اس سے زیادہ گفتگو نہیں ہوسکی۔ نیم پاگل سا ہے۔ وہ کوئی اٹھارہ سال پہلے یہاں آیا تھا اور اب تک شیما کے گھر میں رہ رہا ہے۔''

''اٹھارہ سال سے؟'' خان داراب کو تعجب ہوا۔ ''وہ کوئی قاتل تو نہیں ہے جو قانون کے خوف سے یہاں آگیا ہو؟''

''شاید ایسا نہیں ہے باوا جانی... وہ یہاں کسی کی تلاش میں آیا تھا لیکن ایک حادثے کی وجہ سے وہ سب کچھ بھول گیا۔'' ارسلان نے خان داراب کو گردیزی کی ساری کہانی سنائی جس میں اس رات کا حصہ بھی تھا جب آسمان پر رنگ لہرائے تھے اور پہاڑیوں کی گڑگڑاہٹ سے برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر وادی میں گرنے لگے تھے اور انہی میں سے ایک تودے کی وجہ سے گردیزی کے سر پر ضرب لگی تھی۔

''وادی کے لوگ شیما سے متنفر ہو گئے تھے۔'' ارسلان نے کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''لیکن شیما نے گردیزی کو اپنے گھر میں پناہ دی اور اسے یہاں کی زبان کے علاوہ اس کی اپنی زبان بھی سکھانا شروع کی جو وہ بھول گیا تھا۔ اب وہ یہ دونوں زبانیں بول سکتا ہے لیکن بولتا نہیں ہے۔ زیادہ تر خاموش رہتا ہے۔ شیما یہاں کے لوگوں سے خاصا مختلف ذہن رکھتا ہے کیونکہ اس کے پاس ہماری دنیا کی بے شمار کتابیں جمع ہوگئی ہیں جنہیں وہ پڑھ چکا ہے۔ وہ یہاں کے روحانی پیشوا کی اولاد ہے لیکن اسے اپنی قوم کے رسوم و رواج اور عقائد سے شدید اختلاف ہے۔''

''اس برفانی عورت کے بارے میں بھی کچھ معلوم ہوا؟'' خان داراب نے پوچھا۔ شاید اسے گردیزی اور شیما کی کہانی سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

''یہ لوگ اسے برف کی دیوی سمجھتے ہیں۔ مقامی آبادی کے صرف چار پانچ افراد اسے دیکھنے کے دعوے دار ہیں۔''

''اگر میں خود اسے دیکھ سکا تو مجھے بہت حیرت ہوگی۔ دراصل مجھے برفانی انسان کی باتیں محض کہانیاں معلوم ہوتی ہیں۔ بہرحال، ہم کل ہی بلندی کی طرف سفر شروع کریں گے۔ اگر واقعی وہ ہے تو اسے تلاش کریں گے۔''

''لیکن یہاں کے لوگوں سے ہمیں یہ بہانہ کرنا پڑے گا کہ ہم محض شکار کے لیے اوپر جا رہے ہیں۔ یہ بات ظاہر نہیں ہونا چاہیے کہ ہمیں اس برفانی عورت کی تلاش ہے۔''

''کیوں؟''

''یہ لوگ ایسے لوگوں کو ناپسند کرتے ہیں جو اوپر جا کر ان کی دیوی کے سکون کو درہم برہم کریں۔ وہ اس پارٹی سے بھی نفرت کرنے لگے ہیں جو برفانی عورت کی تلاش میں یہاں آئی ہوئی ہے۔''

''وہ لوگ کون ہیں؟'' خان داراب نے چونک کر پوچھا۔

''کوئی سائنس داں ڈاکٹر ایکم پیٹرووچ ہے جو اپنی پارٹی کے ساتھ آج کل چار ہزار فٹ کی بلندی پر پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے۔'' ارسلان نے بتایا۔

''یہ بہت بُرا ہوا۔'' خان داراب نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''اب ہمیں اس برفانی عورت کی تلاش میں بہت عجلت سے کام لینا پڑے گا۔ میں اس تک سب سے پہلے پہنچنا چاہتا ہوں۔''

''سب سے پہلے اس تک پہنچنے کی خواہش کسی خاص وجہ سے ہے باوا جانی؟'' عالیہ پوچھ بیٹھی۔

''ہاں۔'' خان داراب نے کہا۔ ''اگر وہ ان لوگوں کے ہتھے لگ گئی تو اس کی باقی زندگی ان کے سائنسی تجربات کا ہدف بنتے ہوئے گزر جائے گی جبکہ میری خواہش ہے کہ اگر وہ مجھے مل گئی تو میں اسے یہاں سے چپ چاپ نکال لے جاؤں گا اور اسے ایک مہذب انسان بنانے کی کوشش کروں گا۔''

''اوہ، گڈ!'' عالیہ کا چہرہ پُرجوش انداز میں سرخ ہو گیا۔ ''اگر وہ مہذب بن سکی تو میں اسے دوست بنالوں گی۔''

''ضرور۔'' خان داراب مسکرایا۔

ارسلان نہ جانے کیا سوچنے لگا۔

دوسرے دن جب ان لوگوں نے بلندی کی طرف سفر شروع کیا تو شیما ان سے ملنے آیا۔ گردیزی شاید ہر وقت ہی اس کے ساتھ رہتا تھا۔ اس کی عمر پچپن سال ضرور رہی ہوگی۔ اس کا شیدہ بڑھا ہوا تھا اور آنکھوں میں ویرانیاں ناچ رہی تھیں۔ اس نے مقامی لباس زیب تن کر رکھا تھا لیکن اس کے نقش ونگار صاف ظاہر کر رہے تھے کہ وہ مقامی باشندہ نہیں ہے۔

شیما کی عمر اڑتیس چالیس سال کے لگ بھگ معلوم ہوتی تھی۔ اس نے بڑی حیرت سے خان داراب کی سج دھج دیکھی۔ خان داراب کے ایک شانے سے رائفل اور دوسرے شانے سے کمان اور تیروں سے بھرا ہوا ترکش لٹکا ہوا تھا۔ ایک نیزہ اس نے گھوڑے کی زین سے باندھ رکھا تھا۔ جدید

اور قدیم دور کی یہ آمیزش بڑی عجیب سی معلوم ہو رہی تھی۔

''آپ بہت عجیب و غریب شکاری معلوم ہو رہے ہیں محترم خان!'' وہ خفیف سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''مجھے قدیم ہتھیاروں سے عشق ہے۔'' خان داراب نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ ''میں نے افریقا میں نیزے اور تیر کمان ہی سے دو چیتے اور ایک تیندوے کا شکار کیا تھا۔ میں شکار میں رائفل کا استعمال بہت کم کرتا ہوں۔''

''بہت دل گردے کے معلوم ہوتے ہیں آپ۔'' شیما نے اسے تحسین آمیز نظر سے دیکھا۔

☆☆☆

چار ہزار فٹ کی بلندی کو سر کرنے کے لیے جانوروں کا استعمال ایک خطرناک بات تھی لیکن خان داراب نے یہ خطرہ مول لیا۔ شاید وہ عالیہ کو زیادہ تھکن کا شکار ہوتے ہوئے نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ انہوں نے یہ سفر اتنی آہستگی سے کیا کہ صبح گیارہ بجے کے چلے ہوئے اس وقت چار ہزار فٹ اوپر پہنچے جب سورج غروب ہونے میں صرف آدھا گھنٹا رہ گیا تھا۔ یہاں سے جنگل شروع ہو گیا تھا اور خان داراب نے دوربین سے دیکھ لیا تھا کہ چار پانچ فرلانگ کے فاصلے پر دو خیمے لگے ہوئے تھے جو یقیناً غیر ملکی پارٹی کے ہوں گے۔ خان داراب پڑاؤ ڈالنے کے لیے عام خیموں کے بجائے صرف دو موسمی خیمے لایا تھا جو نہ صرف بہت ہلکے تھے بلکہ ان میں رہ کر سردی سے بھی خاصی حد تک محفوظ رہا جا سکتا تھا۔ یہاں برف کی تقریباً دو انچ موٹی تہ تھی۔ مزدور خیمے لگانے میں مصروف ہو گئے۔ ارسلان اور عالیہ ادھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ انہیں یہاں سے نیچے کا منظر بہت حسین نظر آ رہا تھا۔

یکا یک وہ ٹھٹک گئے۔ ان دونوں کی نظر بیک وقت ان نشانوں پر پڑی تھی جو کسی کے پیروں کے تھے۔ ننگے پیروں کے نشانات... ان نشانات سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی ایسے شخص کے ہیں جس کے پیروں کی انگلیاں بہت پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ان نگاہوں میں ایک ہی سوال تھا۔ ''کیا کوئی مہذب انسان یہاں ننگے پیر چل سکتا ہے؟''

''باوا جانی کو بتانا چاہیے۔'' عالیہ اس طرح بولی جیسے سرگوشی کر رہی ہو۔ کسی خیال سے اس کے چہرے پر سرخی پھیل گئی تھی۔

ارسلان نے سر ہلایا۔ وہ تیزی سے پلٹا اور خان داراب کو اس جگہ لے آیا۔

''اوہ گاڈ!'' خان داراب کے منہ سے نکلا۔ ''یہ تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے میرا خیال غلط تھا کہ برفانی انسان کا کوئی وجود نہیں۔ یہاں ننگے پیر چلنے والا کوئی مہذب انسان نہیں ہو سکتا۔''

وہ نشانات ظاہر کر رہے تھے کہ وہ شخص غیر ملکی کیمپ کی طرف سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا تھا۔

''باوا جانی!'' ارسلان بولا۔ ''آپ کو یقین ہے کہ یہ کسی برفانی انسان کے پیروں کے نشان ہوں گے؟''

''یقین تو خیر میں اسی وقت کروں گا جب اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لوں مگر ان نشانات نے میرے اس یقین کو متزلزل ضرور کر دیا ہے کہ برفانی انسان کا کوئی وجود نہیں۔''

''لیکن یہ نشانات کسی عورت کے تو نہیں معلوم ہوتے۔'' عالیہ بولی۔ ''انگلیاں کتنی پھیلی ہوئی ہیں۔''

''تم نے کبھی اپنے وطن کی غریب عورتوں کے پیر نہیں دیکھے، ننگے پیر چلتے چلتے ان کی انگلیاں کتنی پھیل جاتی ہیں۔''

''مگر اتنی نہیں پھیلتیں۔''

''اس بات کو بھی نظر انداز نہیں کرو کہ یہ ایک برفانی پہاڑی علاقہ ہے۔ اچھا، اب تم دونوں خیمے گاڑنے والوں کی نگرانی کرو، میں ان نشانات کے تعاقب میں جاتا ہوں۔''

ارسلان اور عالیہ کے چہروں سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ دونوں بھی خان داراب کے ساتھ جانا چاہتے ہیں لیکن خان داراب کے مزاج کا خیال رکھتے ہوئے انہوں نے کچھ نہیں کہا۔

خان داراب اپنے گھوڑے کے قریب گیا اور اس پر بیٹھ کر تیزی سے ان نشانات کے تعاقب میں روانہ ہو گیا۔ اب یہ علاقہ اتنا مرتفع نہیں رہا تھا کہ گھوڑے پر سواری کرنا کوئی آسان بات ہوتی۔ خان داراب کو جگہ جگہ اپنے گھوڑے کو جست لگوانا پڑتی۔ پیروں کے نشان والا بھی ان اونچے نیچے مقامات پر چھلانگ لگانے کا عادی معلوم ہوتا تھا۔

یکا یک خان داراب کو اپنا گھوڑا روک دینا پڑا۔ اب اس کے سامنے ایک کھائی آ گئی تھی جو کسی طرح بھی بارہ چودہ فٹ سے کم چوڑی نہیں معلوم ہو رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو کھائی کے بالکل کنارے تک لے گیا۔ وہ نشانات اس جگہ آ کر غائب ہو گئے تھے۔ فوری طور پر خان داراب یہی اندازہ لگا سکا کہ یہاں سے اس نامعلوم ہستی نے چھلانگ لگا کر کھائی پار کی ہو گی لیکن اب اندھیرا اتنا ہو چکا تھا کہ کھائی کے اس پار کسی پیر کا نشان دیکھنا امر محال تھا۔ ماند پڑی ہوئی روشنی میں کھائی کی گہرائی کا اندازہ لگانا بھی ممکن نہیں تھا۔ اگر روشنی مناسب ہوتی تو خان داراب اپنے گھوڑے کو کھائی کی

دوسری جانب جست لگانے پر مجبور کر سکتا تھا لیکن اب... تاریک فضا میں یہ اقدام خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔

اچانک خان داراب کے ذہن میں ایک تدبیر آئی۔ اس نے اپنا نیزہ سنبھالا اور اسے پوری طاقت سے فضا میں پھینکا۔ نیزہ تقریباً نوّے درجے کے زاویے سے پھینکا گیا تھا لیکن عقب سے آتی ہوئی ہوا نے اس کے زاویے کو قدرے آگے کی طرف جھکا دیا۔ پھر جب وہ بلندی سے نیچے آنے لگا تو اس کا رخ کھائی کے اس پار تھا۔ خان داراب نے اسے تین چوتھائی کے قریب زمین میں دھنستے ہوئے دیکھا اور اطمینان کی سانس لی۔ اب اس نے زین سے بندھا ہوا رسّے کا ٹکڑا نکال کے اسے کھولا اور اس کے سرے پر پھندا بنا کر کھائی کے اس پار پھینکا۔ وہ چاہتا تھا کہ نیزہ اس پھندے کی گولائی میں آ جائے لیکن اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے رسّے کو کھینچ کر دوسری مرتبہ کوشش کی اور کامیاب ہو گیا۔ اب وہ اطمینان کی سانس لے کر گھوڑے سے اترا اور ایک ہتھوڑے سے ایک لمبی سی میخ زمین میں ٹھونکنے لگا۔ میخ گاڑ کر اسے خیال آیا کہ وہ کھائی کے پار دھنسے ہوئے نیزے کی مضبوطی کا اندازہ تو کر لے۔ یہ سوچتے ہوئے اس نے رسّے کو اپنی طرف کھینچا۔ پھر زیادہ قوت صرف کی، پھر اور زیادہ قوت صرف کی اور جب اس نے پوری طاقت صرف کر دی تو نیزے نے بہت معمولی سی جنبش کی۔ وہ یقیناً اتنی مضبوطی سے گڑا تھا کہ تین چار آدمی مل کر رسّے کو کھینچتے، تب ہی وہ اکھڑتا۔ اس طرف سے مطمئن ہونے کے بعد خان داراب نے رسّے کا دوسرا سرا میخ سے باندھا اور خوب اچھی طرح کھینچ کر اس کی مضبوطی کا اندازہ بھی لگا لیا۔ اب وہ اس کھائی پر رسّے کا ایک ''پل'' بنا چکا تھا۔ اس نے گھوڑے کی لگامیں دیار کے ایک درخت سے باندھ دیں اور پھر کھائی کے کنارے پر پہنچا۔ وہ رسّے سے لٹک کر کھائی کی دوسری جانب پہنچنا چاہتا تھا۔ عام آدمی کے لیے یہ ایک خطرناک بات ہوتی لیکن خان داراب کے لیے یہ کوئی خاص بات نہیں تھی۔ وہ تو نہایت خطرناک برف پوش چوٹیاں سر کر چکا تھا۔

آخر وہ احتیاط سے رسّے سے لٹک گیا اور کھائی میں لٹک کر بازوؤں کی قوت سے آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا۔ وہ اس وقت خاصا پُرجوش تھا۔ اس کے یقین کے مطابق دوسری طرف ان پیروں کے نشان ضرور ملنا چاہیے تھے۔ خان داراب ٹارچ کی روشنی میں ان نشانات کو دیکھتا ہوا اس ان دیکھی ہستی کے مسکن تک پہنچ سکتا تھا۔

لیکن ابھی وہ پانچ چھ فٹ سے آگے نہیں بڑھا تھا کہ اس کے جسم نے جھٹکا کھایا اور پھر وہ رسّے کو پکڑے ہوئے، جھولا کھاتا ہوا تیزی سے کھائی کی دوسری طرف کی دیوار کی طرف بڑھا۔ فوراً اس کے ذہن میں آیا کہ میخ اکھڑ گئی تھی یا رسّے کی بندش ڈھیلی رہ گئی تھی جو اس کا وزن نہ سہار سکی اور کھل گئی۔ لیکن یہ دونوں ہی باتیں بڑی عجیب سی تھیں۔ اس نے ان دونوں باتوں کا اچھی طرح دھیان رکھا تھا۔

اب صورتِ حال یہ تھی کہ دوسری طرف کی سنگلاخ دیوار سے ٹکرا کر اس کے جسم کی بے شمار ہڈیاں ٹوٹ سکتی تھیں اور اگر وہ رسّا چھوڑ دیتا تو کھائی میں گر جاتا جس کی گہرائی کا اسے کوئی اندازہ نہیں تھا۔

کھائی کی دوسری دیوار صرف دو فٹ کے فاصلے پر رہ گئی تھی جب خان داراب نے ایک فیصلہ کیا اور اس پر ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر عمل کر بیٹھا۔ دیوار سے ٹکرا کر تو اس کے جسم کا نہ جانے کیا حال ہوتا اور اس کے بعد بھی وہ یقیناً کھائی میں گرتا، لہٰذا اس نے دیوار سے ٹکرائے بغیر کھائی میں گرنے کا فیصلہ کیا۔ اس میں ایک امکانی بات یہ تھی کہ شاید وہ کھائی بہت زیادہ گہری نہ ہو اور اسے بس تھوڑی بہت چوٹیں آئیں۔

یہ ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا اور اس موقع پر قسمت نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ صرف پانچ چھ فٹ کی گہرائی میں جا پڑا لیکن پھر بھی اسے ایک جھٹکا لگا اور وہ گر پڑا۔ جسم پر چند معمولی چوٹیں آئیں البتہ بائیں ٹانگ میں کچھ زیادہ تکلیف محسوس ہوئی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس کی جان بچ گئی تھی۔ وہ چند لمبی لمبی سانسیں لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکالی اور اس کا بٹن دبا کر روشنی دیوار پر ڈالی۔ رسّے کا سرا اسے پانچ فٹ کی بلندی پر لٹکتا ہوا نظر آ گیا اور سرے کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے اس کی سانس رک گئی۔ اس کے یہ دونوں خیال غلط تھے کہ میخ اکھڑ گئی تھی یا بندش ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ رسّے کا سرا صاف ظاہر کر رہا تھا کہ اسے کسی تیز دھار آلے سے کاٹا گیا ہے۔

خان داراب کی آنکھیں نیم وا ہو گئیں اور دانت ایک دوسرے پر سختی سے جم گئے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ کسی دشمن نے اس کا تعاقب کیا تھا یا پہلے ہی سے آس پاس کہیں موجود تھا۔ پھر جب اس نے رسّے پر لٹک کر کھائی پار کرنا شروع کی تو اس نامعلوم شخص نے رسّا کاٹ دیا۔

لیکن وہ نامعلوم دشمن کون ہو سکتا ہے؟

اس کا اندازہ بھی لگانا خان داراب کے لیے ممکن نہیں تھا۔

''خیر، بیٹے خان!'' خان داراب زیرِلب بڑبڑایا۔ ''اگر مجھے تمہارا پتا لگ گیا تو میں تم سے اس کا حساب ضرور لوں گا۔''

پھر اس نے ٹارچ کی روشنی میں رسّے کا سرا پکڑ کر ٹارچ بجھا دی۔ اسے تھیلے میں رکھا اور پھر اس ہاتھ سے بھی رسّا پکڑ لیا۔ اب اس نے اوپر چڑھنے کا فیصلہ کیا تھا اور کوہ پیمائی کے تجربے کے باعث یہ اس کے لیے کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ احتیاطاً خان داراب اس طرح اوپر چڑھا کہ اس کا جسم سیدھا نہ ہونے پائے۔ پھر اس نے جیب سے ٹارچ نکالی اور اس کی روشنی اِدھر اُدھر پھینکی۔ آخر اسے پاؤں کا وہ نشان نظر آ ہی گیا اور وہ رینگتا ہوا اس کے تعاقب میں چل پڑا۔ اس طرح چلتے ہوئے اسے کوئی پندرہ منٹ گزرے ہوں گے کہ اس نے ایک فائر کی آواز سنی۔ وہ گولی یقیناً کسی رائفل سے چلائی گئی تھی اور خان داراب کے اندازے کے مطابق وہ فائر اس سے چار پانچ فرلانگ آگے ہوا تھا۔

☆☆☆

جب خان داراب کو گئے ہوئے زیادہ دیر ہو گئی تو عالیہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔

خیمے وغیرہ گاڑے جا چکے تھے۔ سردی کے تدارک کے لیے الاؤ دہکا لیے گئے تھے اور کھانا تیار کیا جا رہا تھا۔

''میرا دل دھڑک رہا ہے ارسلان!'' عالیہ گھبرائی ہوئی آواز میں بولی۔

''خدا کرے تمہارا دل ہمیشہ دھڑکتا رہے اور میرے سر پر تمہارا سایہ ہمیشہ سلامت رہے۔'' ارسلان نے بظاہر بڑی سنجیدگی سے کہا۔

عالیہ نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر غرائی۔ ''جب میں پریشان ہوا کروں تو مجھ سے مذاق نہ کیا کرو ورنہ میں تمہارے دونوں کان اکھیڑ دوں گی۔''

''اچھا ہی ہوگا۔'' ارسلان نے مسکرا کر کہا۔ ''پھر میں تمہاری اوٹ پٹانگ باتیں سننے سے مامون و محفوظ ہو جاؤں گا۔''

''اچھا۔'' عالیہ نے سپاٹ لہجے میں کہا اور اپنے دونوں ہاتھ قدرے اٹھا کر اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں کی طرف دیکھنے لگی۔ یہ ارسلان کے لیے اشاراتی دھمکی تھی کہ اب عالیہ اس کا منہ نوچ کر اس پر گہری خراشیں ڈال سکتی ہے۔

ارسلان جلدی سے سنجیدہ ہو گیا اور بولا۔ ''آخر تم اتنی پریشان کیوں ہو؟''

''کیا تمہیں اندازہ نہیں کہ باوا جانی کو گئے ہوئے کتنا وقت گزر چکا ہے؟''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اب وہ اس برفانی عورت کو پکڑ کر ہی لائیں گے، چاہے صبح ہو جائے لہٰذا اب ہمیں کھانا کھا کر آرام کرنا چاہیے۔''

''تم ہی ٹھونسو اور تم ہی آرام کرو۔'' عالیہ کہہ کر کھڑی ہوئی اور اپنی رائفل اٹھا کر خیمے کے دَر کی طرف بڑھی۔

''کہاں چلیں؟'' ارسلان نے ہانک لگائی۔

''جہنم میں۔''

''وہ ان سرد پہاڑوں میں نہیں ہے۔''

عالیہ کوئی جواب دیے بغیر آگے بڑھ گئی۔ مجبوراً ارسلان کو بھی اپنی رائفل سنبھال کے باہر نکلنا پڑا۔ عالیہ نے اس کی آہٹ سن کر پلٹ کے دیکھا اور پھر تیوری چڑھا کر بولی۔ ''آپ جا کے آرام فرمائیے نا۔''

''میں یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ میرا مستقبل ڈارک روم میں ڈیولپ ہو۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اس علاقے میں ریچھ پائے جاتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی تمہیں اٹھا لے گیا تو......''

عالیہ اس کی پوری بات سنے بغیر ملازمین کی طرف بڑھ گئی اور انہیں بتانے لگی کہ وہ خان داراب کی تلاش میں جا رہی ہے۔ ذرا دیر بعد ہی دو گھوڑے وہاں سے روانہ ہوئے۔ ارسلان نے ٹارچ جلالی تھی۔ اس کی روشنی میں انہیں برفانی عورت کے قدموں اور خان داراب کے گھوڑے کے سموں کے نشان نظر آ رہے تھے۔

آخر وہ اس کھائی تک پہنچ گئے جہاں انہیں خان داراب کا گھوڑا ایک درخت سے بندھا نظر آیا لیکن خان داراب کا پتا نہیں تھا۔ آس پاس بھی اس کی موجودگی ممکن نہیں تھی ورنہ وہ ان دونوں کو دیکھ کر انہیں آواز ضرور دیتا۔ اب ارسلان بھی کچھ پریشان ہوا۔ وہ اور عالیہ گھوڑوں سے اتر کر کھائی کے قریب پہنچے۔ ارسلان نے ٹارچ کی روشنی میں کھائی کی گہرائی دیکھی اور پھر کھائی کی دوسری دیوار پر روشنی ڈالی۔ وہاں اسے ایک رسّا لٹکا ہوا نظر آیا۔ وہ ٹارچ کو... بتدریج اوپر کی طرف حرکت دینے لگا اور آخر روشنی کا دائرہ اس نیزے پر جم گیا جو کھائی کی دوسری جانب زمین میں گڑا ہوا تھا اور رسّے کا پھندا اس میں پڑا ہوا تھا۔

''اوہ!'' ارسلان نے سر ہلایا۔ ''باوا جانی اس رسّے کے سہارے اوپر چڑھے ہوں گے۔''

''لیکن اِدھر سے کھائی میں کس طرح اترے ہوں

ارسلان نے ٹارچ کی روشنی اِدھر اُدھر پھینکی تو اسے گڑی ہوئی میخ نظر آ گئی۔

''یہ دیکھو۔'' ارسلان نے کہا۔ ''وہ اس میخ کے اور دوسرے رسّے کے سہارے نیچے اترے ہوں گے۔''

عالیہ چند لمحے خاموش رہی اور پھر پریشان لہجے میں بولی۔ ''لیکن ہم اب کیا کریں؟''

''انتظار کے علاوہ اور کیا کر سکتے ہیں۔'' ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''ہمارے پاس اس قسم کا کوئی سامان نہیں ہے۔ باوا جانی تو کوہ پیمائی کے سارے سامان سے لیس تھے۔''

''مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا لگ رہا ہے ارسلان!'' عالیہ روہانسی ہو گئی۔

''حیرت ہے کہ تم خان داراب کی بیٹی ہو کر اتنی ہلکان ہو رہی ہو۔ میں تو اس مہم سے قبل ان سے چند ہی مرتبہ ملا ہوں اور مجھے اندازہ ہو چکا ہے کہ وہ ایک مردِ آہن ہیں۔ انہیں گزند پہنچانا کسی کے لیے آسان نہیں۔''

''تم انہیں مردِ آہن کہو یا کچھ اور لیکن بہرحال وہ ایک انسان ہیں۔ ہمیں واپس کیمپ جا کر وہاں سے کچھ ایسا سامان لانا چاہیے کہ اس کھائی کو پار کر سکیں۔''

''ارے وہ دیکھو۔'' اچانک ارسلان نے تقریباً چیخنے والے انداز میں کہتے ہوئے کھائی کے اس پار اشارہ کیا۔

کافی فاصلے پر چند ٹارچوں کی روشنیاں متحرک نظر آ رہی تھیں اور ان روشنیوں کے پس منظر میں چار انسانی ہیولے بھی نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک ہیولے کے قدوقامت اور حرکات و سکنات سے صاف معلوم ہو رہا تھا کہ وہ خان داراب ہے۔

''شکر ہے خدا کا!'' عالیہ نے خان داراب کو پہچان کر اطمینان کی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''مگر ان کے ساتھ اور لوگ کون ہیں؟''

''یہ تو اسی وقت پتا لگے گا جب وہ قریب آ جائیں گے۔''

مگر اچانک ان دونوں نے دیکھا کہ ان ہیولوں کے راستے بدل گئے تھے۔ تین ہیولوں کا رخ کھائی کی مشرقی جانب تھا جبکہ خان داراب انہی کی طرف آ رہا تھا۔

''باوا جانی!'' عالیہ پُرمسرت انداز میں بڑے زور سے چیخی۔

خان داراب نے جواب میں صرف ہاتھ ہلایا لیکن اس کی رفتار میں تیزی آ گئی۔ جلد ہی وہ کھائی کے دوسرے کنارے پر آ کھڑا ہوا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی ان دونوں کی طرف پھینکی اور زور سے بولا۔ ''تم دونوں اِدھر کہاں سے آ گئے؟''

''آپ ہی کو ڈھونڈتے ہوئے آئے ہیں۔'' ارسلان نے جواب دیا۔ ''دیر ہونے کے باعث عالیہ بہت پریشان ہو گئی تھی۔''

''میں نے اسے بیٹوں کی طرح پالا ہے لیکن اس کا دل اب تک عورتوں کا سا ہے۔'' خان داراب نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر کہا اور نیزے کو زمین سے نکالنے کے لیے اسے اِدھر اُدھر ہلانے لگا تاکہ اس پر زمین کی گرفت ڈھیلی ہو جائے۔ اس عمل کو جاری رکھتے ہوئے اس نے پوچھا۔ ''تم لوگوں کے قریب زمین میں ایک میخ گڑی ہوئی ہوگی۔''

''وہ ہم دیکھ چکے ہیں باوا جانی۔'' عالیہ نے جواب دیا۔

''اس سے رسّے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ابھی بندھا ہوا ہوگا۔''

''نہیں تو!'' عالیہ نے قدرے تعجب سے کہا۔ ''کیا اس سے رسّے کا کوئی ٹکڑا بندھا ہوا ہونا چاہیے تھا؟''

خان داراب نے فوراً ہی کچھ نہیں کہا۔

''جواب دیجیے نا باوا جانی!''

''اِدھر آ کے جواب دوں گا۔''

زمین میں مضبوطی سے گڑا ہوا نیزہ اب ڈھیلا ہو چکا تھا۔ خان داراب نے اسے ایک جھٹکے سے اکھاڑا اور کھائی کے اس جانب اس طرح پھینکا کہ وہ عالیہ اور ارسلان سے چند فٹ دور، زمین میں ترچھا گڑ گیا۔ اس کے بعد خان داراب نے اپنے تھیلے میں سے ایک اور میخ نکالی۔ وہ اسے کھائی کے کنارے سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر ٹھونکنے لگا جبکہ نیزہ دس گیارہ فٹ کے فاصلے پر گڑا ہوا تھا۔

میخ سے رسّا باندھ کر وہ کھائی میں اترنے لگا۔ نیچے پہنچ کر اس نے رسّے کو مضبوطی سے پکڑ کر پوری طاقت سے جھٹکے دینا شروع کیے تاکہ میخ ڈھیلی ہو کر اکھڑ جائے اور رسّے سمیت کھائی میں آ گرے۔ آخر کچھ محنت کے بعد وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گیا۔

''تم لوگوں کے پاس تو کوئی رسّا نہیں ہوگا؟'' اس نے زور سے پوچھا تو اس کی آواز کھائی میں گونج گئی۔

''نہیں باوا جانی!'' عالیہ نے جواب دیا۔

''خیر! میں یہ رسّا اوپر پھینکتا ہوں۔ اسے بہت مضبوطی سے میخ سے باندھ دو اور یہ بھی دیکھ لو کہ میخ بہ دستور مضبوطی سے گڑی ہوئی ہے یا نہیں۔''

''بہتر ہے۔''

خان داراب نے رسّے کو میخ سے ڈھائی تین فٹ کے فاصلے سے پکڑا۔ اس نے مصلحتاً میخ بندھی رہنے دی تھی تاکہ رسّے کا وہ سرا بھاری رہے۔ پھر اس نے رسّے کو تیزی سے گردش دینا شروع کی۔ چار پانچ گردشیں دینے کے بعد ہی اس نے رسّے کو چھوڑ دیا۔ میخ، تیزی سے اوپر گئی۔ ارسلان کھائی کے کنارے پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ اس نے فوراً میخ پکڑ لی اور رسّے کو اوپر گھسیٹنے لگا۔

''گڈ!'' خان داراب کی آواز سنائی دی۔ ''اب اس میخ سے رسّے کو کھول کر گڑی ہوئی میخ سے باندھ دو۔''

ارسلان نے ایسا ہی کیا اور خان داراب رسّے کے سہارے اوپر چڑھ آیا۔

''یہ آپ کے ساتھ تین آدمی اور کون تھے باوا جانی؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''غیر ملکی پارٹی کے آدمی۔'' خان داراب نے نفرت سے کہا۔ ''ان میں ڈاکٹر پیٹروویچ بھی تھا۔ وہ بھی ان نشانات کے تعاقب میں تھے اور مجھ سے چار پانچ فرلانگ آگے تھے۔ انہوں نے اس بے چاری پر گولی بھی داغ دی تھی۔''

''ارے۔'' عالیہ کے منہ سے نکلا۔ ''کیا وہ مر گئی؟''

''نہیں، انہوں نے اس کی ٹانگ پر گولی چلائی تھی۔ وہ لوگ اسے زندہ ہی پکڑنا چاہتے تھے لیکن کامیاب نہیں ہو سکے۔ وہ صرف زخمی ہوئی ہے۔ برف پر اس کے خون کے دھبّے ملے تھے لیکن زخمی ہونے کے باوجود وہ جست لگاتی ہوئی ایک ایسے راستے سے بھاگ نکلی کہ پھر اس کا تعاقب جاری رکھنا ممکن نہیں رہا۔''

''کیوں؟''

''وہ ہلاکت خیز حد تک پُرخطر نشیب و فراز ہیں۔ ہم جیسے لوگ، کوہ پیمائی کے مکمل سامان کے بغیر وہاں سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ کل میں پوری تیاری کے ساتھ ادھر کا رخ کروں گا۔ یقیناً وہ اپنے مسکن ہی کی طرف بھاگی ہوگی۔''

''تو آپ نے اسے دیکھ لیا؟'' عالیہ نے پُرشوق لہجے میں پوچھا۔

''نہیں۔'' خان داراب نے جواب دیا۔ ''میں ان لوگوں سے بہت پیچھے تھا جب انہوں نے اس پر گولی چلائی تھی۔ میں نے صرف خون کے دھبّے دیکھے تھے۔ میں نے باقی جو باتیں بتائی ہیں وہ ان... لوگوں کا بیان ہے۔''

''وہ دوسری طرف کیوں چلے گئے؟'' ارسلان نے پوچھا جو اس طرف گڑی ہوئی میخ بھی اکھاڑ چکا تھا۔

''ادھر پانچ چھ فرلانگ آگے جا کر کھائی کی چوڑائی صرف تین چار فٹ ہے۔ یہ مجھے انہی لوگوں نے بتایا ہے۔ وہ لوگ ادھر ہی سے دوسری طرف گئے بھی تھے۔'' خان داراب نے اپنے گھوڑے کی لگامیں درخت سے کھولتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا بات ہے باوا جانی؟'' ارسلان نے اپنے گھوڑے پر سوار ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ بڑے محتاط انداز میں برابر چاروں طرف دیکھتے جا رہے ہیں؟''

''اوہ۔'' خان داراب آہستہ سے ہنسا۔ ''بھانپ لیا تُو نے؟ واقعی تو بہت ذہین ہے۔ ہاں، مجھے اندیشہ ہے کہ آس پاس ہمارا کوئی دشمن ہو سکتا ہے۔''

''دشمن؟'' عالیہ چونکی۔ وہ بھی گھوڑے پر بیٹھ چکی تھی۔

''ہاں۔'' خان داراب نے زمین سے اپنا نیزہ اکھاڑتے ہوئے جواب دیا اور پھر گھوڑے پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے تم لوگوں سے کہا تھا نا کہ ادھر گڑی ہوئی میخ سے رسّے کا ایک ٹکڑا بندھا ہوا ہوگا۔''

''ہاں پوچھا تھا مگر اس کا مطلب؟''

تینوں گھوڑوں نے سفر شروع کر دیا تھا۔ خان داراب انہیں بتانے لگا کہ کسی نامعلوم شخص نے اسے کس طرح موت کے منہ میں دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ ارسلان اور عالیہ وہ کہانی سن کر خاصے تشویش زدہ نظر آنے لگے۔

خان داراب کے خاموش ہوتے ہی عالیہ نے پوچھا۔ ''وہ کون ہو سکتا ہے باوا جانی؟''

''اگر مجھے اس کا علم ہوتا تو میں تم دونوں کے ساتھ پڑاؤ کی طرف جانے کے بجائے اس سے حساب چکانے جا رہا ہوتا۔''

ارسلان بولا۔ ''لیکن آپ نے وہ خطرناک طریقہ اختیار ہی کیوں کیا تھا؟ جس طرح ادھر سے اتر کر ادھر آئے تھے، اسی طرح ادھر سے اس طرف چلے جاتے۔''

''اندازہ نہیں تھا کہ کھائی کتنی گہری ہوگی۔''

''ٹارچ کی روشنی سے دیکھ لیتے۔''

''ہاں، یہ بالکل سامنے کی بات تھی لیکن بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان کے ذہن میں سب سے پہلے جو تدبیر آتی ہے، وہ اسی پر عمل کر بیٹھتا ہے اور غالباً یہ میری خوش قسمتی

ہی تھی کہ میں نے کھائی کی گہرائی دیکھ کر اس میں اترنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر میں ایسا کرتا تو رسّا کٹتے ہی خاصی بلندی سے کھائی میں گرتا اور نہ جانے کتنی ہڈیاں تڑوا بیٹھتا۔ خدا جو کرتا ہے، بہتر ہی کرتا ہے۔'' خان داراب نے جواب دیا۔

''سمجھ میں نہیں آتا۔'' عالیہ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔ ''آخر یہاں آپ کا جانی دشمن کون ہو سکتا ہے؟''

خان داراب کچھ نہیں بولا۔ شاید وہ کچھ سوچنے لگا تھا۔

''ان غیر ملکیوں سے آپ کی کیا بات چیت ہوئی؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''تھوڑی سی تلخ کلامی ہو گئی۔'' خان داراب نے جواب میں کہا۔ ''میں نے فائر کرنے کے سلسلے میں انہیں مطعون کیا تھا۔ ڈاکٹر پیٹروویچ کے دونوں ساتھی مجھ پر کچھ گرم ہونے لگے تو میں نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا لیکن پیٹروویچ ذرا ٹھنڈے مزاج کا آدمی ہے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو خاموش کر دیا اور واپسی پر مجھ سے کچھ گھلنے ملنے کی بھی کوشش کی۔ اس سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ اس کی مخل مزاجی اس کی عیارانہ فطرت کا ایک حصہ ہے۔ وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ کیا ہم لوگ بھی اس برفانی عورت کی وجہ سے یہاں آئے ہیں لیکن میں نے اس پر ظاہر کیا کہ ہمارا مقصد صرف شکار کھیلنا ہے۔''

''کیا اسے یقین آ گیا؟''

''میرا خیال ہے کہ نہیں آیا۔''

''گویا وہ لوگ چاہتے ہیں کہ کوئی اور اس برفانی عورت کے چکر میں نہ پڑے؟''

''ہاں، شاید وہ یہی چاہتے ہیں۔''

''تو پھر یہ بھی ممکن ہے کہ انہی کے کسی آدمی نے آپ کو ہلاک کرنے کی کوشش کی ہو۔''

''شاید۔''

اسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے وہ تینوں اپنے کیمپ تک پہنچ گئے جہاں شیما اور گردیزی بھی موجود تھے۔

''ارے شیما... تم!'' ارسلان تعجب سے بولا۔

''ہاں۔'' شیما نے ہنس کر کہا۔ ''دراصل بستی سے تم لوگوں کی روانگی کے بعد ہی اچانک گردیزی کو سوجھی تھی کہ وہ بھی چار چھ ہزار فٹ کی بلندی پر جا کے شکار کھیلے۔ میں نے سوچا کہ چلو اس بہانے میں بھی تھوڑی سی تفریح کر لوں لیکن درحقیقت مجھے صرف یہ تجسس یہاں تک لایا ہے کہ کیا واقعی یہاں کسی برفانی عورت کا وجود ہے۔''

ارسلان نے محسوس کیا کہ اس وقت خان داراب، گردیزی کو بڑی عجیب سی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

شیما بولتا رہا۔ ''لیکن ہم تم لوگوں پر بوجھ نہیں بنیں گے۔ ہم اپنا خیمہ اور تمام ضروری سامان لے کر آئے ہیں اور ابھی ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ خیمہ ابھی اس لیے نہیں گاڑا کہ تم لوگوں کی اجازت لے لوں۔ معلوم نہیں تم لوگ اپنی اس مہم میں کسی کی رفاقت گوارا کرو گے یا نہیں؟''

''ارے واہ! اس میں ناگواری کی کیا بات ہے؟ کیوں باوا جانی!''

''آں!'' خان داراب چونکا اور پھر ہنس کر بولا۔ ''ارے بھئی، ایک سے دو بھلے تو ہوتے ہی ہیں۔ اگر تین سے پانچ بھلے ہو جائیں تو کیا حرج ہے؟''

''اس دلچسپ جواب سے شیما بہت محظوظ ہوا۔

''بس تو اب تم خیمہ لگاؤ۔'' ارسلان نے کہا۔ ''ہم لوگ اب کھانا کھائیں گے۔ اگر تم لوگ پسند کرو تو...''

''نہیں۔'' شیما نے اس کا مطلب سمجھ کر بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ہم دونوں کھا چکے ہیں۔''

اس دوران میں گردیزی ایک لفظ بھی نہیں بولا تھا۔ اس کی ویران و یران سی نگاہیں بلندی کی طرف لگی ہوئی تھیں۔

☆☆☆

عالیہ کو مطالعے کا شوق تھا، لہٰذا اس مہم پر روانہ ہوتے ہوئے وہ برفانی انسان پر لکھے ہوئے دو ناول اور دو سنجیدہ کتابیں بھی لے آئی تھی۔ رات کو سونے سے پہلے مطالعہ کرنا اس کی عادت بن چکی تھی، چنانچہ کھانے کے بعد وہ مطالعے میں ایسی منہمک ہوئی کہ اسے وقت گزرنے کا احساس ہی نہ رہا جبکہ ارسلان کو سوئے ہوئے آدھے گھنٹے سے زیادہ گزر چکا تھا۔

آخر خان داراب نے اسے ٹوکا۔ ''اب سو جاؤ بیٹا۔''

''آں!'' عالیہ چونک گئی۔

''میں کہہ رہا ہوں کہ اب سو جاؤ۔'' خان داراب نے کہا۔ ''کل ہمیں پھر بلندی کی طرف سفر شروع کرنا ہے۔''

عالیہ نے ایک طویل سانس لے کر کتاب بند کر دی اور پھر کیروسین لیمپ کے بارے میں پوچھا۔ ''کیا اسے بجھا دوں؟''

''نہیں، جلتا ہی رہنے دے۔''

عالیہ نے کتاب سرہانے ہی رکھ لی اور آنکھیں موند

لیں۔ خان داراب بھی ایسا بن گیا جیسے سونے کی کوشش کر رہا ہو لیکن درحقیقت اس کی کوشش یہ تھی کہ اسے نیند نہ آئے۔ وہ عالیہ کے سو جانے کا منتظر تھا۔ کچھ ہی دیر بعد اس نے محسوس کیا کہ عالیہ سو چکی ہے۔ یہ اسے عموماً آنکھیں بند کرنے کے بعد بہت جلدی نیند آجاتی تھی۔

''عالیہ!'' خان داراب نے احتیاطاً اسے سرگوشی کرنے والے انداز میں پکارا۔

عالیہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ وہ سوتے میں بہت گہری گہری سانسیں لیتی تھی۔

خان داراب بڑی احتیاط سے اٹھا۔ گرم بستر سے نکلتے ہی ٹھنڈ کی لہریں اس کے جسم میں سرایت کرنے لگیں۔ اس نے جلدی سے لمبا کوٹ پہنا، پوستین کی ٹوپی اوڑھی اور فل بوٹ پہن کر پنجوں کے بل چلتا ہوا خیمے کے دَر کی طرف بڑھا جسے ڈوریوں سے کس کر بند کر دیا گیا تھا۔ اس نے ڈوریاں کھولیں اور باہر نکل کر انہیں پھر باندھنے لگا۔

کیمپ پر مکمل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ تمام ملازمین ایک خیمے میں تھے اور ایک بڑے خیمے میں جانوروں کو رکھا گیا تھا کہ اگر برف باری ہو جائے تو وہ اس سے محفوظ رہ سکیں۔ ہوا بالکل ساکن تھی مگر سرد لہریں فضا میں جھکولے کھا رہی تھیں۔

خان داراب آہستہ آہستہ شیما کے خیمے کی طرف بڑھا۔ نہ جانے کیوں وہ گردیزی کی طرف سے مطمئن نہیں تھا۔ اسی لیے وہ آج رات گردیزی کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا تھا۔ شاید سامان میں کوئی ایسی چیز مل جاتی جو گردیزی کی شخصیت پر کچھ روشنی ڈال سکتی۔

لیکن جب وہ ان کے خیمے کے قریب پہنچا تو چند لمحے کے لیے ٹھٹک گیا۔ وہ دونوں ابھی جاگ رہے تھے۔ ان کے باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند لمحے رکنے کے بعد خان داراب مزید احتیاط سے آگے بڑھا۔ اسے خیمے میں ایک چھوٹا سا سوراخ اس لیے نظر آ گیا تھا کہ خیمے میں روشنی تھی۔ قریب پہنچ کر خان داراب نے اپنی ایک آنکھ اس سوراخ سے لگا دی۔ اب وہ ان دونوں کو دیکھ بھی سکتا تھا۔

''ہاں میرے دوست!'' گردیزی نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''اتنے برس گزر گئے لیکن تمہاری کوششیں رائگاں ہی رہیں۔ مجھے اپنا ماضی یاد نہیں آ سکا۔ بس اتنا ہی ہے کہ شروع سے اب تک صرف تمہارا نام ہی میرے ذہن میں جھماکے سے پیدا کرتا ہے۔ تمہارا نام شیما ہے لیکن یہ نام میرے ذہن میں ''سیما... سیما'' کی گونج پیدا کر دیتا ہے۔ نہ جانے یہ سیما کون تھی یا کون ہے جو تمہارے نام کے حوالے سے میرے وجود میں شعلے کی طرح لپکنے لگتی ہے۔''

''جب تم ہمارے علاقے میں آئے تھے تو تمہیں کسی کی تلاش تھی اور اس سلسلے میں تم ہمارے قبیلے کے سردار کا تعاون بھی چاہتے تھے۔'' شیما نے کہا۔ ''ممکن ہے کہ وہ سیما ہی ہو جس کی تمہیں تلاش تھی اور وہ سیما شاید تمہاری محبوبہ ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تم اس کی تلاش میں ادھر ہی کیوں آئے؟ یقیناً اس کی کوئی وجہ ہوگی۔ اگر تم صرف وہ وجہ یاد کرنے کی کوشش میں کامیاب ہو جاؤ تو میرا خیال ہے کہ تمہیں اپنا پورا ماضی یاد آ جائے گا۔''

''بہت زور دے چکا ہوں ذہن پر۔'' گردیزی نے پھر ایک ٹھنڈی سانس لی۔ ''مگر کچھ یاد نہیں آتا، البتہ...''

''البتہ کیا؟'' شیما نے جلدی سے پوچھا۔

''ایک لفظ اور بھی ہے جو میرے ذہن میں بھونچال پیدا کرتا ہے۔ یہ بھونچال ان دنوں بھی پیدا ہوتا رہا تھا جب میرے سر پر چوٹ لگی تھی اور ایک سیاح ڈاکٹر نے میرا علاج کیا تھا۔''

''وہ لفظ کیا ہے؟'' شیما نے بے چینی سے اپنا سوال دوسرے لفظوں میں دہرایا۔

''وہ لفظ ''ڈاکٹر'' ہے۔'' گردیزی نے جواب دیا۔ ''اب ان دنوں یہ لفظ میرے ذہن میں پھر بھونچال پیدا کرنے لگا ہے۔''

''کیوں؟''

''وہ جو غیر ملکیوں کی پارٹی یہاں آئی ہوئی ہے، اس کا لیڈر بھی تو ایک ڈاکٹر ہے۔''

''ہاں، ڈاکٹر پیٹرووچ۔''

''وہی۔'' گردیزی نے سر ہلا کر کہا۔ ''اس کا نام بھی میرے ذہن میں بھونچال پیدا کر دیتا ہے۔ میں نے تم سے کہا تھا کہ ہم بھی بلندی پر چل کر شکار کھیلیں لیکن درحقیقت میں یہاں اس لیے آیا ہوں کہ ایک نظر اس ڈاکٹر پیٹرووچ کو دیکھ لوں۔ شاید اس طرح میرے ذہن میں بیداری کی کوئی اور لہر اٹھ سکے جو مجھے سب کچھ یاد دلا دے۔''

''ہوں۔'' شیما نے ایک طویل سانس لی۔ ''تو پھر کل کسی وقت ہم دونوں، غیر ملکیوں کے پڑاؤ کی طرف چلیں گے۔ ڈاکٹر پیٹرووچ کو دیکھنا کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ ہم ادھر جائیں گے تو وہ نظر آ ہی جائے گا۔ خیر... اب ہمیں سونا چاہیے۔ خاصی رات گزر چکی ہے۔''

''تم سو جاؤ دوست۔'' گردیزی نے کھوئے کھوئے سے انداز میں کہا۔ ''مجھے شاید آج بہت دیر سے نیند آئے۔''

''چلو تو میں بھی جاگتا رہتا ہوں۔ جب تک تمہیں نیند نہ آ جائے، ہم چپ چاپ کرتے رہیں گے۔''

''کیا چپ چاپ کرتے رہیں گے؟'' گردیزی پھیکے سے انداز میں مسکرایا۔

''مجھے ایک سلسلے میں مشورہ دو۔ میں اپنے قبیلے میں ایک ذہنی انقلاب لانے کا خواہش مند ہوں۔ ہر چند ہمارے قبیلے کے بہت سے لوگ مسلمان ہو چکے ہیں لیکن وہ ابھی تو ہم پرستی کے جال سے نہیں نکل سکے۔ میں چاہتا ہوں کہ انہیں نئی دنیا کی نئی باتوں کا علم ہو سکے۔ آج تک ہمارے لوگوں کو اس بات کا بھی یقین نہیں کہ انسان چاند پر قدم رکھ چکا ہے۔ اور ایک بات تو تمہاری ہی ذات سے وابستہ ہے۔''

''کون سی بات؟''

''جب تم ہمارے علاقے میں آئے تھے اور آسمان پر بارش اور سرخ روشنیوں کا جال بچھ گیا تھا، معلوم ہوتا تھا کہ بس کسی بھی لمحے آگ کی بارش شروع ہو جائے گی۔ پھر پہاڑ گڑگڑانے لگے تھے۔ برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے اور ایک تودے نے تمہارے سر پر اتنی شدید ضرب لگائی تھی کہ تمہارے دماغ میں شعور کا وہ حصہ مفلوج ہو گیا تھا جہاں یادیں ذخیرہ ہوتی رہتی ہیں۔ ہمارے قبیلے کے مسلمان اسے خدائی قہر اور غیر مسلم آسمانی دیوتا..... کی ناراضی سمجھتے ہیں جبکہ وہ صرف ایک مقناطیسی طوفان تھا۔ میں اس کے بارے میں ایک کتابچہ پڑھ چکا ہوں۔ اس قسم کے طوفان دنیا میں کبھی کبھی آتے ہی رہتے ہیں۔ ان طوفانوں کا تعلق سورج سے ہے۔ جب کبھی سورج کی سطح سے کوئی طوفانی لہر اٹھتی ہے تو تیز رفتار برقی ذرات کا ایک بادل، سورج سے نکل کر خلا میں پھیلتا چلا جاتا ہے اور چونکہ ہماری زمین خود ایک بہت بڑا مقناطیس ہے، وہ طوفان ادھر ہی کا رخ کرتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ ہمارے پہاڑوں کے نیچے زمین میں کوئی آتش فشاں پہاڑ ہے جو اس طوفان سے متاثر ہوا ہوگا۔ اسی کی گڑگڑاہٹ سے ہمارے پہاڑ بھی لرز گئے تھے اور برف کے تودے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔ میرا خیال ہے... بلکہ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ...''

خان داراب یہ ساری باتیں جانتا تھا، اس لیے بور ہونے لگا۔ وہ جس مقصد سے آیا تھا، اس کی تکمیل اب محال نظر آنے لگی تھی۔ وہ اسی طرح سردی میں کھڑے کھڑے کب تک ان کے سونے کا انتظار کرتا؟ آخر کار وہ واپس اپنے خیمے کی طرف جانے لگا۔ جب وہ اپنے خیمے سے صرف دو تین گز کے فاصلے پر تھا تو اس نے ایک نسوانی چیخ سنی جو اسی کے خیمے سے آئی تھی اور یقیناً عالیہ کی تھی۔ وہ دوہری جستوں میں خیمے کے دَر پر پہنچ گیا اور بڑی عجلت میں اس کی ڈوریاں کھولنے لگا۔

''کیا ہوا عالیہ؟'' ارسلان کی گھبرائی ہوئی آواز سنائی دی۔ ظاہر ہے کہ عالیہ کی چیخ سے اس کی آنکھ بھی کھل گئی ہوگی۔

''باوا جانی کہاں ہیں؟'' عالیہ کی کانپتی ہوئی آواز آئی۔

''میں آ رہا ہوں بیٹے!'' خان داراب خیمے کا دَر کھول چکا تھا۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے دیکھا کہ ارسلان نہایت پریشان حالت میں عالیہ کے قریب بیٹھا اس کی پیٹھ تھپک رہا تھا اور عالیہ کے چہرے پر سفیدی پھیلی ہوئی تھی۔ جیسے ہی وہ ان کے قریب پہنچا، عالیہ ''باوا جانی'' کہہ کر اس کے سینے سے لگ گئی۔

''کیا بات ہے بیٹا؟'' خان داراب نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''کیا کوئی خواب دیکھ کر ڈر گئی ہو؟''

''نہیں نہیں، باوا جانی!'' عالیہ نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے اسے جاگتے میں دیکھا تھا۔ معلوم نہیں کوئی آواز ہوئی تھی یا کسی اور وجہ سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ اس کے نقش و نگار اچھے تھے لیکن وہ بڑی بھیانک نظر آ رہی تھی۔ اس کے بال اتنے چکٹ ہو رہے تھے جیسے وہ برسوں سے نہائی نہ ہو اور اس کی آنکھوں میں بلا کی وحشت تھی۔ شاید وہ وہی برفانی عورت ہو۔''

''وہ کہاں دکھائی دی تھی؟'' خان داراب نے پوچھا۔

''وہ ادھر سے جھانک رہی تھی، مجھے ہی گھور رہی تھی۔'' عالیہ نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔

ارسلان اور خان داراب نے بیک وقت اس جانب دیکھا۔ اس طرف خیمے کا مضبوط کپڑا کوئی ایک فٹ کے قریب پھٹا ہوا نظر آ رہا تھا۔ خان داراب عالیہ کو چھوڑ کر تیزی سے اس طرف گیا۔ اس نے پردے کے شگاف سے اندازہ لگایا کہ وہ کسی کند قسم کے ہتھیار سے کاٹا گیا تھا۔ اس نے شگاف سے باہر جھانکا لیکن اندھیرے میں کچھ دکھائی نہیں دیا۔

''ارسلان! تم یہیں رکو۔'' خان داراب نے کہا اور نارچ لے کر پھر خیمے کے دَر کی طرف جھپٹا۔

عالیہ کی چیخ نے ملازمین کو بھی جگا دیا تھا اور وہ اپنے خیمے سے نکل آئے تھے۔ وہ خان داراب کو دیکھ کر اس کی طرف آئے اور کسی نے پوچھا۔ ''کیا ہوا مالک! یہ چیخ کیسی

تھی؟''

خان داراب اس جگہ پہنچ چکا تھا جہاں خیمے کے کپڑے میں شگاف تھا۔ اس نے ٹارچ کی روشنی میں برف پر پھیلی ہوئی انگلیوں والے پیروں کے نشانات دیکھے۔ ان نشانات کو دیکھ کر ملازمین کے چہرے بھی فق پڑ گئے۔

''اوہ یہ تو... یقیناً... برفانی عورت کے قدموں کے نشان معلوم ہوتے ہیں۔'' خان داراب نے شیما کی آواز سن کر اس کی طرف دیکھا۔ گردیزی بھی شیما کے ساتھ تھا۔ وہ دونوں عالیہ کی چیخ ہی سن کر آئے ہوں گے۔ ان کا خیمہ چالیس پچاس فٹ سے زیادہ دور نہیں تھا۔

''ہاں۔'' خان داراب نے پُرتشویش لہجے میں شیما کو جواب دیا۔ ''وہ یقیناً یہاں آئی تھی۔ اس نے ہمارے خیمے کا کپڑا پھاڑا تھا اور اندر جھانک رہی تھی۔ اتفاقاً عالیہ کی آنکھ کھل گئی اور وہ اس برفانی عورت کا چہرہ دیکھ کر چیخ پڑی۔ اس کے چیخنے کے باعث وہ بھاگ نکلی۔''

''کیا ان نشانات کے تعاقب میں چلا جائے؟'' گردیزی کا لہجہ خاصا پُرجوش تھا۔

''نہیں۔'' خان داراب نے فضا میں پھیلتی ہوئی سفیدی کو دیکھ کر کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ برف باری ہونے والی ہے۔''

خان داراب چپ ہوا ہی تھا کہ برف کے ذرّات گرنے لگے۔

''اوہ، یہ بُرا ہوا۔'' گردیزی متاسف انداز میں بولا۔ ''اب جلد ہی یہ نشانات برف باری کے باعث مٹ جائیں گے۔''

''سب لوگ خیمے میں جائیں۔'' خان داراب نے بلند آواز میں اپنے ملازمین سے کہا۔

برف باری میں بہ تدریج شدت آنے لگی تھی۔

''تم بھی جاؤ لڑکو۔'' خان داراب نے شیما اور گردیزی سے کہا حالانکہ شیما کی عمر پینتالیس سال سے کم نہیں تھی۔ گردیزی اس سے بھی سات آٹھ سال بڑا ہوگا۔

☆☆☆

اس رات اتنی شدید برف باری ہوئی کہ ان لوگوں کو کئی مرتبہ بانسوں سے اپنے خیموں کی چھت جھاڑنا پڑی ورنہ برف کے بوجھ سے ان کے خیمے گر بھی سکتے تھے۔ ارسلان نے خیمے کا پھٹا ہوا پردہ مضبوطی سے سی دیا تھا۔

صبح ہوئی تو برف باری رک چکی تھی لیکن سردی میں خاصا اضافہ ہو گیا تھا۔

ناشتے کے دوران میں ارسلان بولا۔ ''مجھے ایک بات پر حیرت ہے باوا جانی!''

''کس بات پر؟'' خان داراب نے پوچھا۔

''غیر ملکی پارٹی نے کل شام ہی اسے گولی سے زخمی کیا تھا۔ یہ بات آپ ہی نے ہمیں بتائی تھی۔ پھر وہ برفانی عورت زخمی حالت میں کل رات ہی ادھر کیسے آ گئی؟''

''ہاں لڑکے!'' خان داراب نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''یہ سوال مجھے بھی الجھن میں ڈالے ہوئے ہے لیکن پریشان کن مسئلہ میرے لیے ایک اور ہے۔''

''وہ کیا؟''

''آج ہمیں مزید بلندی کی طرف جانا ہے لیکن اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ میں نے عالیہ کو اپنے ساتھ لا کر غلطی کی ہے۔''

''وہ کیوں باوا جانی؟'' عالیہ جلدی سے بولی۔

''میں سمجھتا تھا کہ میری بیٹی بہت بہادر ہے۔'' خان داراب نے منہ بنا کر کہا۔ ''لیکن تیری کل رات کی خوف زدہ چیخ نے میری غلط فہمی دور کر دی۔''

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی باوا جانی۔'' عالیہ نے سر جھٹک کر کہا۔ ''میں اب اس سے قطعی خوف زدہ نہیں ہوں۔ کل رات کی بات اور تھی۔ اگر اچانک آنکھ کھلتے ہی، غیر متوقع طور پر کوئی بھیانک چہرہ نظر آئے تو بڑے بڑے بہادروں کا پتا پانی ہو سکتا ہے۔ میری وہ چیخ قطعی اضطراری تھی۔''

''تو یہ کہنا چاہتی ہے کہ اب بھی میرے ساتھ رہے گی؟''

''کیوں نہیں۔''

''میں تو سوچ رہا تھا کہ تجھے ارسلان کے ساتھ واپس نیچے بھیج دوں۔ ملازمین کو تو واپس بھیجنا ہی ہے کیونکہ اب راستہ بھی خطرناک ہے۔ جانوروں پر بھی سفر ممکن نہیں۔''

''میں آپ کے ساتھ چلوں گی۔'' عالیہ نے مستحکم لہجے میں کہا۔ ''میں اس برفانی عورت کو قریب سے دیکھنا چاہتی ہوں۔''

خان داراب نے اسے غور سے دیکھا اور پھر اس طرح مسکرایا جیسے عالیہ کے عزم نے اسے خوش کر دیا ہو۔

اسی اثنا میں خیمے کے باہر سے ایک بلند آواز سنائی دی۔ ''یار عزیز ارسلان!'' وہ شیما تھا۔

خان داراب کا منہ بن گیا۔ اسے یقین تھا کہ شیما کے ساتھ گردیزی بھی ہوگا اور نہ جانے کیوں اس شخص کے بارے میں خان داراب کے خیالات اچھے نہیں تھے۔ ہر چند

کہ گردیزی بظاہر ایک مظلوم سا شخص تھا مگر خان داراب کے ذہن میں یہ بات سمائی ہوئی تھی کہ گردیزی حقیقتاً وہ نہیں ہے جو دکھائی دیتا ہے۔

ارسلان، خان داراب سے اجازت لے کر خیمے کے باہر چلا گیا۔

''ہماری روانگی کب ہے باوا جانی؟'' عالیہ نے پوچھا۔

''بس اب تیاری کرنا ہے۔''

''لیکن جب ملازمین ساتھ نہیں ہوں گے تو اتنا سامان...''

''ہم زیادہ سامان لے کر نہیں جائیں گے۔ بس کھانے پینے کی چیزیں، کچھ ضروری سامان اور ایک موی خیمہ جو میرے ایک تھیلے میں رکھا ہوا ہے۔ وہ بہت ہلکا ہے۔ کوہ پیما اسی قسم کے خیمے ساتھ رکھتے ہیں۔ رہ گیا کوہ پیمائی کا سامان تو وہ ہمارے ہاتھوں میں ہوگا۔ باقی سامان ہم تھیلوں میں اپنی پشت پر باندھ لیں گے اور زیادہ وزنی تھیلا میں اپنی پیٹھ پر رکھوں گا۔''

اسی وقت ارسلان واپس آ گیا اور خان داراب سے بولا۔ ''باوا جانی! شیما پوچھ رہا ہے کہ کیا وہ دونوں ہمارے ساتھ چلیں؟''

''نہیں۔'' خان داراب نے فوراً جواب دیا۔ ''وہ ہم سے ایک آدھ فرلانگ پیچھے ضرور رہیں۔''

''اس کی کوئی خاص وجہ ہے باوا جانی؟'' ارسلان نے ہچکچاتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں۔'' خان داراب نے جواب دیا۔ ''دراصل اس کا دوست گردیزی مجھے کچھ پسند نہیں ہے۔''

ارسلان نے کچھ سوچا اور دوبارہ خیمے کے باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔

''ان لوگوں کو ساتھ رکھنے میں حرج کیا ہے باوا جانی؟'' عالیہ بولی۔

''یہ شخص گردیزی مجھے کچھ اچھا نہیں لگا۔''

''لیکن آپ نے شاید ایک بار کہا تھا کہ تین سے پانچ بھلے۔''

''اگر وہ ہم سے ایک فرلانگ پیچھے رہیں گے تو بھی گویا ساتھ ہی ہوں گے۔''

عالیہ نے اس سلسلے میں بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

''اور ہاں۔'' خان داراب پھر بولا۔ ''آج میں نے فیصلہ کیا ہے کہ ملازمین کو واپس بھیجنے کے بجائے ان سے کہیں گے کہ وہ یہیں پڑاؤ ڈالے رہیں۔ ممکن ہے کسی وقت ہمیں ان سے کسی کام کی ضرورت پڑے۔ اس صورت میں ہمیں بالکل نیچے نہیں جانا پڑے گا۔''

عالیہ نے تھکیھی انداز میں اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ اسی وقت ارسلان واپس آ گیا۔ خان داراب نے اس سے شیما یا گردیزی کے بارے میں کوئی سوال نہیں کیا اور بولا۔ ''میں ذرا ملازمین کو کچھ ہدایات دے آؤں پھر ہم سفر کی تیاری کریں گے۔''

وہ کھڑا ہوا اور خیمے سے نکل گیا۔

ارسلان منہ بنا کر بولا۔ ''باوا جانی کو نہ جانے کیوں گردیزی سے اتنی چڑ ہو گئی ہے۔ مجھے تو وہ بڑا مظلوم لگتا ہے۔''

''شیما کو تم نے کیا جواب دیا؟''

''آخر اخلاق بھی کوئی چیز ہے۔ میں اس سے باوا جانی کی بات تو نہیں کہہ سکتا تھا۔''

''پھر کیا کہا؟''

''یہی کہ ہمیں ایک دوسرے سے کچھ دور رہنا چاہیے تاکہ اگر کوئی خطرہ پیش آ جائے تو دونوں پارٹیاں بیک وقت اس کی زد میں نہ آئیں اور جب ایک پارٹی کسی خطرے میں پڑے تو دوسری اس کی مدد کر سکے۔''

''چلو ٹھیک ہے۔ مناسب جواب دیا ہے تم نے شیما کو۔ میں تو تمہیں بے دال کا بودم سمجھتی تھی۔'' عالیہ شرارت سے مسکرائی۔

ارسلان نے اسے گھور کر دیکھا اور پھر بولا۔ ''ذرا نکاح ہو جانے دو۔ پھر تمہاری اس قسم کی بکواس کا مناسب حساب کیا کروں گا۔''

''مت بھولو کہ میں خان داراب کی بیٹی ہوں۔ دونوں کانوں کے بیچ میں سر کر دوں گی۔''

ان دونوں میں شاید کچھ دیر تک اور چونچیں لڑتیں لیکن اسی وقت خان داراب واپس آ گیا۔ وہ آتے ہی بولا۔ ''بس اب سفر کی تیاری شروع کرو۔''

☆☆☆

دوپہر کے سورج کی بیمار سی زرد کرنیں پہاڑوں پر پھیل چکی تھیں جب ان لوگوں نے سفر شروع کیا۔ ارسلان کو حیرت ہوئی کہ خان داراب کے چند ملازمین بھی ان کے ساتھ ہو لیے تھے۔ یہ بے حد وفادار و جاں نثار قسم کے تھے جو اس خطرناک مہم میں اپنے آقا کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ان لوگوں کی رفاقت سے یہ فائدہ ہوا کہ ارسلان،

عالیہ اور خان داراب کی پیٹھ پر لدے ہوئے تھیلے زیادہ وزنی نہیں رہے۔

اب ان سب کا حلیہ بالکل بدل گیا تھا اور وہ واقعی کوہ پیما نظر آرہے تھے۔ ان لوگوں سے ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے شیما اور گردیزی بھی آرہے تھے۔

خان داراب اس طرف بڑھ رہا تھا جہاں گزشتہ شام غیر ملکیوں نے برفانی عورت پر گولی چلائی تھی لیکن یہ ایک حیرت انگیز امر تھا کہ زخمی ہونے کے باوجود وہ عورت رات کو خان داراب کے پڑاؤ تک پہنچی تھی۔ اگر خیمے کا پردہ پھٹا ہوا نہ ہوتا اور برف پر پیروں کے نشانات دکھائی نہ دیتے تو خان داراب یہی سمجھتا کہ عالیہ نے خواب دیکھا ہوگا۔ زخمی ہونے کے بعد اس کا دوبارہ اتنی دور تک آنا تعجب خیز تھا۔ رات کی برف باری نے گھاس پھوس کو بالکل دبا دیا تھا لیکن درخت اب بھی سر اٹھائے ہوئے تھے۔ ان کی شاخوں پر کہیں کہیں برف کی سفیدی اب بھی چمک رہی تھی۔

آخر وہ لوگ اس جگہ پہنچ گئے جہاں سے غیر ملکیوں کے لیے ممکن نہیں رہا تھا کہ وہ برفانی عورت کا تعاقب جاری رکھ سکتے۔ وہ اسے بس زخمی کرنے میں کامیاب ہو سکے تھے لیکن رات کی برف باری کی وجہ سے اب وہاں خون کا کوئی دھبا تو نظر نہیں آرہا تھا لیکن ایسے نشانات ضرور نظر آگئے تھے کہ خان داراب کے چہرے پر غصے کی سرخی پھیل گئی تھی۔

''یہ کمینے۔'' وہ دانت پیستے ہوئے بولا۔ ''خدا ان کو جہنم کے داروغہ سے ملائے۔ یہ ہم سے پہلے یہاں سے گزر چکے ہیں۔''

''ممکن ہے وہ صبح ہی صبح اپنے پڑاؤ سے روانہ ہو گئے ہوں۔'' ارسلان نے خیال ظاہر کیا۔

''اگر ایسا ہے تو وہ اس وقت ہم سے خاصے آگے ہوں گے۔'' خان داراب نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ انہوں نے بہت عجلت سے کام لیا ہوگا۔ انہیں یقین ہو چکا ہے کہ ہم لوگ بھی اس برفانی عورت کی تلاش میں ہیں لہٰذا وہ ہم سے پہلے اس تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ خیر، میں بھی دیکھوں گا کہ اس مہم میں کون کس کو شکست دیتا ہے۔''

وہ لوگ آگے بڑھتے رہے۔ یہ راستہ اب واقعی اتنا اونچا نیچا اور خطرناک تھا کہ اگر انہوں نے کیلوں کے جوتے نہ پہن رکھے ہوتے تو کسی لمحے بھی پھسل کر کسی گہرے کھڈ میں گر کر جاں بحق ہو سکتے تھے۔ خان داراب نیلی چھتری کا کام اپنے نیزے سے لے رہا تھا اور رائفل کے ساتھ تیر کمان بھی اس کے شانے سے لگی ہوئی تھی لیکن یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ اب تک ان کی مڈبھیڑ کسی درندے سے نہیں ہوئی۔

کوئی تین بجے کے قریب وہ ایک ایسی جگہ پہنچے جہاں کوئی ڈیڑھ سو فٹ اونچی چٹان نے ان کا راستہ روک رکھا تھا۔ دائیں بائیں بھی وہ بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ کسی جانب چل کر آسان راستہ بھی تلاش کیا جا سکتا تھا مگر خان داراب نے چٹان پر چڑھنے کا فیصلہ کیا۔ ہر چند کہ وہ تقریباً عمودی تھی لیکن کوہ پیماؤں کے لیے سو ڈیڑھ سو فٹ کی چٹانیں کوئی اہمیت نہیں رکھتیں۔ خان داراب نے جب اپنے ساتھیوں کو یہ فیصلہ سنایا تو عالیہ منمنائی۔

''اب میرا بھوک سے بُرا حال ہو رہا ہے۔''

''اوہ۔'' خان داراب دھیرے سے مسکرایا۔ ''مجھے تو ایسے موقعوں پر بھوک پیاس کا بالکل خیال نہیں رہتا۔ میرا خیال ہے کہ سب ہی نڈھال ہوں گے۔ چلو ٹھیک ہے۔ پہلے یہیں رک کر کھانا کھا لیتے ہیں، اس کے بعد اوپر چڑھیں گے لیکن خیمہ وغیرہ لگانے میں وقت نہ ضائع کیا جائے۔''

وہ سب ہی بھوک سے بے حال تھے لیکن خان داراب سے یہ بات کہنے کی ہمت عالیہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا تھا۔ وہ وہیں رک گئے اور کھلے آسمان کے نیچے سرد فضا میں ایک مرتفع جگہ پر کھانا کھانے بیٹھے۔ انہیں رکتے دیکھ کر ایک ڈیڑھ فرلانگ پیچھے شیما اور گردیزی بھی رک گئے۔ کھانا کھانے میں زیادہ وقت نہیں لگایا گیا اور جب وہ اس سے فارغ ہو کر چٹان پر چڑھنے کی تیاری کر رہے تھے تو ایک خوفناک آواز نے انہیں چونکا دیا۔ وہ آواز چٹان کے اوپر سے آئی تھی۔

''یہ تو کوئی ریچھ معلوم ہوتا ہے۔'' خان داراب کے منہ سے نکلا۔

اسی وقت پھر ایک چیختی ہوئی آواز سنائی دی جسے سن کر سب ہی اچھل پڑے۔ وہ یقیناً ایک انسانی چیخ تھی مگر اتنی بھیانک کہ غیر انسانی سی معلوم ہو رہی تھی۔ سب ہی نے یہ بات محسوس کی اور سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔

خان داراب کے ہونٹوں میں تفکر آمیز کھنچاؤ پیدا ہو گیا اور پھر وہ بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ کل مجھے ہلاک کرنے کی کوشش انہی غیر ملکیوں میں سے کسی کی ہوگی اور اب چٹان کے اوپر بھی کوئی غیر ملکی ہی ہے۔ اس کتے ڈاکٹر پیٹرووچ نے اپنے کسی آدمی کو اوپر اسی لیے چھوڑا ہوگا کہ وہ کسی طرح ہمیں اوپر چڑھنے سے باز رکھ سکے لیکن یہ اس آدمی کی بدنصیبی ہے کہ وہ کسی ریچھ کے بھتے چڑھ گیا ہے۔''

''لیکن وہ چیخ تو انسانی ہوتے ہوئے بھی غیر انسانی سی تھی واہ اجانی۔'' ارسلان نے پُرتشویش لہجے میں کہا۔

''اگر ریچھ کے ناخن جسم کے کسی نازک حصے میں پیوست ہو جائیں تو چیخ یقیناً بڑی کریہہ ہوتی ہے۔'' خان داراب نے جواب دیا۔

اوپر سے ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے اب بھی وہاں دو فریقوں میں لڑائی ہو رہی ہو۔ دونوں قسم کی آوازیں اب بھی سنائی دے رہی تھیں۔

''وہ دیکھیے مالک!'' خان داراب کا ایک ملازم بڑی زور سے چیخا۔

سب کی نظریں چٹان کے اوپر اٹھ گئیں اور انہوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ وہ دونوں فریق ایک دوسرے سے لڑتے ہوئے چٹان کے کنارے تک آگئے تھے۔ ان میں سے ایک یقیناً ریچھ تھا لیکن دوسری انسانی ہستی کسی غیر ملکی کی ہرگز نہیں ہو سکتی تھی۔ ارسلان، خان داراب اور عالیہ نے دوربینیں آنکھوں سے لگا لیں اور دو بدو لڑائی کا وہ منظر انہیں اپنے بالکل قریب نظر آنے لگا۔

''باواجانی!'' عالیہ دانت پر دانت جما کر بولی۔ ''یہ تو وہی عورت ہے جو گزشتہ رات میرے خیمے میں جھانک رہی تھی۔''

وہ منظر دیکھ کر خان داراب کے ملازمین کی تو سانسیں رکنے لگیں۔ برفانی عورت بڑی بے جگری سے اس ریچھ کا مقابلہ کر رہی تھی۔ اسے تقریباً برہنہ کہا جا سکتا تھا۔ اس نے درختوں کی چھال اور پتوں سے برائے نام ستر پوشی کر رکھی تھی۔ خان داراب نے جلدی سے اپنی کمان اتاری اور ترکش میں سے ایک تیر نکالنے لگا۔ وہ اس ریچھ کو ہلاک کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی وہ چلّے پر تیر چڑھا ہی رہا تھا کہ ان لوگوں نے ایک حیرت انگیز منظر دیکھا۔ برفانی عورت نے اس بھاری بھرکم ریچھ کو اپنے دونوں ہاتھوں پر اس طرح اٹھا لیا تھا جیسے کسی بچے کو اٹھایا ہو۔ چٹان پر اس طرح کھڑی ہوئی وہ عورت کسی دوسری دنیا کی مخلوق معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے ریچھ کو ایک جھٹکے سے نہایت گہرے کھڈ میں پھینک دیا۔

''شاباش ہے۔'' خان داراب کے منہ سے نکلا اور وہ کمان نیچے کر کے تیر ترکش میں رکھنے لگا۔

برفانی عورت اب بھی چٹان کے کنارے پر کھڑی ہوئی تھی اور اس کی وحشت زدہ آنکھیں صرف عالیہ کو گھور رہی تھیں۔ اس کا چہرہ بالکل ویسا ہی تھا جیسا عالیہ نے بتایا تھا۔

دفعتاً ایک چیختی ہوئی آواز نے پہاڑیوں میں گونج سی پیدا کر دی۔ ''سیما... سیما!''

وہ گردیزی تھا جو نہ جانے کب شیما کے ساتھ ان لوگوں کے قریب آگیا تھا۔

گردیزی کی چیخ سن کر برفانی عورت چونکی اور اس کی نظر گردیزی کی طرف گئی۔

''سیما... سیما...!'' گردیزی چیختا ہوا آگے بڑھا اور چٹان سے جا ٹکرایا۔ اس کی پیشانی سے خون بہہ نکلا اور وہ گر پڑا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ برفانی عورت چٹان سے اچانک غائب ہو گئی۔

خان داراب اس صورتِ حال سے بری طرح جھنجلا گیا تھا۔ اس نے غرا کر شیما سے کہا۔ ''تم اپنے پاگل ساتھی کو سنبھالو۔ ہمیں تو فوراً اوپر جانا ہے۔ ہم تمہارے ساتھی کی دیکھ بھال کے لیے یہاں نہیں رک سکتے۔''

''خانِ بزرگ!'' شیما نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں چاہتا بھی نہیں کہ آپ لوگ ہماری وجہ سے یہاں رکیں۔''

شیما آگے بڑھ کر گردیزی کے قریب گیا اور بیٹھ کے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ کر اس کی پیشانی کا جائزہ لینے لگا۔ ارسلان کو گردیزی سے ہمدردی تھی لیکن خان داراب کی وجہ سے وہ کچھ نہیں بول سکا۔ گردیزی کی پیشانی کا زخم بہت معمولی تھا مگر نہ جانے کیوں وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

☆☆☆

شیما نے چٹان کی جڑ کے پاس سے مٹھی بھر برف کے ذرات نکالے اور گردیزی کی پیشانی پر رگڑنا شروع کیا۔ اس طرح خون کا رسنا بند ہو جاتا اور پیشانی بھی صاف ہو جاتی۔

اس دوران میں خان داراب نے اوپر چڑھنے کی تیاری شروع کر دی تھی۔ اس نے چٹان میں ایک میخ ٹھونکی۔ پھر اس سے چند فٹ اوپر دوسری میخ ٹھونکی۔ ان ہی میخوں کے سہارے وہ لوگ اوپر چڑھ سکتے تھے۔ ایک لمبے رسّے کے ذریعے ان سب نے خود کو ایک دوسرے سے منسلک کر لیا۔ سب سے آگے خان داراب تھا جو میخیں ٹھونکتا ہوا اوپر چڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد ارسلان، پھر عالیہ اور اس کے بعد ملازمین۔

شیما نے گردیزی کی پیشانی صاف کر کے اپنے تھیلے میں سے نہ جانے کس چیز کی پتیاں نکالیں اور پیشانی کے زخم پر رکھ کر پٹی باندھ دی۔ اسی وقت گردیزی کو ہوش بھی آگیا۔ ہوش میں آتے ہی اس کے منہ سے کراہ نکلی۔ وہ پلکیں جھپکاتا ہوا شیما کی طرف دیکھنے لگا۔

''میرا خیال ہے کہ اب تم بالکل ٹھیک ہو گے۔'' شیما نے مسکرا کر کہا۔ ''چٹان سے ٹکرا کر تم اپنی پیشانی پر معمولی سا زخم لگا بیٹھے ہو جو میرا خیال ہے، دو ایک دن میں بالکل ٹھیک ہو جائے گا۔''

گردیزی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے خان داراب وغیرہ کو چڑھتے ہوئے صرف ایک نظر دیکھا اور پھر چٹان کے اوپر دیکھنے لگا۔

''وہ... وہ... کہاں گئی؟'' اس کے منہ سے نکلا۔

''غالباً تم برفانی عورت کے بارے میں پوچھ رہے ہو۔ وہ بھاگ گئی ہے۔ تم نے اسے دیکھ کر 'سیما سیما' کیوں چیخنا شروع کر دیا تھا؟''

''سیما۔'' گردیزی نے بڑبڑاتے ہوئے اپنا سر تھام لیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے؟''

''کیا کیسے ممکن ہے؟'' شیما نے پوچھا۔

گردیزی کھوئی کھوئی سی آنکھوں سے شیما کی طرف دیکھنے لگا اور پھر اچانک اپنے سر کو جھٹک دینے لگا۔

''کیا ہوا میرے دوست؟'' شیما نے گھبرا کر پوچھا۔

''میں... میں... نہ جانے کیا ہو رہا ہے میرے سر میں... بس اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے ہیں، بجلیاں سی جھکولے کھا رہی ہیں اور ان بجلیوں کے ساتھ اس برفانی عورت کا چہرہ بھی چمک رہا ہے۔'' گردیزی نے چٹان سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔

شیما اسے پُرتشویش نگاہوں سے دیکھنے لگا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ''کیا میں تمہارے سر میں مالش کر دوں؟''

''نہیں۔'' گردیزی نے آہستہ سے کہا۔ ''مجھے ذرا دیر تک آنکھیں بند کیے بیٹھا رہنے دو۔ میرا خیال ہے، میں خود کو پُرسکون کر لوں گا۔''

شیما اسے بدستور تشویش سے دیکھتا رہا لیکن کچھ بولا نہیں۔

کچھ دیر بعد ارسلان کی آواز سنائی دی۔ ''شیما!''

شیما نے چونک کے سر اٹھایا۔ خان داراب وغیرہ اوپر پہنچ چکے تھے۔ ارسلان اوپر اوندھا لیٹا ہوا تھا اور اس کا صرف سر دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پھر بولا۔ ''ہم آگے جا رہے ہیں شیما لیکن یہ رسّا لٹکا ہوا چھوڑ دیا ہے۔ اس کا سرا یہاں ایک مضبوط میخ سے بندھا ہوا ہے۔ گردیزی کی طبیعت سنبھل جائے تو تم دونوں ایک ایک کر کے اوپر آ جانا اور رسّا کھینچ لینا۔ اسے یوں ہی نہ چھوڑ دینا۔''

''شکریہ دوست۔'' شیما نے جواب دیا۔

ارسلان کا چہرہ غائب ہو گیا۔

گردیزی بہ دستور آنکھیں بند کیے ہوئے تھا۔ شیما سوچنے لگا کہ سیما کا نام یقیناً گردیزی کی زندگی میں کوئی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ جیسا کہ پہلے بھی بات ہو چکی تھی کہ وہ اس کی بیوی یا محبوبہ بھی ہو سکتی ہے جس کی تلاش میں وہ یہاں آیا تھا لیکن وہ برفانی عورت تو ہرگز سیما نہیں ہو سکتی۔ وہ برفانی عورت کہاں، لڑکی تھی۔ وہ بلا کی طاقتور تھی جس نے ریچھ کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کے کھڈ میں پھینک دیا تھا لیکن اس کی عمر اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں لگی جبکہ گردیزی کو یہاں آئے ہوئے اتنا ہی عرصہ گزر چکا تھا۔ پھر آخر وہ اس برفانی لڑکی کو دیکھ کر اسے سیما کے نام سے کیوں پکارنے لگا تھا؟ کیا وہ گردیزی کی محبوبہ سیما سے بہت زیادہ مشابہ ہے؟ شیما اس سوال سے صرف الجھ ہی سکتا تھا۔ کسی حتمی نتیجے تک پہنچنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔

کچھ دیر بعد گردیزی نے آنکھیں کھولیں اور آہستگی سے کھڑا ہوتے ہوئے بولا۔ ''میرا خیال ہے کہ اب میں ٹھیک ہوں۔''

''تو پھر اس رسّے کے سہارے اوپر چڑھو۔ تمہارے بعد میں بھی اوپر آتا ہوں۔''

گردیزی نے اثبات میں سر ہلایا اور لٹکے ہوئے رسّے کی طرف بڑھا۔ اس کے بعد شیما بھی اوپر چڑھا۔ خان داراب وغیرہ غالباً کسی نشیب میں اتر گئے تھے کیونکہ ان میں سے کوئی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ شیما نے رسّا کھینچ لیا اور میخ اکھاڑ کر دونوں چیزیں اپنے تھیلے میں رکھ لیں اور پھر وہ دونوں، خان داراب وغیرہ کے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ ان نشانات کے ساتھ برفانی عورت کے پیروں کے نشان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ شیما نے محسوس کیا کہ گردیزی ان نشانوں سے نظر چرا رہا تھا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بھی ایک نشیب میں اترنے لگے۔ اب خان داراب وغیرہ بھی ان کی نظر میں آ گئے تھے لیکن درمیان میں فاصلہ اچھا خاصا تھا۔

شیما سوچنے لگا کہ آج شاید پیروں کے نشانات کے سہارے، برفانی عورت کے مسکن تک رسائی ہو ہی جائے۔ مگر اس کے بعد کیا ہو گا؟ شیما کو یہ سوال بڑا خوفناک معلوم ہو رہا تھا۔ خدا جانے خان داراب نے اس کے بارے میں کیا سوچا ہو۔ ادھر گردیزی کی حالت نے صاف ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اس برفانی عورت کو دیکھ کر پھر جنون کا شکار ہو جائے گا۔ وہ اس سے نہ جانے کیا چاہے گا؟ اس کے علاوہ غیر ملکی

بارش بھی تھی۔ وہ لوگ یقیناً اس عورت کو پکڑ کر اپنے ملک لے جانا چاہیں گے تاکہ اس پر تجربات کر سکیں۔ گویا امکان یہی تھا کہ اس برفانی عورت کے سلسلے میں تین جانب سے رسّا کشی ہو گی۔

شیما یہ سب کچھ سوچتا ہوا خاموشی سے آگے بڑھتا رہا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ گردیزی سے برفانی عورت کے بارے میں کوئی بات کر کے اس کا ذہن پھر منتشر کرے۔ نشیبی علاقہ ختم ہو گیا۔ اب وہ پھر اونچے نیچے راستے پر قدم بڑھا رہے تھے۔ ہر طرف برف ہی برف تھی یا بلوط کے درخت جن پر جمے ہوئے برف کے ذرّات اب غائب ہو چکے تھے۔ دوپہر کو کچھ دیر کے لیے پھیلنے والی دھوپ نے انہیں پگھلا دیا تھا۔ آسمان پر اب بادل چھائے ہوئے تھے۔ شام کا سا وقت محسوس ہو رہا تھا۔ حالانکہ ابھی سہ پہر تھی۔

اچانک ہوا میں کچھ تیزی آ گئی اور شیما چونک گیا۔ اس کے چہرے پر تشویش کے آثار نظر آنے لگے۔ گردیزی نے اس کے یہ بدلے ہوئے تاثرات محسوس کیے تو بولا۔ ''کیا بات ہے دوست! تم اچانک کچھ پریشان نظر آنے لگے ہو؟''

''ہاں۔'' شیما کے لہجے میں تشویش تھی۔ ''شاید طوفان آنے والا ہے۔ ہمیں کوئی محفوظ جگہ تلاش کرنا چاہیے۔'' وہ تیزی سے اطراف کا جائزہ لینے لگا۔

''کیا برف باری...'' گردیزی نے کہنا چاہا۔

''نہیں۔'' شیما نے کہا۔ ''ہوا... آندھی سمجھ لو... اسے برف باری سے کہیں زیادہ خطرناک سمجھو۔ اس طرف چلو... جلدی۔'' شیما نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے ایک ایسی چٹان کی طرف اشارہ کیا جو سائبان سا بنائے ہوئے تھی۔

گردیزی یہاں کے بدلتے ہوئے موسم کے اثرات کو شیما سے زیادہ نہیں سمجھ سکتا تھا لیکن جلد ہی اسے یہ ضرور محسوس ہو گیا کہ ہوا میں خوف ناک حد تک تیزی آ گئی تھی۔ ان دونوں کو اپنا توازن برقرار رکھنا مشکل ہو گیا تھا لیکن شیما کی حتی الامکان کوشش تھی کہ دونوں جلد از جلد اس چٹان کے نیچے پہنچ جائیں۔ ہر چند کہ وہ جگہ بھی شیما کی دانست میں بالکل محفوظ نہیں تھی لیکن قرب و جوار میں اس سے بہتر جگہ کوئی اور تھی بھی نہیں۔ ہوا نے اب جیسے چنگھاڑنا شروع کر دیا تھا۔ بڑے بڑے درخت اس طرح ایک طرف جھکنے لگے تھے جیسے وہ چھوٹے موٹے پودے ہوں۔ ان کے پتّے اور ڈالیاں تو ٹوٹنے لگی تھیں۔

آخر دونوں اس سائبان نما چٹان کے نیچے پہنچ گئے۔ اس وقت طوفان اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گیا تھا۔ برف کے

بڑے بڑے تودوں کے لیے بھی ہوا کے ان تھپیڑوں کو برداشت کرنا مشکل ہو گیا اور وہ اِدھر سے اُدھر لڑھکنے لگے۔ چھوٹے موٹے تودے تو روئی کے گالوں کی طرح فضا میں اڑنے لگے لیکن وہ چھوٹے موٹے تودے بھی منوں وزنی تھے۔ درخت، جڑوں سے اکھڑ کر گرنے لگے۔ برف کے ذرّات نے فضا کو دھندلا کر دیا۔ ان ذرّات سے بچنے کے لیے گردیزی اور شیما نے عینکیں لگا لیں۔ فضا اب اس طرح گونج رہی تھی جیسے نقاروں پر چوٹ پڑ رہی ہو۔

☆☆☆

خان داراب اور اس کے ساتھی بھی اس طوفانِ بلاخیز کی زد میں تھے اور انہیں کوئی محفوظ جگہ نہیں مل سکی تھی۔ خان داراب بس اتنی عقل مندی کر سکا تھا کہ طوفان کی جولانی سے پہلے ہی اس نے دو سو گز لمبے رسّے سے خود کو اور اپنے ساتھیوں کو اس طرح باندھ دیا تھا کہ وہ بچھڑ نہ سکیں لیکن ہر دو افراد کے بیچ میں پندرہ بیس گز کا فاصلہ رکھا تھا تاکہ وہ ایک دوسرے ہی سے ٹکرا ٹکرا کر زخمی نہ ہو جائیں۔

ان سب نے چشمے لگا لیے تھے لیکن ہوا کے اڑائے ہوئے ذرّات نے ان کی نظر کے سامنے سفید سی چادر تان دی تھی۔ کوئی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ہوا انہیں کھلونوں کی طرح ادھر سے اُدھر لڑھکا رہی تھی لیکن رسّے کی وجہ سے ابھی تک کوئی کسی سے بچھڑا نہیں تھا۔

”عالیہ! کوئی چوٹ تو نہیں لگی؟“ خان داراب پوری طاقت سے چیخا لیکن اس کی آواز، برفستان کے اس طوفان کی چنگھاڑ میں دب گئی۔

شاید وہ سب ہی ایک دوسرے کو پکار رہے ہوں مگر کسی کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔

اچانک خان داراب کے قریب ایک زوردار دھماکا ہوا۔ غالباً کوئی درخت گرا تھا۔ خان داراب اس کے نیچے آنے سے تو بچ گیا لیکن درخت کی ایک شاخ اس کے بائیں بازو سے ٹکرائی۔ تھی تو وہ پتلی سی شاخ لیکن خان داراب کو یوں لگا جیسے کسی نے اس کے بازو پر کوڑا رسید کیا ہو۔ اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی لیکن خان داراب نے دانت پر دانت جما کر تکلیف ضبط کر لی اور ایک جانب لڑھکتے ہوئے اس نے محسوس کیا کہ رسّا ٹوٹ چکا ہے۔ غالباً اس درخت ہی کی ضرب نے رسّے کو کاٹ دیا تھا۔ خان داراب کو اب اپنی صرف ایک جانب کھنچاؤ محسوس ہو رہا تھا۔ گویا اس جانب اس کے ساتھی اب بھی اس کی کمر سے بندھے ہوئے رسّے سے منسلک تھے جبکہ دوسری جانب کے ساتھی اس سے بچھڑ چکے تھے۔ اس عالم میں خان داراب جیسا آہنی شخص بھی اپنے ہوش و حواس کو پوری طرح بحال نہیں رکھ سکا تھا۔ اسے یہ بات یاد نہیں آ رہی تھی کہ ارسلان اور عالیہ اس کے کس جانب تھے؟ اس جانب جدھر کے ساتھی اس سے بچھڑ چکے تھے یا اس جانب جدھر رسّے میں کھنچاؤ اب بھی موجود تھا۔

”عالیہ... ارسلان!“ وہ ایک بار پھر پوری طاقت سے چیخا۔ لیکن اس کی آواز نقار خانے میں طوطی کی آواز کے مترادف تھی۔

طوفان کی شدت کتنی دیر تک برقرار رہی؟ اس کا اندازہ ان میں سے کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا اور طوفان کی شدت کب کم ہونا شروع ہوئی تھی؟ اس کا احساس بھی کسی کو نہیں تھا۔ جب طوفان نے دم توڑ دیا تو بھی خان داراب کے دماغ میں ”سائیں سائیں“ ہو رہی تھی۔ کچھ دیر کے لیے اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ کچھ دیکھنے اور سننے سے بھی معذور تھا۔ جب اس کے حواس پوری طرح بحال ہوئے تو وہ یہ اندازہ لگانے سے بھی قاصر تھا کہ وہ ہوش میں رہتے ہوئے بھی کتنی دیر تک حواس سے بیگانہ رہا ہے۔

انہیں حدِ نگاہ تک برف کی سفید چادر بچھی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ خان داراب کو اپنی کمر سے بندھے ہوئے رسّے سے صرف ارسلان اور کچھ دوسرے مزدور منسلک دکھائی دیے۔ اب خان داراب کو یاد آیا کہ عالیہ کو اس نے اپنی دوسری جانب باندھا تھا۔

”اوہ... عالیہ... میری بچی!“ خان داراب ہذیانی انداز میں چیخ پڑا۔

ارسلان اور تمام ماندہ مزدور سمٹ کر خان داراب کے قریب آ گئے۔ عالیہ کی جانب کے رسّے سے منسلک مزدوروں کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ارسلان نے خان داراب کی کمر سے بندھے ہوئے رسّے کو کٹا ہوا دیکھا اور صورتِ حال اس کی سمجھ میں بھی آ گئی۔

”انہیں... انہیں ڈھونڈو۔“ خان داراب کھوئے کھوئے انداز میں بڑبڑایا۔

وہ سب اِدھر اُدھر چل پڑے۔ اندھیرا پھیلنے سے پہلے پہلے انہوں نے ایک خیمہ اور کچھ سامان کے علاوہ دو مزدور بھی ڈھونڈ نکالے۔ ان کے دائیں بائیں جانب کے رسّے بھی کسی حادثے میں کٹ گئے تھے، اس لیے صرف وہی دونوں یک جا رہ گئے تھے۔ ان کے چہروں پر وحشت تھی۔ خان داراب کو دیکھ کر وہ کچھ پرسکون ہوتے نظر آئے۔

”باوا جانی!“ ارسلان نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ پہلے خیمہ گاڑ لیا جائے۔“ شاید وہ یہ بھی کہنا چاہتا تھا کہ اندھیرے میں تو اب کچھ نظر نہیں آئے گا لیکن عالیہ کے لیے وہ بھی بہت بے قرار تھا۔

”ہاں، ٹھیک ہے۔“ خان داراب نے مزدوروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ لوگ خیمہ گاڑیں گے۔ ہم آگے بڑھتے ہیں۔ تمہارے تھیلے میں ٹارچ تو ہو گی؟“

خان داراب کے تھیلے میں بھی ٹارچ تھی۔ وہ ارسلان کے ساتھ ایک طرف بڑھنے لگا۔ جو گمشدہ چیزیں نظر آتی گئیں، وہ انہیں اٹھاتے رہے اور آخر انہیں کچھ مزدور اور بھی مل گئے لیکن عالیہ کا سراغ نہیں لگا۔ خان داراب کی بے چینی بڑھنے لگی اور یہی حالت ارسلان کی تھی۔

تعجب خیز امر یہ تھا کہ اپنے سامان کی تین چوتھائی تعداد مل گئی تھی۔ یہ سب کچھ مل جانے کے بعد یہ اندیشہ پیدا ہو چلا تھا کہ عالیہ اور باقی مزدور کسی گلیشیر کے نیچے آ کر ہلاک نہ ہو گئے ہوں لیکن یہ اندیشہ زبان پر لانے کی ہمت کسی میں بھی نہیں تھی۔

☆☆☆

اس چٹان کے نیچے شیما اور گردیزی کو ہرگز پناہ نہیں مل سکتی تھی۔ ہوا انہیں وہاں سے بھی اڑا لے جاتی لیکن چٹان میں انہیں ایک غار مل گیا اور وہ طوفان کے اس خوفناک شکنجے سے محفوظ ہو گئے۔ سردی ان دونوں کے مزاج پوچھ رہی تھی۔ تاہم کھلی فضا کی بہ نسبت انہوں نے خود کو یہاں محفوظ سمجھا۔

”اگر یہاں پتھر مل جائیں تو اس دہانے کو کسی نہ کسی حد تک بند بھی کیا جا سکتا ہے۔“ شیما نے بڑبڑاتے ہوئے اپنے تھیلے میں سے ٹارچ نکال کر جلائی اور اس کی روشنی اِدھر اُدھر بھٹکنے لگا۔

”اوہ!“ اس کے منہ سے نکلا۔

غار میں کئی جگہ مختلف جانوروں کی ہڈیاں پھیلی ہوئی تھیں جو سیاہی مائل ہو چکی تھیں۔

”میں نے داخل ہوتے ہی کچھ عجیب سی بو محسوس کی تھی۔“ شیما نے کہا۔ ”لیکن سمجھ نہیں سکا تھا۔“

”شاید یہ غار کسی درندے کا مسکن ہو۔“ گردیزی نے خیال ظاہر کیا۔

”نہیں۔“ شیما نے بڑے اعتماد سے تردید کی۔ ”یہ کسی درندے کا مسکن نہیں ہو سکتا۔ درندوں کے مسکن میں بہت زیادہ اور ایسی گھورچی بسی ہوئی ہوتی ہے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ کسی درندے کا مسکن نہیں ہے، البتہ... یہ ممکن ہے...“ وہ کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ ”شاید وہ... برفانی عورت بھی جانوروں کو شکار کر کے کھاتی ہو۔“

”تو یہ برفانی عورت کا مسکن ہو سکتا ہے۔“ گردیزی پُرجوش انداز میں بولا۔

”مجھے اس سے بھی اختلاف ہے۔“ شیما نے کہا۔ ”وہ کوئی جانور تو ہے نہیں کہ یوں ہی زمین پر لیٹ جائے۔ جب وہ اپنی برائے نام ستر پوشی کے لیے درختوں کے پتّے اور چھال وغیرہ استعمال کر سکتی ہے تو یہاں اپنے آرام کے لیے ان چیزوں کا بستر بھی بنا سکتی ہے۔ اگر اس کے ذہن میں بستر کا کوئی تصور نہ ہو تو بھی وہ یہاں پتّوں کا ایک ڈھیر تو لگا سکتی ہے جس پر وہ آرام سے سو سکے۔ نہیں میرے دوست! یہ اس کا مسکن نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے وہ کبھی یہاں اپنا شکار کھانے آتی ہو۔ اچھا اب تم ایک موٹی موم بتی نکال کر تو روشن کرو۔ ٹارچ کے سیل کب تک ضائع کیے جائیں۔ یہاں ہمیں پتھر بھی نہیں ملے ہیں کہ دہانہ بند کیا جا سکتا۔ موم بتی کو بالکل کونے میں رکھ کر جلاؤ تاکہ روشن رہ سکے۔“

موم بتی کی روشنی ہی کتنی تھی؟ مگر انہوں نے اسی کو غنیمت جانا۔ وہ دونوں، موم بتی والے ہی کونے میں سکڑے سمٹے بیٹھے رہے اور باہر طوفان چنگھاڑتا رہا۔

”گردیزی!“ شیما بولا۔ ”مجھے یہ سوال کر کے تمہارے ذہن کو پریشان تو نہیں کرنا چاہیے لیکن میری بے چینی بھی اب اتنی بڑھ گئی ہے کہ لگتا ہے جیسے پھٹ جاؤں گا۔“

”کیا سوال پریشان کر رہا ہے تمہیں؟“ گردیزی نے پوچھا۔

”تم نے چٹان پر کھڑی ہوئی اس برفانی عورت کو سیما کے نام سے پکارا تھا۔“

”ہوں۔“ گردیزی نے ایک دل دوز آہ بھری۔ ”وہ اس تصویر سے بہت مشابہ ہے جسے میں سیما کہتا ہوں۔“

”تصویر؟“ شیما تعجب سے بولا۔

”ہاں۔“ گردیزی نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”میں شرمندہ ہوں کہ میں نے تمہیں کبھی وہ تصویر نہیں دکھائی۔ لاؤ، آج دکھا ہی دیتا ہوں۔“ وہ پشت پر بندھا ہوا تھیلا کھولنے لگا۔

شیما کے تجسس کو ہوا ملنے لگی۔ گردیزی نے پوسٹ کارڈ سائز کی ایک تصویر نکال کر شیما کو دی۔ وہ کافی احتیاط سے رکھے جانے کے باوجود کناروں سے کچھ مڑ گئی تھی۔ شیما نے

اس تصویر میں جو نسوانی چہرہ دیکھا، وہ نہایت پُرکشش تھا۔ بلیک اینڈ وہائٹ تصویر میں بھی وہ بہت خوب صورت نظر آرہی تھی۔ اس کی عمر بائیس چوبیس سال کے قریب معلوم ہوتی تھی۔ یکا یک شیما کو اپنی سانسیں اٹکتی محسوس ہوئیں۔ گردیزی کا خیال درست ہی تھا۔ برفانی عورت کے نقوش اس تصویر والی عورت سے کافی ملتے جلتے تھے۔ فرق تھا تو صرف عمر کا! برفانی عورت اٹھارہ انیس سال سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اگر اس کے چہرے کی وحشت کم کر کے اسے نہلا دھلا دیا جاتا تو وہ تصویر والی عورت کی چند سال چھوٹی بہن معلوم ہوتی۔

شیما نے پلٹ کر دیکھا کہ شاید تصویر کے پیچھے کچھ لکھا ہو لیکن ایسا نہیں تھا۔ اس نے گردیزی کو تصویر لوٹاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اس کا نام سیما کیوں رکھا ہے؟''

''تمہارے نام کی وجہ سے۔ میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ تمہارا نام سنتے ہی میرے ذہن میں سیما کا نام چمکا تھا۔''

''تو اس تصویر والی عورت کا نام سیما ہے؟''

''خدا جانے۔'' گردیزی نے معصومیت سے کہا۔ ''بس یہ نام مجھے اچھا لگا اور میں اسے سیما کہنے لگا۔''

''اور وہ... برفانی عورت؟''

یکا یک گردیزی کے چہرے پر جوش کے آثار نظر آئے اور وہ بولا۔ ''تم نے... کیا تم نے... ہاں... ان دونوں کی... مشابہت نہیں محسوس کی؟''

''کی تھی۔'' شیما نے آہستہ سے کہا۔ ''لیکن وہ برفانی عورت تو سیما نہیں ہو سکتی۔ وہ اس تصویر والی عورت سے کئی برس چھوٹی ہے۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ تم اس تصویر والی عورت ہی کی تلاش میں یہاں آئے تھے تو اب اس کی عمر چالیس سال ہونا چاہیے۔ تمہیں ہمارے علاقے میں آئے اٹھارہ سال ہو چکے ہیں۔ اگر وہ زندہ ہوگی تو اسی طرح بوڑھی ہو رہی ہوگی جس طرح تم بوڑھے ہو چکے ہو۔ وہ برفانی عورت تو نوجوان ہے۔ تم اسے سیما کیسے سمجھ سکتے ہو میرے دوست؟''

گردیزی کے چہرے پر بے بسی نظر آنے لگی۔

شیما نے قدرے توقف سے پوچھا۔ ''تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ یہ تصویر تمہاری ہی ملکیت ہے؟''

''یہ میرے سامان میں تھی۔''

''لیکن تمہیں یاد نہیں کہ اس سے تمہارا کیا تعلق رہا ہے؟'' شیما نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

گردیزی نے نفی میں سر ہلایا۔

شیما بولا۔ ''کبھی تم نے تنہائی میں دو چار گھنٹے تک اس تصویر کو دیکھتے ہوئے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی ہے؟''

''کئی مرتبہ۔'' گردیزی نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن اس کوشش سے میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔''

''مگر یاد کچھ نہیں آتا۔''

گردیزی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ اس کی بے بسی کی انتہا تھی۔ شیما نے مناسب یہی سمجھا کہ اس ذکر کو آگے نہ بڑھائے۔ وہ ارسلان، خان داراب اور عالیہ کے بارے میں سوچنے لگا کہ اس طوفان میں ان لوگوں پر نہ جانے کیا گزر رہی ہو۔

☆☆☆

عالیہ کو جب ہوش آیا تو اس نے خود کو ایک غار میں پایا۔ وہ ایک بستر پر لیٹی ہوئی تھی، بشرطیکہ اسے بستر کہا جا سکتا۔ وہ بے شمار پتوں اور پھولوں کا ایک ڈھیر تھا جس کو چھ فٹ کی لمبائی اور چار فٹ کی چوڑائی میں ہموار انداز سے ایک چبوترے پر پھیلایا گیا تھا۔

عالیہ کے پیروں میں جوتے اور موزے نہیں تھے۔ حتیٰ کہ جسم پر گرم لباس بھی نہیں تھا۔ وہ صرف زیریں لباس میں تھی لیکن اسے سردی یوں نہیں محسوس ہو رہی تھی کہ غار کے وسط میں ایک الاؤ دہک رہا تھا۔ اس الاؤ کے قریب ٹن کا ایک بڑا سا ڈبا رکھا ہوا تھا جو خاصا زنگ آلود تھا۔ ایک کونے میں مشعل بھی جل رہی تھی لیکن وہ ویسی مشعل نہیں تھی جیسی مہذب دنیا کے لوگ اب خاص خاص موقعوں پر بنانے لگے ہیں۔ ادھر اُدھر پھیلی ہوئی سڑی ہوئی ہڈیوں سے بو اٹھ رہی تھی۔ یہ مختلف جانوروں کی ہڈیاں معلوم ہو رہی تھیں۔

عالیہ لیٹے لیٹے یہ سب کچھ دیکھتی بھی رہی اور سوچتی بھی رہی کہ وہ کہاں تھی اور کہاں آ گئی ہے۔ آہستہ آہستہ جب اس کے حواس پوری طرح بحال ہو گئے تو وہ دھیرے سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس وقت ذہن میں آنے والے ایک خیال نے اس کی روح کو لرزا دیا۔ یہ غار... کیا یہ برفانی عورت کا مسکن ہے؟

اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ اس نے غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔ دہانے کے آگے چند گز کے فاصلے پر ایک چٹان نظر آ رہی تھی۔

اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ وہ جلدی جلدی اپنا لباس پہننے لگی جو ایک طرف پڑا تھا۔ اس نے موزے اور جوتے بھی پہن لیے۔ اب اسے احساس ہوا کہ اسے گرمی لگنے لگی ہے۔ اس نے سوچا کہ ٹن میں بھرے ہوئے پانی سے

آدھا الاؤ بجھا دے یا کم از کم اپنا ریڈیر کا کوٹ اتار دے۔

اچانک اسے پھر خیال آیا کہ اگر وہ برفانی عورت ہی اسے یہاں لائی ہے تو کیوں اور کس ارادے سے؟

عالیہ کو وہ قیامت خیز طوفان بھی یاد آیا۔ وہ سب رسّے سے بندھے ہوئے ادھر سے اُدھر لڑھکتے پھر رہے تھے کہ اچانک اس نے محسوس کیا کہ اس کے دائیں جانب کا رسّا ٹوٹ گیا ہے۔ پھر فوراً ہی بائیں جانب کا رسّا ٹوٹا اور وہ تیزی سے ایک طرف لڑھکتی ہوئی ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتی چلی گئی۔ رسّے کا وہ ٹکڑا جس سے اس کی کمر بندھی ہوئی تھی، اس کے لباس کے قریب ہی پڑا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر دیکھا اور اس کے دونوں سروں پر نظر ڈال کر اس کا منہ تعجب سے کھل گیا۔ دونوں جانب سے رسّے ٹوٹے نہیں تھے بلکہ کاٹے گئے تھے۔

مگر کاٹنے والا کون ہو سکتا ہے؟

کیا وہ برفانی عورت؟

اوہ! مگر کیوں؟ برفانی عورت کو اس سے کیا سروکار؟ خیمے کا پردہ پھاڑ کر بھی وہ صرف اسی کو گھور رہی تھی۔ پھر جب وہ چٹان پر نظر آئی تھی، تب بھی اسی کو گھور رہی تھی۔ شاید اس کا سبب یہ ہو کہ اس نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی ہم جنس دیکھی ہو اسی لیے وہ عالیہ کو اغوا بھی کر لائی تھی۔ یہاں لا کر اس نے عالیہ کا لباس اتارا تھا۔ وہ مکمل اطمینان چاہتی ہوگی کہ عالیہ کا تعلق اسی کے ''قبیل'' سے ہے لیکن اس وقت اس نے یہ بھی محسوس کیا ہوگا کہ بے ہوش ہونے کے باوجود عالیہ کے جسم پر سردی سے کپکپی طاری ہو گئی ہوگی۔ اسی کپکپی کو ختم کرنے کے لیے اس نے غار میں الاؤ دہکایا تھا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی تھی کہ وہ عورت تھوڑی سی سوجھ بوجھ ضرور رکھتی ہے۔

عالیہ آہستگی سے اٹھی اور پانی کے ٹن کے قریب گئی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ یہ ٹن برفانی عورت کے پاس کہاں سے آ سکتا ہے؟ شاید اوپر آنے والے کچھ شکاری اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے اس قسم کی چیزیں یہیں پھینک جاتے ہوں گے۔ اس نے ٹن اٹھا کر الاؤ پر دھیرے دھیرے پانی پھینکنا شروع کیا۔ وہ الاؤ کو مکمل طور پر نہیں بجھانا چاہتی تھی۔ اسی وقت ایک عجیب سی آواز گونجی۔ ''آ... غر...''

ٹن، عالیہ کے ہاتھ سے چھوٹ کر الاؤ پر جا گرا اور پھر اس نے پلٹ کر دیکھا تو چند لمحوں کے لیے سن ہو کر رہ گئی۔

پہلی مرتبہ وہ برفانی عورت کو چند گز کے فاصلے پر اپنے سامنے کھڑا دیکھ رہی تھی۔ پتوں اور چھال سے نیم ستر پوش وہ عورت غار کے دہانے پر قدرے جھکی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں درندوں کی آنکھوں کی طرح وحشیانہ انداز میں چمک رہی تھیں۔ جسم کے کھلے ہوئے حصوں پر میل کی تہیں تھیں جن میں کہیں کہیں سے جلد کا اصل رنگ بھی جھانک رہا تھا جو بڑی حد تک صاف تھا۔ اس کے بال زیادہ سے زیادہ کمر تک تھے لیکن چوٹیاں باندھی نہ جانے کے باوجود وہ میل سے چکٹ جانے کے باعث چوٹیوں ہی کی طرح جھول رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھوں میں نیزہ یا بلم نما کوئی ہتھیار پکڑ رکھا تھا۔ نیزے میں ایک جانب نوک ہوتی ہے لیکن اس ہتھیار میں نوک کی جگہ کلہاڑی سی نظر آ رہی تھی اور وہ کلہاڑی بھی کسی مضبوط پتھر کو گھس کر بنائی گئی ہوگی۔

عالیہ اتنی خوف زدہ ہو گئی تھی کہ بے اختیار پوری قوت سے چیخ پڑی۔ ''باوا جانی!''

اس کی یہ آواز غار میں کوئی آدھے منٹ تک گونجتی رہی۔ الاؤ کوئی تین چوتھائی کے قریب بجھ چکا تھا، اس لیے اب غار میں روشنی بھی بہت کم ہو گئی تھی۔

برفانی عورت آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی اور عالیہ خوف زدگی کے عالم میں اس طرف ہٹنے لگی جدھر پتے وغیرہ بچھے ہوئے تھے۔ برفانی عورت الاؤ کے قریب رک گئی۔ اس نے اِدھر اُدھر بہتے ہوئے پانی کو اپنے پیروں سے الاؤ کی طرف دھکیلا اور الاؤ پوری طرح بجھ گیا۔ اب غار میں صرف مشعل کی روشنی رہ گئی تھی۔ عالیہ بستر پر گر کر کبھی لمبی سانسیں لینے لگی۔ وہ اپنی حفاظت ریوالور سے کر سکتی تھی اور وہ اس تھیلے میں تھا جو اس کی پشت پر بندھا ہوا تھا لیکن اب وہ تھیلا کہیں نظر نہیں آ رہا تھا۔ ظاہر تھا کہ برفانی عورت ہی اس کا تھیلا اٹھا کر کہیں لے گئی ہوگی... مگر کیوں؟

اس کا جواب تو برفانی عورت ہی سے مل سکتا تھا۔ الاؤ بجھا کر وہ آہستہ آہستہ پھر عالیہ کی طرف بڑھنے لگی۔ اب عالیہ کی پیشانی پر پسینا چمکنے لگا۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتی ہوئی اس برفانی عورت کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں تو وحشت تھی لیکن چہرے پر غصہ یا اس سے ملتی جلتی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ عالیہ کے قریب آئی اور آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ پھر اس کے ہونٹ آہستہ آہستہ کھلنے لگے۔

''ہے...'' اس کی کرخت آواز شاید اس کے پیٹ سے نکلی تھی اور اس کی باچھیں تک کھل گئی تھیں۔ شاید وہ مسکرائی تھی لیکن اس کے سیاہی مائل زرد دانت دیکھ کر عالیہ کو گھن آنے لگی۔ اس کا دایاں ہاتھ عالیہ کی طرف بڑھا تو عالیہ کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ برفانی عورت نے اپنا وہ ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیا اور پھر آہستہ آہستہ گال تک لے آئی۔ وہ

دھیرے دھیرے عالیہ کا گال سہلانے لگی۔ اس کا ہاتھ اتنا کھردرا اور سخت تھا کہ عالیہ کے چہرے کی جلد میں جلن سی ہونے لگی۔ اچانک اس نے ہاتھ ہٹالیا اور پھر دونوں ہاتھوں کو اس طرح جنبش دی جیسے کوئی سوال کر رہی ہو لیکن اس سوال کو عالیہ کے فرشتے بھی نہیں سمجھ سکتے تھے۔ خدا جانے وہ کیا پوچھ رہی تھی۔ جب عالیہ نے کوئی جواب نہیں دیا تو وہ ''ہیخ... غے... غے... غے...'' کر کے ہنس پڑی۔ اس کا بدبودار تنفس عالیہ کی ناک سے ٹکرایا تو اسے ابکائی آگئی۔ اس نے جلدی سے ایک طرف تھوک دیا ورنہ اسے قے ہوجاتی۔

''ہے!'' برفانی عورت نے کہتے ہوئے اپنے سینے پر ہاتھ مارا۔ ''چاغنی۔'' پھر اس نے عالیہ کے سینے پر ہاتھ مار کر اپنے دونوں ہاتھوں کو سوالیہ انداز میں جنبش دی۔

اوہ! عالیہ نے سوچا۔ شاید میرا نام پوچھ رہی ہے اور اپنا نام چاغنی بتا چکی ہے۔ عالیہ کا خوف اب کچھ کم ہوگیا تھا۔ اس نے برفانی عورت کے کندھے پر آہستگی سے ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''چاغنی۔''

''ہیخ... غے... غے...'' وہ اپنے مخصوص انداز میں زور سے ہنسی اور اس کے منہ سے نکلنے والی بدبو سے بچنے کے لیے عالیہ کو اپنی سانس روکنا پڑی۔

جب وہ ہنس چکی تو عالیہ نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''عالیہ۔''

برفانی عورت اسے غور سے دیکھنے لگی۔ عالیہ نے اپنا نام دہرایا۔

''آغ...'' برفانی عورت کے منہ سے کھرکھراتی ہوئی آواز نکلی۔

''لیہ...'' عالیہ نے جلدی سے کہا۔

''لیغہ...'' برفانی عورت نے دہرانے کی کوشش کی۔

''عالیہ...''

''آغ... لیغہ...''

''چلو ٹھیک ہے۔ آغ لیغہ ہی کہہ لو۔'' عالیہ اس طرح ہنسی جیسے کسی کوڑھ مغز طالب علم کو پڑھا رہی ہو۔

اسے ہنستے دیکھ کر برفانی عورت بھی اپنے مخصوص انداز میں ہنسنے لگی اور عالیہ کو اس کے منہ کی بدبو سے بچنے کے لیے پھر سانس روکنا پڑی۔ اس اشاراتی تعارف نے عالیہ کے ذہن کا بوجھ ضرور کچھ کم کر دیا۔ وہ محسوس کرنے لگی کہ برفانی عورت اس کی دشمن نہیں ہے بلکہ شاید دوستی کی خواہش مند ہے۔ اسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے ایک ہاتھ پیٹ پر رکھ کر دوسرے ہاتھ سے نفی کا اشارہ کیا۔ برفانی عورت کے چہرے پر الجھن نظر آئی۔ یہ اشارہ اس کی سمجھ میں نہیں آسکا تھا۔ عالیہ نے کچھ سوچا اور پھر جلدی سے دائیں ہاتھ کی پوروں کو آپس میں ملا کر اپنے منہ تک لے گئی اور دوسرے ہاتھ سے پیٹ تھپتھپایا۔

اب برفانی عورت کی باچھیں کھل گئیں اور اس کے سیاہی مائل زرد دانت صاف دکھائی دینے لگے۔ شاید اس مرتبہ وہ عالیہ کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔ اس نے تصدیق کے لیے عالیہ کی حرکت دہرائی۔ اس وقت عالیہ نے غور کیا کہ اس کے ہاتھ کے پانچوں ناخن غیر معمولی طور پر لمبے تھے لیکن کہیں سے مڑے نہیں تھے۔ یقیناً وہ بلا کے مضبوط اور تیز بھی ہوں گے۔ اس نے برفانی عورت کے اشارے کے جواب میں اپنے سر کو اثباتی جنبش دی۔ برفانی عورت نے اپنا ہتھیار سنبھالا اور اچھل کے کھڑی ہوگئی۔ پھر ایک ہاتھ سے عالیہ کو وہیں رکنے کا اشارہ کرتی ہوئی غار کے دہانے کی طرف بڑھی۔ اس کے چلنے کا انداز زقندیں بھرنے کا سا تھا۔

عالیہ یہ یقین تو کر چکی تھی کہ برفانی عورت اسے کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں تھا کہ وہ اپنی بقیہ زندگی اب اسی عورت کے ساتھ ان پہاڑوں میں گزار دیتی۔ اسے کئی مرتبہ خیال آچکا تھا کہ ارسلان اور خان داراب اسے کھوکر کتنے بے قرار ہوں گے۔ اسے کسی نہ کسی طرح ان لوگوں تک پہنچنے کی کوشش کرنا ہی ہوگی۔ وہ اٹھ کے غار کے دہانے کی طرف بڑھی۔ دہانے کے سامنے کی چٹان ستر اسی فٹ سے کم نہیں ہوگی۔ اس کے اور غار کے بیچ میں ایک دراڑ تھی لیکن اندھیرے کی وجہ سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ دائیں یا بائیں جانب کتنی دور تک گئی ہوئی تھی۔

صبح کا انتظار کرنا ضروری ہے، عالیہ سوچتی ہوئی اپنے پتوں کے بستر کی طرف لوٹ آئی۔ برفانی عورت سے اپنے فرار کو لاعلم رکھنا ضروری تھا۔ برفانی عورت اسے اغوا کر کے اس لیے نہیں لائی تھی کہ اسے آسانی سے چلے جانے دیتی۔ کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ دراڑ میں دھما کا ہوا۔ غالباً کوئی اوپر سے کودا تھا۔ وہی برفانی عورت ہوگی، عالیہ نے سوچا اور بیٹھی رہی لیکن اس وقت وہ اچھل پڑی جب اس نے غار کے دہانے پر سات آٹھ فٹ کا برفانی ریچھ کھڑا ہوا دیکھا۔ وہ اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ برفانی ریچھ نے دانت نکالے۔ وہ ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھ کر بے حد خوش نظر آنے لگا تھا۔

''چاغنی!'' عالیہ نے پوری طاقت سے برفانی عورت

کو پکارا اور اس کی آواز غار میں گونجنے لگی۔

جھومتا ہوا ریچھ دونوں ہاتھ پھیلائے اس کی طرف بڑھ رہا تھا اور عالیہ فیصلہ کرنے سے قاصر تھی کہ کس طرح اس موذی کو دھوکا دے کر غار سے نکلنے کی کوشش کرے۔ لیکن اسے زیادہ دیر تک پریشان نہیں ہونا پڑا۔ دفعتاً ریچھ کی بھیانک چیخ سے غار گونج اٹھا تھا۔ اس کی پشت چاغنی کے بھالا نما ہتھیار کی زد میں آئی تھی اور عالیہ نے چاغنی کو غار کے دہانے پر کھڑا ہوا دیکھا تھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات اس وقت بڑے بھیانک تھے۔ ریچھ ڈکراتا ہوا مڑا۔ اب عالیہ اس کی پیٹھ میں پیوست بھالے کو صاف دیکھ رہی تھی اور ریچھ کے سیاہ بالوں میں خون بھی پھیلتا جا رہا تھا۔

ریچھ کے قدم ڈگمگا رہے تھے لیکن وہ خوفناک انداز میں چیختا ہوا چاغنی کی طرف بڑھ رہا تھا لیکن چاغنی نے اس کے قریب آنے کا انتظار کرنے کے بجائے خود ہی اس پر جست لگائی۔ ریچھ اس کی ٹکر سے گر پڑا۔ یقیناً بلا کی طاقت تھی چاغنی میں۔ دوسرے ہی لمحے اس کا دایاں ہاتھ ریچھ کی گردن پر پڑا۔ اس کے ناخنوں نے تیز دھار آلے کا کام کیا۔ ریچھ کی گردن ادھڑ گئی اور چاغنی کی انگلیاں اس میں اترتی چلی گئیں۔ گردن کے مختلف حصوں سے خون کے فوارے ابلنے لگے۔ ریچھ کی کرب ناک چیخوں سے غار گونج اٹھا۔

عالیہ دم بہ خود کھڑی، ریچھ کو بے بسی سے ہاتھ پیر مارتے دیکھتی رہی۔ ذرا ہی دیر میں ریچھ دم توڑ چکا تھا۔

☆☆☆

جب طوفان آیا تو غیر ملکی پارٹی ایک پتلی سی دراڑ میں چل رہی تھی۔ اس دراڑ کی چوڑائی مشکل سے پانچ چھ فٹ ہو گی۔ ایسی پھنسی ہوئی جگہ میں وہ طوفان ان سب کی ہلاکت کا سامان بن جاتا مگر یہ ان کی خوش قسمتی تھی کہ انہیں عین وقت پر ایک غار مل گیا اور وہ سب جلدی جلدی اس میں گھس پڑے۔ بیک وقت کئی آدمیوں نے ٹارچیں بھی جلالیں اور جو منظر انہوں نے دیکھا، وہ ان کے لیے نہ صرف غیر متوقع اور تعجب خیز بلکہ ایک اعتبار سے خوف ناک بھی تھا۔

وہاں ایسی چیزیں تھیں جیسے ماضی میں وہ غار کسی کا مسکن رہا ہو یا اب بھی ہے۔ درخت کی چھالوں اور پتوں کا ایک بستر سا بنا ہوا تھا۔ ٹوٹے پھوٹے سے کچھ برتن بھی نظر آرہے تھے۔ ایک بجھی ہوئی مشعل بھی ملی تھی جس کے قریب ہی ایک پیالے میں کوئی مائع شے بھری ہوئی تھی۔ پیٹر وویچ نے اس مائع میں انگلی ڈالی اور نکالی تو محسوس کیا کہ وہ تیل کی قسم کی کوئی چکنی چیز ہے۔ پیٹر وویچ نے اسے سونگھ کر دیکھا۔

فرق صاف ظاہر ہے!

○ ماں اور بیوی میں کیا فرق ہے؟

☆ ماں لوری سناتی ہے جبکہ بیوی صلواتیں۔

○ شوہر اور کنوارے میں فرق؟

☆ وہی جو ایک جیل کے قیدی اور ایک آزاد انسان میں ہوتا ہے۔

○ لڑکی اور عورت میں کیا فرق ہے؟

☆ کوئی فرق نہیں... دونوں ہی عمر چھپاتی ہیں، دونوں ہی میک اَپ کرتی ہیں۔ ہاں بیویاں پارٹ ٹائم جاب بھی کرتی ہیں اپنے شوہروں کی جیبوں پر ہاتھ صاف کر کے۔

○ طالب علم اور طالب فلم میں کیا فرق ہے؟

☆ طالب علم، علم کے علاوہ بہت سی چیزوں کا طالب ہوتا ہے جیسے موبائل فیور (بخار)، لڑکیاں پھنسانا، فلرٹ کرنا، اسٹیٹس سمبل کے طور پر سگریٹ پینا وغیرہ وغیرہ جبکہ ''طالب فلم'' بے چارہ صرف فلم کا ہی طالب ہوتا ہے۔

○ میک اَپ کرنے کے بعد خواتین کے چہروں میں کیا تبدیلی آتی ہے؟

☆ یہی کہ انہیں سب آسانی سے پہچان لیتے ہیں۔

○ یونیورسٹی لیول تک پہنچتے پہنچتے لڑکوں اور لڑکیوں میں کیا کیا تبدیلیاں آتی ہیں؟

☆ لڑکیاں میک اَپ کرنے میں ''اسپیشلائزڈ'' ہو چکی ہوتی ہیں جبکہ لڑکے بابے، بڈھے اور انکل وغیرہ ہو چکے ہوتے ہیں۔

(ثمینہ حبیب کی سوغات مری آباد۔ کوئٹہ)

وہ اس کے لیے ایک نامانوس بو تھی۔ کچھ سوچ کر اس نے مشعل کو پیالے میں ڈبویا اور اسے ماچس کی تیلی دکھا دی۔ مشعل کی تیز روشنی میں اب غار کا ایک ایک گوشہ نظر آنے لگا اور اس طرح بھیانک ماحول مزید واضح ہوگیا۔ اس ماحول کو بھیانک بنانے والی صرف ایک شے تھی۔ کھوپڑی سمیت ایک انسانی پنجر!

''اوہ!'' کسی کے منہ سے نکلا۔ ''یہ کسی مرد کا ڈھانچا ہے یا کسی عورت کا۔''

''کم از کم میں تو اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔''

وہ سب اس انسانی ڈھانچے کی باتیں کر رہے تھے لیکن پیٹر وویچ کی نظر ایک نہایت خستہ صندوق پر جمی ہوئی تھی

اور وہ اسی کی طرف بڑھ رہا تھا۔

پیٹرووچ کی آنکھیں چمک اٹھیں جب اس نے صندوق کھولا۔ صندوق میں کتابیں بھری ہوئی تھیں جو بڑی حد تک خستہ ہو چکی تھیں۔ پیٹرووچ ایک ایک کتاب اٹھا کر بڑی احتیاط سے ان کے اوراق الٹنے پلٹنے لگا۔ وہ سب کی سب کتابیں کسی سائنس داں کی معلوم ہو رہی تھیں۔ پیٹرووچ کے لیے یہ بات بڑی حیرت انگیز اور سنسنی خیز تھی کہ یہ غار کسی سائنس داں کا مسکن رہا تھا۔

''یہ کیسی کتابیں ہیں ڈاکٹر؟'' ساتھیوں میں سے کسی نے پوچھا۔

''یہ کتابیں کسی سائنس داں ہی کی ہو سکتی ہیں۔'' پیٹرووچ نے بڑبڑانے والے انداز میں کہا۔

''اور غالباً اسے مرے ہوئے بھی کافی دن ہو چکے ہیں۔'' بولنے والے نے ڈھانچے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''کیوں؟''

''انسانی جسم کو ڈھانچا بننے میں کافی عرصہ لگتا ہے جبکہ یہاں پتوں وغیرہ سے جو بستر بنایا گیا ہے، وہ زیادہ پرانا نہیں معلوم ہوتا۔''

''اوہ! تو یہ غار کہیں اسی برفانی عورت کا مسکن نہ ہو۔''

''ابھی میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میرا ذہن خاصا الجھ گیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم لوگ اب کھانے وغیرہ کی تیاری کرو۔ ایک آدمی کو غار کے دہانے پر پہرا دینے کے لیے بھی مامور کر دو۔ میں اس دوران میں صندوق کی ساری کتابیں نکال کر دیکھنا چاہتا ہوں۔ شاید ان کتابوں میں کہیں کچھ کاغذات بھی دبے دبائے پڑے ہوں۔ اگر وہ مل گئے تو ان سے صورتِ حال کو سمجھنے میں خاصی مدد ملے گی۔''

''آپ سوچ تو صحیح رہے ہیں۔''

''بس تو پھر تم لوگ مجھے سکون سے کام کرنے دو۔''

وہ آدمی سر ہلا کر پیٹرووچ کے قریب سے ہٹ گیا۔

باہر طوفان اب بھی گرج رہا تھا۔ تو دوں کے لڑھکنے کے شور میں کوئی اور بیرونی آواز سنائی نہیں دے سکتی تھی۔

وہ سب لوگ اپنا اپنا سامان ٹھیک طرح سے رکھنے لگے۔ کھانے کی تیاری بھی شروع کی گئی۔ لکڑیوں کا ایک گٹھر ہمہ وقت ان کے ساتھ رہتا تھا تاکہ جب بھی الاؤ جلانے کی ضرورت محسوس ہو، انہیں لکڑیوں کی تلاش میں مارا مارا نہ پھرنا پڑے۔ ایک آدمی کو غار کے چھوٹے سے دہانے پر متعین کر دیا گیا۔ وہ دہانہ اتنا چھوٹا تھا کہ باہر سے کوئی کھوہ معلوم ہوتا تھا۔ باہر سے دیکھنے والے تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ وہ چھوٹا سا دہانہ ایک وسیع غار کا ہے۔

پیٹرووچ بڑے انہماک سے صندوق کی کتابیں نکال نکال کر ان پر اچٹتی ہوئی نظر ڈالتا اور ایک طرف رکھتا جاتا۔ آخر اسے ایک ایسی چیز مل ہی گئی کہ اس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

وہ ایک ڈائری تھی۔ اس کے ابتدائی صفحات الٹنے پلٹنے سے معلوم ہوا کہ وہ ڈائری پروفیسر ایلکانڈر نام کے ایک آدمی کی تھی اور وہ گرین لینڈ کا باشندہ تھا۔

ڈائری کے اندرونی صفحات ہاتھ کے لکھے ہوئے تھے۔ پیٹرووچ نے فیصلہ کیا کہ وہ ڈائری کے مندرجات کو اطمینان سے لیٹ کر پڑھے گا۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ کوئی اہم راز پانے والا ہے۔ اس نے اپنا شب خوابی کا تھیلا نکال کر اس طرح بچھایا کہ اس کا سر، مشعل کی طرف رہے۔ اس نے تھیلے میں لیٹنے کے بعد اس کی زپ سینے تک کھینچ لی۔ اس کے دونوں ہاتھ باہر تھے۔ باقی سب لوگ کسی نہ کسی کام میں مصروف تھے۔ اس نے ایلکانڈر کی ڈائری پڑھنا شروع کی۔ پہلے ہی صفحے کے اندراجات ایسے تھے کہ پیٹرووچ کا انہماک بڑھ گیا۔ جیسے جیسے وہ آگے بڑھتا رہا، اس کی دلچسپی بڑھتی ہی چلی گئی۔ پھر وہ اس وقت چونکا جب کسی نے اعلان کیا کہ کھانا تیار ہے۔

کھانے کے دوران میں پیٹرووچ خیالات میں ڈوبا رہا تھا۔ اس کا ایک ساتھی بول پڑا۔ ''کیا کوئی خاص بات معلوم ہو رہی ہے ڈاکٹر؟''

''ہاں۔'' پیٹرووچ نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اس کتاب سے خاصے سنسنی خیز انکشافات ہوں گے۔''

''یہ کس قسم کی کتاب ہے؟''

''کسی ڈاکٹر ایلکانڈر کی ڈائری ہے۔''

''اوہ! تو پھر یہ خیال درست ہی ثابت ہوا نا کہ یہ غار کسی مہذب آدمی کا مسکن رہا ہے۔''

''ہوں۔''

''اب تک آپ نے کیا کیا پڑھا ہے؟''

''پوری ڈائری پڑھنے کے بعد سب کچھ بتاؤں گا۔''

پیٹرووچ اس گروپ کا لیڈر تھا اس لیے کوئی بھی اصرار نہیں کر سکا کہ پیٹرووچ نے اب تک جو کچھ پڑھا ہے، وہی بتا دے۔ کھانے کے بعد پیٹرووچ پھر اپنے تھیلے میں پہنچ گیا اور

ڈائری وہیں سے پڑھنا شروع کی جہاں سے چھوڑی تھی۔ برف کے تودے لڑھکنے کا شور نہ جانے کب بند ہو چکا تھا۔ پیٹرووچ کو اپنے انہماک میں اس کا احساس ہی نہیں ہو سکا۔

''اب تم سب لوگ سو جاؤ۔'' پیٹرووچ نے ان سے کہا۔ ''میں نے ریوالور اپنے ہاتھ کے پاس رکھ لیا ہے۔ اگر کوئی خطرہ ہوا تو میں ایک فائر کر دوں گا اور تم سب جاگ جاؤ گے۔ بس اپنا اپنا اسلحہ قریب ہی رکھو۔''

ان سب نے پیٹرووچ کی ہدایات پر عمل کیا اور شب خوابی کے تھیلوں میں لیٹ گئے۔ بعض نے زپ سر تک کھینچ لی اور بعض نے صرف منہ کھلے رہنے دیے۔ پیٹرووچ ڈائری پڑھتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ اسے پڑھنے میں رات تو گزر ہی جائے گی۔ ریوالور اس کے دائیں ہاتھ کے قریب رکھا ہوا تھا لیکن اس کے استعمال کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ صبح قریب تھی جب پیٹرووچ نے ڈائری کا آخری صفحہ پڑھا اور ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کر لیں لیکن پھر جلدی سے کھول بھی دیں۔ اسے ایک لمحے کے لیے بھی غار کے دہانے کی طرف سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے تھا۔

ڈائری سے جو انکشافات ہوئے تھے، ان کے مطابق گرین لینڈ کے ڈاکٹر ایلکانڈر کو برفانی انسان سے بہت دلچسپی تھی۔ وہ اس کے بارے میں تحقیقات کر رہا تھا۔ کئی برفانی علاقے بھی اس نے چھان مارے تھے اور اس جنون میں وہ کچھ خبطی ہو گیا تھا۔ ڈائری میں لکھے ہوئے بعض جملے اس کے غماز تھے۔ وہ خود کو ایک برفانی انسان سمجھنے لگا تھا جس کے آباؤ اجداد کو امریکی، کوہِ ہمالیہ سے پکڑ لائے تھے اور پھر ان کو تربیت دے کر مہذب انسان بنا لیا تھا۔

ڈائری میں اس بات کی وضاحت نہیں تھی کہ ڈاکٹر کے ذہن میں اس خیال نے جڑ کیوں پکڑی؟ لیکن اس کا جنون بڑھتا ہی چلا گیا اور وہ سوچنے لگا کہ واپس اپنے وطن، یعنی کسی برف پوش پہاڑ پر چلا جائے اور کسی طرح اپنی نسل کو بھی آگے بڑھائے۔ اس نے اب تک مجرد زندگی گزاری تھی، ورنہ شاید وہ اپنی بیوی ہی کو لے کر کسی پہاڑ پر چلا جاتا۔ اسی دوران میں کسی میگزین کے ذریعے اسے معلوم ہوا کہ ایک ایشیائی سائنس داں عالم گردیزی بھی برفانی آدمی کے بارے میں تحقیق کر رہا ہے۔

ڈاکٹر ایلکانڈر فوراً اپنے ملک سے روانہ ہوا اور جا کے عالم گردیزی سے ملا۔ گردیزی بھی جنون کی حد تک برفانی انسان کے خبط میں مبتلا تھا اور اس کی خوب صورت بیوی سیما اس کی بے توجہی سے عاجز رہتی تھی۔ اولاد سے وہ دونوں محروم تھے۔

گردیزی کو ایلکانڈر سے مل کر اس لیے خوشی ہوئی تھی کہ اب وہ ایک ہی مشن کے لیے ایک سے دو ہو گئے تھے۔ کچھ دن گزرنے کے بعد جب وہ کچھ بے تکلف ہو گئے تو ایلکانڈر نے اس کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر اس کے ہمراہ وادی کے پہاڑوں پر چلے۔ سیما پر ٹیسٹ ٹیوب بے بی کا تجربہ کیا جائے اور کامیابی کی صورت میں ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی تربیت اس طرح کی جائے کہ وہ خود کو برفانی انسانوں کی اولاد سمجھنے لگے۔

گردیزی کو یہ بات نہ صرف ناگوار گزری بلکہ وہ ایلکانڈر سے کچھ برگشتہ ہو گیا لیکن ایک میزبان ہونے کے ناتے اس نے کسی شدید ردِعمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بس اتنا ہوا کہ اس نے ایلکانڈر سے اس موضوع پر گفتگو کرنا بالکل چھوڑ دی۔

اب ایلکانڈر کے دماغ میں کچھ اور کیڑے رینگنے لگے۔ وہ چرب زبان اور خوش شکل شخص تھا، اس لیے سیما اس سے متاثر تھی۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ وہ اپنے شوہر کی عدم توجہی کا شکار تھی لیکن ایلکانڈر جانتا تھا کہ بات صرف مصروفیت کی ہے ورنہ گردیزی کو اپنی بیوی سے بہت محبت ہے۔

ایلکانڈر نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور سیما کو ورغلانے لگا۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں تھا لہٰذا جب ایلکانڈر نے اس سے کہا کہ وہ اس کے ساتھ یہاں سے اس طرح غائب ہو جائے کہ گردیزی کو ان کا سراغ ہی نہ مل سکے تو رضامند ہونے کے باوجود وہ کچھ گھبرا گئی۔ اس نے کہا کہ پہلے وہ گردیزی سے طلاق تو لے لے۔ لیکن ایلکانڈر نے مختلف تاویلیں دے کر سیما کو ڈرا دیا کہ وہ طلاق لینے میں کامیاب نہیں ہو سکی تو پھر گردیزی کا رویہ اس کے ساتھ سخت ہو جائے گا۔

دراصل ایلکانڈر کو یقین تھا کہ گردیزی اپنی بیوی کو ہرگز طلاق نہیں دے گا، لہٰذا اس نے اس کی نوبت نہیں آنے دی اور سیما کو شیشے میں اتار لیا۔ جب وہ آمادہ ہو گئی تو ایلکانڈر نے بڑی عجلت میں ساری تیاریاں کیں اور ایک مناسب وقت دیکھ کر سیما کو لے کر کافرستان کی طرف فرار ہو گیا۔ اس نے سیما کو اپنے ارادے سے بے خبر رکھتے ہوئے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ ایک آدھ سال تک ان پہاڑوں میں چھپے رہیں تو گردیزی یا پولیس انہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک کے بیٹھ جائیں گے اور پھر وہ دونوں کسی دوسرے ملک میں جا کر آرام

کی زندگی گزاریں گے۔ چند مقامی کارندوں کو بھی ساتھ لیا گیا تھا اور ان سے یہ بات کی گئی تھی کہ وہ یہاں شکار کھیلنے کی غرض سے آئے ہیں۔ اس غار کو ایلکانڈر نے اپنا مسکن بنایا تھا اور مزدوروں کا خیمہ چٹان کے اوپر رہتا تھا۔

جب سیما کو معلوم ہوا کہ ایلکانڈر اسے ایک ٹیسٹ ٹیوب بے بی کی ماں بنانا چاہتا ہے تو اس نے احتجاج کیا لیکن ایلکانڈر نے اسے کسی طرح رام کر ہی لیا۔ شاید سیما نے یہ بھی سوچا ہو کہ اب اسے ایلکانڈر ہی کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو خوش رکھیں گے، تب ہی بات بنے گی۔ لیکن وہ اس بات سے بے خبر تھی کہ ایلکانڈر اس کی ٹیسٹ ٹیوب بے بی کو برفانی عورت بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔

اس دن ایلکانڈر کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا جب اس کا وہ تجربہ کامیاب ہو گیا۔ ٹیسٹ ٹیوب بے بی وجود میں آ گئی لیکن سیما اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ ایلکانڈر کو اس کی موت کا ذرا بھی ملال نہیں ہوا لیکن یہ دشواری ضرور پیش آئی کہ اسے پہلے ہی دن سے اس بچی کی پرورش کا بوجھ اٹھانا پڑ گیا۔ اس نے سب سے پہلا کام تو یہ کیا کہ اپنے مزدوروں کو گولیاں مار کر ان کی لاشیں گہری کھائیوں میں پھینک دیں تا کہ اس برف پوش پہاڑ پر ایک نومولود لڑکی کا راز ان مزدوروں کے ذریعے دوسروں تک نہ پہنچ سکے۔ اس کے بعد وہ لڑکی کی پرورش میں لگ گیا۔ اس نے خود پر دودھ گویا حرام کر لیا اور اس کا سارا ذخیرہ لڑکی کے لیے وقف کر دیا تا کہ اسے پانچ چھ ماہ کے لیے فکر نہ رہے۔

پھر اس نے ماحول کی تبدیلی کو اولیت دی تا کہ بچی طبعاً اس کی مرضی کے مطابق بن جائے۔ اس نے اپنے سارے لباس ضائع کر دیے اور اپنی ستر پوشی کے لیے درختوں کی چھالیں اور پتے استعمال کیے۔ لڑکی کو بھی پتوں کے ڈھیر میں لپیٹ کر رکھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ چونکہ اس برفانی فضا میں پیدا ہوئی ہے، اس پر یہاں کی سردی کا اثر نہیں ہوگا تاہم ابتدائی کچھ عرصے تک اس نے لڑکی کے قریب ایک چھوٹا سا الاؤ دہکائے رکھا۔

دواؤں کا ذخیرہ اس نے بڑی احتیاط سے رکھا تھا کہ لڑکی کو کسی وقت بھی کسی دوا کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ اسے خود ہی کچھ دواؤں کی ضرورت پڑ گئی۔ ہر چند کہ وہ ایک سرد علاقے کا رہنے والا تھا لیکن وہاں اپنے جسم پر پتے نہیں باندھا کرتا تھا جو سردی سے بچا نہ سکتے تھے۔

لڑکی کا نام اس نے چاغنی رکھا تھا۔ اس کی دیکھ بھال کے علاوہ سارا وقت وہ ایسے ہتھیار بنانے میں لگا رہتا جو پتھر کے زمانے کے آدمی استعمال کرتے تھے۔ ایک ہتھیار چھ سات سال کے اور ایک دس بارہ سال کے بچے کے لیے بھی بنایا۔

جب بچی چھ ماہ کی ہو گئی اور قلقاریاں لگانے لگی تو ایلکانڈر اس سے ایسی زبان میں بات کرنے لگا جو خود اس کی سمجھ میں بھی نہیں آتی تھی۔ وہ کئی زبانوں کا ملغوبہ تھا اور اسے یقین تھا کہ جب چاغنی بڑی ہو گی تو یہ ''زبان'' خود بہ خود ڈیولپ ہو جائے گی۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اسی زبان میں باتیں کیا کریں گے۔

ایلکانڈر نے جنگلی پھل، زیادہ سے زیادہ مقدار میں کھانے کی عادت ڈال لی۔ مختلف جانوروں کا شکار کر کے وہ ان کا گوشت بھی اَدھ کچا اَدھ پکا کھانے لگا۔ وہ اس طرح خود کو کچا گوشت کھانے کا عادی بنا رہا تھا۔ کچھ وقت وہ اس طرح بھی گزارتا کہ سیما کے ڈھانچے کا معائنہ کرتا رہتا۔ اس نے کچھ سیال استعمال کر کے سیما کا گوشت چند دن میں گلا دیا تھا اور برف پگھلا کر اس کے پانی سے سارا غار دھو ڈالا تھا تا کہ مُردے کے پگھلے ہوئے گوشت کی بو ختم ہو جائے۔ چاغنی بڑی ہو کر اس ڈھانچے کے بارے میں ضرور پوچھتی، لہٰذا ایلکانڈر نے سوچ لیا تھا کہ وہ کیا جواب دے گا۔ وہ چاغنی کو یہی بتاتا کہ یہ اس کی ماں کا ڈھانچا ہے جو اس کی پیدائش کے وقت مر گئی تھی۔

ایلکانڈر نے یہ پروگرام بھی بنایا تھا کہ چاغنی جب تک ایک سال کی ہو گی، وہ ان تمام اشیا کو ضائع کر دے گا جو مہذب دنیا کے لوگ استعمال کرتے تھے۔ صرف پانی وغیرہ کے لیے اس کو دو ایک کنستر اور چھوٹے موٹے دو ایک برتن بچانا تھے۔ ان کے بارے میں وہ چاغنی سے کہہ سکتا تھا کہ یہ وہ چیزیں ہیں جو نیچے سے اوپر آنے والے دوسری قوم کے لوگ کبھی کبھی یہیں چھوڑ جاتے ہیں۔

احتیاطاً ایلکانڈر نے ایک اسٹین گن اور کارتوسوں کی پیٹی ایک نہایت محفوظ جگہ چھپا دی تھی تا کہ چاغنی کی نظر میں نہ آ سکے۔ کتابوں کو وہ اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا تھا۔ ان کے بارے میں بھی وہ چاغنی سے یہی کہتا کہ یہ بکس دوسری قوم کے لوگ یہاں بھول گئے تھے اور وہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ایلکانڈر وہاں کی سردی کا عادی ہوتا چلا گیا اور چاغنی بھی اس ٹھنڈ میں کسی بیماری میں مبتلا نہیں ہوئی۔

ڈائری کا اختتام اس دن ہوا تھا جب چاغنی چھ ماہ اکیس دن کی ہو چکی تھی۔ اس کے بعد ایلکانڈر نے اگر کچھ لکھا تھا تو وہ پیٹرووِچ کے ہاتھ نہیں لگ سکا۔ بعد کے بارے میں صرف اندازے ہی لگائے جا سکتے تھے اور یہ کوئی زیادہ مشکل کام نہیں تھا۔

غار کے دہانے پر صبح کی ہلکی ہلکی روشنی نظر آنے لگی تھی جب پیٹرووِچ اپنے سونے کے تھیلے سے نکلا اور فضا کا جائزہ لینے کے لیے دہانے کی طرف بڑھا۔ دہانے سے سر نکال کر اس نے اوپر دیکھا اور یکا یک اپنی سانس رکتی محسوس کی۔ سامنے کی چٹان کے اوپر ایک برفانی آدمی لنگڑاتا نظر آیا اور پیٹرووِچ کے اندازے کے مطابق وہ آدمی ایلکانڈر ہی ہو سکتا تھا۔ اس کی لڑکھڑاہٹ سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ پیٹرووِچ کی چلائی ہوئی گولی، برفانی عورت کو نہیں بلکہ ایلکانڈر کو لگی تھی۔ زیادہ درمیانی فاصلہ ہونے کی وجہ سے وہ اندازہ نہیں لگا سکے تھے کہ انہوں نے کسی مرد پر گولی چلائی تھی۔ ویسے ان کے ذہن میں بھی عورت بسی ہوئی تھی۔

چٹان کے کنارے ایک بہت بڑا برفانی تودہ نظر آ رہا تھا اور برفانی آدمی کوشش کر رہا تھا کہ اس تودے کو دراڑ میں گرا دے۔ غالباً اس نے پیٹرووِچ اور دوسروں کو دیکھ لیا تھا اور اب تودے کو دراڑ میں گرا کر اس سے غار کا دہانہ بند کر دینا چاہتا تھا۔

پیٹرووِچ نے چیخ کر اپنے ساتھیوں کو اٹھایا اور بولا۔ ''جلدی سے نکل چلو یہاں سے، ورنہ ہم زندہ درگور ہو جائیں گے۔''

مگر اس سے پہلے کہ ان میں سے کوئی حرکت میں آتا، دراڑ میں ایک دھماکا ہوا۔ گرنے والا تودہ کئی ٹکڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ان میں سے ایک ٹکڑا غار کے دہانے پر آ کر جم گیا۔

''شامت!'' پیٹرووِچ دانت پر دانت جما کر بولا۔ ''اب غار میں موجود آکسیجن ختم ہوتے ہی ہم سب موت کی آغوش میں پہنچ جائیں گے۔''

پیٹرووِچ کا یہ اعلان سنتے ہی اس کے ساتھیوں کے جسم میں بجلیاں سی بھر گئیں۔ وہ سلاخیں اور چھریاں لے کر اس برفانی تودے پر اس طرح ٹوٹ پڑے جیسے اپنے کسی جانی دشمن کے جسم کا قیمہ قیمہ کر دینا چاہتے ہوں۔ لیکن جلد ہی انہیں اندازہ ہو گیا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں۔ برفانی تودہ کسی پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے ٹکڑے ٹوٹ تو رہے تھے لیکن اس کی رفتار ایسی تھی کہ صورت حال کو امید افزا نہیں کہا جا سکتا تھا۔

کچھ دیر بعد مشعل بجھ گئی۔ شاید غار کی آکسیجن ختم ہو چلی تھی۔ اس کی تصدیق یوں بھی ہوئی کہ اب انہیں اپنی سانسیں گھٹتی ہوئی محسوس ہونے لگی تھیں۔ موت کے خوف کے باعث ان کے جسموں سے پسینا چھوٹ پڑا۔ انہوں نے تودے کو توڑنے کے لیے اپنی کوششیں مزید تیز کر دیں لیکن گھٹتی ہوئی سانسوں کے ساتھ یہ تیزی برقرار نہیں رہ سکتی تھی۔ ذرا دیر میں وہ اس قابل بھی نہ رہے کہ ہاتھ کو معمولی سی جنبش دے سکیں۔ ان کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ دم گھٹنے لگا اور حواس زائل ہونے لگے۔ اب کوئی معجزہ ہی انہیں بچا لیتا تو اور بات ہوتی ورنہ ان کی موت یقینی تھی۔

☆☆☆

جب وہ لوگ عالیہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے تھک گئے تو انہیں ستانے کے لیے رکنا پڑا۔ انہیں ستاتے ہوئے آدھا گھنٹا گزرا ہوگا کہ صبح کے آثار نظر آنے لگے۔ جب سورج کی پہلی کرن پھوٹی تو ارسلان نے خان داراب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ خوش مزاج اور طاقتور بوڑھا بہت مرجھایا ہوا نظر آ رہا تھا۔ آخر عالیہ اس کی اکلوتی بیٹی تھی۔ ارسلان نے اس کی یہ حالت دیکھ کر اپنا نچلا ہونٹ بڑی سختی سے دانتوں میں دبا لیا۔ خود اس کے دل سے بھی ہوک اٹھ رہی تھی۔ اس نے عالیہ کو قلب کی گہرائیوں سے چاہا تھا۔ وہ آہستگی سے اٹھ کر خان داراب کے قریب گیا۔

''باوا جانی!'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ''ابھی اتنے مایوس نہ ہوں کہ سچ مچ بوڑھے نظر آنے لگیں۔ ہم عالیہ کو ضرور ڈھونڈ لیں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ زندہ ہے۔ مجھے ان ہواؤں میں اس کی سانسوں کی بازگشت محسوس ہو رہی ہے۔ ناشتا کر لیجیے تو ہم پھر تلاش شروع کریں۔''

''مجھے بالکل بھوک نہیں ہے بیٹے۔''

''بھوک تو مجھے بھی نہیں ہے لیکن عالیہ کو تلاش کرنے کے لیے ہمیں اپنی توانائی بحال رکھنا ہوگی۔''

''میرا بزرگ بننے کی کوشش مت کر لڑکے! میں کھائے پیے بغیر تین دن تک اپنی ٹانگوں کو متحرک رکھ سکتا ہوں۔ بس تو اپنے ناشتے کی فکر کر۔ ملازمین وغیرہ بھی ناشتا کر لیں۔''

لیکن جب ناشتا تیار ہو گیا تو ارسلان نے خان داراب کو بھی شریک کر ہی لیا۔ اب روشنی ہر طرف پھیل چکی تھی۔ وہ لوگ عالیہ کی تلاش میں روانہ ہونے کے لیے کھڑے ہوئے اور اسی وقت ہوا میں تیزی آ گئی۔

''اوہ!'' خان داراب کے منہ سے نکلا۔ ''ایسی ہی ہوا کل شام کے طوفان سے پہلے چلی تھی۔''

''تو کیا ہم سب رستے کے ذریعے ایک دوسرے سے منسلک ہو جائیں؟'' ارسلان کے لہجے میں تشویش تھی۔

"نہیں، اس غار کی طرف دوڑو جو ہم نے رات کو دیکھا تھا۔"

رات کو عالیہ کی تلاش میں اِدھر اُدھر بھٹکتے ہوئے انہیں ایک غار دکھائی دیا تھا اور اب خان داراب کی دانست میں وہیں پناہ لینا مناسب ہوتا۔ ہوا کی تیزی بڑھتی جارہی تھی۔ وہ سب اس غار کی طرف دوڑ پڑے۔ وہ غار اتنا چھوٹا سا تھا کہ وہ سب پھنس پھنسا کر اس میں بیٹھ سکتے تھے کیونکہ انہیں اپنا سامان بھی وہیں محفوظ کرنا تھا۔

گزشتہ شام کی یاد تازہ ہونے لگی۔ برفانی تودے اِدھر سے اُدھر لڑھکتے ہوئے نظر آنے لگے۔ بعض تودے اونچائی سے نیچے آتے تو ٹکڑے ٹکڑے ہوکر فضا میں روئی کے گالوں کی طرح اڑتے دکھائی دیتے۔ خان داراب وغیرہ نے عینکیں لگالی تھیں۔ برف کے ذرّات سے محفوظ رہنے کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ ہوا اب جیسے چنگھاڑنے لگی تھی۔ اگر وہ لوگ کل کی طرح کھلے میں ہوتے تو پھر ادھر سے اُدھر لڑھکتے پھرتے۔ اس تنگ غار میں وہ ایک جگہ تو رہے۔ بس یہ خوف ہر لمحے رہا کہ کوئی بڑا تودہ انہی کی طرف نہ آگرے۔ یہ طوفان کوئی آدھے گھنٹے تک شدت سے جاری رہا اور پھر ہوا کی شدت میں بتدریج کمی ہوتی چلی گئی۔ تودے گرنے کا اوسط کم ہونے لگا۔ تھوڑی دیر بعد ہوا معمول کے مطابق رہ گئی اور ان لوگوں نے اطمینان کا سانس لیا۔

کچھ دیر بعد وہ اس غار سے نکلے۔ ارسلان نے دوربین آنکھوں سے لگا کر اطراف کا جائزہ لیا اور پھر دفعتاً چیختی ہوئی آواز میں بولا۔

"باوا جانی! ادھر کوئی برف پر ساکت پڑا ہوا ہے۔"

"کدھر؟" خان داراب نے بے چینی سے پوچھا۔

ارسلان نے انگلی سے اشارہ کیا۔ خان داراب نے بھی دوربین آنکھوں سے لگا کر اس سمت کا جائزہ لیا اور پھر بڑبڑایا۔ "ہاں، کوئی ہے تو سہی لیکن وہ عالیہ نہیں معلوم ہوتی۔"

"دیکھنا تو چاہیے۔ اگر وہ عالیہ نہیں ہے تو بھی آخر کون ہے؟"

وہ سب اس طرف بڑھنے لگے۔ ان کے گرد ٹوٹے ہوئے برفانی تودے بکھرے ہوئے تھے۔ وہ سب جلد ہی اس مقام تک پہنچ گئے۔

"اوہ!" ارسلان کے منہ سے نکلا۔

برف پر اوندھا پڑا ہوا وہ شخص شیما تھا۔ اس نے ان کی آہٹ سن کر بھی سر نہیں اٹھایا تو ارسلان جلدی سے جھک کر اس کا جائزہ لینے لگا کہ وہ مر تو نہیں گیا؟ شیما صرف بے ہوش تھا۔ اس کی پیشانی پر چوٹ نظر آرہی تھی جس سے خون رس رہا تھا۔

"یہ اکیلا کیوں ہے؟" ارسلان بڑبڑایا۔ "گردیزی کو بھی تو ہونا چاہیے تھا اس کے ساتھ۔"

"ممکن ہے وہ طوفان میں اس سے بچھڑ گیا ہو۔" خان داراب نے خیال ظاہر کیا۔

ارسلان نے سامان میں سے فرسٹ ایڈ بکس نکالا اور شیما کی پیشانی پر دوا لگا کے پٹی باندھنے کے بعد اسے ہوش میں لانے کی کوشش کرنے لگا۔ اس کوشش میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ شیما نے ہوش میں آنے کے بعد خود کو ان لوگوں کے درمیان پایا تو اس کے چہرے پر اطمینان کے آثار نظر آئے۔

"گردیزی کہاں ہے؟" ارسلان نے اس سے پوچھا۔

"کیا وہ میرے ساتھ نہیں ملا؟" شیما نے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔"

"اوہ!" شیما نے ایک طویل سانس لی۔ "اس کا مطلب ہے کہ وہ طوفان میں مجھ سے بچھڑ گیا۔ کل کے طوفان میں تو ہم کو پناہ گاہ مل گئی تھی لیکن آج صبح ہی صبح ہم وہاں سے چلے تو اس وقت طوفان آیا جب ہم کسی پناہ گاہ کے قریب نہیں تھے۔ ہم نے چاہا تھا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے رہیں لیکن ہوا کے ایک شدید تھپیڑے نے ہمیں جھٹکے کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا کر دیا۔ میں اس کے بعد بھی چلتا رہا لیکن پھر برف کا ایک ٹکڑا میری پیشانی پر اتنی زور سے لگا کہ میرے ہوش وحواس زائل ہوگئے۔"

"اور۔" ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "ادھر ہم عالیہ کو گم کر بیٹھے ہیں۔"

"اوہ، یہ تو بہت بُرا ہوا۔"

"لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اسے تلاش کرلیں گے۔"

"اور شاید گردیزی بھی مل جائے۔"

"مجھے صرف اپنی بیٹی سے دلچسپی ہے۔" خان داراب نے خشک لہجے میں کہا۔

شیما نے خان داراب کی طرف دیکھا لیکن کچھ بولا نہیں۔

"میرا خیال ہے۔" ارسلان بولا۔ "تم زخمی بھی ہو اور اکیلے بھی رہ گئے ہو، اس لیے اب ہمارے ساتھ ہی رہو۔"

بات ختم کرتے ہی ارسلان نے خان داراب کی طرف دیکھا کہ وہ اس کے خلاف نہ بول پڑے لیکن جب خان داراب

خاموش رہا تو ارسلان نے اطمینان کی سانس لی۔

"تم کمزوری تو نہیں محسوس کر رہے؟" ارسلان نے شیما سے پوچھا۔ "میرا مطلب ہے کہ ہمارے ساتھ چل سکتے ہو؟"

"یقیناً۔" شیما کھڑا ہوگیا۔ "میں بالکل کمزوری نہیں محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ لوگ ایک بار پھر چل پڑے۔ خان داراب ذرا الگ تھلگ تھا۔

شیما نے سرگوشی کرنے والے انداز میں ارسلان سے کہا۔ "مجھے تم سے گردیزی کے بارے میں کچھ بات کرنا ہے۔"

"کیا بات؟"

"ذرا خان بزرگ سے دور ہو جاؤ۔"

"ان سے چھپانے والی بات ہے؟"

"نہیں۔" شیما نے کہا۔ "بعد میں تم چاہو تو انہیں بتا دینا۔"

"ہوں۔"

ان دونوں نے اپنی رفتار کچھ کم کی اور خان داراب سے ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ گیا۔

شیما بولا۔ "تم کچھ اندازہ لگا سکتے ہو کہ کیوں برفانی عورت کو دیکھ کر گردیزی نے اسے سیما کے نام سے پکارا تھا اور اس پر جنون کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی؟"

"وہ سب کچھ میں نے دیکھا تو تھا لیکن اس کے بارے میں کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا۔"

اب شیما نے ارسلان کو وہ ساری باتیں بتائیں جو اس کی گردیزی سے ہوئی تھیں۔ اس نے تصویر کے بارے میں بھی بتایا جو گردیزی کے پاس تھی۔

"معنی خیز کہانی ہے۔" ارسلان سوچ میں ڈوب گیا۔

ٹھیک اسی وقت ایسی آوازیں سنائی دیں کہ وہ سب چونک پڑے۔ وہ گولیاں چلنے کی آوازیں تھیں اور یقیناً کسی اسٹین گن سے چلائی گئی تھیں۔

"اوہ، یہ غیر ملکی۔" خان داراب دانت پیس کر بولا۔ "آخر یہ کم بخت اس بے چاری کو ہلاک کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔"

اسٹین گن کا ایک برسٹ چلنے کی آواز سنائی دی۔

"خدا کی قسم۔" خان داراب نے اپنی رفتار تیز کرتے ہوئے بڑے غصے سے کہا۔ "میں ان سب کو مار ڈالوں گا اگر وہ اس بے چاری کو ہلاک کر چکے ہیں۔"

وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ انہیں اس سمت کا اندازہ تو ہوگیا تھا جدھر سے گولیاں چلائی گئی تھیں لیکن درمیانی فاصلے کا اندازہ لگانا مشکل تھا۔

☆☆☆

گزشتہ رات چاغنی نے ریچھ کی لاش غار کے باہر لے جاکر پھینک دی تھی۔ واپسی پر اس کا خون آلود بھالا بھی اس کے ہاتھ میں تھا اور اس کی مخصوص مکروہ مسکراہٹ ہونٹوں پر تھی۔ سیاہی مائل زرد زرد دانتوں کی مسکراہٹ۔ عالیہ پسینے میں ڈوبی ہوئی، پتوں کے بستر پر بیٹھی لمبی لمبی سانسیں لے رہی تھی۔ چاغنی نے اس کے سامنے کئی جنگلی پھل ڈال دیے اور بولی۔ "خباغ۔"

عالیہ سمجھ گئی کہ وہ اس سے پھل کھانے کے لیے کہہ رہی ہے۔ اب اس میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ عالیہ کے لیے چاغنی کے جذبات منفی نہیں تھے۔ اسے عالیہ نے بہت غنیمت جانا۔ وہ اپنے سامان کے تھیلے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی جو اب اس کے پاس نہیں تھا اور غار میں بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ یقیناً چاغنی ہی اسے کہیں رکھ آئی تھی۔ اسی بیگ میں عالیہ کا پستول بھی تھا اور عالیہ خود کو مسلح رکھنا چاہتی تھی۔ معلوم نہیں کب اس وحشی عورت کا دماغ کسی بات پر پھر جاتا۔ اس نے چاغنی سے اشاروں میں اپنے بیگ کے بارے میں پوچھا۔ چاغنی اس کا اشارہ سمجھ گئی اور تیزی سے چلتی ہوئی غار کے باہر نکل گئی۔ شاید بیگ ہی لینے گئی ہوگی لیکن یہ بات عالیہ کی سمجھ میں نہیں آسکی کہ اس نے بیگ کہیں اور لے جاکے رکھا ہی کیوں تھا؟

جنگلی پھلوں میں سے دو ایک عالیہ کو غنیمت معلوم ہوئے اور وہ بھی شاید بھوک کی وجہ سے، سو اس نے کھالیے۔ اتنے میں چاغنی اس کا بیگ لے کر آگئی۔ عالیہ نے اسے کھول کر دیکھا اور تمام چیزیں چیک کرنے کے بعد ایک طویل سانس لی۔ سارے سامان میں سے صرف پستول غائب تھا۔ یقیناً چاغنی کو معلوم ہو چکا تھا کہ وہ ایک خطرناک چیز ہے، لہٰذا وہ اس نے بیگ میں سے نکال لیا تھا۔ عالیہ نے مناسب سمجھا کہ چاغنی سے اس کے بارے میں استفسار نہ کرے۔ اگر کرتی تو چاغنی اس کے بارے میں نہ جانے کیا سوچنے لگتی۔

عالیہ نے اپنے بال درست کرنے کے لیے کنگھا نکالا اور پھر لیف کا ڈبا نکال کر کھولا جس میں آئینہ لگا ہوا تھا۔ وہ آئینے میں دیکھ کر اپنے بال درست کرنے لگی، چاغنی اس کے قریب آگئی۔ وہ بڑی پُرتجسس نظر آرہی تھی۔ عالیہ نے اپنے بال درست کر کے آئینہ، چاغنی کو دے دیا۔ چاغنی نے آئینے

میں اپنا عکس دیکھا۔ اس کے چہرے پر پہلے تو حیرت کے آثار نظر آئے اور پھر اچانک اس نے اپنا ہاتھ اس طرح آئینے کے پیچھے ڈالا جیسے آئینے کے پیچھے کھڑی ہوئی چاغنی کو پکڑنا چاہتی ہو۔ عالیہ کو بے ساختہ ہنسی آگئی۔ چاغنی نے آئینہ اپنے چہرے کے سامنے سے ہٹا کر دیکھا کہ وہاں کوئی نہیں ہے اور پھر وہ بھی اپنی مخصوص کھرکھراتی ہوئی ہنسی کے ساتھ دوبارہ آئینہ دیکھنے لگی۔ اس مرتبہ وہ اپنے ایک ہاتھ سے اپنے پورے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔ کبھی وہ عالیہ کی طرف بھی دیکھتی جیسے اپنا اور اس کا موازنہ کر رہی ہو۔ اس نے منہ کھول کر اپنے دانت بھی دیکھے۔ جبڑا ہلا ہلا کر انہیں ہر طرح دیکھتی رہی اور پھر اس نے عالیہ کی طرف دیکھ کر اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو۔ ''تم بھی منہ کھولو نا۔''

عالیہ نے منہ کھول دیا۔ چاغنی اس کے چمکتے ہوئے دانتوں کو دیکھتی ہوئی اس کے قریب آگئی، پھر اس نے اپنے ایک گھٹنے کو ناخن سے عالیہ کے اوپری دونوں دانتوں کو گویا کھٹکھٹایا۔ عالیہ کو ابکائی آگئی لیکن اس نے کوشش کی کہ قے نہ ہو۔ چاغنی اپنے دانت کھٹکھٹانے لگی۔ عالیہ نے ایک طرف تھوکا اور پھر اپنے بیگ میں سے ٹوتھ پیسٹ اور برش نکالنے لگی۔ چاغنی بدستور آئینے میں اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ عالیہ نے اسے اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے دانتوں کی طرف اشارہ کیا اور پھر اس کے دانتوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ چاغنی سے پوچھنا چاہتی تھی کہ کیا وہ بھی اپنے دانتوں کو صاف کروانا چاہتی ہے؟ کئی اشاروں کے بعد یہ بات چاغنی کی سمجھ میں آئی اور اس نے خوشی خوشی سر ہلایا۔

یہ عالیہ کے لیے بڑا صبر آزما کام تھا لیکن وہ چاغنی کے دل میں اپنے لیے زیادہ سے زیادہ جگہ بنا لینا چاہتی تھی۔ وہ کنستر اٹھا کے غار کے باہر گئی اور اس میں تھوڑی سی برف بھر لائی۔ پھر الاؤ روشن کیا۔ اس آگ سے اس نے برف کو پگھلا کر پانی بنایا۔ خود ایک کلی کر کے چاغنی کو بھی ایسا ہی کرنے کا اشارہ کیا پھر برش پر ٹوتھ پیسٹ نکالا اور چاغنی کو قریب بٹھا کر اسے منہ کھولنے کا اشارہ کیا۔ چاغنی نے منہ کھول دیا۔ عالیہ اس کے دانتوں پر برش کرنے لگی۔ چاغنی کے چہرے سے یوں معلوم ہونے لگا جیسے وہ گدگدی محسوس کر رہی ہو لیکن وہ ضبط کیے بیٹھی رہی۔

یہ عالیہ کے لیے بڑا صبر آزما کام تھا۔ اسے چاغنی کے بدبودار تنفس سے بچنے کے لیے بار بار اپنی سانس روکنا پڑتی یا دوسری طرف منہ پھیرنا پڑتا۔ اس نے پندرہ منٹ تک برش کرنے کے بعد چاغنی کو کلیاں کروائیں۔ پندرہ بیس سال کے گندے دانت اتنی جلدی چمک دار نہیں ہو سکتے تھے لیکن پھر بھی خاصا فرق آگیا۔ عالیہ نے اسے کلیاں کرانے کے بعد دوبارہ برش کرنا شروع کیا۔ اس مرتبہ چاغنی کے تنفس کی بدبو خاصی کم ہو چکی تھی۔ پندرہ بیس منٹ بعد عالیہ نے چاغنی کو پھر کلیاں کروائیں اور اس کے بعد آئینہ دکھایا۔ اس کے دانتوں کو چمکیلا بنانے میں شاید ایک مہینا لگ جاتا لیکن اتنی ہی صفائی دیکھ کر چاغنی بہت خوش نظر آنے لگی۔ اب اچانک اس نے اپنے چمکتے ہوئے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اس کے بعد عالیہ کے ریشمی بال سہلائے۔

''ہے!'' وہ اپنے مخصوص انداز میں ہنسی۔ اس کی ہنسی ایسی ہوتی تھی کہ آخر میں خراش زدہ سی آواز نکلتی تھی۔

عالیہ سمجھ گئی کہ اب چاغنی اس سے کیا چاہتی ہے لیکن اب اسے سخت نیند آرہی تھی۔ اس نے چاغنی کو اشاروں میں بتانا چاہا کہ اب وہ تھک گئی ہے، اس لیے یہ کام کل کیا جائے گا تو بہتر ہے لیکن یہ اشارے یا تو چاغنی کی سمجھ میں نہیں آئے یا وہ ضد کرتی رہی کہ یہ کام اسی وقت ہونا چاہیے۔ عالیہ اسے ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی، لہٰذا اس کام کے لیے بھی کمر بستہ ہو گئی لیکن اسے اندازہ تھا کہ اس کام میں ساری رات گزر سکتی تھی۔

بیس سالہ گندے بالوں کو دھونے کے لیے نہ جانے کتنی برف پگھلا کر پانی بنانا پڑتا اور پھر ان الجھے ہوئے بالوں کو سلجھانا بھی کوئی آسان کام نہیں ہوتا، تاہم اسے اس کے لیے کمر بستہ ہونا پڑا۔ اس کے تھیلے میں صابن تو تھا ہی۔

عالیہ کو پورے اکیس مرتبہ چاغنی کے بال دھونے پڑے۔ ابتدا میں تو صابن کا جھاگ بالکل سیاہ بنتا رہا۔ اس کے بعد پانی کی سیاہی کم ہونا شروع ہوئی اور بالآخر عالیہ اس کے بالوں کا چکٹا پن ختم کرنے میں کامیاب ہو گئی لیکن یہ عمل اس کے لیے نہایت تھکا دینے والا ثابت ہوا تھا۔ سر دھونے سے چاغنی کا چہرہ بھی دمک گیا تھا۔ وہ خاصے کھلتے ہوئے رنگ کی تھی۔ اس نے آئینہ دیکھا اور خوشی سے اچھلنے کودنے لگی۔ اس کے بعد پھر عالیہ کے قریب آبیٹھی اور کنگھے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ عالیہ کو کنگھا کرتے ہوئے دیکھ ہی چکی تھی۔ خاصی تھکن کے باوجود عالیہ نے اس کے بال سلجھانا شروع کیے۔ یہ عمل چاغنی کے لیے خاصا تکلیف دہ تھا کیونکہ اس کے بال بری طرح الجھے ہوئے تھے لیکن وہ عالیہ جیسے بال بنوانے کے شوق میں بیٹھی ہی رہی۔

صبح ہو گئی۔ ابھی کچھ کسر باقی تھی کہ باہر سے ہواؤں کی چنگھاڑ اور تودے گرنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ عالیہ کا

ہاتھ ایک دم رک گیا۔ وہ بے ساختہ بول پڑی۔ ''شاید پھر طوفان آگیا۔'' اسے خیال ہی نہیں رہا تھا کہ چاغنی اس کی بات نہیں سمجھ سکتی۔

چاغنی اس کی بات نہیں سمجھی لیکن اس کا ہاتھ رکنے کا سبب اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے ایک مرتبہ غار کے دہانے کی طرف دیکھا اور پھر اس طرح اپنے ہاتھ ہلائے جیسے بے پروائی کا مظاہرہ کر رہی ہو۔ یہ طوفان اس کے لیے کوئی اہمیت ہی نہیں رکھتے ہوں گے۔ اس نے عالیہ کے سامنے اپنا سر جھکا دیا تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھ سکے۔ عالیہ نے ایک طویل سانس لے کر کنگھا اٹھا لیا۔ اتنی دیر میں کنگھے کے کئی دندانے ٹوٹ چکے تھے۔ جب طوفان رکا تو چاغنی کے بال بھی سلجھ چکے تھے۔ عالیہ نے اس کی بیچ سے مانگ بھی نکال دی اور بال اس کی پشت پر پھیلا دیے۔

اب خود عالیہ کو چاغنی اچھی لگنے لگی۔ چاغنی نے جو آئینے میں اپنی یہ حالت دیکھی تو وہ ایک بار پھر اسے ہاتھ میں لیے سارے غار میں ناچنے لگی۔ عالیہ سوچ رہی تھی کہ وہ کوشش کرے تو اس لڑکی کو مہذب بنا سکتی ہے۔ اب اس کو نہلانا اور غیر معمولی طور پر بڑے ناخن کاٹنا باقی تھا۔ پھر اسے پتوں کے بجائے ہلکا پھلکا لباس بھی پہنایا جا سکتا تھا۔ اس سردی کی عادی چاغنی گرم کپڑے تو ہرگز نہیں پہن سکتی تھی۔

لیکن سب سے اہم کام یہ تھا کہ اسے یہاں سے لے جایا جا سکے اور یہ کام خان دارا ب ہی کر سکتا تھا۔ عالیہ اندازہ لگانے سے قاصر تھی کہ وہ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہوں گے یا انہوں نے اسے مردہ سمجھ لیا ہو گا۔ دفعتاً چاغنی نے ناچتے ناچتے عالیہ کو بھی اپنے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور ناچتی رہی۔

''ارے ارے!'' عالیہ بوکھلا گئی۔

چاغنی بڑے زور سے ہنسی۔ اچانک اس نے عالیہ کو پتوں کے بستر پر اچھال دیا اور ناچنا بند کر دیا۔ اس کا چہرہ اپنا رنگ بدل چکا تھا اور اس کی وجہ عالیہ کی سمجھ میں آگئی تھی۔ کہیں قریب ہی سے گولیاں چلنے کی آواز سنائی دی تھی۔ چاغنی نے اپنا بھالا اٹھایا اور غار کے دہانے کی طرف زقند لگائی۔

☆☆☆

آہستہ آہستہ آنکھیں کھولتے ہوئے، دماغ نے بھی آہستہ آہستہ کام کرنا شروع کیا اور پیٹر وویچ کو خیال آیا کہ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے غار میں دم گھٹ جانے کے باعث دم توڑ دیا تھا لہٰذا اب اس کی روحانی آنکھیں عالم ارواح میں کھل رہی ہیں۔ لیکن جب اس کی آنکھیں پوری طرح کھل گئیں تو اس نے تعجب سے اپنے اردگرد دیکھا اور اس کے تمام

حواس یک بہ یک بیدار ہو گئے۔ وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیکھا کہ وہ اسی غار میں ہے۔ اس کے تمام ساتھی بھی وہیں پڑے ہوئے تھے۔ ایک آدھ کے سوا سب ہی کلبلا رہے تھے۔ انہیں ہوش آ رہا تھا۔ وہ برفانی تودہ اب غار کے دہانے پر نہیں تھا اور بیرونی ٹھنڈک ان تک پہنچ رہی تھی۔ وہ تودہ کہاں چلا گیا؟ یہ پیٹروویچ کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم تھا۔ ان سب کے ہوش و حواس زائل ہو چکے تھے جب صبح کے وقت ایک تند و تیز طوفان آیا تھا اور ہوا کے تھپیڑوں سے وہ تودہ وہاں سے لڑھک گیا تھا۔ صبح کی روشنی میں پیٹروویچ اپنے ساتھیوں کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر ہوش میں لانے لگا۔

''اٹھو... اٹھو۔'' وہ پاگلوں کی طرح چیختا بھی جا رہا تھا۔ آخر ان سب کو ہوش آ گیا۔

''ارے!'' ان میں سے ایک حیرت سے بولا۔ ''غار کا دہانہ کیسے کھل گیا؟''

''کھلا ہو گا کسی طرح! اس مسئلے میں الجھ کر وقت ضائع نہ کرو۔'' پیٹروویچ نے جھنجلائے ہوئے انداز میں کہا۔ ''جلدی جلدی سامان سمیٹو اور یہاں سے نکل چلو۔ کہیں کوئی اور مصیبت نازل نہ ہو جائے۔''

اس کے ساتھی فوراً اس کے حکم کی تعمیل میں مصروف ہو گئے۔ پیٹروویچ اس طرف لپکا جہاں اس نے ڈاکٹر ایلکا نڈر کی ڈائری چھوڑی تھی۔ غار کے اس حصے میں تقریباً اندھیرا تھا۔ باہر کی روشنی وہاں تک نہیں پہنچ رہی تھی اور مشعل تو پہلے ہی بجھ چکی تھی۔ اس نے ڈائری اٹھائی ہی تھی کہ گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے غار گونج اٹھا۔ اس نے بے اختیار خود کو نیچے گراتے ہوئے، ریوالور نکالنے کے لیے اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور غار کے دہانے کی طرف دیکھا۔

چھوٹے سے دہانے پر وہی برفانی آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں اسٹین گن تھی جس سے وہ پیٹروویچ کے ساتھیوں پر گولیاں برسا رہا تھا۔ نیم تاریکی میں ہونے کی وجہ سے پیٹروویچ، اس برفانی آدمی کی نظر میں نہیں آیا تھا اور نہ اب تک اس کے جسم میں بھی متعدد گولیاں پیوست ہو چکی ہوتیں۔

پیٹروویچ کے تمام ساتھیوں کے جسم چھلنی ہو چکے تھے۔ صرف وہ محفوظ رہا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط سے برفانی آدمی کی پیشانی کا نشانہ لیا اور اپنے ریوالور کا ٹریگر دبا دیا۔ وہ خاصا ماہر نشانہ باز تھا۔ گولی ٹھیک نشانے پر لگی اور برفانی آدمی کے منہ سے ایسی آواز نکلی جیسے اس نے چنگی لی ہو۔ اس کے ساتھ ہی وہ اپنی اسٹین گن سمیت غار کے باہر لڑھک گیا۔

پیٹروویچ ایک طویل سانس لیتا ہوا سیدھا کھڑا ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ اس کی ٹانگوں میں خفیف سی لرزش تھی اور سردی کے باوجود مساموں سے پسینا پھوٹ نکلا تھا۔ موت اس کے بہت قریب سے نکل گئی تھی۔ وہ لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا غار کے دہانے کی طرف بڑھا۔ اس کے تمام ساتھی بے حس و حرکت ہو چکے تھے۔ کوئی امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ اب ان میں سے کوئی زندہ بچا ہو گا۔ ان کا خون اس طرح پھیل رہا تھا جیسے وہاں دو تین گائیں ذبح کر دی گئی ہوں۔ پیٹروویچ کوشش کے باوجود اپنے جوتوں کو خون سے بچائے بغیر باہر نہیں نکل سکا۔ برفانی آدمی کی لاش ساکت پڑی ہوئی تھی اور اس کی پیشانی سے خون اب بھی آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ پیٹروویچ نے غور سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوچا کہ یہ ڈاکٹر ایلکا نڈر ہی ہو سکتا ہے۔ ایلکا نڈر... ایک ایبنارمل آدمی! پیٹروویچ کی دانست میں یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ کوئی نارمل آدمی یہ سب کچھ کر گزرتا۔

ایلکا نڈر کو گھورتے گھورتے پیٹروویچ چونکا۔ اب بہتر یہی تھا کہ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جاتا اور حتی الامکان تیزی سے نیچے اتر کر اپنے پڑاؤ تک پہنچ جاتا۔ وہ تیزی سے ایک مرتبہ پھر غار میں داخل ہوا اور اتنا ضروری سامان سمیٹنے لگا جو تنہا اٹھا کر لے جا سکے۔ پھر وہ غار سے نکلا۔ اس نے اب بھی دائیں ہاتھ میں ریوالور اور بائیں ہاتھ میں ایلکا نڈر کی ڈائری سنبھال رکھی تھی۔ روانہ ہونے سے پہلے اس نے آخری مرتبہ ایلکا نڈر پر ایک نظر ڈالی اور پھر دراڑ سے نکلنے کے لیے ایک طرف مڑا ہی تھا کہ اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ وہ نیم انسانی اور نیم وحشیانہ سی غراہٹ تھی۔

پیٹروویچ کا سر ایک دم اٹھا اور اس نے چٹان کے اوپر برفانی عورت کو کھڑا دیکھا۔ اس نے گھبرا کر فوراً ہی اسے بھی گولی کا نشانہ بنانا چاہا لیکن برفانی عورت نے اس سے زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا۔ اس کے ہاتھ میں دبا ہوا بلم پیٹروویچ کے بازو سے آ کے ٹکرایا اور گوشت کو کاٹتا ہوا ہڈی سے ٹکرایا۔ ریوالور اس کی گرفت سے نکل گیا۔ برفانی عورت کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی جب اس نے اوپر ہی سے پیٹروویچ پر جست لگائی۔ وہ دراڑ کی چٹان سے ٹکرایا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے محسوس کیا کہ برفانی عورت کی کلائی اس کی گردن پر اپنا دباؤ بڑھاتی چلی جا رہی تھی۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

''چاغنی!'' اس نے چیخ کر کہنا چاہا لیکن اس کے حلق سے ذرا بھی آواز نہیں نکل سکی۔

☆☆☆

چٹان پر کھڑی ہوئی عالیہ نے بھی یہ خوف ناک منظر

دیکھا۔ وہ چاغنی کے پیچھے دوڑتی ہوئی یہاں تک آئی تھی۔ اسے یوں نظر آنے لگا جیسے پیٹروویچ کی آنکھیں اس کے حلقوں سے ابل پڑیں گی۔ اس کی گردن پر چاغنی کی کلائی کا دباؤ جیسے آہنی قوت لیے ہوئے تھا۔ دفعتاً چاغنی کا دایاں ہاتھ پیچھے ہٹا اور پھر انتہائی سرعت سے آگے بڑھا۔ اس کے ہاتھ کی سیدھی انگلیاں پیٹروویچ کی پسلیوں کے عین نیچے ٹکرائیں اور تیز دھار چاقوؤں کی طرح اس کے سینے میں پیوست ہو گئیں... پیٹروویچ کی چیخ بڑی لرزہ خیز تھی اور یہ منظر عالیہ کے لیے اتنا ناقابلِ برداشت تھا کہ اس نے ایک دم آنکھیں بند کر لیں۔

''عالیہ!'' اس نے ارسلان کی آواز سنی اور چونک کر آنکھیں کھولتے ہوئے مڑ کر دیکھا۔

ارسلان اور خان داراب وغیرہ تیزی سے اس کی طرف آ رہے تھے۔

عالیہ نے چاہا کہ دوڑ کر ان کے قریب چلی جائے لیکن وہ کوشش کے باوجود ایسا نہیں کر سکی۔ نہ جانے کیوں اس کے پیر من من بھر کے ہو گئے تھے۔ اس نے ایک مرتبہ پھر چاغنی کی طرف دیکھا اور کانپ گئی۔ چاغنی نے اپنے دائیں ہاتھ سے پیٹروویچ کا کلیجا اس کے سینے سے نکال لیا تھا۔ پیٹروویچ کی آنکھیں چڑھ گئی تھیں۔ وہ یقیناً دم توڑ چکا تھا۔ چاغنی نے اس کی گردن سے اپنی کلائی ہٹالی اور وہ کٹے ہوئے شہتیر کی طرح گر پڑا۔ اس وقت چاغنی کے چہرے پر اس بلا کی وحشت تھی کہ عالیہ کانپ گئی۔

شدید اشتعال کے باعث چاغنی شاید ارسلان کی آواز نہیں سن سکی تھی۔ اس نے پیٹروویچ کا کلیجا ایک طرف پھینکا اور اس طرف لپکی جہاں ایک برفانی آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ دراڑ میں پہلے تو اس کی ایک خوف ناک چیخ گونجی اور پھر وہ برفانی آدمی پر گر کے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اس کا یہ رونا بھی کسی درندے کا سا انداز لیے ہوئے تھا۔ اتنے میں خان داراب وغیرہ وہاں پہنچ گئے۔

عالیہ کی ٹانگیں کانپنے لگی تھیں۔ اس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کے ہوش و حواس زائل ہوتے جا رہے ہوں۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، وہ ایسا تھا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو۔ چاغنی کو پکڑنے کے لیے اس پر مضبوط ریشمی ڈوریوں کا جال پھینکا گیا تھا اور وہ اس میں پھنس بھی گئی تھی۔ اس کے منہ سے غراہٹیں نکلنے لگیں۔ وہ جال کی ڈوریوں کو توڑنے لگی۔ اس میں بلا کی طاقت تھی۔ وہ یقیناً جال کو توڑ کر نکل جاتی لیکن اسی وقت خان داراب اور اس کے ملازمین مضبوط رسّے لیے ہوئے دراڑ میں کود گئے

تاکہ چاغنی کو ان رسّوں سے جکڑ سکیں۔

''نہیں... نہیں... نہیں...'' عالیہ کے منہ سے کپکپاتی ہوئی آوازیں نکلنے لگیں اور اس کا جسم اس طرح کانپنے لگا جیسے شدید ترین سردی کی زد میں ہو۔

''عالیہ!'' ارسلان نے اسے اپنے ایک بازو میں سمیٹ لیا۔ ''کیا ہو گیا ہے تمہیں؟''

''ارسلان!... پلیز... اسے اس طرح بیدردی سے نہ پکڑو۔ پلیز!'' عالیہ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''کیا پاگل ہو گئی ہو تم؟'' ارسلان نے اسے جھنجوڑا۔

دوسری طرف چاغنی نے جال کے تو ٹکڑے اڑا ڈالے تھے لیکن مضبوط رسّوں نے اسے بری طرح جکڑ لیا تھا۔ اس عالم میں وہ بڑے بھیانک انداز میں چیخ رہی تھی۔ عالیہ پر غشی سی طاری ہونے لگی تھی جو بالآخر بے ہوشی پر منتج ہوئی۔ پھر ہوش آنے پر اسے احساس نہیں تھا کہ وہ کتنی دیر تک بے ہوش رہی تھی۔ اس نے خود کو اسی چٹان پر پایا۔ اس کے قریب ارسلان بھی تھا۔ باقی لوگ دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ وہ جلدی سے بولی۔ ''کہاں گئے سب؟''

''کوئی سوفٹ نیچے ایک مرتفع جگہ پر پڑاؤ ڈالا گیا ہے۔ سب وہیں ہیں۔ آؤ چلیں۔'' ارسلان نے اس کا ہاتھ پکڑا۔

عالیہ نے چٹان کے کنارے سے دراڑ میں دیکھا جہاں پیٹرووچ کی سینہ چاک لاش پڑی ہوئی تھی۔ قریب ہی اس کا کلیجا بھی پڑا ہوا تھا جو چاغنی نے اس کے سینے سے نکالا تھا۔ برفانی آدمی کی لاش بھی وہیں پڑی ہوئی تھی۔ عالیہ نے چاغنی کو اس سے لپٹ کر روتے ہوئے دیکھا تھا۔ شاید وہ چاغنی کا باپ ہو۔ اس کی پیشانی پر گولی لگی تھی۔ اسے مارنے والا عالیہ کی دانست میں شاید یہ پیٹرووچ ہی تھا جس سے چاغنی نے بڑے بھیانک انداز میں انتقام لیا تھا۔

''چلو عالیہ!'' ارسلان نے اس کے ہاتھ کو خفیف سی جنبش دی۔

''چلو!'' عالیہ کہتی ہوئی آہستہ سے مڑی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ پڑاؤ میں وہ چاغنی کو کس عالم میں پائے گی۔

''ہم لوگ۔'' ارسلان بولا۔ ''پاگلوں کی طرح کل سے تمہیں ڈھونڈتے پھر رہے تھے۔ تم کہاں تھیں؟''

پڑاؤ میں پہنچنے تک عالیہ نے اپنی ساری روداد سنا دی۔

''اوہ!'' ارسلان نے ایک طویل سانس لی۔ ''ہم لوگ حیران تھے کہ اس کے بال دھلے ہوئے، بلکہ کنگھی کیے ہوئے اور دانت اتنے صاف کیوں ہیں۔''

صرف ایک خیمہ گڑا ہوا تھا۔ باقی ملازمین کھلے میں تھے اور کھانے کی تیاری کر رہے تھے۔ ارسلان اور عالیہ خیمے میں داخل ہوئے جہاں خان داراب بڑے انہماک سے کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ ایک کونے میں چاغنی بڑی بے بسی کے عالم میں پڑی ہوئی تھی۔ اسے شانوں سے کمر تک رسّوں سے اس طرح جکڑا گیا تھا کہ صرف کلائیاں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے علاوہ اس کے دونوں پیروں کو بھی ملا کر ٹخنوں سے باندھ دیا گیا تھا۔

''چاغنی!'' عالیہ بے تحاشا اس کی طرف گئی اور بڑی محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگی۔

''آغ لیغہ۔'' چاغنی دھیرے سے بولی۔ اس کی بڑی بڑی دہشت بھری آنکھوں میں اس وقت بے بسی بھی ناچ رہی تھی۔

اس کی یہ حالت دیکھ کر عالیہ آبدیدہ ہو گئی اور خان داراب سے بولی۔ ''اسے چھوڑ دیجیے باوا جانی! اسے میرے حوالے کر دیجیے۔ یہ کچھ ہی دن میں خوشی خوشی ہمارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔''

''کیا تیرا دماغ خراب ہو گیا ہے لڑکی؟'' خان داراب نے منہ بنایا۔

اس سے پہلے کہ عالیہ کچھ کہتی، ارسلان نے خان داراب کو بتانا شروع کیا کہ گمشدگی سے اب تک عالیہ اسی برفانی لڑکی کے ساتھ رہی ہے جس نے عالیہ کو اپنا نام چاغنی بتایا ہے۔

''ہوں۔'' خان داراب نے منہ بنایا اور عالیہ سے کہا۔ ''تجھے خوش فہمی ہو رہی ہے بے وقوف لڑکی! یہ تو ممکن ہے کہ تو اسے اپنی گہری دوست بنا لے لیکن یہ وحشی لڑکی ان پہاڑوں سے جانے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہو گی۔''

''آپ مجھے ایک موقع تو دیں باوا جانی۔''

''بکواس بند کر بے وقوف لڑکی۔''

اس دوران میں چاغنی پلکیں جھپکا جھپکا کر باری باری باپ بیٹی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ شاید اسے کچھ اندازہ ہو گیا تھا کہ ان دونوں میں کیا باتیں ہو رہی ہیں۔

''لیکن باوا جانی...''

''بیکار باتیں نہیں۔'' خان داراب نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''ارسلان! تو اس بے وقوف لڑکی کو سمجھا۔'' اور پھر خان داراب تیزی سے چلتا ہوا خیمے سے نکل گیا۔

عالیہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی اور چاغنی کے چہرے پر بھی مایوسی نظر آنے لگی۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کی

دوست عالیہ اسے آزاد کروانے کی کوشش میں ناکام ہو چکی ہے۔ یکایک اس نے بڑے زور سے چیخ ماری۔ وہ اس طرح اپنے غصے کا اظہار کر رہی تھی۔ عالیہ پھر اس کے قریب جا بیٹھی اور اس کا سر سہلاتی ہوئی بولی۔ ''چاغنی! میں ایک بار پھر اپنے والد کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔''

چاغنی اس کا منہ تکتی رہ گئی۔ ظاہر ہے کہ عالیہ کی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ سکی ہو گی۔ اس نے زیادہ سے زیادہ بس یہی اندازہ لگایا ہو گا کہ عالیہ اسے تسلی دے رہی ہے۔ معاً عالیہ کو دھچکا سا لگا۔ اس کی نظر چاغنی کے ایک ہاتھ پر پڑی تھی۔ اس کے پانچوں ناخن کٹے ہوئے تھے۔ پھر عالیہ نے اس کے دوسرے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ وہ ہاتھ بھی چاقوؤں جیسے تیز ناخنوں سے محروم تھا اور ظاہر ہے کہ یہ کام خان داراب ہی نے کروایا ہو گا۔ اس طرح چاغنی اپنے اس آخری ہتھیار سے بھی ہاتھ دھو بیٹھی تھی۔ اپنے تیز دھار ناخنوں سے رسّوں کو کاٹنا اس کے لیے عین ممکن تھا۔

☆☆☆

کھانے کے بعد سفر کا آغاز ہوا۔ اب یہ ضروری تھا کہ چاغنی کو اس بُری طرح نہ جکڑ کر رکھا جائے کہ وہ اپنے پیروں پر نہ چل سکے اور یہ ممکن نہیں تھا کہ کوئی اسے اپنے اوپر اٹھا کے چل سکتا۔ ویسے تو خان داراب اس عمر میں بھی اتنا تنومند تھا کہ چاغنی کو اٹھا سکتا لیکن اسے اٹھا کر ان اونچے نیچے برف پوش راستوں پر چلنا ممکن نہیں تھا۔ چنانچہ مجبوراً چاغنی کے ہاتھ پیر کھول دیے گئے۔ صرف کمر سے رسّے کو کئی بل دے کر اس کے دونوں سرے چار طاقتور ملازمین کو دے دیے گئے تھے۔ ان ملازمین کو چاغنی کے دائیں بائیں آٹھ آٹھ دس دس فٹ کے فاصلے پر رکھا گیا تھا اور اس کام کے لیے سب سے موٹے رسّے کا استعمال کیا گیا تھا۔ جب بھی مینوں کے سہارے کسی عمودی چٹان سے نیچے اترنا پڑتا، چاغنی ان ملازمین میں سے دو کے بعد اور دو سے پہلے اترتی۔ کبھی کبھی اس کے منہ سے درندوں کی سی غراہٹیں نکلنے لگتیں جن سے معلوم ہوتا کہ وہ اپنے غصے کا اظہار کر رہی ہے۔ عالیہ برابر سوچ رہی تھی کہ چاغنی کو کس طرح رہائی دلوائے لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ خان داراب سے اس موضوع پر دوبارہ بات کرنا اس نے فضول سمجھا تھا۔

رات کو ان لوگوں نے پھر پڑاؤ ڈالا اور چاغنی کو پہلے ہی کی طرح بے بس کر کے ڈال دیا گیا اور اس کے چہرے پر غصے کی سرخی بڑھ گئی۔ اس کے صاف ستھرے خوب صورت چہرے کے ساتھ اس کا میلا کچیلا جسم بڑا عجیب سا معلوم ہو رہا تھا۔ ان دنوں میں ارسلان کا شیو خاصا بڑھ گیا تھا۔ وہ اس رات شیو کرنے کے لیے بیٹھا تو بلیڈ دیکھ کر عالیہ کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ بلیڈ سے رسّی کاٹی جا سکتی تھی لیکن سوچنا یہ تھا کہ کیا چاغنی بلیڈ کو استعمال کر سکے گی؟ امکان نہیں تھا کہ اس وحشی لڑکی کو بلیڈ کی افادیت یا اس سے کام لینے کا طریقہ معلوم ہوتا، تاہم عالیہ نے اس رات ارسلان کے بلیڈ کا ایک پیکٹ چرا لیا۔ صبح ان لوگوں کا سفر پھر شروع ہوا۔ شیما بہت کھویا کھویا سا رہنے لگا تھا۔ یقیناً اسے اپنے دوست گردیزی کی یاد ستا رہی ہو گی جو طوفان میں اس سے بچھڑ گیا تھا۔ وہ دوربین آنکھوں سے لگائے ہمہ وقت چاروں طرف دیکھتا رہتا۔ عالیہ نے بلیڈ کے پیکٹ کے ساتھ رسّے کا ایک فٹ بھر کا ٹکڑا اپنے لباس میں چھپا لیا تھا اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جب وہ خان داراب کی نظر سے بچ کر چاغنی کے قریب ہو سکے۔ آخر اسے یہ موقع اس وقت ملا جب ایک تقریباً عمودی چٹان میں میخیں ٹھونک ٹھونک کر نیچے اترنا پڑ رہا تھا۔ ایسے موقعوں پر ہمیشہ خان داراب ہی آگے ہوتا تھا۔ عالیہ چاغنی کے قریب ہو گئی۔ اس نے سب کی نظر بچا کے رسّی کا ٹکڑا اور بلیڈ کا پیکٹ نکالا۔ چاغنی اسے عجیب سے انداز میں دیکھنے لگی۔

انداز بیاں اور

ریڈیو کے ایک چینل پر کرکٹ کمنٹری جاری تھی جبکہ دوسرے چینل پر میک اَپ کرنے کے طریقے بتائے جا رہے تھے۔ فنی خرابی کے باعث دونوں چینل مکس ہو کر کیسی نشریات پیش کر رہے تھے، ذرا آپ بھی ملاحظہ کریں۔

''حسین نظر آنے کے لیے کپتان نے فیلڈنگ کا فیصلہ کیا۔ کھلاڑی بال سکھاتے ہوئے میدان کی جانب روانہ ہوئے۔ بالوں کی پنچ بالکل خشک ہے۔ مساج، فیشل اور ماسک کے لیے شاہد آفریدی تیار ہے۔ ویکسنگ کے لیے شعیب ملک موجود ہے۔

میک اَپ کو تادیر قائم رکھنے کے لیے شعیب اختر شارٹ لیگ پر کھڑے ہیں۔ آنکھ کے اردگرد ایک رن کا مزید اضافہ ہوا۔ اب بلش آن لیک بریک کرواتے ہیں۔ پویلین کی طرف سے مسکارا لگائیں۔ ٹھوڑی پر ایک شاندار چھکا... فاؤنڈیشن اپلائی کرتے ہوئے بولر سلپ ہو گئے۔ لپ اسٹک لگاتے ہوئے گیند باؤنڈری لائن پار کر گئی۔ چہرے کو آخری ٹچ دیتے ہوئے اسٹیڈیم میں دوبارہ خوش آمدید۔''

(مری آباد کوئٹہ سے ثمینہ حبیب کا تعاون)

عالیہ چاہتی بھی یہی تھی کہ چاغنی اسے پوری توجہ سے دیکھے۔

عالیہ نے بلیڈ کے پیکٹ میں سے ایک بلیڈ نکالا اور رسّے کے ٹکڑے کو درمیان میں سے کاٹنے کی کوشش کرنے لگی۔ رسّا خاصا موٹا تھا۔ کوئی ایک تہائی کٹا ہوگا کہ بلیڈ کند ہونے لگا۔ عالیہ نے بلیڈ کو پلٹ کر اس کی دوسری دھار سے رسّے کو کاٹنا شروع کیا۔ دوسری دھار بھی کند ہوگئی لیکن رسّا پوری طرح نہیں کٹا۔ اب عالیہ نے دوسرا بلیڈ نکالا اور اس سے وہ رسّے کو کاٹنے میں کامیاب ہوگئی اور مسکرا کر چاغنی کی طرف دیکھا۔ چاغنی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ یقیناً اس نے سمجھ لیا تھا کہ عالیہ نے اسے کیا سمجھانے کی کوشش کی تھی۔

عالیہ نے چپکے سے بلیڈ کا پیکٹ اسے دے دیا اور رسّے کے کٹے ہوئے دونوں ٹکڑے اپنے لباس میں چھپا کر آہستہ آہستہ چاغنی سے دور ہوتی چلی گئی۔

''تم اس سے کیا باتیں کر رہی تھیں؟'' ارسلان بولا۔

''میں اس سے کیا باتیں کروں گی؟'' عالیہ نے سنجیدگی سے کہا۔ ''ہم دونوں ایک دوسرے کی زبان نہیں سمجھ سکتے۔ بس مجھے اس کے قریب رہ کر سکون ملتا ہے۔''

''گویا وہ میری رقیبِ روسیاہ ہے۔'' ارسلان نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

''فضول باتیں نہ کرو۔'' عالیہ نے منہ بنایا۔

''اچھا تو ایک غیر فضول بات سنو۔''

''وہ کیا؟''

''کل رات ہمارے خیمے میں چوری ہوئی ہے۔''

عالیہ کا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا ارسلان نے اسے بلیڈ کا پیکٹ چراتے دیکھ لیا تھا؟

''کیسی چوری؟'' وہ آہستہ سے بولی۔

''تمہارے چہرے کا رنگ تو ایسے بدل گیا ہے جیسے وہ چور تم ہی ہو۔ کیا وہ ڈائری تم ہی نے چرائی ہے؟''

''کیسی ڈائری؟''

''وہی جو باوا جانی کو پیٹر وویچ کی لاش کے قریب پڑی ہوئی ملی تھی۔''

''مجھے تم نے اس کے بارے میں نہیں بتایا۔''

''خیال نہیں رہا ہوگا۔ ویسے مجھے یہ نہیں معلوم کہ اس ڈائری میں کیا تھا۔ وہ باوا جانی ہی نے پڑھی تھی۔ صبح ہمیں خیمے کے باہر کسی آدمی کے کیل دار جوتوں کے نشان نظر آئے تھے۔ اس سے باوا جانی نے اندازہ لگایا ہے کہ وہ چور گردیزی ہوگا۔ وہ زندہ ہے اور ہمارے اردگرد منڈلا رہا ہے۔ ایک بات باوا جانی نے بڑی اچھی کی کہ اگر وہ چور گردیزی ہی ہے تو بہت اچھا ہوا کہ اس نے وہ ڈائری چرالی۔ اب وہ تمام حقائق سے آگاہ ہو جائے گا۔''

''یعنی اس کی یادداشت لوٹ آئے گی؟''

''میں نے حقائق سے آگاہی کی بات کی تھی۔ باوا جانی کو اس بات پر یقین نہیں کہ گردیزی کی یادداشت چلی گئی ہے۔ وہ اسے گردیزی کا ڈراما قرار دیتے ہیں۔''

چٹان سے اتر کر اب وہ لوگ ایک مرتفع جگہ پر آگے بڑھ رہے تھے۔

خان داراب ان دونوں کے قریب آتے ہوئے بولا۔

''جہاں جہاں غار دکھائی دیں، ان کا خیال رکھو تاکہ اگر پھر اسی قسم کا طوفان آئے تو ہم دوڑ کر اس غار میں پناہ لے سکیں۔''

''میں اس کا خیال رکھے ہوئے ہوں باوا جانی!'' ارسلان نے سر ہلا کر کہا۔

اس وقت سب سے آگے آگے شیما چل رہا تھا۔ اس کے بعد چاغنی اور اس کے رسّے پکڑے ہوئے ملازمین تھے۔ باقی ملازمین ارسلان، عالیہ اور خان داراب کے پیچھے تھے۔

''ارے! یہ کیا؟'' اچانک خان داراب کے منہ سے نکلا اور وہ جھکا۔

اب عالیہ اور ارسلان نے بھی دیکھا کہ وہ خون کے قطرے تھے جو چاغنی تک چلے گئے تھے۔

''کیا وہ زخمی ہوگئی ہے؟'' خان داراب کہتا ہوا تیزی سے آگے بڑھا۔

عالیہ کو اپنی جان نکلتی محسوس ہوئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ رسّوں کو کاٹنے کی کوشش میں چاغنی اپنی انگلیوں کو بھی زخمی کر بیٹھی تھی۔ ظاہر ہے کہ اسے بلیڈ کو صحیح طور پر استعمال کرنا تو آتا نہیں ہوگا۔ عالیہ یہ بھی دیکھ رہی تھی کہ رسّے ابھی پوری طرح نہیں کٹے تھے کیونکہ چاغنی کے دونوں ہاتھ رسّوں پر پھیلے ہوئے تھے اور وہ اپنی زخمی انگلیوں کی پروا کیے بغیر انہیں کاٹنے میں مصروف تھی۔

خان داراب کے تیز قدموں کی آواز سن کر چاغنی نے پلٹ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات ابھرے۔ پھر اس نے ایک بھیانک چیخ کے ساتھ دونوں رسّوں کو پوری طاقت سے جھٹکا دیا۔ دونوں رسّے اس حد تک کٹ چکے تھے کہ وہ اس جھٹکے سے ٹوٹ گئے اور ان رسّوں کو پکڑے ہوئے ملازمین برف پر گر پڑے۔ چاغنی نے ایک چیختا ہوا سا پُرمسرت قہقہہ لگایا اور زقندیں بھرتی ہوئی دائیں

جانب بھاگی۔

''پکڑو اسے۔'' خان داراب پاگلوں کی طرح چیخا۔

وہ سب دوڑے لیکن چاغنی کو پکڑنا اب ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ وہ ان پہاڑوں کے چپے چپے سے واقف تھی۔ یہاں کے اونچے نیچے اور ٹیڑھے میڑھے راستے طے کرنے کا اسے خوب آتا تھا۔ عالیہ کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آگئے کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی تھی۔ پھر بھی وہ سب بھاگ رہے تھے کہ شاید اسے پکڑ لیں۔ دفعتاً چاغنی ایک جگہ رک گئی یا شاید اسے رکنا پڑا۔ کیونکہ آگے ایک گہری کھائی تھی۔

''اسے تینوں جانب سے گھیرو۔'' خان داراب چیخا۔

چاغنی نے عالیہ کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور اپنے مخصوص بے ہنگم انداز میں مسکرائی۔

''آغ لیغہ!'' وہ چیخی اور اپنے جسم کو پیچھے کی طرف جھکایا۔

''سنبھلو چاغنی! تم گر جاؤ گی۔'' عالیہ چیخی۔

لیکن اس وقت تک چاغنی کھائی میں گر چکی تھی۔ خان داراب متاسفانہ انداز میں ہاتھ ملتا ہوا نظر آیا۔ وہ سب کھائی کے قریب پہنچے۔ وہ خاصی گہری تھی لیکن اس کی صحیح گہرائی کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کوئی دو ڈھائی سو فٹ نیچے نہ جانے وہ کہر تھی یا اسی رنگ کی کوئی گیس کہ اس کے آگے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا... بظاہر یہی سمجھا جا سکتا تھا کہ اس کھائی میں گر کر چاغنی کی ساری ہڈیاں پسلیاں چکنا چور ہوگئی ہوں گی۔ عالیہ نے کھائی کے کنارے سے سر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

خان داراب نے اتنی سختی سے دانت پر دانت جما لیے کہ اس کے جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ ارسلان اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر نہ جانے کس قسم کے جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شیما کے چہرے پر کسی قسم کے تاثرات نہیں تھے، پتھریلا پن سا تھا اور ملازمین ہونق نظر آ رہے تھے۔

☆☆☆

اچانک برف باری کے آثار نظر آنے لگے اس لیے خان داراب کو وہیں پڑاؤ ڈالنا پڑا۔ برف باری کی پیش گوئی شیما نے کی تھی اور جب وہ لوگ خیمے میں داخل ہوئے تو برف باری کا آغاز ہو رہا تھا۔ خیمے میں ایسی خاموشی چھائی ہوئی تھی جیسے وہ کسی قبرستان کے ماحول میں سوگوار کھڑے ہوں۔

یہ سکوت خان داراب نے توڑا۔ ''ارسلان!''

''جی باوا جانی!'' ارسلان کا لہجہ بہت دھیما تھا۔

''اپنا شیونگ بکس کھول۔''

ارسلان کے چہرے پر الجھن نظر آئی لیکن وہ کوئی سوال کرنے کے بجائے اپنے سامان میں سے شیونگ بکس نکالنے لگا۔

عالیہ سر جھکائے ہوئے تھی اور اس کے دل کی دھڑکنیں تیز ہوگئی تھیں۔

''ارے!'' اس نے ارسلان کی آواز سنی۔ ''میرا بلیڈوں کا ایک پورا پیکٹ غائب ہے۔''

''مجھے یقین تھا کیونکہ میں اپنا شیونگ بکس چیک کر چکا ہوں۔''

''لیکن اس کا مطلب... باوا جانی!''

''میں جانتا ہوں کہ وہ بہت طاقتور تھی لیکن اتنی بھی نہیں کہ وہ مضبوط رسّے توڑ دیتی۔ وہ انہیں اس وقت توڑ سکی جب وہ آدھے سے زیادہ کٹ چکے تھے۔ انہیں بلیڈوں سے کاٹا گیا تھا مگر چونکہ وہ بلیڈوں کے طریقۂ استعمال سے واقف نہیں تھی، اس لیے اپنی انگلیاں بھی زخمی کر بیٹھی۔''

''تو...'' ارسلان حیرت سے بولا۔ ''کیا اس نے میرا پیکٹ چرایا تھا؟''

''نہیں۔'' خان داراب نے کہا اور پھر بڑی سرد مہری سے بولا۔ ''عالیہ نے!''

عالیہ نے ڈرتے ڈرتے نظریں اٹھائیں۔

خان داراب کا چہرہ اس وقت بڑا عجیب سا نظر آ رہا تھا۔ جب وہ بولا تو اس کی آواز غصے کی دھیمی آنچ میں تپی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ ''تجھے اس کی کیا سزا دی جائے بے وقوف لڑکی!''

عالیہ کے ہونٹ لرز کر رہ گئے اور وہ آبدیدہ نظر آنے لگی۔

ارسلان نے ایک طویل سانس لے کر اس کی طرف دیکھا۔ شیما کی نظر بھی عالیہ کے چہرے پر جمی ہوئی تھی۔

''بہرحال۔'' خان داراب نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''میری ساری محنت بیکار گئی لیکن میرا یہ یقین ضرور پختہ ہوگیا کہ برفانی انسانوں کا کوئی وجود نہیں۔''

''یہ آپ کیسے کہہ رہے ہیں باوا جانی؟'' ارسلان بولا۔

''اس ڈائری کی وجہ سے جو چوری ہو چکی ہے۔''

''اوہ... مگر... کیا لکھا تھا اس میں؟''

خان داراب جواب دینے کے بجائے خیمے کے پردے کا تھوڑا سا حصہ سرکا کر برف باری کی شدت کا اندازہ کرنے لگا پھر مڑ کر بولا۔ ''برف باری کے بعد ہم کافرستان کی

طرف سفر شروع کریں گے۔"

"تو اب تک کس طرف کر رہے تھے؟" ارسلان نے تعجب سے کہا۔

"کافرستان کے لوگ اپنی برفانی دیوی کو ہماری قیدی کی حیثیت سے ہرگز برداشت نہیں کرتے، اس لیے میں مخالف سمت سے نیچے اتر رہا تھا لیکن اب اس کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"اوہ!" ارسلان چپ ہو گیا۔

خان داراب نے ایک مرتبہ گھور کر عالیہ کو دیکھا اور پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر سر جھکا لیا۔ وہ کچھ ایسا ہی آدمی تھا۔ کبھی کبھی تو اسے بہت معمولی بات پر غصہ آجاتا اور کبھی وہ بڑی سے بڑی بات درگزر کر جاتا۔ غالباً اس نے عالیہ کی غلطی بھی درگزر کر دی تھی۔

"خان بزرگ!" شیما بولا۔

"ہوں۔" خان داراب نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔

"کیا آپ میرے دوست گردیزی کی تلاش میں میرا ساتھ نہیں دیں گے؟"

"اسے تلاش کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ نہ صرف زندہ ہے بلکہ ہمارے قرب و جوار میں ہی کہیں موجود ہے۔"

"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟" شیما نے تعجب سے کہا۔

خان داراب نے اسے ڈائری کی چوری کے بارے میں نہیں بتایا تھا۔ اب اسے یہ بات بتائی گئی تو اس کی پیشانی پر سوچ بچار کی شکنیں پڑ گئیں۔ وہ بولا۔ "اگر یہ حقیقت ہے تو وہ ہمارے سامنے کیوں نہیں آجاتا؟"

"ایک تو اس نے میرے پاس سے ڈائری چرائی ہے، دوسرے شاید وہ ہم لوگوں کو پسند بھی نہیں کرتا۔ اس لیے جب ہم تمہاری بستی میں پہنچنے کے بعد اپنے وطن چلے جائیں گے تو وہ تم سے آملے گا۔"

☆☆☆

لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جب وہ لوگ اس... پُرفضا وادی سے رخصت ہو گئے تو اس کے بعد شیما پندرہ دن تک اپنے دوست کا انتظار کرنے کے بعد مایوس ہو گیا۔ اسے خیال آیا کہ خان داراب کو گردیزی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی لہٰذا وہ شیما کو ٹال گیا تھا۔

اسی دوران میں شیما کا باپ ایک خطرناک بیماری سے دوچار ہو کر موت کی آغوش میں چلا گیا۔ اب اصولاً بڑے بیٹے کی حیثیت سے شیما کو "باپ" کی گدی پر بیٹھنا تھا مگر اس کے خیالات و افکار کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے اس کے چھوٹے بھائی کو اپنا نیا "مذہبی پیشوا" بنایا۔ رہ گیا شیما تو وہ اس گدی پر بیٹھنے کا خواہش مند بھی نہیں تھا۔

پھر کچھ دن بعد وادی کے طول و عرض میں یہ بات پھیلنے لگی کہ اب پہاڑوں پر برفانی دیوی کے ساتھ ایک برفانی دیوتا بھی نظر آتا ہے اور برفانی دیوی پہلے سے زیادہ خوب صورت نظر آتی ہے۔ اس کے بال فضا میں لہرانے لگتے ہیں۔ کافرستان کے بٹیانوں نے اندازہ لگایا کہ برفانی دیوی کی تنہائی کو ختم کرنے کے لیے عظیم دیوتا ساجی گورنے وہاں ایک برفانی دیوتا بھی بھیج دیا ہے۔ شیما کو یہ باتیں معلوم ہوئیں تو وہ ان کی تلاش میں اکیلا ہی پہاڑوں پر جا چڑھا۔ بستی کے دوسرے نوجوان اس معاملے میں اس کا ساتھ دینے کو گناہ سمجھتے تھے۔

پھر یہ خبر چترال اس دن پہنچی جب ارسلان اور عالیہ کی شادی ہو چکی تھی اور شادی کے دوسرے دن ارسلان عالیہ کو لے کر اپنے وطن کی طرف روانہ ہونے والا تھا۔ اس خبر نے ان تینوں کو چونکا دیا اور تینوں کے ذہن میں بہ یک وقت ایک بات آئی۔

چاغنی اس کھائی میں گر کر مری نہیں تھی۔ اس کھائی میں کودتے ہوئے اسے معلوم ہوگا کہ وہ بچ جائے گی اور پھر بعد میں اسے گردیزی مل گیا ہوگا۔ گردیزی کے پاس سیما کی تصویر تھی جس کے نقوش بڑی حد تک چاغنی سے ملتے تھے۔ اس تصویر کی وجہ سے چاغنی نے اسے اپنا دوست سمجھ لیا ہوگا اور گردیزی کو اس کا علم ڈائری سے ہو گیا ہوگا کہ چاغنی اس کی بیوی سیما کی آخری نشانی ہے۔ عالیہ دوبارہ اس وادی میں جانے کے لیے مچلی لیکن خان داراب نے اس کی خواہش کچل دی۔

"نہیں۔" اس نے سختی سے کہا۔ "ہمیں کوئی ضرورت نہیں ہے کہ ان کی خوشی میں رخنے ڈالیں۔ چاغنی ایک اعتبار سے گردیزی کی بیٹی ہے اور اگر اس کی خاطر گردیزی بھی اپنی باقی زندگی ان پہاڑوں پر گزارنا چاہتا ہے تو ہمیں کیا؟"

عالیہ چپ تو ہو گئی لیکن اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنے باپ سے چھپ کے ارسلان کے ساتھ ایک بار پھر اس مقام تک جائے گی اور چاغنی سے ملے گی۔ لیکن کیا چاغنی اسے ملتی؟ کون جانے... لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ چند ہی گھنٹوں کی رفاقت میں عالیہ کو چاغنی سے بے انتہا محبت ہو گئی تھی جسے فراموش کرنا اس کے لیے ممکن نہیں تھا۔

کچھ فرصت کے لمحات تھے اور ہم کچھ دوست تھانے کے ملحقہ ایک کوارٹر میں بیٹھے تاش کھیل رہے تھے۔ ہمارا "صاحب" بھی اپنا تبادلہ رکوانے کے لیے بھاگ دوڑ میں مصروف تھا اور کسی منسٹر وغیرہ کی سفارش ڈھونڈنے میں ایک شہر سے دوسرے شہر کے چکر لگاتا پھر رہا تھا۔ کچھ روز سے کوئی واردات بھی نہیں ہوئی تھی، اس لیے کم از کم ہمارے لیے تو وادی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

اچانک دروازہ کھلا اور رسول بخش اندر داخل ہوا۔ وہ ایک باغ و بہار شخصیت کا مالک..... تھا اور دلچسپ بھی۔

"اصغر میاں! کیا ہو رہا ہے؟" رسول بخش نے میری طرف دیکھ کر باچھیں پھیلا کے پوچھا مگر جانے کیوں عدنان نے اس کی طرف خاموشی سے گھورنے کے انداز میں دیکھا تھا۔

"آؤ یار رسول بخش... کیسے ہو؟" میں نے مسکرا کے کہا۔ ساتھ ہی مجھے جماہی بھی آگئی۔

"لگتا ہے شہر میں وارداتیں ہونا بند ہو گئی ہیں یا پھر سارے بدمعاشوں نے پولیس کی نوکری جوائن کر لی ہے۔" رسول بخش نے کان میں اڑسی ہوئی بیڑی نکال کے ہونٹ میں دابی۔ عدنان کو اس کی بات سخت ناگوار گزری۔ وہ اس کی طرف گھور کے بولا۔ "زیادہ بکواس کرنے کی ضرورت نہیں، جاؤ اپنا کام کرو۔ تمہارا یہاں کیا کام؟"

"ارے چھوڑ یار! بے چارے غریب پر کیوں غصہ کرتے ہو۔" میں نے عدنان کو ٹوکا اور رسول بخش کی طرف دیکھا۔

واردات

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

جب ذہن کے خفیہ گوشوں میں جذبۂ انتقام کروٹیں لینے لگے تو انسان سے درندہ بننے میں دیر نہیں لگتی... شعبدہ بازی اور جادو نگری دنیا میں نت نئے کرتب دکھانے والا مداری... خود ایک شعبدہ گری کی نذر ہو گیا...

ذہانت کا لاجواب استعمال کرنے والے شخص کا پراسرار المیہ

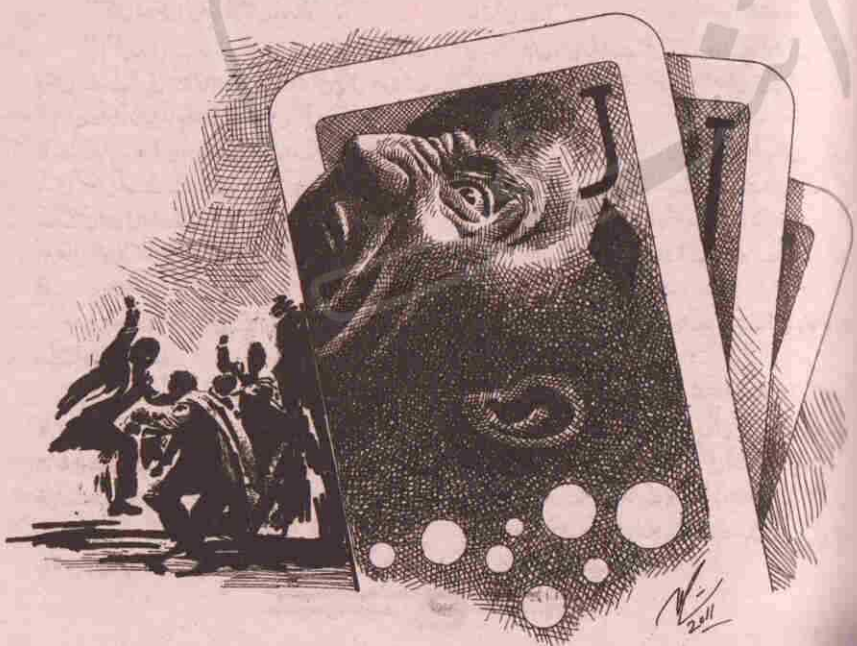

عدنان کی بات پر وہ عموماً خاموشی اختیار کر لیتا تھا مگر اس بار بڑے جوش سے ہم سب کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ایک واردات تم لوگوں کی منتظر ہے۔''

''کیا؟'' ہم سب اس کی طرف دیکھنے لگے۔

''کیا کوئی ڈاکا وغیرہ پڑ گیا ہے؟'' ہمارے تیسرے ساتھی ایوب نے اس کی طرف دیکھ کے استفسار یہ کہا اور ساتھ ہی اپنی جیب سے ماچس کی ڈبیا نکال کے رسول بخش کی طرف اچھال دی۔ اس نے بڑے آرام سے ماچس کیچ کی اور ہونٹوں میں دبی بیڑی سلگالی۔ یہ ہمارا مخبر تھا، سادہ لباس میں رہتا تھا۔ تڑی مڑی بیڑی کا ایک گہرا کش لگا کے وہ اسرار بھرے لہجے میں بولا۔

''اب تک تو نہیں لیکن ایک شخص کو ایسی ہی دھمکی دی گئی ہے اور اگر اس کی حفاظت نہ کی گئی تو اس بات کا قوی امکان ہے کہ یہ جلد ہی علاقے کی ایک بڑی واردات بن جائے گی۔ مگر تم لوگ تاش کھیلنے میں مگن رہتے ہو، خدا کے لیے اس غریب شخص کی مدد کرو۔''

''اس شخص کا نام کیا ہے؟'' میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''دل مراد نام ہے اس کا۔''

''دل مراد؟'' پُرسوچ بڑبڑاہٹ سے میں نے یہ شناسا نام دہرایا۔

''کہیں یہ وہی دل مراد تو نہیں... جو...؟''

''بالکل وہی ہے یہ شخص جو اس سے پہلے میری جگہ پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا اور اس کی نشاندہی پر کئی خطرناک مجرموں کو گرفتار کیا جا چکا ہے۔'' رسول بخش نے میری بات کاٹ کے کہا۔ عدنان اور ایوب وغیرہ اب اس کی بات میں سنسنی محسوس کرنے لگے تھے۔ ورنہ اس نئے مخبر رسول بخش کے متعلق ان کی رائے کچھ ٹھیک نہ تھی۔ بہ قول ان کے یہ نکما مخبر تھا اور خود کو ''ایکسپوز'' کرنے کے لیے بے پر کی ہانکتا رہتا تھا۔

بہرطور... رسول بخش نے اپنی بات یا اطلاع جاری رکھتے ہوئے مزید کہا۔

''ممکن ہے دھمکی دیے جانے کی یہی وجہ ہو۔ دل مراد کا کہنا ہے کہ وہ اسے قتل کر دیں گے۔ چنانچہ اس نے تحفظ کی درخواست کی ہے۔'' رسول بخش یہ ساری معلومات ہم تک پہنچانے کے بعد چلا گیا۔ ہم سوچ میں پڑ گئے۔

دل مراد یہ ظاہر سیدھا سادہ نظر آنے والا شخص تھا، عمر چالیس سے متجاوز تھی، غیر شادی شدہ تھا۔ اس نے ہمارے لیے پانچ سال کام کیا تھا اور ہمارے ''صاحب'' کے کاندھوں پر پھول کے اضافے کا سبب بھی دل مراد ہی تھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا، اس نے یہ نوکری چھوڑ دی کیونکہ اس نے شادی کر لی تھی۔ ممکن ہے اس کی بیوی نوکری چھڑوانے کا باعث بنی ہو جسے شوہر کا یہ کام خطرناک لگا ہو۔

دل مراد سے متعلق ایک دلچسپ بات ہم نہیں بھول سکتے تھے۔ جی ہاں، وہ بلا کا شعبدہ باز بھی تھا۔ یہ نہ جانے اس نے کہاں سے اور کس سے سیکھا تھا۔ چند اچھے آئٹم اس نے ہمیں بھی کر کے دکھائے تھے، اس میں کوئی شک نہیں تھا کہ وہ اچھا شعبدہ باز تھا۔ اس نے پولیس کے لیے مخبری کرنے کی نوکری چھوڑنے کے بعد اسی شعبدہ گری کو ہی ذریعہ روزگار بنا لیا تھا اور میلوں ٹھیلوں میں حیران کن اور ششدر کرنے والے آئٹم کر کے روزی روٹی کماتا تھا۔ اس کی شہرت اس قدر چار دانگ پھیل گئی کہ علاقے کی ثقافتی شوز کرنے والی ایک تنظیم کی طرف سے اسے ٹاؤن ہال میں عنقریب ایک بڑا میجک شو پیش کرنا تھا۔

''یار اصغر! ایک بات تو بتا... شعبدہ باز اور ساحر میں کیا فرق ہوتا ہے؟'' چند ثانیوں کی پُرسوچ خاموشی کے بعد ہمارے چوتھے ساتھی خرم نے استفسار یہ لب کشائی کی۔

اس سے پہلے کہ میں کوئی جواب دیتا، عدنان اس کی طرف دیکھ کر پوچھ بیٹھا۔ ''کیا مطلب؟ کیا دل مراد ایک ساحر بھی ہے؟''

'ہاں، سن رکھا ہے میں نے۔ وہ اپنے شوز میں شعبدہ گری کے ساتھ ساتھ مخیر العقول آئٹم بھی پیش کرنے لگا ہے۔''

''شعبدہ بازی اور ساحری میں کوئی فرق نہیں۔'' میں نے خرم کے سوال کا جواب دیا۔ ''ظاہر ہے اس کے آئٹم مخیر العقول ہوتے ہوں گے تو وہ شعبدہ باز کہلاتا ہے نا۔''

''ارے یار! میری مراد کالے جادو سے تھی۔'' خرم بڑبڑایا۔

''ممکن ہے اسے ٹیلی پیتھی کے بارے میں کچھ جان کاری ہو۔''

''یہ تم لوگ کس فضول بحث میں الجھ گئے ہو؟'' ایوب نے جھلا کے کہا۔ ''کیا تم لوگ کسی بڑی قتل جیسی واردات کے ہونے کا انتظار کر رہے ہو؟ ہمیں فوراً عملی قدم اٹھانا چاہیے۔'' پھر وہ میری طرف متوجہ ہو کے بولا۔ ''یار اصغر! کم از کم تم ہی اپنی ذمے داری کو محسوس کر لو۔ صاحب اپنی جگہ تمہیں ہی تھانے کا چارج سونپ گئے ہیں۔''

''عارضی چارج!'' خرم نے منہ بنایا۔

''تم کیوں جلتے ہو؟ عارضی چارج کے لائق بھی تو آخر صاحب نے مجھے سمجھ کر ہی سونپا ہے نا، ورنہ تو تم بھی تھے۔ مجھ سے صرف چھ ماہ جونیئر اے ایس آئی۔'' میں نے اسے اس کی اوقات یاد دلائی۔

وہ دوستانہ انداز میں مسکرا کے بولا۔ ''ارے یار! میں تو تمہیں چھیڑ رہا تھا۔'' میں نے سر جھٹک دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں خرم کو لے کر روانہ ہو گیا۔

☆☆☆

دلشاد شاہراہ پندرہ پر واقع ہم اس کی تھیٹر گاہ پر پہنچے۔ میں نے آج دل مراد کو پورے ایک سال بعد ہی دیکھا تھا اور بالکل حیران نہیں ہوا تھا کیونکہ اس نے اپنا جو حلیہ بنا رکھا تھا، وہ اس کے اس نئے پروفیشن کی مجبوری یا ضرورت تھی۔

اس نے چہرے پر چگی داڑھی رکھ لی تھی جس سے اس کا دبلا پتلا چہرہ مزید لمبوترا نظر آنے لگا تھا۔ تاہم قد کاٹھ وہ دراز قامت تھا۔

اس وقت ایک نوعمر لڑکا، تھیٹر کے اندرونی حصے میں اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی ہمیں اس کے کمرے میں لے کر گیا تھا، جو ہمیں ویسا ہی لگا تھا جیسا کہ ایک شعبدہ باز کا ہونا چاہیے تھا۔

حیرت کی بات تھی، وہ ہمارا شناسا ہونے کے باوصف بڑے سپاٹ انداز میں ملا۔

''خیریت... کیسے آئے ہو؟ میرے شو کے لیے ٹکٹ... انتظامیہ کے ذمے ہیں، اس میں میرا کوئی اختیار نہیں کہ میں رعایت...''

''خاموش رہو، ہم تم سے یہاں ٹکٹ کی رعایت کروانے نہیں آئے ہیں۔'' خرم نے چڑ کے کہا۔ وہ شاید اس کی بے رخی پر اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ کوئی تمہیں جان سے مارنے کی دھمکیاں دے رہا ہے۔'' میں نے اس کی طرف دیکھ کر نہایت متانت سے مقصد کی بات کر ڈالی۔

''یہ تمہارے اس نئے مخبر رسول بخش کی کارستانی ہو گی۔'' وہ عجیب سے انداز میں مسکرا کے بولا۔

''کیا یہ درست ہے؟'' میں نے کسی بحث سے بچنے کے لیے کہا۔

''ہاں، تمہارا شکریہ اصغر صاحب! میں یوں بھی عنقریب تم سے مدد لینے کے لیے تھانے آنے والا تھا۔'' وہ اب ہمارا ممنون نظر آنے لگا اور پھر ہمیں بیٹھنے کو کہا۔ ہمارے بیٹھنے کے بعد اس نے اپنا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور ایک کاغذ میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے وہ کاغذ اس کے ہاتھ سے لیا۔

یہ ایک مختصر سا نوٹ تھا اور صرف اتنا ہی تحریر تھا۔

'' دل مراد! تم چونکہ کافر ہو، لہٰذا ہم تمہیں قتل کر دیں گے۔

فقط، نیک ارواح۔''

''یہ سستی شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ لوگ اسے واقعی ایک بڑا جادوگر سمجھیں اور جن جھپٹ کے سلسلے میں بھی اس کی کمائی کروائیں۔'' یہ نوٹ پڑھنے کے بعد خرم نے فوراً میرے کان میں سرگوشی کی۔ میں نے اس کے تبصرے پر کوئی خاص توجہ نہ دی اور کاغذ کا جائزہ لینے لگا۔

یہ تحریر ایک عام سے کاغذ پر چھپی ہوئی تھی لہٰذا اس سے ہمیں کوئی مدد نہیں مل سکتی تھی۔ تاہم اس قدر بات تو سمجھ میں آئی تھی کہ اس کے کسی دشمن نے ''نیک روح'' کا ڈھونگ رچا کے اسے اس انداز میں دھمکانے کی کوشش کرنی چاہی تھی۔

''تمہیں دھمکی کب موصول ہوئی؟'' میں نے کاغذ کی طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا۔

''آج صبح۔'' اس نے جواباً کہا اور آگے بتایا۔ ''مجھے اس سے پہلے بھی مختلف دھمکیاں مل چکی ہیں لیکن... یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے مجھے قتل کی دھمکی دی۔''

خواہش

ایک وکیل نے اپنے دوست کو اپنی زندگی کے پُرلطف واقعات سناتے ہوئے ایک مقدمے کا ذکر کیا، جس میں ایک عورت نے نان و نفقے کی پروانہ کرتے ہوئے جج سے کہا۔

''جناب عالی! مجھے اپنے شوہر سے کچھ نہیں چاہیے۔ میں تو بس اتنا چاہتی ہوں کہ وہ مجھے اسی حالت میں چھوڑ دے جس میں اس نے مجھے پایا تھا۔''

''اور وہ حالت کیا تھی؟'' جج نے پوچھا۔

''میں بیوہ تھی۔'' عورت نے سر جھکا کر کہا۔

(سمیعہ صارم آرائیں، گولارچی)

''تمہارے خیال میں یہ کون لکھ سکتا ہے؟''

''کوئی بھی۔'' اس نے شانے اچکائے۔

''میں سمجھ گیا۔'' خرم بیچ میں بولا۔ ''گویا تمہیں یقین نہیں ہے کہ یہ عبارت ارواح نے تحریر کی ہے؟''

''میں حقیقتاً ایسا نہیں سمجھتا اور اگر کوئی شخص یہ ثابت کر دے کہ کسی روح کا واقعی کوئی وجود ہے تو میں اسے انعام دینے کو تیار ہوں۔''

''آج رات تم کون سا تماشا کرو گے؟ کیا روحوں کو حاضر کرنے کا آئٹم پیش کرو گے؟'' میں نے دریافت کیا۔

''نہیں، آج میں مجک شو کروں گا۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہ کون ہے؟'' میں نے انگوٹھے سے اس نیولے جیسی شکل والے لڑکے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھا جو صندوقوں کو ادھر سے اُدھر رکھ رہا تھا۔

''یہ سلیم خان ہے، میرا نائب۔ میرے ساتھ اسٹیج پر جاتا ہے۔''

''کتنے عرصے سے تمہارے ساتھ ہے؟''

''تقریباً ایک سال سے۔ اس نے میرے کئی شو دیکھے تھے اور پھر میرا مرید ہو گیا۔ مجھے بھی ایک نائب کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اسے رکھ لیا لیکن تمہیں اس کے بارے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ یہ لڑکا بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔''

''تمہیں قتل کی یہ دھمکیاں کتنے عرصے سے موصول ہو رہی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سے میں اس پیشے سے منسلک ہوا ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن جیسا کہ میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے، یہ پہلا موقع ہے کہ کسی نے حد سے تجاوز کرتے ہوئے مجھے قتل کی دھمکی دی ہے حالانکہ ان کے اندر اتنی جرأت نہیں ہے، تاہم میں نے سوچا کہ اگر ایک دو دن میری حفاظت کی جائے تو بہتر ہے... اب تم لوگ آرام سے بیٹھو اور میرے کام میں حارج ہونے کی کوشش مت کرنا۔ میں شو کے سلسلے میں کچھ تیاریاں کر لوں۔'' اتنا کہہ کر وہ ایک صندوق پر بیٹھ گیا اور تاش کے پتوں کے کرتب کی مشق کرنے لگا۔ خرم اور میں اس کے کرتب کو بہ غور دیکھنے لگے لیکن میں نے اس جانب کوئی دھیان نہیں دیا کیونکہ میں ڈیوٹی پر تھا۔

''میں سمجھ گیا۔'' خرم یکایک بولا۔ ''تم تاش کے ایک بہت بڑے ماہر ہو، میں تمہارے نئے گر کا جائزہ لے رہا تھا۔''

دل مراد نے چونک کر اس کی جانب دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں پہلی بار اشتیاق کا رنگ جھلکا۔ ''تم شعبدہ بازی میں دلچسپی رکھتے ہو؟''

''محض ایک طفلِ مکتب ہوں۔'' خرم نے انکسار سے کہا۔ ''تاہم کبھی کبھار تاش کا کوئی نیا گر آزمانے کی کوشش کرتا ہوں۔''

''تو پھر میرے پاس آؤ۔'' دل مراد نے اسے دعوت دی۔ ''اور دیکھو کہ یہ نیا گر کیسا رہے گا؟''

خرم اس کے پاس جا بیٹھا۔ وہ اس میں الجھ گیا۔ حتیٰ کہ شو کا وقت ہو گیا۔ اثنائے راہ... میں نے اٹھ کے سارے تھیٹر کا جائزہ لیا اور دل مراد کے نائب سلیم خان سے بھی تھوڑی بہت گفتگو کی۔ جگہ بالکل صاف ستھری تھی، کہیں پر بھی کسی قاتل کے چھپنے یا چھپ کے گھات لگا کر گولی چلانے کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ وہ لڑکا سلیم خان پہلی ہی نگاہ میں مجھے ناپسند لگا تھا۔ شکل سے وہ نیولا نظر آتا تھا لیکن جب میں نے اس سے گفتگو کی تو خاصا اچھا لڑکا ثابت ہوا۔ اسے شعبدے بازی پر یقین نہیں تھا لیکن میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ وہ اپنے باپ یا استاد کا بے حد وفادار تھا اور اسے بچانے کی خاطر اپنی جان پر بھی کھیل سکتا تھا۔

رات کے تقریباً آٹھ بجے شو کا آغاز ہوا۔ تھیٹر تماش بینوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ دوسرے لفظوں میں احمقوں سے بھرا ہوا تھا اور میں یہ سوچ سوچ کر حیران ہو رہا تھا کہ کتنے سارے احمق سو روپے کے عوض ایک شعبدے باز کے پیٹ میں سے خرگوش کے برآمد ہونے کا تماشا دیکھنے جمع ہوئے تھے۔ میں اور خرم ایک ایسی جگہ کھڑے تھے جہاں سے اس جادوگر پر ہر وقت نظر رکھی جا سکے اور کسی حادثے کے جنم لیتے ہی فوراً اس تک پہنچا جا سکے۔

اسٹیج پر پہنچنے کے بعد وہ سب سے پہلے تاش کے پتوں کے کرتب دکھانے لگا۔ وہ فضا میں ہاتھ لہراتا اور تاش کے پتوں کی ایک زنجیری، پھڑ پھڑاتی ہوئی اس کی مٹھی میں آ جاتی پھر دوسرے ہی لمحے غائب ہو جاتی۔ کچھ دیر تک وہ یہی عمل دہراتا رہا پھر سگریٹ کے بے شمار کرتب دکھائے اور پھر بلیئرڈ کی گیند کو اچھال اچھال کر غائب کرنے لگا لیکن مجھے اس کے کسی شعبدے میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ لہٰذا میں اس جانب بہ مشکل متوجہ تھا۔ پھر اس کا نائب، سلیم خان ایک طشت اور ایک گلاس لیے اسٹیج پر نمودار ہوا۔ طشت میں نقلی موتیوں کی مالا رکھی ہوئی تھی۔ دل مراد نے مالا لے کر اس کا دھاگا اور سارے موتی گلاس میں بھر دیے۔ اس کے بعد اس

دھاگے کو لپیٹ کر اپنے منہ میں رکھ لیا اور پھر گلاس کے تمام موتی بھی اپنے منہ میں بھر لیے۔ وہ ایک منٹ تک جگالی کرنے کے انداز میں منہ چلاتا رہا جیسے موتی چبانا چاہتا ہو۔ پھر دھاگے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کیا اور وہ مالا دوبارہ اپنی اصل حالت میں اس کے منہ سے برآمد ہونے لگی۔ میرے خیال میں یہ ساری شعبدے بازی خاصی آسان اور سہل تھی جبکہ اس شعبدے کو دیکھنے کے لیے وہاں موجود سیکڑوں افراد نے فی کس سو روپے ادا کیے تھے۔ یہ خاصا منافع بخش کاروبار تھا۔ اس کے بعد جان دار اشیا کا آئٹم پیش کیا جانے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا اسٹیج خرگوشوں اور کبوتروں سے بھر گیا۔ وہ انہیں کبھی حاضر کرتا، کبھی غائب کر دیتا۔ اس کے فوراً بعد دو خوب صورت جوان لڑکیاں نمودار ہوئیں۔ اس نے ان کے ساتھ بھی خرگوشوں اور کبوتروں جیسا سلوک کیا۔ اس موقع پر میں نے اپنی ٹائی کی گرہ درست کی اور اس کے شعبدوں میں ذرا دلچسپی لینے پر مجبور ہوا۔

میری ڈیوٹی بہرحال اتنی کوفت آمیز ثابت نہیں ہو رہی تھی۔ اس دوران میں، میں نے ایک خاص بات محسوس کی۔ دل مراد کبھی کبھی عجیب حرکتیں کرنے لگتا تھا۔ وہ پیٹ پکڑ کر یوں دہرا ہو جاتا گویا اس کے پیٹ میں شدید درد ہو رہا ہو۔ میں سمجھا کہ وہ غلطی سے کوئی موتی نگل گیا ہے۔

یہ شو تقریباً ڈھائی گھنٹے تک جاری رہنے کے بعد ساڑھے دس بجے اختتام پذیر ہوا۔ پردہ گرنے کے دوران سارا ہال تالیوں سے گونج رہا تھا۔ لیکن دل مراد... ایک لفظ کہے بغیر تیزی سے ڈریسنگ روم کی جانب بڑھ گیا۔ خرم نے میری جانب دیکھا۔ میں نے اسے اشارہ کیا پھر ہم دونوں بھی تیزی سے اس کے پیچھے لپکے۔ ڈریسنگ روم میں پہنچتے ہی وہ واٹر کولر کی جانب بھاگا اور یکے بعد دیگرے چار گلاس پانی ... پی گیا۔ پھر مڑ کر ہماری جانب دیکھا اور مخاطب ہوا۔

''مجھے اتنی شدت کی پیاس لگ رہی تھی کہ میرے لیے شو کو جاری رکھنا محال ہو رہا تھا۔ کہو شو کیسا رہا؟''

''بہت ہی شاندار۔'' خرم نے توصیفی لہجے میں کہا۔ ''میں نے اس سے اچھا شو آج تک نہیں دیکھا۔''

''تم نے واقعی کمال کر دیا۔'' میں اس سے یہ کہنے ہی والا تھا کہ... اچانک دل مراد اپنا پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔

''کیا بات ہے؟ کیا ہوا؟'' میں نے قدرے گھبرا کے پوچھا۔

''پتا نہیں۔'' وہ بولا۔ ''شو کے آغاز سے ہی میں اپنے پیٹ میں تکلیف محسوس کرنے لگا تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے، پیٹ میں آگ لگی ہوئی ہے۔''

''ممکن ہے بدہضمی ہو گئی ہو۔'' میں نے خیال آرائی کی۔

''ایک منٹ۔'' معاً خرم پُرجوش لہجے میں بول پڑا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ تمہارے پیٹ میں مروڑ ہو رہی ہے اور آگ سی لگی ہوئی محسوس ہو رہی ہے؟''

جواب میں دل مراد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''اور تمہیں بے حد شدید پیاس بھی لگ رہی ہے؟''

دل مراد نے دوبارہ اثبات میں سر ہلایا۔

''انسپکٹر!'' خرم میری جانب مڑا۔ ''بہتر ہو گا کہ اسے فوراً ہی اسپتال لے جانے کا بندوبست کرو۔ فوراً... کسی نے اسے سنکھیا کھلا دی ہے۔''

''حمق۔'' میں نے کہا۔ ''ہم نے شروع سے آخر تک اس پر نگاہ رکھی ہوئی ہے۔ کسی کو اسے سنکھیا کھلانے کا موقع ہی کب ملا ہے؟ ہاں، یہ ممکن ہے کہ ہماری آمد سے پہلے ہی کوئی یہ حرکت کر گزرا ہو۔''

''مجھے آپ کے خیال سے اتفاق ہے۔'' دل مراد نے کہا۔ ''شاید اس کی وجہ بدہضمی ہے۔''

''ہرگز نہیں۔'' خرم کا لہجہ اٹل اور مستحکم تھا۔ ''یہ علامتیں سنکھیا خورانی کی ہیں، بدہضمی میں اتنی شدید پیاس نہیں لگتی۔ بہتر ہے کہ اسے جلد از جلد اسپتال بھیج دیا جائے، ڈاکٹر خود تشخیص کر لیں گے۔''

میں اس کا خیال رد کرنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ معاً مجھے اس کی سابقہ خدمات یاد آ گئیں۔ اس کے قیاسات پہلے بھی کئی موقعوں پر سو فیصد درست ثابت ہوئے تھے۔

''ممکن ہے تمہارا قیاس درست ہو۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا اور فوراً ایمبولینس کا بندوبست کرنے کے لیے وہاں موجود ایک خدمت گار کو اسپتال فون کرنے کا کہا پھر اس کی طرف متوجہ ہوا۔

''سوچ کر بتاؤ کہ تم نے سب سے پہلے کب اپنے پیٹ میں درد اور جلن محسوس کی تھی؟''

''شو کے آغاز سے تقریباً بیس منٹ بعد۔'' اس نے جواب دیا۔ ''لیکن میرا خیال ہے کہ تم رائی کا پہاڑ بنا رہے ہو۔''

چند ہی منٹ بعد مذکورہ خدمت گار نے بتایا کہ ایمبولینس پہنچنے والی ہے۔

دل مراد کی حالت پہلے سے ابتر ہونے لگی تھی۔ اس وقت سلیم خان کمرے میں داخل ہوا اور اپنے باس کی علالت

کا سن کر بدحواس ہو گیا۔ وہ ڈاکٹر کو بلانے کے لیے جانا چاہتا تھا کہ ہم نے اسے بتایا، ایمبولینس چند ہی لمحوں میں پہنچنے والی ہے۔ وہ واقعی بے حد پریشان نظر آ رہا تھا۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ فضا ایمبولینس کے سائرن کی آواز سے گونجنے لگی۔ خرم نے باہر جا کر دیکھا اور واپس آ کر ایمبولینس کے پہنچنے کی اطلاع دی۔ اس کے ساتھ اسپتال کے دو اہل کار بھی تھے جنہوں نے اسٹریچر اٹھا رکھا تھا۔ دل مراد اسٹریچر پر لیٹنا نہیں چاہتا تھا لیکن اہل کاروں نے اسے زبردستی لٹا دیا اور روانہ ہو گئے۔ سلیم خان بھی اپنے باس کے ساتھ اسپتال جانا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ مجھے اس کی مدد کی ضرورت تھی کیونکہ وہ واحد شخص تھا اور میں وہ ساز و سامان چیک کرنا چاہتا تھا۔ ایمبولینس کی روانگی کے بعد ہم نے اپنا کام شروع کر دیا۔ میں اس سے پہلے بھی زہر خورانی کے کیس کی تفتیش کر چکا تھا۔ چنانچہ میں نے سب سے پہلے واٹر کولر کا معائنہ کیا۔ میں نے کسی کتاب میں پڑھا تھا کہ سنکھیا کس رقیق شے میں واضح طور پر نظر آتی ہے لیکن پانی آئینے کی طرح صاف اور شفاف تھا۔

''سنولڑکے!'' میں نے سلیم کو مخاطب کیا۔ ''کیا ہماری آمد سے پہلے دل مراد نے باہر جا کر کسی ہوٹل میں چائے یا کوئی اور مشروب پیا تھا؟''

سلیم خان نے ایک لمحہ غور کیا اور پھر بے حد پُرجوش لہجے میں چیخ کر بولا۔

''ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا تھا۔ وہ آپ لوگوں کی آمد سے تقریباً بیس منٹ پہلے باہر گئے تھے اور جاتے ہوئے کہہ گئے تھے کہ چائے پینے جا رہا ہوں۔ آپ نے بالکل درست سوچا۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا کر اس کا شانہ تھپتھپایا۔ لڑکا خاصا ذہین تھا اور مجھے اس سے کافی مدد ملنے کی توقع تھی۔

''وہ چائے پینے کہاں گیا تھا؟'' میں نے اس سے دریافت کیا۔

''یہ انہوں نے نہیں بتایا تھا لیکن میرا خیال ہے کہ اسی اطراف میں واقع کسی ہوٹل میں گئے ہوں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور وہیں کسی نے اس کی چائے میں سنکھیا ملا دی ہو گی۔'' میں نے کہا۔ ''اس نے ہوٹل کی نشاندہی نہ کر کے حماقت کی لیکن خیر... ہم اطراف کے سارے ہوٹلوں کو چیک کر کے یہ پتا چلانے کی کوشش کریں گے کہ اسے کس ہوٹل میں سنکھیا دی گئی ہے۔ ممکن ہے وہ خودکشی کرنا چاہتا ہو اور اس نے کسی کو اپنے اس ارادے سے آگاہ کرنا پسند نہ کیا ہو۔'' میں نے خیال آرائی کی۔

''اوہ نہیں، وہ خودکشی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ میں ایسا نہیں سمجھتا... لیکن...'' وہ ایک لمحے کے لیے رک کر سوچنے لگا پھر ذرا ہچکچاتے ہوئے بولا۔ ''آج کل کاروبار کچھ نرم ہے۔''

''ہوں۔'' میں نے ہنکارا بھرا۔ ''میرا خیال ہے کہ میں کسی نکتے پر پہنچ رہا ہوں۔ اچھا آؤ... اب ذرا اس کے ساز و سامان کی تلاشی لی جائے۔''

''ساز و سامان کی تلاشی لینا وقت برباد کرنے کے مترادف ہو گا۔'' خرم نے کچھ سوچنے کے انداز میں کہا۔

''پھر بھی یہ ضروری ہے۔'' میں نے کہا اور ہم سامان کی تلاشی لینے لگے۔ میں نے زندگی میں آج تک اتنے سارے صندوق اور عجیب و غریب چیزیں نہیں دیکھی تھیں لیکن یہ تلاش بے سود ثابت ہوئی۔ سنکھیا کہیں سے بھی برآمد نہیں ہو سکی۔ اچانک میرے ذہن میں ایک خیال رینگ گیا۔

''ارے سنو۔'' میں چونک کر سلیم خان کی جانب مڑا۔ ''وہ دو لڑکیاں کہاں گئیں جنہیں اس نے تلوار سے دو ٹکڑے کر کے غائب کر دیا تھا؟''

''کیوں؟ وہ دونوں تو شو ختم ہوتے ہی رخصت ہو گئی تھیں اور میرے خیال میں اپنے گھروں میں ہوں گی۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''اوہ... ہاں! لیکن مجھے یقین ہے کہ اس واقعے سے ان دونوں کا گہرا تعلق ہے۔'' میں نے کہا اور خرم سے مخاطب ہو کے بولا۔ ''خرم! تم اس لڑکے سے ان دونوں لڑکیوں کے نام اور پتے معلوم کر کے ہیڈ کوارٹر فون کرو اور ان سے کہو کہ ان لڑکیوں کو فوراً جمشید نگر تھانے میں طلب کریں۔''

''ایک منٹ، انسپکٹر۔'' خرم بول اٹھا۔ وہ ایک لمحے قبل ہی کمرے سے نکل گیا تھا اور اس وقت منیجر کے کمرے کی طرف سے تیز تیز قدم اٹھاتا چلا آ رہا تھا۔ ''میں نے ابھی اسپتال فون کر کے ان سے مریض کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ اسے سفید سنکھیا دی گئی ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ قریب المرگ ہے۔''

''اوہ میرے خدا۔'' سلیم خان چیخ پڑا۔ ''مجھے اس وقت اس کے بستر کے قریب ہونا چاہیے، ہر حالت میں ہونا چاہیے۔''

''میں جانتا ہوں کہ حالات بہت گمبھیر ہیں۔'' میں

نے اسے ملائم لہجے میں مخاطب کیا۔ ''لیکن وہاں سے زیادہ یہاں تمہاری ضرورت ہے۔ ہم تمہاری مدد سے قاتل تک پہنچنا چاہتے ہیں... خرم! ان لڑکیوں کی تفصیل معلوم کرو، میں باہر جا کر اس کافی ہاؤس کا پتا چلاتا ہوں۔''

''کیا میں ایک مشورہ دے سکتا ہوں؟'' خرم نے کہا۔

''میرے خیال میں ان لڑکیوں اور کافی ہاؤس پر ایک لمحے کے لیے خاک ڈالو۔ میرے ذہن میں ایک تجویز ہے، کیا میں اس پر عمل کر سکتا ہوں؟''

میں چند لمحوں کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ وہ ایک ذہین شخص تھا، چنانچہ میں نے اسے اجازت دے دی اس کا چہرہ جوشِ مسرت سے دمکنے لگا۔

''سلیم!'' اس نے دل مراد کے نائب کو مخاطب کیا۔ ''مجھے آج رات پیش کیے جانے والے شو کے سارے آئٹم یاد ہیں... لیکن کیا تم انہیں میرے سامنے ترتیب وار دہرا سکتے ہو؟''

سلیم نے اپنا ماتھا سہلا کر اثبات میں سر ہلایا اور بولا۔ ''سب سے پہلے تاش کے پتوں کا کرتب، پھر سگریٹ، اس کے بعد بلیئرڈ کی گیند اور پھر موتیوں کی مالا کا کرتب، پھر جادوئی صندوقوں کا تماشا... اور پھر...''

''بس بس... یہ کافی ہے۔'' خرم نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''شکریہ۔''

پھر وہ میری جانب متوجہ ہوا۔ ''انسپکٹر! میں چند لمحوں کے لیے باہر جا رہا ہوں اور تم سے محض اتنی سی گزارش ہے کہ صبر و تحمل سے میری واپسی کا انتظار کرو۔ شاید میں اس طرح تمہاری مدد کر سکوں۔''

''اگر تم یہ پتا لگانے جا رہے ہو کہ دل مراد نے کس کافی ہاؤس میں کافی پی تھی۔'' میں نے کہنا شروع کیا۔ ''تو...''

''میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔'' اس نے میری بات کاٹ دی۔ ''میرے ذہن میں اس کے علاوہ کچھ ہے لیکن میں اس وقت نہیں بتا سکتا۔ میں جلد ہی واپس آ جاؤں گا۔''

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا تو وہ رخصت ہو گیا۔

☆☆☆

انتظار کے لمحے طویل ہونے لگے تھے اور میری پریشانی میں لمحہ بہ لمحہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ سلیم خان کھڑکی کے پاس مغموم کھڑا تھا۔ میں نے اپنی رسٹ واچ پر نگاہ ڈالی۔ بارہ بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے جبکہ خرم ساڑھے گیارہ بجے رخصت ہوا تھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا منیجر کے کمرے کی جانب بڑھ گیا۔ میں نے وہاں سے اسپتال فون کیا اور انہوں نے مجھے بتایا کہ دل مراد نے دم توڑ دیا ہے۔ ڈریسنگ روم میں واپس جاتے ہوئے میں واقعی پریشان تھا۔ مجھے خرم کو اس طرح جانے کی اجازت نہیں دینا چاہیے تھی۔ اب یہ قتل کیس بن گیا تھا۔ اگر وہ دو لڑکیاں ملزم ثابت ہوتیں اور میں ان پر ہاتھ نہ ڈال سکتا تو زبردست مشکلات میں گھر سکتا تھا۔ میرا ''صاحب'' مجھے نہیں چھوڑتا اور ہیڈ کوارٹر والے میری پٹی اتروا کے مجھے کوارٹر گارڈ کر سکتے تھے یا پھر میرا تبادلہ... کسی دور دراز علاقے میں یقینی ہوتا۔ پھر میری کوئی مدد نہیں کر سکتا تھا۔ ابھی میں ان دونوں لڑکیوں کو گرفتار کرنے کی غرض سے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ خرم تیزی سے کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے مسرت چھلکی پڑ رہی تھی جبکہ میرے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔

''ایک منٹ۔'' وہ میرے کچھ کہنے سے قبل ہی بول پڑا۔ ''میں... میں ایک چیز دیکھنا چاہتا ہوں۔'' وہ یہ کہتا ہوا، دل مراد کے ایک صندوق کی جانب بڑھ گیا اور اس کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکنے کے بعد ہماری جانب مڑا پھر سلیم خان کی جانب انگلی اٹھائی۔ ''یہ رہا تمہارا مجرم۔'' اس نے جیسے دھماکا کیا۔

سلیم خان ایک بھنچی بھنچی سانس لے کر ہماری جانب مڑا۔ اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔

''کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟'' میں نے برہمی سے کہا۔ ''یہ لڑکا اپنے باس کے غم میں دل گرفتہ ہو رہا ہے اور تم اس پر قتل کا الزام لگا رہے ہو؟ یہ شروع سے آخر تک ہماری نگاہ

باقی باتیں

دو خواتین کو بیس بیس سال قید کی سزا ہوئی۔ جیل میں دونوں کو ایک ساتھ رکھا گیا۔ سزا پوری ہونے کے بعد دونوں کو قید سے نجات ملی تو جیل سے باہر آتے ہوئے ایک نے دوسری خاتون سے کہا۔ ''اچھا بہن... اب باقی باتیں گھر پہنچنے کے بعد فون پر ہوں گی۔''

سکھر سے صفیہ رشید کی شوخی

میں تھا، ہمیں کسی اور نکتے پر غور کرنا پڑے گا۔ مجھے ابھی ابھی معلوم ہوا ہے کہ دل مراد مر گیا ہے۔''

''ہاں، میں جانتا ہوں۔ میں نے اسپتال فون کر کے دریافت کیا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اور میں یہ ثابت کر سکتا ہوں کہ سلیم خان ہی قاتل ہے۔''

''ٹھیک ہے، ثابت کرو۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی۔

''ہر شے، اسی کے قاتل ہونے کا اشارہ کرتی ہے۔'' وہ بولا۔ ''جب میرے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے سنکھیا کس طرح کھلائی گئی ہوگی تو فوراً ہی یہ میری نگاہوں میں مشکوک ہو گیا۔ سفید سنکھیا فوراً ہی اثر انداز ہوتی ہے اور پیٹ میں شدید جلن شروع ہو جاتی ہے۔ اس سے قبل کہ یہ خون میں شامل ہو، اکثر اس جلن کی شدت سے ہی انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسے یہ زہر ہماری یہاں آمد سے قبل نہیں دیا گیا تھا۔ خودکشی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور سنکھیا تلاشی کے باوجود یہاں سے برآمد نہیں ہو سکی ہے۔ یہ بھی نہ بھولو کہ ہماری آمد کے بعد سے، شو کے اختتام تک دل مراد نے کوئی شے کھائی تھی اور نہ ہی کچھ پیا تھا۔ لہٰذا یہ سنکھیا کسی اور ہی ذریعے سے اس کے پیٹ میں پہنچائی گئی تھی۔ جب میں نے اس نکتے پر غور کیا تو دو ایک باتیں سامنے آئیں کہ اس نے چند سگریٹ اپنے منہ میں رکھے تھے۔ دوسرے موتیوں کی وہ مالا... موتی کافی بڑے تھے اور جب میں نے مزید غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ انہی موتیوں میں ایک سفید سنکھیا کی گولی تھی جو کہ موتیوں کو منہ میں رکھ کر گردش دینے کے دوران پگھل کر اس کے حلق سے نیچے اتر گئی۔ چونکہ یہ بے مزہ ہوتی ہے لہٰذا دل مراد کو احساس تک نہ ہو سکا اور یہی نکتہ سلیم خان کو مجرم ثابت کرتا ہے کیونکہ موتیوں کی اس مالا تک صرف اس کی رسائی تھی۔'' وہ ایک لمحے کے لیے خاموش ہوا اور پھر دوبارہ گویا ہوا۔ ''اس فیصلے پر پہنچنے کے بعد میں نے مختلف جگہوں پر فون کر کے معلومات حاصل کیں، میرے علم میں یہ بات آئی ہے کہ سلیم خان کا باپ راجا خان... ایک جرائم پیشہ آدمی تھا۔ ایک دو سال قبل جب دل مراد ہمارے لیے... یعنی پولیس کے لیے مخبری کرتا تھا تو اسی کی نشاندہی پر راجا خان کو گرفتار کیا گیا تھا۔ چنانچہ اس لڑکے سلیم خان نے اس سے اپنے باپ کا انتقام لینے کی ٹھانی اور کسی طرح اس کا نائب بننے میں کامیاب ہو گیا تاکہ اس سے انتقام لے سکے اور اسے اپنے ارادے میں ناکامی نہیں ہوئی۔''

''لیکن اس نے اسے پہلے ہی قتل کیوں نہ کر دیا؟'' میں نے ایک نکتہ اٹھایا۔ ''یہ تو ایک سال سے اس کے ساتھ تھا۔''

''دراصل یہ ہماری... یعنی پولیس کی موجودگی میں اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانا چاہتا تھا تاکہ اس پر کسی کا شبہ نہ جا سکے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو فوراً مشکوک قرار پاتا لیکن اب جبکہ پولیس اس کے سامنے موجود تھی اور انہیں بھی یقین تھا کہ یہ حرکت اس نے نہیں کی تو اندازہ کرو کہ اس نے کتنی ذہانت کا ثبوت دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہی اسے دھمکی آمیز تحریریں ارسال کرتا رہا تھا مگر دل مراد نے انہیں درخور اعتنا نہیں سمجھا اور کسی محافظ کی ضرورت محسوس نہیں کی... جبکہ یہ چاہتا تھا کہ کسی محافظ کی موجودگی میں یہ حرکت کرے چنانچہ اس نے اپنی دھمکی کو مزید سخت کر دیا اور اس دفعہ قتل کی دھمکی دے ڈالی تاکہ دل مراد اپنی جان کی حفاظت کے خیال سے کسی محافظ کی درخواست کرے۔ اس کے بعد اس نے حسبِ منشا اپنے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا اور تم دیکھ رہے ہو کہ اسے قاتل ثابت کرنا آسان کام نہیں ہوا... یہ دیکھو۔'' اس نے صندوق سے وہ مالا نکال کر دکھائی اور جب ہم نے اس کا بہ غور جائزہ لیا تو واقعی اس میں ایک موتی کم تھا۔

''تم پر لعنت ہو۔'' اچانک سلیم خان گرج اٹھا اور ہم نے اسے حیرت سے دیکھا تو اس کے ہاتھ میں ایک سیاہ ریوالور دبا ہوا تھا۔ ''اگر تم نہ ہوتے تو میں اپنے ارادے میں کامیاب ہو چکا ہوتا۔ اب میں تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔'' اس نے خرم کو للکارتے ہوئے کہا۔

میں آپ کو خرم کے پھرتیلے پن سے پہلے ہی آگاہ کر چکا ہوں لیکن شاید آپ بھول گئے، وہ اب تک ہم سے بہ ظاہر قطعی بے نیاز تاش کے پتوں سے کھیل رہا تھا لیکن پھر اچانک ہی جیسے برق سی لہرائی۔ وہ یکبارگی اپنی جگہ سے تڑپ کر اچھلا اور اگلے ہی لمحے اس کا بھرپور مکا سلیم خان کے جبڑے پر پڑا۔ سلیم خان کا ریوالور اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر واٹر کولر سے ٹکرایا اور پھر صندوق سے ٹکرا کر نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ سلیم خان الٹ کر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ میں نے جلدی سے بڑھ کر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دی۔ گویا ہم نے دل مراد کے قتل کے بیس ہی منٹ کے اندر اس کے قاتل کو گرفتار کر لیا تھا۔

مارپا بیڈ پر بیٹھی دھوئیں کے مرغولے اڑا رہی تھی۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جبکہ دوسرے ہاتھ سے وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی سے بے خیالی میں کھیل رہی تھی۔ ٹائی کی گرہ خاصی ڈھیلی تھی۔

اتنے میں رچرڈ باتھ روم سے باہر آ گیا۔ اس نے اپنی کمر کے گرد ایک تولیا لپیٹا ہوا تھا۔ ''کیا تم شاور لو گی؟''

مارپا نے اپنی نظروں کا رخ رچرڈ کی جانب پھیرتے ہوئے سگریٹ کا ایک لمبا کش لیا اور اپنے بائیں پیر میں موجود پتلی ایڑی کے اونچے سرخ سینڈل کو اچھالتے ہوئے بولی۔ ''نہیں۔''

رچرڈ نے فرش پر گری ہوئی اپنی باکسر شارٹس کو اٹھایا اور مارپا کی جانب پیٹھ کرتے ہوئے اسے تولیا کے اندر سے پہننے لگا۔ ''میرے سامنے لباس پہننے سے شرم آ رہی ہے؟ لیکن پندرہ منٹ پہلے تو تمہیں کوئی شرم نہیں آ رہی تھی؟''

کمرے کی فضا میں تناؤ کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ رچرڈ کا منہ بن گیا۔ ''تم ناراض لگ رہی ہو؟''

مارپا نے سائڈ ٹیبل پر موجود کافی کے کپ میں سگریٹ کی راکھ جھاڑتے ہوئے کہا۔ ''میں بھلا ناراض کیوں ہوں؟ اس لیے تم نے موٹیل کے اس کریہہ کمرے کا انتخاب کیا ہے؟ اس لیے کہ اب تم روانہ ہو جاؤ گے؟ اس لیے آج کی رات تم میرے پاس ہونے کے بجائے اس کے پاس ہو گے؟''

''دیکھو... غصہ تمہارے وجود سے پھوٹ رہا ہے۔'' رچرڈ نے پتلون پہنتے ہوئے کہا پھر بیڈ کے کنارے پڑی ہوئی اپنی قمیص اٹھا کر پہنی اور اس کے بٹن بند کرنے لگا۔

''تم اسے کب چھوڑ رہے ہو، رچرڈ؟'' مارپا نے کہنی کے سہارے بیڈ پر لیٹتے ہوئے کہا اور چھت کی جانب دھوئیں کا ایک مرغولہ چھوڑ دیا۔

جب رچرڈ بیڈ پر بیٹھا تو میٹرس کے اسپرنگ چرچرا اٹھے۔ اس نے باری باری اپنے موزے پہنے اور جوتوں کی تلاش میں بیڈ کے نیچے نظریں دوڑانے لگا۔ ''ابھی یہ بات مت کرو۔'' اس نے مارپا سے کہا۔

مارپا نے سگریٹ کا آخری کش کھینچا اور پھر اسے کپ میں گرا دیا۔ کافی میں گرتے ہی سگریٹ کے انگارے نے سسکاری سی لی اور بجھ گیا۔ ''تو پھر یہ بات کب کروں؟''

رچرڈ نے دونوں کہنیاں اپنی رانوں پر ٹکا دیں اور معافی کے انداز میں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''مارپا...!''

''میرا نام مت لو۔'' مارپا نے بیڈ پر لمبی تانتے ہوئے اپنا

مختصر پیرائے میں ایک سلگتی بھڑکتی ناقابل فراموش کتھا

دوسری عورت

سلیم انور

حسد اور انتقام کی کوئی حد نہیں.... اس فتنہ گر کا قصہ جسے اپنے سوا کسی دوسرے کا وجود گوارا نہیں تھا...

ایک ہاتھ سر کے نیچے رکھ دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی سے کھیلنے لگی۔

رچرڈ نے ایک آہ بھری اور اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر اپنی قمیص کو اِن کرنے کے بعد بیلٹ باندھنے لگا۔

ماریا نے گلے میں پڑی ہوئی ٹائی اتاری اور اسے اپنے پرس میں رکھتے ہوئے بولی۔ ”اب مجھ سے مزید یہ نہیں ہو گا۔“ اس نے یہ کہہ کر بیڈ سے نیچے چھلانگ لگائی اور ایک جھٹکے سے اپنا سرخ ساٹن کا لباس اٹھا کر پہن لیا اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے لباس کی عقبی زپ بند کر دی۔

”میں تم سے محبت کرتا ہوں لیکن میں اسے چھوڑ نہیں سکتا۔“ رچرڈ نے اپنا کوٹ اٹھایا اور اپنے بازو باری باری اس کی آستینوں میں ڈالتے ہوئے بولا۔ ”تم سمجھتی کیوں نہیں ہو؟“

ماریا نے غراتے ہوئے کہا۔ ”اگر تمہیں مجھ سے محبت ہے تو تمہیں اسے چھوڑنا ہوگا۔“

رچرڈ نے ایک طویل آہ بھری اور بے بسی کے عالم میں بولا۔ ”مکان اس کے نام ہے، کاروبار اس کے نام ہے، سب ہی کچھ اس کے نام ہے... اگر میں نے اسے چھوڑ دیا تو ان سب سے محروم ہو جاؤں گا۔ تمہیں یہ بات بہ خوبی معلوم ہے۔“

ماریا نے اپنا پرس اٹھا لیا۔ ”اگر یہ سب چیزیں اتنی ہی اہم ہیں تو پھر انہیں اپنی تحویل میں لینے کا کوئی راستہ ڈھونڈو اور اس عورت سے چھٹکارا حاصل کر لو۔“

رچرڈ نے کمرے کا دروازہ کھول دیا۔ باہر کی مرطوب فضا میں تاریکی پھیل چکی تھی اور پارکنگ لاٹ میں نیون سائن جگ مگ کر رہے تھے۔ ”یہ اتنا آسان نہیں ہے۔“

”یہ بہت آسان ہے، رچرڈ... بہت آسان ہے۔ لاکھوں طریقے ہیں جن سے چھٹکارا حاصل کیا جا سکتا ہے۔ حادثات تو ہر وقت ہی ہوتے رہتے ہیں۔“ ماریا نے اسے ایک طرف دھکیلتے ہوئے کہا۔

رچرڈ اسے گھورتا رہ گیا پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ”میں یہ نہیں کر سکتا۔ وہ میری...“

ماریا تیزی سے گھوم گئی۔ ”وہ تمہاری ترجیح ہے؟“

رچرڈ نے تیزی سے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور سمجھانے کے انداز میں بولا۔ ”نہیں، نہیں۔ وہ میری ترجیح نہیں ہے۔ میں اس معاملے میں کچھ نہ کچھ سوچوں گا۔“ یہ کہتے ہی اس نے اپنا چہرہ ماریا کے چہرے پر جھکانا چاہا تو اس نے بل کھاتے ہوئے اپنا چہرہ دوسری طرف گھما لیا۔

رچرڈ نے شکست خوردہ انداز میں ایک آہ بھری اور بولا۔ ”اب تم سے اگلے ہفتے ملاقات ہوگی۔“

ماریا نے خود کو رچرڈ کی گرفت سے آزاد کرا لیا اور قدرے تلخ لہجے میں بولی۔ ”پہلے اپنی ترجیحات درست کر لو پھر ملنے کی بات کرنا۔“

☆☆☆

جب ماریا مکان کے نزدیک پہنچی خوب اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اس نے سڑک پر دونوں طرف نگاہ ڈالی۔ دور دور تک کوئی ذی روح نظر نہیں آ رہا تھا۔

ماریا نے مکان کے دروازے پر دستک دی۔

اندر سے کسی عورت کی آواز آئی۔ ”کون؟“ ساتھ ہی دروازہ ہلکا سا کھل گیا۔

”ہیلو! میں ماریا ہوں اور آفس میں رچرڈ کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ کیا وہ گھر پر موجود ہے؟“

عورت نے دروازہ پورا کھول دیا۔ ”اوہ... لیکن اس نے تو کسی مہمان کی آمد کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔“

”اسے میری آمد متوقع نہیں تھی۔ میں اس کے لیے ایک پروجیکٹ مکمل کر رہی ہوں... میں نے سوچا کہ راستے میں اسے دکھاتی چلوں۔“

”تو پھر اندر آ جاؤ اور چائے کا ایک کپ پی لو، جب تک وہ بھی آ جائے گا... اگر تمہیں دیر نہ ہو رہی ہو اور انتظار کی زحمت گوارا کر سکتی ہو؟“ یہ کہہ کر وہ پلٹی اور اندر چلی گئی۔

”ٹھیک ہے۔“ ماریا نے اندر داخل ہوتے ہوئے کہا اور ساتھ ہی دروازہ بھی بند کر دیا۔

”میں درحقیقت تم سے ملنے کے لیے آئی ہوں۔“ ماریا نے اس عورت کے عقب میں پہنچ کر کہا۔ اس دوران میں وہ اپنے پرس میں سے ٹائی نکال چکی تھی۔

”مجھ سے؟“ عورت نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔“ ماریا نے بجلی کی سی سرعت سے ٹائی کا پھندا عورت کے گلے میں ڈال دیا اور پوری طاقت سے اس کی گرہ کھینچتے ہوئے عورت کو بے بس کر دیا... اور اس وقت تک گرفت ڈھیلی نہیں کی جب تک عورت ہاتھ پیر مارنے کے بعد بے جان نہیں ہو گئی۔

ماریا نے تسلی کرنے کے بعد اس کی گردن میں پڑی ہوئی ٹائی کی گرہ ڈھیلی کی اور ٹائی نکال کر واپس اپنے پرس میں رکھ لی۔

پھر جس خاموشی سے وہ گھر میں داخل ہوئی تھی اسی خاموشی سے نکل کر اپنی راہ چل دی۔

اسے پورا یقین تھا کہ رچرڈ کی ماں کو ہلاک کر کے اس نے رچرڈ کے سارے مسائل حل کر دیے تھے۔

انصاف

تنویر ریاض

ایک مقولا ہے کہ انصاف میں تاخیر انصاف سے انکار... یقیناً انصاف کے تقاضے پورے نہ ہوں تو عدم تحفظ کا احساس پروان چڑھتا ہے... جو بڑھتے بڑھتے انسان کو قانون کی حد بندیوں سے ماورا فیصلہ کرنے پر مجبور کر دیتا ہے... عدل و انصاف کا یادرہ جانے والا ایک کڑا امتحان۔

مغرب سے برآمد تازہ شاہکار جس میں مشرقی معاشرے کی جھلک نمایاں ہے

وہ گزشتہ چار گھنٹے سے اس پہاڑی پر موجود تھا جہاں سے نیچے قبرستان کا منظر صاف نظر آ رہا تھا۔ ہزاروں گز پر پھیلے ہوئے اس قبرستان میں دور دور تک قبروں کے کتبے دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے اپنے لیے گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک جگہ منتخب کی اور ترپال پھیلا کر اس پر پیٹ کے بل اوندھا لیٹ گیا۔ یہاں سے وہ سینٹ مائیکل کے قبرستان کا اچھی طرح جائزہ لے سکتا تھا۔ گو کہ ابھی ستمبر کا مہینا شروع ہوا تھا لیکن خنکی محسوس ہو رہی تھی۔ اس بار خزاں کا موسم جلد آ گیا تھا اور درختوں سے گرنے والے پتے اس کے جسم کو ڈھانپ رہے تھے۔ اس نے جان بوجھ کر ان پتوں کو ہٹانے

کی کوشش نہیں کی تاکہ وہ اپنے آپ کو چھپا سکے۔ دائیں جانب اس کی رائفل رکھی ہوئی تھی جس پر ایک طاقتور دوربین نصب تھی جبکہ بائیں جانب ربر کی بوتل میں پانی رکھا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ربر کا ایک پائپ منسلک تھا جس کا دوسرا سرا اس کے بائیں کندھے سے بندھا ہوا تھا۔ جب بھی اسے پیاس محسوس ہوتی تو وہ سر کو تھوڑا سا گھما کر اس پائپ کے ذریعے پانی پینے لگتا۔ اس نے گوریلا سپاہیوں جیسا لباس پہن رکھا تھا جو برسوں پہلے اسکاٹ لینڈ کے ...لوگوں نے ایجاد کیا تھا۔ اس پر جھاڑیاں، پتے، گھاس اور شاخیں بنی ہوئی تھیں جسے عام زبان میں کیموفلاج کہتے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ ان جھاڑیوں کو کاٹنے کے بعد ہی کوئی شخص اس تک پہنچ سکتا ہے۔

اسے دائیں جانب کچھ ہلچل محسوس ہوئی تو وہ چوکنا ہو گیا۔ دائیں جانب سے گاڑیوں کا ایک قافلہ قبرستان کی جانب آرہا تھا۔ تمام گاڑیاں بالکل اس کے سامنے آکر رک گئیں۔ وہ انہیں اچھی طرح دیکھ سکتا تھا۔ ان میں ایک مقامی پولیس کی گاڑی تھی جبکہ دوسری کا تعلق کاؤنٹی کے شیرف ڈپارٹمنٹ سے تھا۔ اس کے پیچھے گہرے نیلے رنگ کی دو عدد وینز اور ایک پیلے رنگ کی وین تھی جبکہ سب سے آخر میں ہلکے براؤن رنگ کی وین آئی جس کا تعلق بھی شیرف کے محکمے سے تھا۔

اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنی رائفل اٹھالی۔ گاڑیوں کے دروازے کھلنا شروع ہوئے اور ان میں سے کئی پولیس والے اور شیرف کے معاونین باہر آنے لگے جبکہ بڑی وین سے چودہ مرد اور عورتیں برآمد ہوئیں۔ ان میں سے کچھ نے سوٹ اور بقیہ لوگوں نے جینز اور قمیصیں پہن رکھی تھیں۔ نیلے رنگ کی وین سے ایک بوڑھا شخص باہر آیا جبکہ دوسری گاڑی سے دو مرد اور دو عورتیں اترتی ہوئی دکھائی دیں۔ البتہ سب سے پیچھے والی وین کے دروازے ابھی تک نہیں کھلے تھے اور وہ بے چینی سے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

پولیس والے اور دیگر تمام افراد ایک جانب چل دیے اور ایک بڑے کتبے کے پاس رک گئے جو صنوبر کے درختوں سے گھرا ہوا تھا۔ ان کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کا انتظار کر رہے ہیں۔ بالآخر آخری گاڑی کے دروازے بھی کھل گئے اور ان میں سے شیرف کے دو معاونین باہر آئے اور انہوں نے گاڑی کا عقبی دروازہ بھی کھول دیا۔ وہ اس طرح کھڑے ہوئے تھے کہ کتبے کے پاس کھڑے ہوئے لوگوں کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ دونوں معاونین اپنے ہاتھوں اور بازوؤں سے کچھ اشارے کر رہے تھے پھر انہوں نے بھی چلنا شروع کر دیا۔ ان کے درمیان ایک شخص منہ بناتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ اس نے ڈارک گرے سوٹ پہن رکھا تھا اور سفید قمیص پر نیلے رنگ کی ٹائی باندھ رکھی تھی۔ جوتے پالش کیے ہوئے تھے جبکہ اس کے ہاتھ پاؤں آزاد تھے اور وہ کسی طرح بھی قیدی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ تازہ ہوا میں سانس لیتے ہوئے خوشی محسوس کر رہا تھا۔

خوشی تو نشانے باز کو بھی ہو رہی تھی۔ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو چکی تھیں اور شکار اس کی زد میں آگیا تھا۔ اس نے دوربین سے دیکھا اور اپنے شکار کے ماتھے کو نشانے پر لے لیا۔

☆☆☆

پولیس وین کے پاس کھڑی ہوئی آفیسر اسٹیفنی نے قریب کھڑی ہوئی وین کا دروازہ کھلتے دیکھا اور اس میں سے جیوری کے اراکین باہر آنے لگے۔ ان میں بارہ باقاعدہ رکن تھے جبکہ دو اراکین کو متبادل کے طور پر شامل کیا گیا تھا۔ وہ سب ایک گروپ کی شکل میں جمع ہو گئے تھے۔ اس گروپ میں ایک جج، دو وکیل صفائی اور دو استغاثہ کے وکیل پہلے سے شامل تھے۔ اسٹیفنی کے برابر میں ہی والٹ پریسٹن کھڑا ہوا تھا جو عہدے کے لحاظ سے سارجنٹ اور اس کا ٹریننگ آفیسر تھا، دوسرے پولیس والے اور شیرف کے معاونین بھی ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔

پریسٹن نے اس کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''کیا بات ہے، تم کچھ خوش نظر نہیں آرہی ہو؟''

''ہاں، میں بالکل بھی مطمئن نہیں ہوں۔''

''اس کی وجہ جان سکتا ہوں؟''

جج، جیوری کے اراکین اور وکیل سب ایک جگہ جمع تھے اور ملزم دو معاونین کے ہمراہ مسکراتا ہوا چلا آرہا تھا جبکہ شیرف کے دونوں معاونین کے چہروں پر تناؤ تھا اور یوں لگتا تھا جیسے وہ ایک ناخوشگوار فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

اسٹیفنی بولی۔ ''تم ٹومی کو یہاں اس لیے لے کر آئے ہو کہ وہ جائے واردات کی نشان دہی کرے جہاں وہ سنگین نوعیت کے جرائم کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کی مسکراہٹ دیکھ کر لگتا ہے کہ جیسے اسے دنیا میں کسی کی پروا نہیں ہے۔''

''کسی حد تم تمہاری بات صحیح ہے۔'' سارجنٹ نے جواب دیا۔ ''اسے اس بات کی فکر نہیں ہے کہ وہ رات کہاں گزارے گا، کھانا کہاں سے کھائے گا اور اگر بیمار پڑ گیا تو ڈاکٹر کے پاس کیسے جائے گا۔ سرکاری مہمان ہونے کے یہی تو فائدے ہیں کہ آدمی ان تمام فکروں سے آزاد ہو جاتا ہے۔''

''لعنت ہے ایسے مہمان پر۔'' اسٹیفنی نے جل کر کہا۔ ''کیا اسے یہ پریشانی نہیں ہوگی کہ اس پر فردِ جرم عائد ہونے والی ہے؟''

''ٹومی جیسے لوگ ان باتوں پر پریشان نہیں ہوتے۔'' پریسٹن نے کہا۔ ''یہ لوگ روز جیتے اور روز مرتے ہیں۔ ان کی زندگی جنگل کی اس مخلوق کی طرح ہے جو اپنی بقا کے لیے ادھر سے اُدھر بھٹکتی رہتی ہے۔ اس کے علاوہ اس نے دو بہترین وکیلوں کا بھی بندوبست کر لیا ہے جو اسے بری کرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

اسٹیفنی نے بے اختیار وکلاء صفائی کی جانب دیکھا۔ ان میں ایک مرد اور ایک عورت تھی۔ وہ دونوں میاں بیوی تھے اور ان کا تعلق مانچسٹر کی ایک مشہور قانونی فرم سے تھا۔ اسٹیفنی تلخی سے بولی۔ ''یہ بات بھی مجھے پریشان کر رہی ہے۔ تمہارے خیال میں ایک عورت، شوہر یا باپ کو اس طرح کے مقدمے میں صفائی کا وکیل بننا چاہیے؟''

سارجنٹ نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''اچھے وکیل کی پہچان ہی یہی ہے کہ وہ اپنے موکل کا کامیابی سے دفاع کرے، اسے جرم کی نوعیت سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ ظاہر ہے کہ ہر وکیل کسی نہ کسی رشتے میں بندھا ہوتا ہے۔ اگر وہ ماں، باپ، بیوی اور شوہر بن کر سوچنے لگے تو بھوکا مر جائے گا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا جرم قابلِ نفرت ہے، وہ ایسے مجرموں کی پیروی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔''

ٹومی کے جرائم کا تصور کرتے ہی اسٹیفنی کو جھرجھری آگئی اور وہ کانپتے ہوئے بولی۔ ''واقعی یہ شخص قابلِ نفرت ہے۔ اس نے اس قبرستان میں ایک درجن سے زیادہ عورتوں پر جنسی حملے کیے۔ یہ مینی اور میسا چوسٹس کی پولیس کو بھی مطلوب ہے کیونکہ اس پر دو افراد کے قتل کا الزام بھی ہے۔ پھر اب چلے تو ایسے شخص کو مقدمہ چلائے بغیر ہی سرِعام گولی مار دوں۔ اتنا بکھیڑا پھیلانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''واقعی یہ شخص قابلِ نفرت ہے۔'' سارجنٹ اس سے اتفاق کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن ہم قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لے سکتے۔ اسے سزا دینا عدالت کا کام ہے۔''

اسٹیفنی نے ایک گہری سانس لی اور بولی۔ ''اس شخص کو اپنے کیے پر کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ دیکھو، کیسی ڈھٹائی سے مسکرا رہا ہے۔''

ٹومی دونوں ہاتھ سینے پر باندھے اپنے وکیلوں سے گفتگو کر رہا تھا جبکہ جیوری کے ارکان اس سے بیس گز کے فاصلے پر کھڑے تھے۔ ان سے کچھ فاصلے پر استغاثہ کے دونوں وکیل بیزار سے نظر آرہے تھے جیسے اس تماشے سے ان کا کوئی تعلق نہ ہو۔ اسٹیفنی نے ایک بار پھر ٹومی کی جانب دیکھا اور منہ بناتے ہوئے بولی۔ ''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسے آزاد کیوں چھوڑ دیا گیا ہے؟ اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے اور نہ ہی پیروں میں بیڑیاں۔''

پریسٹن نے کہا۔ ''اس کے وکیلوں نے اعتراض کیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی صرف اس پر الزام عائد کیا گیا ہے اور اس کے ثابت ہونے تک، وہ معصوم ہی کہلائے گا۔ اسی لیے وین سے اترتے وقت شیرف کے آدمیوں نے اسے گھیر لیا تھا تاکہ وہ جیوری کے اراکین کو نظر نہ آسکے اور اس دوران میں انہوں نے اس کی ہتھکڑیاں کھول دیں۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو جیوری کے ارکان پر اچھا تاثر قائم نہ ہوتا۔''

''میں تمہارے جواب سے مطمئن نہیں ہوں۔'' اسٹیفنی نے کہا۔

''تمہیں اتنی پریشانی کیوں ہو رہی ہے؟''

''وہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر کچھ بھی کر سکتا ہے۔'' اسٹیفنی نے کہا۔ ''فرض کرو وہ دوڑ لگا دے، کار چرا کر بھاگ

بیوی

جدید ترین تحقیق سے پتا چلا ہے کہ بیوی سے پیار بھری باتیں کرنے سے مندرجہ ذیل فائدے ہوتے ہیں:

1- ذہنی اور اعصابی تناؤ دور ہو جاتا ہے۔
2- دل کا دورہ پڑنے کے خطرات 80 فیصد کم ہو جاتے ہیں۔
3- زندگی پُرلطف ہو جاتی ہے۔
4- انسان سارا دن خوشگوار موڈ میں رہتا ہے۔
5- بلڈ پریشر کے مریضوں کو 60 فیصد افاقہ ہوتا ہے۔
6- مزاج کے تروتازہ رہنے سے غصے میں بپھرنے کے امکانات معدوم ہو جاتے ہیں۔
7- جسم میں خون کی پیداوار 10 فیصد بڑھ جاتی ہے۔
8- ہر مسئلے کا حوصلہ مندی کے ساتھ سامنا کرنے کی قوت پیدا ہوتی ہے۔

بس ایک نکتے کا خیال رکھنے کی ضرورت ہے کہ بیوی اپنی نہ ہو۔

(امریکا سے محمود اعجاز کی تحقیق)

جائے یا کسی مصنوعی ہتھیار کے ذریعے جیوری کے رکن یا جج کو یرغمال بنالے تو اس صورت میں ہم کیا کرسکیں گے؟''

پریسٹن نے کچھ نہیں کہا۔ اسٹیفنی سمجھی کہ شاید وہ کچھ زیادہ ہی بول گئی ہے لیکن دوسرے ہی لمحے پریسٹن اس کی جانب جھکا اور سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس کی نگرانی ہورہی ہے۔''

☆☆☆

نشانے باز نے تمام تیاریوں کا جائزہ لیا۔ اب اس کی پوری توجہ اپنے ہدف پر تھی۔ وہ اپنے گردوپیش ..... کی دنیا سے لاتعلق ہوگیا تھا۔ وہ پوری طرح اپنے ہدف پر نظریں جمائے ہوئے تھا۔ اس کی سانس آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ دل کی دھڑکن بھی معمول پر آچکی تھی اور وہ اپنے آپ کو قدرے پُرسکون محسوس کررہا تھا۔ اب اسے اپنا کام نمٹانے کے لیے مناسب موقع کا انتظار تھا۔ اس نے اپنی رائفل لوڈ کر رکھی تھی اور سیفٹی کیچ بھی ہٹا دیا تھا۔ اس کی انگلی ٹریگر پر تھی اور اسے محض دبانے کی دیر تھی۔ اس کا نشانہ بہت پکا تھا اور اس سے پہلے وہ اس رائفل سے ہزاروں راؤنڈ فائر کرچکا تھا۔ انگلی دباتے ہی ایک دھماکا ہوتا اور اس کے شکار کی موت واقع ہوجاتی جو اس وقت بے فکری سے کھڑا قہقہے لگا رہا تھا اور اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوگا کہ موت اس کے کتنے قریب پہنچ چکی ہے۔

عام طور پر یہی کہا جاتا ہے کہ موت کا ایک وقت معین ہے اور خدا کی مرضی کے بغیر ایک پتا بھی نہیں ہل سکتا۔ اس کرائے کے قاتل کو اس فلسفے سے کوئی غرض نہیں تھی۔ وہ تو ان زمینی خداؤں کے احکامات پر عمل کرنے کا پابند تھا جو اپنے طور پر فیصلے کرتے اور لوگوں کے لیے سزائیں تجویز کرتے تھے۔ اسے فخر تھا کہ مشکل ترین ہدف کے لیے اسی کا انتخاب کیا جاتا ہے کیونکہ اسے اس کام کا معقول معاوضہ ملتا تھا۔ اس لیے وہ ان فیصلوں کو درست سمجھنے پر مجبور تھا ورنہ اس کی رائفل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے الماری میں بند ہوجاتی اور وہ دریا کے کنارے مچھلیاں پکڑ کر اپنی گزراوقات کررہا ہوتا۔ اس نے ایک گہری سانس لے کر اپنے شکار پر نظر ڈالی۔ شاید فیصلے پر عمل کرنے کا وقت آگیا تھا۔

☆☆☆

اسٹیفنی نے غور سے سارجنٹ کی طرف دیکھا اور حیران ہوتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہارا مطلب نہیں سمجھی.... نگرانی ہورہی ہے مگر کیسے؟''

پریسٹن نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''تمہیں اندیشہ ہے کہ ٹومی دوڑ لگا دے گا، کار چھین کر فرار ہوجائے گا یا کسی کو یرغمال بنالے گا۔ یہ سب باتیں پہلے سے ہمارے ذہن میں تھیں۔ جب اس کے وکیلوں نے اعتراض کیا تھا کہ جب اسے جائے واردات پر جیوری کے اراکین کے ہمراہ لایا جائے تو اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی نہیں ہونی چاہیے۔ لہٰذا پولیس چیف اور اٹارنی جنرل کے دفتر نے ایک منصوبہ بنایا اگر تم اس کے بارے میں جاننا چاہتی ہو تو تمہیں بہت محتاط رہنا ہوگا۔ تمہاری زبان سے نکلا ہوا ایک لفظ بھی ہمارے لیے مشکلات پیدا کرسکتا ہے۔''

اچانک ہی اسٹیفنی کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ کالج کے زمانے میں تعلیمی اخراجات پورے کرنے کے لیے دو جگہ ملازمت کرتی تھی اور اس کے لیے اس نے دن کا چین اور رات کی نیند قربان کردی تھی لیکن ایک بھیانک رات اس کی زندگی میں ایسا طوفان آیا جو اس کا سب کچھ بہا کرلے گیا اور یوں لگا کہ وہ اپنی منزل تک نہیں پہنچ پائے گی۔ لیکن اس نے اس حادثے کو زندگی روگ نہیں بنایا اور پہلے سے زیادہ محنت کرکے اس مقام تک پہنچ گئی۔

اس نے سر کو جھٹکا اور اعتماد سے بولی۔ ''ہاں، میں محتاط رہوں گی۔''

☆☆☆

نشانے باز نے اپنا سر بائیں جانب گھمایا اور پانی کی نلکی اپنے منہ سے لگا کر ایک لمبا گھونٹ لیا۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کے منہ میں جانے والا نلکی کا سرا کچھ ڈھیلا ہے۔ فی الوقت وہ اپنی توجہ کسی اور جانب نہیں کرسکتا تھا لہٰذا اس نے سوچا کہ وہ بعد میں اسے ٹھیک کرلے گا۔ ایک اچھا نشانے باز ہمیشہ اپنے ساز وسامان کی درستگی کا خیال رکھتا ہے لیکن اس کی زیادہ توجہ اپنی رائفل اور کارتوسوں پر ہوتی ہے۔ بقیہ چیزیں مثلاً لباس یا پانی کی بوتل غیر اہم ہیں اور ان میں الجھ کر وہ کسی خطرے کو دعوت نہیں دے سکتا۔

☆☆☆

پریسٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ٹھیک ہے۔'' اپنی آنکھیں کھلی رکھو لیکن اِدھر اُدھر دیکھنے سے گریز کرو کہ اگر قبرستان میں ایک اور پولیس آفیسر کارل ڈکسن بھی موجود ہے جس کا تعلق اسپیشل گروپ سے ہے۔ تم اسے جانتی ہو۔''

''ہاں لیکن وہ یہاں کیا کررہا ہے؟'' اسٹیفنی نے تجسس کے عالم میں چاروں طرف اپنی نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

''میں تم سے کہہ چکا ہوں کہ اِدھر اُدھر مت دیکھو۔

یہیں کہیں موجود ہوگا لیکن ہم میں سے کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔ ممکن ہے کہ وہ قبرستان سے باہر کسی اونچی جگہ پر اپنی رائفل اور دوربین سمیت موجود ہو۔ میں شرطیہ کہہ سکتا ہوں کہ ٹومی اس کے نشانے کی زد پر ہوگا اور اگر اس نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو کارل گولی چلانے سے بھی دریغ نہیں کرے گا۔''

''کہیں تم مذاق تو نہیں کررہے؟'' اسٹیفنی کو اب بھی یقین نہیں آیا تھا۔

''بالکل نہیں۔ یہ مذاق کرنے کا وقت نہیں ہے۔ کارل کو یہ ذمے داری سونپی گئی ہے کہ ٹومی اگر بھاگنے کی کوشش کرے، کسی کو یرغمال بنائے یا کوئی کار چھین کر فرار ہونے لگے تو کارل فوراً ہی اس کا خاتمہ کردے۔''

اسٹیفنی کو یہ جان کر قدرے سکون محسوس ہوا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''یہ تو بہت زبردست منصوبہ ہے۔''

''اسی سے تم اندازہ لگا سکتی ہو کہ پولیس اس معاملے میں غفلت نہیں برت سکتی۔''

''کیا اس کے وکیلوں کو یہ بات معلوم ہے؟''

''تم بچوں جیسی باتیں کررہی ہو۔'' پریسٹن نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''ہم اپنے پتے کبھی ظاہر نہیں کرتے۔ انہیں ڈھکے چھپے لفظوں میں یہ پیغام دے دیا گیا ہے کہ اگر ٹومی نے کوئی ایسی ویسی حرکت کی تو پولیس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوسکتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ ٹومی تک یہ پیغام پہنچ گیا ہوگا۔''

اسٹیفنی نے ایک بار پھر ٹومی کی طرف دیکھا جو شیرف کے معاونین کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا جبکہ جیوری کے ارکان قبروں کے گرد جمع تھے اور مختلف لوگوں کے بیانات سن رہے تھے۔

''لعنت ہو اس شخص پر۔'' اسٹیفنی نے کراہت سے کہا۔ ''یہ تو بہت بُرا ہوا۔''

''کیا بُرا ہوا؟'' پریسٹن نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''تم کیا کہنا چاہ رہی ہو؟''

''یہ بہت بُرا ہوا کہ ٹومی کو وارننگ مل گئی۔ بہتر ہوتا کہ وہ بھاگنے کی کوشش کرتا اور اس طرح کارل کو اسے نشانہ بنانے کا جواز مل جاتا۔''

''ایک نوجوان لڑکی کے منہ سے ایسے سخت الفاظ سن کر مجھے حیرت ہورہی ہے۔'' پریسٹن نے خوش مزاجی سے کہا۔

اسٹیفنی جھینپتے ہوئے بولی۔ ''اب میں ایک نوجوان لڑکی نہیں بلکہ پولیس آفیسر ہوں اور ان عورتوں کے بارے میں سوچ رہی ہوں جو اس شخص کی درندگی کا نشانہ بنیں.... اور یہ کہ وہ اس کے خلاف گواہی میں کیا کہیں گی۔ یہی کہ وہ سڑک پر جارہی تھیں، جاگنگ کررہی تھیں یا اپنے کسی کام میں مصروف تھیں کہ یہ شخص انہیں ورغلا کر یا زبردستی قبرستان میں لے گیا۔ وہ نہیں جانتی تھیں کہ اس حادثے کے بعد انہیں زندہ رہنا چاہیے یا موت کو گلے لگالیں۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ وہ جیتے جی مرچکی ہیں اور اب انہیں ایک بار پھر زندگی کی طرف واپس آنا ہوگا۔ اس شخص کو دیکھ کر ان کے زخم دوبارہ ہرے ہوجائیں گے اور اب انہیں بھری عدالت میں وہ سب کچھ بتانا ہوگا جسے بیان کرکے وہ اپنی نظروں میں گر سکتی ہیں۔ کوئی بھی شریف عورت بھرے مجمع میں اپنی بربادی کی داستان کس طرح سنا سکتی ہے؟''

پریسٹن کچھ دیر خاموش رہا پھر بولا۔ ''تم ٹھیک کہہ رہی ہو لیکن اب بہت کچھ بدل گیا ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ عدالت میں کس طرح کے سوالات کیے جاتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ ایک عورت گواہی دینے کے لیے آئی تھی تو اس سے انتہائی ذاتی نوعیت کی باتیں پوچھی گئی تھیں۔ مثلاً یہ کہ پہلی بار وہ ڈیٹ پر کب اور کس کے ساتھ گئی تھی۔ شادی سے پہلے کتنے مردوں سے اس کے تعلقات رہے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اب صورتِ حال پہلے سے بہتر ہے اور میرا خیال ہے کہ ان عورتوں کو گواہی دینے میں زیادہ مشکل کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا۔''

اسٹیفنی نے غصے کے مارے مٹھیاں بھینچ لیں۔ یہ کیسا انصاف تھا کہ جس پر ظلم ہوا، اسی سے اس پر ہونے والے ظلم کی داستان مزے لے لے کر سنی جائے؟ اس نے اپنے غصے کو ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ''اگر تمہاری بات پر یقین کرلیا جائے کہ عدالت میں ان عورتوں کے زخموں پر نمک نہیں چھڑکا جائے گا، اس کے باوجود یہ امر کتنا تکلیف دہ ہے کہ ان عورتوں کو یہ منحوس چہرہ ایک بار پھر دیکھنا پڑے گا جس کی تلخ یاد کو وہ بہت پہلے اپنے ذہن سے کھرچ کر پھینک چکی ہیں۔''

''انصاف حاصل کرنے کے لیے تھوڑی بہت قیمت تو ادا کرنا پڑتی ہے۔'' سارجنٹ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

☆☆☆

نشانے باز بڑی بے چینی سے نیچے ہونے والی کارروائی دیکھ رہا تھا۔ جیسے ہی استغاثہ کے وکیل نے اس کتبے کی جانب اشارہ کیا تو جیوری کے تمام اراکین اس جانب متوجہ ہوگئے۔ یہ مقدمے کی کارروائی کا ایک حصہ تھا البتہ ابھی تک کوئی گواہی ریکارڈ نہیں کی گئی تھی۔ فی الحال جیوری کے اراکین کو جائے واردات دکھائی جارہی تھی تاکہ جب

گواہیاں شروع ہوں تو اراکین کے ذہن میں جائے واردات کا نقشہ پوری طرح موجود ہو۔ نشانے باز اس سارے عمل سے اچھی طرح واقف تھا۔ وکیلِ استغاثہ ان درختوں، کتبے اور سڑک کی نشان دہی کرتا جہاں سے ملزم اپنی دوربین کے ہمراہ گزر رہا تھا تاکہ کچھ ایسی چیزوں کا مشاہدہ کر سکے جن کا تعلق اس کے فیلڈ ورک سے تھا۔ وہ نیو ہیمپشائر یونیورسٹی کا طالب علم تھا۔

وکیلِ استغاثہ کو یقین تھا کہ جیوری کے اراکین نے قبرستان کی طرف آنے والی سڑک پر روشنی کی عدم دستیابی کا نوٹس لیا ہوگا۔ وہاں اسٹریٹ لائٹس نہیں تھیں اور نہ ہی قرب و جوار میں کوئی عمارت یا مکانات تھے جہاں کے رہنے والے بتا سکتے کہ اس رات قبرستان میں کیا ہوا تھا۔

اسٹیفنی نے پوچھا۔ ''یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟''

پریسٹن نے کہا۔ ''عام طور پر اس میں زیادہ دیر نہیں لگتی۔ استغاثہ کے وکیل جیوری کے اراکین کو جائے واردات دکھائیں گے اور وہ سر ہلا ہلا کر اپنی دلچسپی کا اظہار کرتے رہیں گے۔ البتہ کوئی سوال نہیں پوچھا جائے گا کیونکہ جیوری کے اراکین صرف جائے واردات کا معائنہ کرنے آئے ہیں۔''

اسٹیفنی نے دیکھا کہ ٹومی اپنی خاتون وکیلِ صفائی سے سرگوشیاں کر رہا ہے۔ اس عورت نے سیاہ سوٹ اور سفید بلاؤز پہن رکھا تھا جبکہ اس کے گلے میں قیمتی موتیوں کا نیکلس بھی پڑا ہوا تھا۔ اسٹیفنی نے سوچا کہ اس عورت کو ذرّہ برابر بھی یہ خیال نہیں کہ وہ ایک دشمن کے لیے کام کر رہی ہے۔ اس کے خیال میں ٹومی تمام عورتوں کا دشمن تھا۔

''اسٹیفنی!'' سارجنٹ نے اسے آواز دی۔

''ہاں۔'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''کیا تمہیں یہاں سے جانے کی جلدی ہے؟''

اسٹیفنی نے ٹومی کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ جیوری کے ارکان ابھی تک گروپ کی شکل میں کھڑے جائے وقوعہ کا معائنہ کر رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی آگے بڑھنے یا گروپ سے الگ ہونے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جیسے انہیں لاشعوری طور پر یہ احساس ہو کہ وہ ایک خطرناک مجرم کے سامنے کھڑے ہوئے ہیں اور ایک دوسرے سے جڑے رہ کر اپنے آپ کو محفوظ تصور کر رہے ہیں۔

اسٹیفنی نے بھویں چڑھائیں اور بولی۔ ''نہیں..... بلکہ میں چاہتی ہوں کہ یہ تماشا جلد ختم ہو جائے۔''

☆☆☆

ایسا لگ رہا تھا کہ تمام کارروائی مکمل ہو چکی ہے اور استغاثہ کے وکیلوں نے بھی جائے واردات کی مکمل طور پر نشان دہی کر دی ہے..... کہ اچانک ہی وہ واقعہ پیش آ گیا جس کی کسی کو توقع نہیں تھی۔ ٹومی دبے پاؤں شیرف کی وین کی طرف بڑھا اور وہاں سے گھوم کر جیوری کے ارکان کے عقب میں پہنچ گیا۔ اس نے ایک خاتون رکن کا بازو پکڑ کر اپنی جانب کھینچا اور اس کے گال پر بوسہ لے لیا۔ وہ ایک خوش شکل لمبے بالوں والی لڑکی تھی جس نے مختصر سا اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسی لمحے نشانے باز تیزی سے حرکت میں آیا۔ اس نے اپنے تھیلے سے..... سائلنسر نکالا اور رائفل میں فٹ کر دیا۔ گزشتہ تجربات سے یہ ثابت ہو چکا تھا کہ یہ سائلنسر کم از کم دو فائروں کے لیے کارآمد تھا جبکہ نشانے باز کو یقین تھا کہ دوسرے فائر کی نوبت ہی نہیں آئے گی، وہ ایک ہی فائر میں اپنے شکار کا کام تمام کر دے گا۔ اس نے ایک بار پھر دوربین کی مدد سے ٹومی کی کھوپڑی کو نشانے کی زد پر لیا اور ٹریگر دبا دیا۔

☆☆☆

اسٹیفنی اپنی وین کی جانب بڑھ رہی تھی کہ اسے ایک آواز سنائی دی جیسے کسی نے کدو پر ہتھوڑی ماری ہو۔ پھر اس نے ٹومی کو منہ کے بل گرتے ہوئے دیکھا۔ شیرف کے معاونین نے اپنے ہتھیار نکال لیے اور وہ چلّا چلّا کر اِدھر اُدھر دوڑتے پھر رہے تھے جبکہ خاتون وکیلِ صفائی کی آواز ان سے بھی بلند تھی اور وہ زور زور سے چیخ رہی تھی۔ پریسٹن نے اسٹیفنی کو بازو سے دھکیلا اور چلّاتے ہوئے بولا۔ ''جلدی سے وین کے پیچھے چلی جاؤ۔''

اسٹیفنی نے اپنا چشمہ اتار کر جیب میں رکھا اور خوف زدہ اراکین جیوری کی طرف بڑھنے لگی جو پہلے سے ہی وین میں پناہ لینے کے لیے تیزی سے اس کی جانب بڑھ رہے تھے۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ ایک دوسرے کو دھکیلتے اور گرتے پڑتے وین کے عقب میں پہنچ گئے اور زمین پر بیٹھ کر ہانپنے لگے۔ ان کی آنکھوں میں خوف اور دہشت کا تاثر نمایاں تھا۔ ان کے ساتھ شامل ہونے والوں میں ایک وکیل اور جج بھی تھا۔ خاتون وکیل ابھی تک چلّا رہی تھی جبکہ جج خاموشی سے حالات کا جائزہ لے رہا تھا۔

اسٹیفنی نے وین کے عقب سے جھانک کر دیکھا۔ ٹومی زمین پر بے حس و حرکت پڑا ہوا تھا اور اس کے سر سے خون کی دھار بہہ کر زمین میں جذب ہو رہی تھی۔ اس کے چہرے کی مسکراہٹ برقرار تھی جیسے کسی ساکت کیمرے نے اسے تصویر کی شکل میں قید کر لیا ہو۔

☆☆☆

نشانے باز نے تیزی سے اپنی جگہ سے حرکت کی اور جھاڑیوں کی آڑ لیتا ہوا نیچے اترنے لگا۔ اس نے اپنی رائفل، پانی کی بوتل اور تھیلا اسی ترپال میں لپیٹ لیا جو اس نے جھاڑیوں پر بچھا رکھی تھی۔ وہ تیزی سے ڈھلان اترتا ہوا پولیس والوں اور جیوری کے ارکان سے دور ہوتا جا رہا تھا۔ ایک درخت کے نیچے پک اَپ کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے عقبی حصے میں ترپال رکھی اور اپنا سوٹ اتار کر... وہیں رکھ دیا۔ اب وہ عام شہری لباس یعنی جینز اور ٹی شرٹ میں تھا۔ پھر وہ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا، پک اَپ اسٹارٹ کی اور وہاں سے چل دیا۔ تیس سیکنڈ کے اندر وہ قبرستان کی حدود سے نکل چکا تھا اور اگلے تیس سیکنڈ بعد اس کی پک اَپ ٹریفک کے ہجوم میں گم ہو چکی تھی۔ اب وہ اس بائی وے پر سفر کر رہا تھا جو چند منٹوں میں اسے مَنی میں واقع اس کے گھر تک پہنچا دیتی۔

☆☆☆

اسٹیفنی کو کسی شخص کے چلّانے کی آواز سنائی دی۔ اس نے آواز کی سمت دیکھا، وہاں بلندی پر ایک چھوٹی سی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت نظر آ رہی تھی۔ شاید اسے قبرستان کا عملہ اسٹور کے طور پر استعمال کرتا ہو۔ اس عمارت سے سیاہ یونیفارم میں ملبوس ایک شخص اترتا ہوا دکھائی دیا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ اس کا تعلق اسپیشل گروپ سے ہے۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی اور ہاتھ میں رائفل لیے ہوئے تھا۔ اسٹیفنی کو اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگی۔ وہ چلّا چلّا کر کہہ رہا تھا۔ ''میں نے گولی نہیں چلائی..... میں نے گولی نہیں چلائی۔''

☆☆☆

گھر پہنچ کر نشانے باز نے پک اَپ کو گیراج میں بند کیا۔ گھر کے اندر داخل ہو کر فریج کھولا اور ٹھنڈے پانی کا گلاس پی کر اطمینان سے اپنی سانس درست کرنے لگا۔ بہرحال، اس نے ایک کارنامہ سرانجام دیا تھا اور وہاں پر موجود پولیس والوں کے لیے مشکلات کھڑی کر دی تھیں۔ ان کے ذہنوں میں قاتل کے حوالے سے کئی شبہات اٹھ رہے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسا شخص بھی ہو سکتا ہے جو متاثرہ عورتوں کا کوئی رشتے دار یا دوست ہو یا کوئی جاننے والا..... اور یا پھر کوئی ایسا بدمعاش جو قانون کو ہاتھ میں لینا چاہتا ہو۔ وہ خود بھی پولیس والوں کی کارکردگی سے واقف تھا۔ وہ ایک یا دو ہفتوں تک تو بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کرتے ہیں اور ملزم کو عدالت کے سامنے پیش کر کے سمجھتے ہیں کہ ان کا کام ختم ہو گیا لیکن جب وکیلِ صفائی کسی واضح ثبوت کی عدم موجودگی کی بنا پر دھجیاں اڑانے لگتے ہیں اور اپنے مؤکل کو رہا کروانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو پولیس والوں کی بھی جان میں جان آتی ہے اور وہ کسی دوسرے مقدمے میں الجھ جاتے ہیں۔

اس کی چھٹی حس اسے کسی خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ وہ مضطرب ہو کر اٹھا اور دوبارہ گیراج کی جانب چل دیا۔ اس نے ایک بار پھر اپنے سوٹ کا معائنہ کیا۔ ترپال کھولی اور رائفل کا بغور جائزہ لینے لگا۔ پانی کی بوتل کو غور سے دیکھا اور اس کے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ لعنت ہو اس پر..... وہ ایک انتہائی اہم ثبوت وہاں چھوڑ آیا تھا۔

☆☆☆

ٹومی کو گولی لگتے ہی جائے وقوعہ پر بھگدڑ مچ گئی۔ ہر جانب سے لوگوں کے چیخنے چلّانے کی آوازیں آنے لگیں۔ ان میں پولیس اور ایمبولینس گاڑیوں کے سائرن کا شور بھی شامل ہو گیا۔ کچھ دیر بعد جب یہ ہنگامہ ختم ہوا تو جیوری کے ارکان، جج اور وکیلوں کو ان کی گاڑی میں قریبی پولیس اسٹیشن روانہ کر دیا گیا تاکہ وہاں وہ اپنے بیانات ریکارڈ کروا سکیں اور اگر انہوں نے ٹومی کے قتل سے پہلے کوئی غیر معمولی بات دیکھی ہو تو اس کی بھی نشان دہی ہو جائے۔ ان کے جانے کے بعد اسٹیفنی اور دوسرے پولیس آفیسرز نے بڑی احتیاط سے جائے وقوعہ کا معائنہ شروع کر دیا۔ وہ ایک نیم دائرے کی شکل میں اس جانب بڑھ رہے تھے جہاں سے گولی چلائی گئی تھی۔ اچانک ہی ایک پولیس آفیسر نے دائیں بائیں دیکھا اور کہا۔ ''اسے سائلنسر لگی ہوئی طاقتور رائفل سے نشانہ بنایا گیا ہے۔ وہ یقیناً کوئی پیشہ ور قاتل تھا۔''

اسٹیفنی اس کے خیال سے متفق تھی لیکن اب اسے بھی ایک کام کرنا تھا۔ وہ ڈھلوان پہاڑی کی جانب چلنے لگی اور پھر اس نے وہاں سے نیچے کی طرف نظر دوڑائی تو اسے ایک بالکل نیا کرائم سین نظر آیا۔ جائے واردات کی تصاویر لی جا رہی تھیں اور سراغ رساں مختلف زاویوں سے پیمائش کر رہے تھے۔ اسٹیفنی نے خدا کا شکر ادا کیا کہ جب اس کے سامنے یہ واقعہ پیش آیا تو وہ بالکل نہیں گھبرائی اور نہ ہی اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی تھی۔ واقعی اس نے اپنے حصے کا کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا تھا اور اب بھی وہی کرنے جا رہی تھی۔

پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ کر اس نے جھاڑیوں کا ایک

بڑا جھنڈ دیکھا۔ وہ ان کے درمیان سے گزرتی ہوئی زمین پر نظریں جمائے چل رہی تھی لیکن ابھی تک اسے کچھ نظر نہیں آیا تھا۔ پھر اچانک اس کے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے۔ جھاڑیوں کے درمیان تھوڑی سی زمین صاف نظر آرہی تھی۔ لگتا تھا کہ کسی نے جھاڑیاں ہٹا کر اس جگہ کو استعمال کیا ہے۔ اسٹیفنی نے گھٹنوں کے بل جھک کر جھاڑیوں کے درمیان جھانکا لیکن اسے وہاں کچھ نظر نہیں آیا۔ وہ ایک بار پھر گھٹنوں کے بل جھکی اور چوکنے ہوئے سرگوشی میں بولی۔

''جہنم میں جاؤ۔''

اس کی نگاہوں کے سامنے ٹیوب کی شکل کا ایک پلاسٹک کا ٹکڑا پڑا ہوا تھا۔ اس نے اپنی جیب سے ایک پین نکالا اور اس کی مدد سے وہ ٹکڑا اٹھا کر دیکھنے لگی۔

☆☆☆

نشانے باز نے بار بار پانی کی بوتل کے ساتھ لگے ہوئے ربر پائپ کو دیکھا۔ اس کے آخری سرے پر لگا ہوا ٹکڑا غائب تھا جسے منہ میں رکھ کر وہ پانی پیتا تھا۔ اسے یاد آیا کہ جب اس نے آخری بار پانی پیا تھا تو اسی وقت وہ ٹکڑا ڈھیلا لگ رہا تھا اور جب اس نے وہاں سے چلتے وقت اپنی سب چیزیں سمیٹیں تو وہ ٹکڑا ڈھیلا ہونے کی وجہ سے زمین پر گر گیا ہوگا۔

اس کے ذہن میں پہلا سوال یہی آیا کہ کیا اس پر کسی کی نظر پڑ سکتی ہے؟ یقیناً وہ زمین پر پڑا ہوگا اور بہ آسانی ہر ایک کی نظروں میں آجائے گا۔ کوئی بھی معمولی سی سوجھ بوجھ رکھنے والا جان سکتا ہے کہ اسے کس مقصد کے لیے استعمال کیا گیا ہوگا۔ تھوڑی سی جانچ پڑتال اور اس کے ڈی این اے کے بعد وہ لوگ اس کمپنی اور دکان سے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہ ٹکڑا کہاں استعمال ہوتا ہے اور کسے فروخت کیا گیا تھا۔ وہ سمجھ گیا کہ عدالتی کارروائی کے نتیجے میں اس کا بچنا مشکل ہو جائے گا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور اس عورت کے بارے میں سوچنے لگا جس سے کچھ عرصے پہلے اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ اس نے اپنے سر کو جھٹکا دیا۔ اسے پہلے سے یقین تھا کہ بالآخر انصاف کی جیت ہوگی اور ایسا ہو چکا تھا۔

☆☆☆

اسٹیفنی نے اس پلاسٹک کے ٹکڑے کا بغور معائنہ کیا اور سمجھ گئی کہ اسے پانی کی بوتل میں لگی نلکی کے دوسرے سرے پر لگایا جاتا ہے اور اس کا استعمال بالعموم وہ نشانے باز کرتے ہیں جنہیں اپنے شکار کو نشانہ بنانے کے لیے کچھ دیر انتظار کرنا پڑ جائے۔ اس نے ایک بار پھر جھاڑیوں کے درمیان زمین کا جائزہ لیا اور سارا معاملہ اس کی سمجھ میں آگیا۔ اس کی نظر قدموں کے نشانات پر گئی جن سے لگتا تھا جیسے کوئی گھسٹتا ہوا یہاں سے گیا ہے اور جانے کی جلدی میں ایک اہم ثبوت چھوڑ گیا ہے۔

اسٹیفنی کھڑی ہوگئی اور اس نے پلاسٹک کا وہ ٹکڑا اپنی پتلون کی جیب میں رکھ لیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی واپس آئی اور اپنے ساتھیوں میں شامل ہوگئی۔

پریسٹن نے اس کی جانب پُرامید نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ''کچھ ملا؟''

اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتی، اس کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے وہ خوفناک رات یاد آگئی جب وہ کالج کی ایک پارٹی میں شرکت کرنے کے بعد واپس آرہی تھی کہ اس کے ایک ساتھی نے اسے کمرے تک چھوڑنے کی پیشکش کی لیکن اندر داخل ہوتے ہی اس نے شرافت کا لبادہ اتار پھینکا اور وہ حادثہ پیش آگیا جس کے بارے میں وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ رات اس نے بڑے کرب کے عالم میں گزاری۔ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہیے۔ کیا وہ اس واقعے کی اطلاع پولیس کو دے؟ لیکن اس سے کیا حاصل ہوگا؟ وہ کچھ بھی ثابت نہیں کر پائے گی، سوائے بدنامی کے اسے کچھ نہیں ملے گا، وہ اس تلخ یاد کو ذہن کے کسی گوشے میں مقید کر کے سنجیدگی سے اپنی پڑھائی کی جانب توجہ دینے لگی۔ ڈگری حاصل کرنے کے بعد اس نے پولیس میں ملازمت اختیار کر لی۔ اس کے سامنے جب بھی کوئی ایسا ملزم آتا جس پر عورت کے ساتھ زیادتی کرنے کا الزام ہو تو اس کا دل چاہتا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اسے گولی مار دے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ عدالتوں سے انصاف کی توقع نہیں۔ ملزمان کے وکیل اکثر اوقات انہیں بری کروانے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ ٹوبی بھی ایسے کسی موقع سے فائدہ اٹھائے لہٰذا اس نے خود ہی انصاف کے تقاضے پورے کرنے کا فیصلہ کیا اور اس کے لیے اسے ایک کرائے کے قاتل کی خدمات حاصل کرنا پڑیں جو ایک ماہر نشانے باز تھا۔

''اسٹیفنی!'' پریسٹن نے دوبارہ کہا۔ ''کیا تمہیں وہاں سے کوئی چیز ملی؟''

'انصاف۔' اس نے دل میں سوچا۔ 'مجھے وہاں سے انصاف ملا۔'

وہ بہ آوازِ بلند بولی۔ ''نہیں۔ مجھے وہاں سے کوئی ثبوت یا نشان نہیں ملا۔''

مجھے کاریں پسند ہیں۔ اسی لیے جب میری نگاہ اُس کار ڈ 812 پر گئی تو میں ایک لمحے کے لیے ٹھٹک کر رہ گیا۔ 1937ء ماڈل کی کنورٹیبل سیڈان دیکھنے میں ہی بہت خوب صورت لگ رہی تھی لیکن جب میں نے قریب جا کر اسے دیکھا تو بڑی مایوسی ہوئی۔ کسی نے اس اعلیٰ درجے کی کار پر بُری طرح سے رنگ کیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ کسی پانچ سال کے بچے نے تین مختلف شیڈز کے رنگوں میں برش ڈبو کر اپنی طرف سے کار کو خوب صورت بنانے کی کوشش کی ہے۔ گاڑی کی چھت گلابی رنگ کی تھی جبکہ باڈی پر گہرا سرخ رنگ کیا گیا تھا جبکہ نچلے حصے پر میرون رنگ نظر آرہا تھا... اور کہیں کہیں گاڑی کا اصلی کریم کلر بھی جھلک رہا تھا۔ لگتا تھا کہ کسی نے بڑی عجلت میں یہ کام کیا ہے اسی لیے گاڑی پوری طرح پینٹ نہیں ہوئی۔

میں ڈرتے ڈرتے آگے بڑھا اور کھڑکی سے جھانک کر اندر دیکھنے لگا تاکہ جان سکوں کہ گاڑی کے اندرونی حصے کو تو نقصان نہیں پہنچا۔ وہاں ایک نیا مسئلہ موجود تھا۔ کار کی پچھلی نشست پر کوئی چیز پڑی ہوئی تھی جسے کمبل سے ڈھانپ دیا گیا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر وہ کمبل ذرا سا ہٹایا تو میرے منہ سے ہلکی سی چیخ برآمد ہوئی۔ کمبل کے نیچے کوئی چیز نہیں بلکہ ایک عورت تھی اور اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ مر چکی ہے۔ مجھے لگا جیسے میں نے اس عورت کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔

''کیا ہوا ولیم؟'' کسی نے مجھے عقب سے پکارا۔

اس سے پہلے کہ میں پولیس کو بلانے کے لیے نمبر ڈائل کرتا، شو میں شرکت کے لیے آنے والی دوسری گاڑیوں کے مالکان میری جانب بڑھنا شروع ہو گئے۔ یقیناً وہ میری خوف زدہ چیخ سن کر ہی متوجہ ہوئے تھے۔

''دور رہو۔'' میں زور سے چیخا۔ ''یہاں ایک قتل ہو گیا ہے۔''

تماشائیوں میں سے صرف ایک نے میری وارننگ پر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ کاؤنٹی کا رکلاسک کا جونی ڈارلنگ اور اس شو کا منتظم تھا۔ اس نے مجھے فون پر ہدایات دیتے سن لیا ہوگا اسی لیے وہ مرکزی دروازے سے دوڑتا ہوا چلا آیا۔ میں اسے پسند نہیں کرتا تھا لیکن وہ اپنے کام سے اچھی طرح

ہر دفعہ کامیابی سے ہمکنار ہونے والے چوروں کی دلچسپ کہانی.....

ہر نایاب شے کی قسمت میں قدر دانی نہیں لکھی ہوتی ... وہ ہمیشہ ایک جوہر شناس نگاہوں کی منتظر رہتی ہے ... ایک غیر مہذب شخص کا ماجرا جسے قسمت سے قیمتی چیز مل گئی تھی...

قدر شناس

بابر نسیم

واقف تھا۔ اسی لیے جب وہ کار کی طرف بڑھنے لگا تو میں نے اسے روکتے ہوئے کہا۔ ''واپس گیٹ پر جاؤ اور مزید کاروں کو اندر آنے سے روک دو۔''

''ٹھیک ہے ولیم۔'' اس نے فرماں برداری کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ اب اسے ان گاڑیوں کے لیے متبادل انتظامات کرنے تھے جو اس شو میں شرکت کے لیے آرہی تھیں۔ ان کے مالکان کا خیال ہوگا کہ یہاں نہ صرف ان کی کاروں کی اچھی قیمت مل جائے گی بلکہ بہت سے دوستوں سے ملاقات کا بھی موقع مل جائے گا۔

اس کے جانے کے بعد بھی میں وہاں موجود رہا۔ میری کوشش تھی کہ پولیس کے پہنچنے تک میں وہاں کسی کو نہ آنے دوں تاکہ کچی زمین پر قدموں کے نشانات میں اضافہ نہ ہونے پائے۔ گاڑیوں کے مالکان کو میرا یہ رویہ پسند آیا اور وہ فاصلے پر کھڑے ہو کر اس واردات کے بارے میں چہ میگوئیاں کرتے رہے۔

''کسی نے گاڑی کو یہاں آتے ہوئے دیکھا تھا؟'' میں نے بہ آوازِ بلند کہا۔

جواب میں مختلف آوازیں ابھرنے لگیں لیکن کوئی کام کی بات معلوم نہ ہوسکی۔ اور کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ یہ کار کب آئی تھی اور نہ ہی کسی کو یہ معلوم تھا کہ اس کار کو چلانے والا کون تھا؟ البتہ اس کار پر بدصورتی سے کیے ہوئے رنگ کی وجہ سے سب ہی اس کی طرف لمحہ بھر کے لیے متوجہ ہو گئے تھے۔ ایک عقابی نظر رکھنے والے کار مالک کا بیان تھا کہ اس گاڑی کو ایک مرد چلا رہا تھا اور دیکھنے میں وہ ایک لمبا اور دبلا شخص تھا۔ مشکل یہ ہے کہ اس شہر میں کار شو کے لیے کوئی مخصوص طریقۂ کار متعین نہیں ہے۔ اس طرح کے شوز کھلے میدانوں میں ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہوتا یوں ہے کہ لوگ اپنی کاریں لے کر آتے ہیں۔ دوسروں کے سامنے ان کی تعریفوں کے پل باندھتے ہیں۔ کسی گاہک کو کوئی گاڑی پسند آجائے تو ٹھیک ورنہ وہ دوسری کار کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ پندرہ بیس منٹ کے وقفے کے دوران آنے والی ایک درجن سے زائد گاڑیوں کو کسی نے غور سے دیکھا ہوگا۔

میں پولیس کے انتظار میں اس کار کے قریب کھڑا تھا اور لوگوں کو اس سے دور رکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ایک شخص نے یہ کہہ کر میری اس کوشش کو ناکام بنا دیا کہ اسے اس گاڑی کے قریب آنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ یہ براڈ میڈکیسل کا مالک میجر پیٹر مینگ تھا۔ وہ سیدھا چلتا ہوا میرے پاس آیا اور بولا۔

''یہ میری کار ہے اور یہ بات میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں۔ دیکھو، انہوں نے اس کا کیا حشر کر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ جھکا اور نمبر پلیٹ پڑھنے لگا۔ اس نے سہارے کے لیے اپنا ہاتھ کار پر رکھنا چاہا۔ ''کرائم سین!'' میں چلایا اور اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

وہ سیدھا ہو کر مجھے گھورنے لگا۔ ''تم کون ہو اور یہاں کیا کر رہے ہو؟ دیکھتے نہیں کہ کسی نے میری کار پر سرخ رنگ پھیر دیا ہے۔''

''اس کار کے اندر ایک لاش بھی ہے۔'' مجھے وہ آدمی دیکھنے میں ہی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہوگی اور چہرے کے نقش و نگار جولیس سیزر سے ملتے جلتے تھے۔ لگتا تھا کہ وہ حکم دینے کا عادی ہے لیکن میں اس کے رعب میں نہیں آیا۔

اس کی آواز مدھم ہوگئی اور وہ آہستہ سے بولا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ لوگ مذاق نہیں کر رہے تھے۔'' اس نے دور کھڑے ہوئے لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''پولیس آنے ہی والی ہے۔'' میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اسی لیے میں نے ان لوگوں کو دور رکھا ہوا ہے۔''

''اور تم کون ہو؟''

''ولیم کولبی۔ میرا تعلق فراگ ہل کلاسک کار سے ہے اور میں کاروں سے متعلق جرائم کے کیسوں میں پولیس کے لیے کام کرتا ہوں۔''

''میری کار دو ہفتے پہلے غائب ہوگئی تھی لیکن تم نے اسے تلاش کرنے کے لیے تو کچھ نہیں کیا۔ دیکھو، اس پر انہوں نے سرخ رنگ کر دیا ہے جبکہ وہ کریم.....''

میں اس سے زیادہ نہیں سننا چاہتا تھا لہٰذا میں نے کار کی پچھلی نشست کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا اور پریشان ہوتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ میری کار ہے۔ یہ عورت کون ہے؟''

مجھے لگا کہ اس کی طبیعت بگڑ رہی ہے۔ کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی کیونکہ میں اس عورت کو اچھی طرح جانتا تھا، وہ بونی تھی۔

''ہم تمہیں کاریں ڈھونڈنے کا معاوضہ دیتے ہیں، لاشوں کا نہیں۔'' سراغ رساں چیف انسپکٹر ڈیوڈ جونز نے غراتے ہوئے کہا۔ میں نے پولیس کو فون کرنے کے بعد اس سے بھی ہاٹ لائن پر رابطہ کیا تھا کیونکہ کینٹ پولیس کا اسپیشل کرائم یونٹ اسی کے ماتحت تھا اور میں چاہ رہا تھا کہ وہ خود اس معاملے کی تفتیش کرے۔ حالانکہ اس کا نائب ڈینس مولی گن بھی خاصا محنتی اور ہوشیار آفیسر تھا۔ اس نے وہاں پہنچتے ہی مجھے چبھتی ہوئی نظروں سے دیکھا کیونکہ اس وقت میری حیثیت ایک ایسے شخص کی تھی جس نے سب سے پہلے لاش کو دیکھا تھا۔ اس لحاظ سے ڈیوی کی موجودگی سے بھی مجھے کوئی رعایت نہ ملتی کیونکہ یہ جرم اس کے لیے بھی خاص دلچسپی رکھتا تھا۔

پولیس کے آتے ہی معاملہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب مجھے خود کو ان کے سوالوں کے لیے تیار کرنا تھا۔ میں صبح نو بجے کے قریب یہاں آیا تھا اور اس وقت تک بہت کم تعداد میں گاڑیاں آئی تھیں، تبھی مجھ سے یہ احمقانہ حرکت سرزد ہوئی کہ میں اس کار کو دیکھنے چلا گیا۔ ورنہ ممکن ہے کہ میری جگہ کوئی اور شخص یہ عذاب بھگتتا۔ پولیس نے تمام داخلی راستے بند کروا دیے اور بعد میں آنے والی گاڑیوں کو برابر میں واقع میدان میں بھیج دیا گیا۔ اب جونی کی ذمے داری ختم ہو چکی تھی لہٰذا وہ بھی میرے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔

ہم اور دوسرے کار مالکان پھنس کر رہ گئے تھے۔ پولیس نے یہاں کا چارج سنبھال لیا تھا۔ ہم نہ باہر جا سکتے تھے اور نہ آپس میں کوئی ڈیلنگ کر سکتے تھے۔ مہمانوں کی خاطر تواضع کے لیے جو ٹینٹ لگایا گیا تھا، وہاں مولی گن نے اپنا عارضی کیمپ بنا لیا۔ لہٰذا ہم ایک دوسرے ٹینٹ میں جا کر بیٹھ گئے جو تفتیش کے لیے مخصوص تھا۔ ہمارے پاس اس واردات کے بارے میں باتیں کرنے کے علاوہ کوئی اور موضوع نہیں تھا۔ یہ کار کس کی تھی؟ اس پر سرخ رنگ کس نے کیا؟ بونی کون ہے؟ کیا کار پر دوسرا رنگ کرنا بھی جرم ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ان لوگوں کے نزدیک بونی کی موت اہم تھی یا کار کا رنگ؟

مجھ سے یہ سب برداشت نہ ہو سکا اور میں ڈیوی کی تلاش میں باہر آگیا جو ایک کرسی پر بیٹھا کچھ فارم بھرنے میں مصروف تھا۔ میں نے اس کے قریب جا کر کہا۔ ''تم نے لاش شناخت کر لی۔ وہ بونی ہی ہے نا؟''

اس نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ایسا ہی لگتا ہے۔ اس کا وینٹی بیگ فرش پر پڑا ہوا تھا۔ اس کا اصلی نام ایوا کراؤلے ہے۔ اسے اس کے اپنے ہی اسکارف سے گلا گھونٹ کر مارا گیا ہے۔''

میں نے اس زندہ دل اور پُرکشش لڑکی کے بارے میں سوچا جس کی آنکھیں ہمیشہ کے لیے بند ہو چکی تھیں۔ وہ اس شہر میں ہونے والے کار شوز کی جان تھی۔ گو کہ اس کے پاس ذاتی کار نہیں تھی لیکن اسے پرانی کاریں اور ان کے امیر کبیر مالکان پسند تھے۔ جب کبھی ہم دونوں کا سامنا ہوتا تو وہ مجھے دیکھ کر گرم جوشی سے ہاتھ ہلاتی جیسے مجھ سے دوستی کی خواہش رکھتی ہو۔ شاید وہ مجھے بھی کوئی مال دار شخص سمجھتی تھی جبکہ میری آمدنی اتنی نہ تھی کہ میں بونی جیسی طرح دار حسینہ کے نخرے برداشت کر سکتا۔

میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا نام بونی کس طرح پڑ گیا تھا۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہو کہ وہ پرانی کاروں کے بونٹ پر بیٹھ کر تصویریں بنواتی تھی تاکہ اس طرح ان گاڑیوں کے مالکان کا دل لبھا سکے لیکن اس کی ایک اور وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ کبھی کبھی اپنے ایک ساتھی مائیک کلائیڈ کے ساتھ کار شو میں آیا کرتی تھی جو اسے بونی کہہ کر بلاتا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ اس کا نک نیم ہو۔ ان دونوں کے درمیان کیا رشتہ تھا، کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ شاید وہ اس کا بھائی ہو لیکن میرے علم میں یہ بات ضرور تھی کہ مائیک کلائیڈ نے کبھی کسی کار کے مالک اور بونی کے تعلق پر اعتراض نہیں کیا۔ میں نے اس کے بارے میں مزید جاننے کے لیے ڈیوی سے پوچھا۔ ''کیا تمہارے ریکارڈ سے مائیک کے بارے میں معلومات مل سکتی ہیں؟''

''شاید۔ لگتا یہی ہے کہ وہ دونوں ایک ٹیم کی طرح کام کرتے تھے۔''

''کیا تمہیں مائیک پر شبہ ہے؟''

''ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ بونی کی لاش برد ہو چکی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے کل سہ پہر میں قتل کیا گیا ہے۔ اگر مائیک کا اس کے قتل میں ہاتھ ہے تو وہ بڑی احتیاط سے گاڑی چلا کر یہاں لایا ہوگا۔''

''کیا شو میں شرکت کے لیے اس کار کی رجسٹریشن کروائی گئی تھی؟'' میں نے ڈیوی سے پوچھا حالانکہ میں گاڑی کی ونڈ اسکرین پر چسپاں اسٹیکر دیکھ چکا تھا۔ لیکن مجھے شک تھا کہ یہ رجسٹریشن کسی فرضی نام سے کروائی گئی ہوگی۔

''ہاں۔'' ڈیوی نے کہا۔ ''یہ گاڑی کل ہی فلپ اسٹین کے نام سے رجسٹر ہوئی تھی۔ یقیناً یہ ایک فرضی نام ہے کیونکہ یہ کار تو میجر کی ہے جس کی چوری کی رپورٹ دو ہفتے پہلے درج ہوئی تھی۔''

اتنی دیر میں پیتھالوجسٹ اور فوٹو گرافرز اپنا کام ختم کر کے جا چکے تھے۔ کار میں سے تمام چیزیں سمیٹ لی گئی تھیں اور انہیں ثبوت کے طور پر محفوظ کر لیا گیا تاکہ ضرورت پڑنے پر ان سے مدد لی جا سکے۔ لاش وہاں سے ہٹالی گئی تھی اور اب میں تصور میں جیتی جاگتی بونی اور اس کی لاش کا موازنہ کر رہا تھا۔ اس طرح کے شوز میں وہ جینز اور ٹی شرٹ پہن کر نہیں آتی تھی بلکہ اس کا لباس انتہائی نفیس اور قیمتی ہوتا

تھا۔ یہ خیال آتے ہی میں نے ڈیوی سے پوچھا۔

''بونی نے کس قسم کے کپڑے پہنے ہوئے تھے؟''

''اسکرٹ اور بلاؤز... لیکن مرنے سے پہلے اس کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہوئی۔''

''میں اس بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتا۔'' میں نے آزردہ ہوتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم مجھے کار چوری کی وارداتوں کے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو؟''

''تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ گزشتہ برس کئی قیمتی پرانی کاریں چوری ہوئی تھیں۔''

''کیا وہ سب گاڑیاں کار شوز سے چرائی گئیں؟''

''کار چوری کرنے کے لیے کوئی مخصوص جگہ نہیں ہے۔ کہیں سے بھی کوئی کار چرائی جا سکتی ہے۔ ویسے زیادہ تر گاڑیاں ہوٹلوں، کار پارکنگ اور مختلف مقامات سے چوری ہوئیں۔''

''ان وارداتوں میں ایسی کیا بات مشترک تھی جس کی بنا پر تم یہ اندازہ لگا رہے ہو کہ یہ کسی گروہ کی کارستانی ہے۔''

''تم جانتے ہو کہ ایسی گاڑیوں کو فروخت کرنا مشکل ہے جبکہ ان میں سے بیشتر کو کوئی نقصان نہیں پہنچا اور اصل مالکان کو واپس کر دی گئیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان چوریوں کا کوئی اور مقصد تھا۔''

''میں نہیں سمجھتا کہ بونی نے محض لانگ ڈرائیو کے لیے گاڑی چوری کی ہوگی۔ اور جیسا کہ تم نے کہا، ایسا بھی نہیں لگتا کہ بونی اور مائیک نے اس کاروبار سے بہت پیسے کمائے ہوں گے۔''

''میجر کی کار کا معاملہ دوسری چوریوں سے مختلف ہے۔ یہ گاڑی مالک کو واپس تو کر دی گئی لیکن اس کے ساتھ ہی اسے نقصان بھی پہنچایا گیا۔ اتنے اناڑی پن سے رنگ کرنا ایک طرح کا نقصان ہی ہے۔''

''کار کی باڈی کو بھی نقصان پہنچا ہے۔''

''ایسی صورت میں میجر کا اشتعال میں آ جانا فطری ہے۔'' ڈیوی نے پُرامید انداز میں کہا۔ ''میجر اپنی کار کو دیکھ کر غصے میں آ گیا ہوگا اور اس نے اپوا کراؤلے کا خاتمہ کر دیا۔''

مجھے اس کی حماقت پر ہنسی آنے لگی۔ ''وہ اتنا غریب بھی نہیں ہے کہ اپنی کار پر دوبارہ رنگ نہ کروا سکے۔ پھر وہ اسے قتل کرنے کا خطرہ کیوں مول لے گا؟''

ڈیوی نے کندھے اچکائے اور بولا۔ ''یہ محض ایک خیال بھی ہو سکتا ہے۔ خطرہ تو بونی اور مائیک کے لیے بھی تھا کہ وہ اس کار کو یہاں لے کر آئیں اگر یہ رنگ انہوں نے کیا تھا۔''

''رنگ تو وہ اس صورت میں کرتے جب انہوں نے کار چرائی ہوتی۔ تمہارے پاس اس کا کوئی ثبوت ہے؟''

''نہیں، یہ بات تو تحقیقات کے بعد ہی ثابت ہو سکتی ہے۔''

''سوچنے کی بات ہے کہ بونی کل سہ پہر قتل ہوئی اور اس کی لاش کو آج یہاں لایا گیا۔ کیا تم نے ان درجن بھر کاروں کا بھی معائنہ کیا جو میرے ساتھ ہی اندر آئی تھیں؟''

''سب سے پہلے جونی ڈارلنگ اپنی پورچ کار میں آیا۔ اس کے بعد آنے والی اس کی نائب تھی پھر سب گاڑیاں آگے پیچھے آئیں اور ان کی ترتیب کوئی نہیں بتا سکتا۔'' ڈیوی نے بناوٹی انداز میں مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تم کب آئے تھے ولیم... اور تم نے یہاں کسے دیکھا؟''

''میں سوا نو بجے کے قریب یہاں پہنچا تھا۔ دور سے ہی میری نظر اس گاڑی پر گئی اور اس کے سرخ رنگ نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا چنانچہ میں سیدھا اس طرف چلا آیا۔ میں نے گرد و پیش پر نگاہ ہی نہیں ڈالی اس لیے مجھے نہیں معلوم کہ یہاں کون کون تھا۔''

''مولی گن۔ اسے جھنگڑی لگا دو۔'' ڈیوی نے ہنستے ہوئے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ گو کہ اس نے مذاق میں یہ بات کہی تھی لیکن مولی گن کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ واقعی اس پر عمل کرنے والا ہے کیونکہ سب سے پہلے میں ہی جائے واردات پر پہنچا تھا اس لیے مجھے ہی مجرم ٹھہرایا جاتا۔ خوش قسمتی سے مجھے کئی لوگوں نے اپنی کار میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔ اس لیے مجھ پر کم از کم یہ الزام تو نہیں لگ سکتا تھا کہ میں ہی میجر کی کار کو چلا کر یہاں لایا تھا۔ گو کہ وقتی طور پر مولی گن نے مجھ پر سے نظریں ہٹالی تھیں لیکن اس کے ذہن میں ایک اور ہی منظر نامہ چل رہا ہوگا۔ مثلاً یہ کہ گزشتہ شب میں نے اسے قتل کیا، گاڑی چلا کر اندر لایا، کار وہیں چھوڑی اور خود دیوار پھلانگ کر وہاں سے نکل گیا اور صبح کو اپنی کار میں بیٹھ کر شو میں چلا آیا۔

ممکن ہے کہ یہ میرا وہم ہو اور مولی گن کے ذہن میں ایسی کوئی بات نہ ہو کیونکہ پولیس ثبوت اور شہادتوں کی بنیاد پر آگے بڑھتی ہے۔ پھر مجھے یاد آیا کہ جب میں نے پچھلی سیٹ پر پڑے ہوئے کمبل کو قریب سے دیکھنے کی کوشش کی تو سہارے کے لیے اپنا ایک ہاتھ کار کی باڈی پر رکھ دیا تھا۔ اس طرح وہاں میری انگلیوں کے نشان موجود ہوں گے اور یہ بھی ایک طرح کا ثبوت تھا۔

مولی گن نے قدرے ہچکچاتے ہوئے میری جان چھوڑی اور مایوسی سے سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ اب میرے لیے

بھی وہاں ٹھہرنا بہت مشکل ہو گیا تھا لہٰذا میں دوبارہ اس ٹینٹ میں چلا گیا جہاں دوسرے لوگ جمع تھے۔ ان سب کو گواہی دینے کے لیے روکا گیا تھا۔ ان میں سے کچھ فارغ ہو چکے تھے اور کچھ اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے۔ ان میں سے کم از کم آدھے لوگ بونی کو اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ سب اسی موضوع پر گفتگو کر رہے تھے اور بار بار ایک ہی جیسے سوال دہرا رہے تھے۔ بدقسمتی سے کسی کے پاس ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں تھا اور نہ ہی وہ کوئی مفروضہ قائم کر سکے تھے۔

میرے دماغ میں بھی اس حوالے سے بہت سی باتیں گردش کر رہی تھیں۔ مثلاً یہ کہ بونی کا اس شو میں کسی سے افیئر چل رہا ہو اور مائیک کو یہ بات پسند نہ آئی ہو... لیکن سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ اگر مائیک نے ایسا کیا تھا تو پھر اس نے لاش کو یہاں لانے کا خطرہ کیوں مول لیا؟ ممکن ہے کہ مائیک کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ یہ کار چوری کی ہے۔ لیکن وہ اور بونی ایک دوسرے کے بہت قریب تھے اور اسے یہ بات یقیناً معلوم ہو گی۔ ممکن ہے کہ مائیک کے بجائے وہ شخص اس کار کو لے کر یہاں آیا ہو جس نے بونی کو قتل کیا تھا اور کار یہاں چھوڑ کر پیدل چلا گیا ہو۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اسے کار یہاں لانے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ اسے کہیں بھی چھوڑ سکتا تھا۔ ان سب باتوں سے ایک ہی نتیجہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اس قتل کا شو سے کوئی نہ کوئی تعلق ضرور ہے لیکن اس کے باوجود ایک سوال کا جواب نہیں مل رہا تھا کہ کار پر اس طرح کا رنگ کیوں کیا گیا جس سے اس کی قیمت گر گئی؟

اس سوال کے کئی ممکنہ جواب ہو سکتے تھے۔ پہلا تو یہ کہ اس طرح کار کے مالک کو غصہ دلایا جائے لیکن کار چرانے کے بعد اس پر رنگ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ شاید اس کی شناخت چھپانے اور اسے کسی دوسرے ملک میں فروخت کرنے کے لیے ایسا کیا گیا ہو۔ اس دنیا میں ایسے شوقین مزاج لوگوں کی کمی نہیں جو بھاری قیمت دے کر پرانی کار خریدتے ہیں تو اس پر اپنی پسند کے مطابق نیا رنگ بھی کروا سکتے ہیں۔ تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس کار کی وجہ سے چوروں کے درمیان جھگڑا ہو گیا ہو۔ ممکن ہے کہ بونی نے مائیک کو ناراض کرنے کے لیے یہ حرکت کی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بونی کو یہ کار پسند آ گئی ہو اور مائیک نے اسی وجہ سے کار کا رنگ تبدیل کر دیا ہو۔ یہ بھی فرض کیا جا سکتا ہے کہ مائیک اور بونی آپس میں پارٹنر نہ ہوں یا کم از کم اس جرم میں ان کی شراکت داری نہ ہو۔ یہ بھی ممکن تھا کہ چوروں کا تعلق شو سے نہ ہو اور وہ باہر کے لوگ ہوں۔ کسی نے بونی کو پہلے سے تیار کر دیا ہو کہ وہ ان پر نظر رکھے... اور وہ شخص جونی بھی ہو سکتا تھا۔

☆☆☆

ہنگامی طور پر شو کے شرکاء اور مہمانوں کے لیے دوسرے ٹینٹ میں چائے، کافی اور بسکٹ وغیرہ کا انتظام کیا گیا۔ ایک درمیانی عمر کی قبول صورت عورت ان انتظامات کی نگرانی کر رہی تھی۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ عورت یہاں ٹی اسٹال چلاتی ہوگی لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ میجر کی سیکریٹری ہلڈا ہے اور اس کی بیوی کی غیر موجودگی میں مہمانوں کی خاطر تواضع کر رہی ہے۔ جونی اس کے آگے پیچھے پھر رہا تھا۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ بونی کو بھی اسی طرح تنگ کرتا ہوگا۔ ہلڈا کسی کام سے باہر گئی تو میں نے جونی کو گھیر لیا اور کہا۔ ''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

''کہو، کیا پوچھنا ہے؟'' اس نے بیزاری سے کہا۔ اس کی نظریں اب بھی ہلڈا کے تعاقب میں بھٹک رہی تھیں۔

''تم یہاں آنے والے پہلے شخص تھے اور تم نے ہی اس گاڑی کو بھی اندر آنے دیا؟''

''پھر کیا ہوا؟ اس گاڑی کی ونڈ اسکرین پر ہمارا اسٹیکر لگا ہوا تھا۔ دوسری بات یہ کہ میں ڈرائیور کا چہرہ اچھی طرح نہیں دیکھ سکا کیونکہ اس نے سر پر ٹوپی اور آنکھوں پر سیاہ چشمہ پہنا ہوا تھا۔''

''میرا خیال ہے کہ اس کار پر جس بھونڈے انداز میں رنگ کیا گیا ہے، اس کی وجہ سے وہ فوراً نظروں میں آ سکتی ہے۔''

اس نے مجھ پر ایک معاندانہ نظر ڈالی اور بولا۔ ''اگر تم یہ پوچھنا چاہ رہے ہو کہ میں نے اس گاڑی میں کوئی لاش دیکھی تو میرا جواب نہیں میں ہے۔ میں کوئی کسٹم آفیسر نہیں ہوں جو گاڑیوں میں جھانکتا پھروں۔ ویسے بھی میں کار کی جانب متوجہ تھا۔ ایسی گاڑیاں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔''

''اچھا، یہ بتاؤ کہ بونی سے تمہارے تعلقات کس نوعیت کے تھے؟''

''تمہارا اشارہ جس تعلق کی جانب ہے، میں اس سے محروم ہی رہا۔ وہ مجھے اچھی لگتی تھی لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ میں امیر شخص نہیں ہوں تو وہ مجھ سے دور ہو گئی۔''

''تمہارے خیال میں وہ کسے پسند کرتی تھی؟''

وہ زور سے ہنسا اور کہنے لگا۔ ''وہ اپنے بھائی کے ساتھ آتی تھی لیکن جاتے وقت اس کے ساتھ ہمیشہ ایک نیا مرد ہوتا تھا۔''

''کیا واقعی مائیک اس کا بھائی ہے؟''

''مجھے معلوم نہیں لیکن لوگ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔ اگر وہ اس کی گرل فرینڈ ہوتی تو اسی کے ساتھ گھر واپس جاتی۔ وہ

ہمیشہ مجھ سے یہی پوچھتی کہ شو میں کون کون لوگ آرہے ہیں اور میں اسے ٹال دیتا تھا۔ میں ایک کار شو کمپنی چلا رہا ہوں، کوئی کلب یا ہوٹل نہیں۔''

''ممکن ہے کہ تمہیں غلط فہمی ہوئی ہو۔ شاید وہ تم سے اس لیے پوچھتی ہو کہ اسے کاروں سے دلچسپی تھی؟''

دلچسپی تو مجھے بھی تھی۔ شاید اسی لیے میں اس بدبخت کار کے پاس چلا گیا تھا۔ یہ خیال آتے ہی میرا دھیان میجر کی طرف چلا گیا جو ابھی تک غصے کے عالم میں اپنی کار کے اردگرد منڈلا رہا تھا اور وہاں آنے والے ہر شخص سے اس واقعے کے بارے میں گفتگو کر کے اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔ میں بھی ٹہلتا ٹہلتا اس کے پاس چلا گیا اور دوستانہ انداز میں بولا۔ ''بہت بُرا ہوا۔''

اس نے مجھے ناگواری سے دیکھا لیکن جواب دینے کی زحمت نہیں کی۔

''اس لڑکی کی لاش لے کر کون آیا تھا؟'' میں نے ڈھیٹ بن کر پوچھا۔

''ظاہر ہے جس نے یہ کار چرائی تھی، وہی اسے یہاں چھوڑ کر بھی گیا ہوگا۔''

میں خاموش رہا تاکہ وہ اپنی بات پوری کر سکے۔

''اس طرح کی گاڑیاں اب نایاب ہیں۔ میں نے اس کی چوری کی رپورٹ درج کرا دی تھی۔ اس لیے اسے پہچان لیے جانے کا امکان موجود تھا، چاہے اس پر کیسا ہی رنگ کر دیا جائے۔ جس نے بھی یہ گاڑی چرائی تھی، وہ اس سے بہ آسانی پیچھا نہیں چھڑا سکتا تھا چنانچہ وہ اس کار کو یہاں چھوڑ کر چلا گیا۔''

''اور وہ لاش... کیا تم سمجھتے ہو کہ بونی نے وہ کار چرائی ہوگی؟''

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے بھی وہ اب مر چکی ہے۔''

''اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ وہ چور نہیں ہو سکتی۔'' میں نے اپنی بات پر اصرار کیا۔ ''پولیس کا کہنا ہے کہ اس کا اصلی نام ایوا کراؤلے ہے اور وہ اپنے ایک ساتھی کی مدد سے یہ کام کرتی تھی۔''

''پھر تو وہی شخص اس گاڑی اور لاش کو یہاں چھوڑ گیا ہوگا۔''

یہ ممکنات میں سے تھا لیکن وہ کون ہو سکتا ہے؟ مائیک، جونی یا خود میجر.... ؟ گو کہ میں نہیں سمجھتا تھا کہ وہ غصے کے عالم میں قتل بھی کر سکتا ہے۔ وہ پاگل ضرور تھا لیکن ایک کار کے لیے اتنا بڑا خطرہ مول نہیں لے سکتا تھا۔ زیادہ سے زیادہ وہ یہی کرتا کہ کار واپس ملنے پر پولیس کو فون کرتا اور گاڑی کو دوبارہ رنگ کے لیے بھیج دیتا۔

اس سے باتیں کرنے کے بعد جب میں ٹینٹ میں واپس آیا تو وہاں ایک فرد کا اضافہ ہو چکا تھا۔ میں دیکھتے ہی سمجھ گیا کہ وہ مائیک کلائیڈ ہی ہو سکتا ہے۔ وہ تیس سال کا ایک خوش شکل بندہ تھا لیکن اس کے چہرے کو دیکھتے ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ زندگی نے اس کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بونی کی موت کی وجہ سے اس کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی ہو۔ اگر وہ بونی کا قاتل نہیں تھا تو اس کی اداسی کی وجہ سمجھ میں آتی تھی۔

''بہت بُرا ہوا۔'' میں نے اس کے سامنے بھی وہی جملہ دہرایا۔ ''یہ پولیس والے بالخصوص مولی گن ہر ایک کو مجرم سمجھتے ہیں، خواہ اس سے جرم سرزد ہوا ہو یا نہیں۔''

اس نے مجھے شک بھری نگاہ سے دیکھا اور بولا۔ ''جونی کا کہنا ہے کہ تم پولیس کے لیے کام کرتے ہو۔''

''ہاں لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ خود بھی پولیس والا ہوں۔ میرا کام چوری کی گئی گاڑیوں کو تلاش کرنا ہے۔ قتل جیسے معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔''

''اسی لیے تم یہاں نظر آرہے ہو کیونکہ تمہارے خیال میں یہ کار چوری کا کیس ہے؟''

''یقیناً اور ابھی یہ معاملہ ختم نہیں ہوا... جب تک کہ یہ کار اس کے مالک کو واپس نہیں مل جائے۔''

''ٹھیک ہے۔ تم اپنا کام کرو۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

''مجھے بونی کے مرنے کا بہت افسوس ہے۔''

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ اس کے چہرے پر چھائی افسردگی میں کسی حد تک کمی واقع ہو گئی تھی۔

''میں نے تم دونوں کو اکثر ایک ساتھ شوز میں آتے ہوئے دیکھا تھا۔''

''اسے آج بھی میرے ساتھ ہی آنا تھا۔ میں نے کافی دیر تک اس کا انتظار کیا، جب وہ نہیں آئی تو میں یہی سمجھا کہ شاید اس کا پروگرام بدل گیا ہے۔ اس کا موبائل بھی بند تھا پھر میں خود ہی یہاں چلا آیا کیونکہ مجھے اس شخص جونی پر بالکل بھی بھروسا نہیں ہے۔ وہ میری غیر موجودگی میں بونی کو تنگ کر سکتا تھا۔''

پوچھ گچھ کا سلسلہ ختم ہوا تو میں سوچوں میں گھرا ہوا اپنے گھر چلا آیا۔ میرے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آرہے تھے۔ میرا گھر فراگ ہل فارم میں واقع ہے۔ وہیں

میرا گیراج اور دفتر بھی ہے۔ دوسری صبح میرے کاریگر کام پر آئے، تب بھی میں اسی خیال میں گم تھا۔ زوگرانٹ اور لین وکر، دونوں ہی اپنے کام میں بہت ماہر ہیں اور ان کے سامنے میری حیثیت ایک شاگرد جیسی ہے۔ انہیں کاروں کے بارے میں حیرت انگیز معلومات ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا۔ ''کیا تم بھی مائیک کلائیڈ سے ملے ہو؟''

''ہاں۔'' ان دونوں نے بیک آواز کہا۔

''تم جانتے ہو کہ وہ اپنی گزر اوقات کس طرح کرتا ہے؟''

''نہیں۔''

یہ نکتہ قابلِ غور تھا۔ اگر واقعی مائیک کار چوری میں ملوث .... ہوتا تو وہ اس کے دھندے کے بارے میں ضرور جانتے کیونکہ وہ اس بزنس میں موجود ہر شخص سے اچھی طرح واقف تھے۔ پھر میں نے بونی کے بارے میں پوچھا۔

''بونی کو جانتے ہو... اس کا اصل نام ایوا کراؤلے ہے؟''

''اس کے بارے میں سنا ضرور ہے لیکن کبھی ملنے کا اتفاق نہیں ہوا۔'' زوگرانٹ نے جواب دیا۔

''کسی نے اسے قتل کر دیا ہے۔'' یہ کہہ کر میں نے انہیں گزشتہ روز کا واقعہ سنا دیا۔

انہوں نے اپنا کام روک دیا اور کچھ دیر خاموش رہے پھر لین بولی۔ ''یہ سن کر افسوس ہوا۔ وہ اچھی لڑکی تھی۔ میں اس سے مل چکی ہوں۔''

زوگرانٹ نے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''کیا تم بھی اسے پسند کرتے تھے؟''

''نہیں، وہ میری پہنچ سے دور تھی۔ اس کی نظر اچھی کاروں اور ان کے امیر مالکان پر رہتی تھی اور اس معاملے کا ہولناک پہلو یہ ہے کہ کسی نے اس کار پر بہت بُری طرح تین طرح کا لال رنگ کر دیا ہے۔''

''حالانکہ اسے فروخت کرنے کے لیے بلیک کلر زیادہ موزوں ہوتا۔'' زوگرانٹ نے اس پر اپنی ماہرانہ رائے دی۔

لین جھرجھری لیتے ہوئے بولی۔ ''خدا کی پناہ... میں تو کبھی ایسی کار کی جانب نہ دیکھوں۔''

اسی وقت ڈیوی کا فون آ گیا جس کی وجہ سے میں زوگرانٹ سے مزید گفتگو نہ کر سکا لیکن اس کے الفاظ میرے ذہن میں چپک کر رہ گئے۔ اگر بونی اور مائیک پرانی کاریں چرانے کا دھندا کرتے تھے تو اس کام میں انہیں بہت تھوڑی آمدنی ہوتی ہوگی اور بونی ایسی عورت نہیں تھی جو تھوڑے پر گزارہ کر لے۔

ڈیوی نے مجھے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا کہ اس نے مائیک کو گرفتار کر لیا ہے لیکن شاید اس پر کوئی الزام ثابت نہ ہو سکے، گو کہ کار پر اس کی انگلیوں کے نشانات پائے گئے ہیں۔

''تب تو تم اسے کم از کم کار چوری کے الزام میں گرفتار کر سکتے ہو۔''

''شاید... لیکن یہ نشانات کار کے باہر نہیں بلکہ اندر ہیں۔ اور یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ کار کے بیرونی حصے کو ہاتھ لگائے بغیر اسے چلا کر لے گیا ہو۔''

''کیا اس نے کار پر رنگ کرنے کا اعتراف کر لیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، اس کا کہنا ہے کہ وہ خود ایک ہنرمند ہے اور کار ڈھیسی نایاب کار کو تباہ نہیں کر سکتا۔''

''اس سے مزید کیا معلومات حاصل ہوئیں؟''

''تھوڑی بہت۔ وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ مولی گن نے اس جگہ کا معائنہ کیا ہے۔ وہاں اسے ایسی کوئی علامت نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہو سکے کہ وہ کار چوری کے کاروبار میں ملوث ہے... مثلاً جعلی نمبر پلیٹیں وغیرہ۔''

''ممکن ہے کہ اس نے اس کام کے لیے کوئی اور جگہ کرائے پر لے رکھی ہو۔ آج کل اس کاروبار کے لیے زیادہ بڑی جگہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ چوری کی گئی کاروں کے لیے ایک کمپیوٹر ہی کافی ہے۔ تم لوگوں نے بونی کے گھر کا بھی معائنہ کیا ہوگا؟''

''ہاں، وہ ایک ٹیرس ہاؤس میں رہتی تھی لیکن ہر اپارٹمنٹ کا بلڈنگ کے عقب میں اپنا ایک گیراج ہے جس کا راستہ برابر والی گلی سے جاتا ہے اور تم اندازہ نہیں کر سکتے کہ ہمیں اس کے گیراج سے کیا ملا؟''

''تین مختلف شیڈز میں سرخ رنگ اور بچوں کے استعمال کا ایک برش۔''

''بالکل ٹھیک... البتہ پینٹ برش کافی تعداد میں تھے جن میں سے صرف دو استعمال کیے گئے۔''

اب یہ بات پوری طرح سمجھ میں آ گئی تھی کہ بونی کی موت کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کار کی چوری سے تھا ورنہ وہ اس طرح کیوں قتل کی جاتی۔ اس کا جواب مائیک ہی دے سکتا تھا البتہ اس قتل کا محرک کوئی کاروباری نہیں بلکہ ذاتی وجہ تھی۔ میری سمجھ میں یہ بات نہیں آ رہی تھی کہ قاتل اس گاڑی کو وہاں کیسے چھوڑ کر چلا گیا۔ مائیک کے ساتھ ساتھ مجھے جونی

پر بھی شک تھا لیکن اس کا بونی کے ساتھ کوئی کاروباری یا ذاتی تعلق نہیں تھا لہٰذا اس پر شک کرنے کی کوئی ٹھوس وجہ نظر نہیں آ رہی تھی۔

میں زوگرانٹ کو سیاہ رنگ کی ٹرائمف پر کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ اچانک میرے کانوں میں اس کے الفاظ گونجے۔ ''سیاہ رنگ زیادہ موزوں ہوتا۔''

''بلیک میل۔'' میں زور سے چلّایا۔ ''یہی اصل کاروبار تھا جس میں کسی کار کو نقصان نہیں پہنچایا گیا۔''

''کیسا بلیک میل؟'' زوگرانٹ نے حیرت سے پوچھا۔

''مائیک محض ایک دلال تھا۔ بونی امیر لوگوں کو گھیرتی اور ان کی کاریں چرا لیتی پھر وہ ان کی واپسی کے لیے بھاری تاوان طلب کرتی اور یہ بھی دھمکی دیتی کہ عدم تعاون کی صورت میں وہ ان کے اہلِ خانہ یا پارٹنرز کو ان کے جنسی تعلق کے بارے میں بتا دے گی۔''

زوگرانٹ نے دلچسپی سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''تمہارا کہنا ہے کہ وہ امیر کار مالکان کے ساتھ رات گزارتی تھی... پھر وہ ان کی کار کس طرح چراتی ہوگی؟''

''جب آدمی پر کسی جوان عورت کی قربت کا نشہ چڑھ جائے تو وہ گردوپیش سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ بونی اسی کیفیت سے فائدہ اٹھا کر ان کی کار کی چابیاں چرا لیتی تھی۔''

''کار کے مالک کو اس وقت بھی ہوش نہیں آتا ہوگا جب وہ کہتی ہوگی کہ میرے ساتھ وقت گزارنے کا بہت بہت شکریہ۔ اب میں تمہاری کار چلاتی ہوئی گھر جاؤں گی جو تمہیں واپس نہیں ملے گی۔'' زوگرانٹ نے طنز کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کام مائیک کیا کرتا تھا۔'' میں نے اس کے طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ ان دونوں کا پیچھا کرتے ہوئے اس جگہ تک پہنچ جاتا جہاں یہ کھیل کھیلا جا رہا ہوتا یا بونی خود اسے وہاں بلا لیتی اور کسی ترکیب سے چابیاں اس کے حوالے کر دیتی۔ جب وہ کار لے کر چلا جاتا تو بونی زبان بند رکھنے اور کار واپس کرنے کے لیے بھاری رقم طلب کرتی اور کار کا مالک اپنی عزت بچانے کے لیے یہ مطالبہ ماننے پر مجبور ہو جاتا۔''

''تمہارا کہنا ہے کہ ایسی کاروں کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا اور وہ اپنے مالکوں کو صحیح حالت میں مل جاتی تھیں؟''

''ہاں۔''

''پھر میجر کی کار کو کیوں نقصان پہنچایا گیا؟ اس پر اس بیدردی سے سرخ رنگ کیوں کیا گیا؟''

''یہی تو وہ نکتہ ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔'' میں نے پُرخیال انداز میں کہا۔

☆☆☆

میری نشان دہی پر میجر پیٹر مینگ کو گرفتار کر لیا گیا اور سرخ رنگ کی کار پر اس کی انگلیوں کے نشانات بھی مل گئے۔ یہ ایک واضح ثبوت تھا کیونکہ اس کار میں لاش دیکھنے کے بعد میں نے کسی کو بھی اس کے قریب نہیں آنے دیا تھا جس کا مطلب ہے کہ یہ نشانات اس سے پہلے کے تھے۔ رہی سہی کسر ڈی این اے ٹیسٹ نے پوری کر دی جس کا مطلب تھا کہ اس کے اور بونی کے درمیان کم از کم ایک بار ضرور کوئی تعلق قائم رہا ہوگا۔ میجر نے اپنے بیان میں اعتراف کر لیا کہ بونی نے ایک ہفتہ قبل اسے فون پر بلیک میل کرنے کی کوشش کی تھی جس کے جواب میں پہلے تو اس نے کہا کہ وہ ان دھمکیوں میں آنے والا نہیں ہے۔ وہ چاہے تو ساری دنیا کو بتا دے لیکن بعد میں وہ اس کی طلب کردہ رقم کا نصف دینے پر آمادہ ہو گیا۔ بونی مان گئی لیکن گھر جا کر اس نے کار پر اناڑی پن سے سرخ رنگ پھیر دیا۔

شو سے ایک روز پہلے وہ کار واپس لے کر آ گئی۔ اس نے اپنی رقم وصول کی اور جانے سے پہلے میجر کو ایک بار پھر نہال کر دیا۔ اس کے جانے کے بعد جب وہ..... ہوش و حواس میں آیا تو اس نے باہر آ کر اپنی گاڑی کا معائنہ کیا اور اس کی حالت دیکھ کر وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ تاہم میجر کا کہنا تھا کہ اس کا ارادہ اسے مارنے کا نہیں تھا۔ وہ صرف اسے سرزنش کرنے گیا تھا لیکن وہ اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ اس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا، اس سے بچنے کے لیے اس نے شو میں شرکت کرنے کے لیے اپنی کار کو فرضی نام سے رجسٹر کروایا۔ رات بھر وہ کار پارکنگ میں کھڑی رہی اور صبح ہوتے ہی وہ بھی دوسری کاروں کے ساتھ اپنی گاڑی مین گیٹ سے اندر لے آیا۔ اگر وہ گاڑی پارکنگ میں ہی رہتی تو صبح ہوتے ہی وہ نظروں میں آ جاتا۔

نظروں میں تو وہ اب بھی آ گیا تھا مگر ذرا دیر سے۔ غلطی مجھ سے ہوئی تھی جو میں شروع میں سچائی کا اندازہ نہ کر سکا۔ جب وہ اس گاڑی کی ملکیت کا دعویٰ کر رہا تھا تو مجھے اسی وقت جان لینا چاہیے تھا کہ کوئی غضب ناک مالک ہی اس کار کو فل اسٹین کے نام سے رجسٹر کروا سکتا ہے۔ فل اسٹین کا مطلب ایسا غیر مہذب شخص ہے جسے نادر و نایاب چیزوں کی قدر نہ ہو اور اس شو میں میجر ہی ایک ایسا شخص تھا جو اس تعریف پر پورا اترتا تھا۔

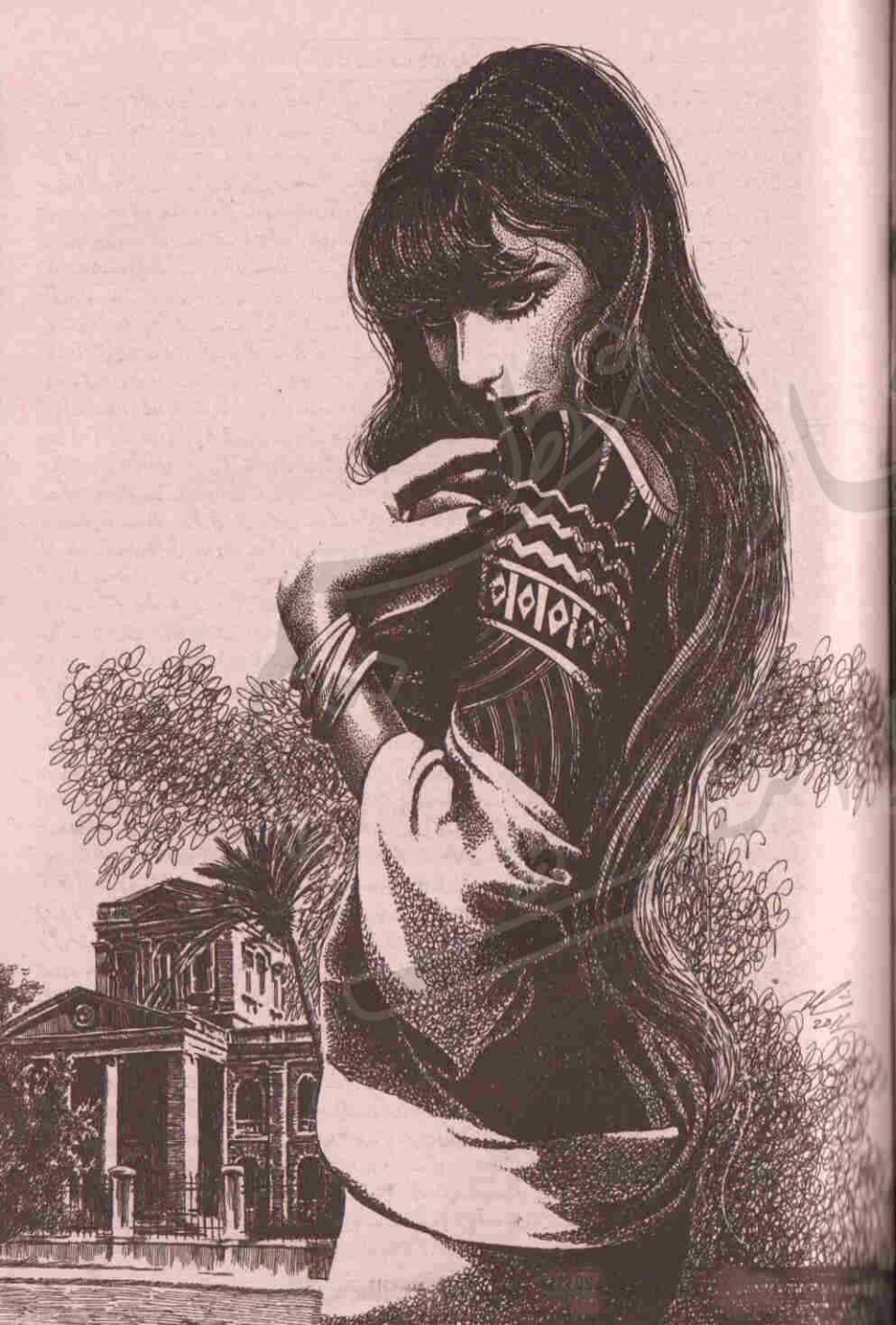

تیئسویں قسط

للکار

طاہر جاوید مغل

زمانۂ قدیم سے عاشق وہ غبارِ خاک ہے جو یہاں سے وہاں اڑتا پھرتا ہے۔ خود داری اور انا کو بالائے طاق رکھ کر کوئے یار کے طواف میں محو رہتا ہے ..... مگر آج عشق کی اقدار میں تبدیلی ..... وقت کی ضرورت اور حالات کا تقاضا ہے ..... جس نے عشق کا منظر نامہ بدل ڈالا ہے ..... کردار وں میں بھی تبدیلی آچکی ہے ..... سر پھرے عاشق نے اب ایسے شخص کا روپ دھارا جو اپنے جذبے اور شعور سے کام لے کر محبت اور محبت کے ساتھ ساتھ دیگر فرائض و منصب کو بھی پیش نظر رکھتا ہے ..... ایسے ہی عاشقوں کے گرد گھومتی داستانِ محبت جہاں ایک عاشق عشق پیشہ ہے ..... عشق میں اس کی زندگی کی سب سے بڑی سچائی اور قدر ہے ..... جبکہ دوسرے عاشق کا مطمح نظر مختلف ہے۔ زندگی اور دنیا کی وسعت نے اس کے قلب و نظر ..... عقل و شعور اور جذبِ عشق میں کشادگی کو بھر دیا ہے ..... کائنات کا ہر مسئلہ اس کے پیشِ نظر ..... ایک للکار ہے۔

ان عاشق پروانوں کا ماجرائے خاص جو للکار سننے اور للکارنے کے دھنی تھے

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

میں ایک شرمیلا اور کم گو نوجوان تھا۔ ثروت میری محبت اور منگیتر تھی۔ ہم اپنی شادی کا انتظار گھڑیاں گن گن کر کر رہے تھے لیکن پھر ایک طوفان آیا۔ سیٹھ سراج کے اوباش بیٹے واجد عرف واجی نے ایک چھوٹی سی بات سے مشتعل ہو کر ثروت کو اغوا کرلیا۔ ثروت بخیریت گھر واپس تو آگئی لیکن اس کے ماتھے پر ایک ایسا داغ لگ گیا جس نے نہ صرف اس کے والدین کی جان لی بلکہ اسے اور اس کے گھر والوں کو خاموشی سے ملک چھوڑنے پر بھی مجبور کر دیا۔ پھر میں خودکشی کا سوچنے لگا لیکن پھر میری ملاقات ایک خوش باش ہمہ صفت شخص عمران دانش سے ہوئی۔ میرا اور ثروت کا بدلہ چکانے کے لیے عمران ہاتھ دھو کر سیٹھ سراج کے پیچھے پڑ گیا۔۔۔ جلد ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ سیٹھ سراج لال کوٹھیوں میں رہنے والی ایک دبنگ عورت میڈم صفورا کے لیے کام کرتا ہے۔ یہ لوگ ٹیکسلا، ہڑپہ وغیرہ سے نوادرات حاصل کرتے تھے۔ میڈم صفورا کی چھوٹی بہن نادیہ عمران پر بری طرح فریفتہ ہو گئی۔ عمران کے ہاتھوں نادیہ کی موت کے بعد میڈم کے کارندے ہمارے پیچھے لگ گئے۔ اس خوفناک تعاقب کے نتیجے میں عمران کے سینے پر رائفل کا پورا برسٹ لگا اور وہ ایک ڈیک نالے کے تاریک پانیوں میں اوجھل ہو گیا۔ سفاک سیٹھ سراج اور شیرے نے میری والدہ کو مجبور کر دیا کہ وہ موت کو گلے لگالیں۔ ماں کی اندوہناک موت نے میرے ہوش و حواس چھین لیے۔ میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو ایک اجنبی جگہ پایا۔ یہاں مجھے ایک راجپوت لڑکی سلطانہ ملی۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ وہ میری بیوی ہے اور ہمارا ایک بچہ بھی ہے۔ پھر مجھ پر یہ حیرت ناک انکشاف ہوا کہ میں پاکستان میں نہیں بلکہ انڈیا میں اتر پردیش کی ایک دور دراز ریاست میں ہوں اور دو برسوں کے بعد ہوش میں آیا ہوں۔ میں جس جگہ موجود تھا اسے بھانڈیل اسٹیٹ کہا جاتا ہے۔ یہاں دو بڑی آبادیاں ہیں زرگاں اور ہل پانی۔ بعد ازاں مجھے زرگاں میں بگوڈا پہنچایا گیا جبکہ سلطانہ کو بھی الگ کر دیا گیا۔ یہاں میری میڈم صفورا سے ملاقات ہوئی۔ پھر مجھے بگوڈا سے نکال کر جارج کی رہائش گاہ پہنچا دیا گیا۔ پھر میں وہاں سے بھاگ کھڑا ہوا اور بھاگتے بھاگتے ایک غار میں پہنچ گیا اور اپنے ساتھیوں سے مل گیا۔ ہم نے جارج کی سوتیلی بہن ماریا کو اغوا کرلیا۔ ہم ماریا کو لے کر وہاں سے نکلے۔ ہمیں ایک عجیب الخلقت آدمی ملا جس کا ایک ہاتھ اور ٹانگ کٹی ہوئی تھی اور وہ نشے میں تھا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے آئے۔ بعد ازاں ہمیں پتا چلا کہ وہ جوڈو کراٹے کا نامور چیمپئن ہے۔ ہم واپس غار میں پہنچ گئے۔ ہمارے ایک ساتھی کی غداری کی وجہ سے ماریا ہمارے ہاتھ سے نکل گئی۔ میں ساتھیوں سے الگ ہو گیا اور بارونداجنگی تک جا پہنچا۔ مجھے اور جنگی کو کل پانی چھوٹے سرکار کے دیوان میں پہنچا دیا گیا۔ سلطانہ ایک دن خاموشی سے دیوان سے نکل گئی۔ سلطانہ کی تلاش کے دوران ہم شکنتلا تک پہنچ گئے۔ شکنتلا کو دیوان لے آیا گیا۔ جنگی کی حالت خراب تھی۔ جنگی نے دم توڑ دیا۔ ادھر زرگاں میں تین بندے قتل ہونے پر سلطانہ کو پکڑ لیا گیا۔ میں ایک ہندو فیملی کے گھر پہنچ گیا۔ رام پرشاد کے بیٹے ستیش کا تعلق انتہا پسند ہندو تنظیم سے تھا۔ پھر ایک روز ستیش نے بتایا کہ سلطانہ کو سزا دینے کا وقت آن پہنچا ہے۔ ستیش کے مطابق سلطانہ کو زندہ جلایا جاتا تھا اور اس کی چتا کو میں آگ دیتا۔ وہاں عمران کو دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اس نے کہا کہ ہم سلطانہ کو وہاں سے نکال لیں گے۔ عمران اکیلا نہیں تھا بلکہ اقبال بھی اس کے ساتھ تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہوئے اور ایک چھوٹی سی بستی میں پہنچے۔ وہاں ہم نے تاؤ افضل نامی شخص کے مکان میں قیام کیا۔ پھر ہم ایک مندر میں آگئے۔ میرا آپریشن ہو گیا اور میری گردن سے وہ منحوس چپ نکال دی گئی۔ میں اور عمران میڈم صفورا کے پاس پہنچ گئے۔ میڈم اپنی بہن کی موت کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ وہاں میڈم کے گارڈ اور اس کے ساتھ لڑائی ہوئی تاہم اس دوران میں میڈم کو سانپ نے کاٹ لیا۔ عمران نے میڈم صفورا کی جان بچالی۔ میڈم کا رویہ فی الحال ہمارے ساتھ ٹھیک ہو گیا۔ پھر میں نے جارج گورا کو سامبر کا چیلنج کر ڈالا۔ اسٹیل نے مجھے بتایا کہ جارج نے سامبر کا چیلنج قبول کرلیا ہے۔ راج بھون سے ہمارا بلاوا آ گیا۔ سامبر کی تاریخ دے دی گئی۔ میں نے ایک روز عمران کو اپنی کہانی سنانے کو کہا۔ عمران شمالی پنجاب کے ایک گاؤں میں اپنی ماں کے ساتھ رہتا تھا۔ گاؤں کا چودھری عمران عرف عمو کو دور دراز گاؤں کے ایک مزار پر ایک سال خدمت کرنے کے لیے بھیج دیتا ہے۔ عمو وہاں صبح سویرے سے رات تک صفائی کرتا۔ ایک روز وہاں کچھ مہمان آئے۔ ان میں ایک عورت ماجھاں تھی۔ اس نے عمو کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ ماجھاں نامی عورت ایک ڈاکو کی بہن تھی۔ وہ عمو سے تعلق قائم کرنا چاہتی تھی تاہم عمو کو اس سے گھن محسوس ہوئی۔ ماجھاں نے عمو کے ساتھ زبردستی کرنے کی کوشش کی اور ناکامی پر عمو کو سزا کے طور پر کتوں کی کوٹھری میں بند کروا دیا۔ عمو کو وہاں کی ایک ملازمہ شبانہ سے محبت ہو گئی۔ ایک روز موقع پا کر عمو اور شبانہ نے فرار کی کوشش کی مگر وہ پکڑے گئے۔ ماجھاں نے عمو اور شبانہ پر تشدد کیا۔ اب عمو کے پاؤں میں زنگ آلود بیڑی ڈلی رہتی تھی۔ ایک روز اچانک ماجھاں کے سرکش گھوڑے نے خوب اودھم مچایا اور ایک دو بندوں کو زخمی کر دیا مگر حیران کن طور پر عمو نے گھوڑے پر قابو پالیا اور اس پر سواری بھی کی۔ وہاں ماجھاں کا مہمان راجا نامی شخص بھی موجود تھا۔ راجا اور عمو کی دوستی ہو گئی پھر راجا نے عمو اور شبانہ کو وہاں سے نکالنے کا پروگرام بنایا اور وہ لوگ بھاگ نکلے۔ راستے میں ماجھاں سے ٹکراؤ ہو گیا مگر اس ٹکراؤ میں ماجھاں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔ ماجھاں کی موت کے بعد وہ لوگ شاد پورہ میں روپوش ہو گئے اور کبیر احمد کے گھر رہنے لگے۔ عمو کی والدہ اچانک اپنے گاؤں سے غائب ہو گئی تھی۔ عمو اپنی ماں کو ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ عمو کچھ اختلافات کی بنا پر راجا کو چھوڑ کر سرکس کے مالک جان محمد کے پاس آ گیا اور ان کی حویلی میں ٹھہر گیا۔ وہاں اسے پیر صادق شاہ نظر آ گیا۔ عمران نے اس سے بدلہ لینے کے لیے بگھ ٹائیگر کو اس پر چھوڑ دیا۔ ادھر شبانہ کے گھر والوں کا پتا ٹھکانا معلوم کر کے شبانہ کو اس کے گھر بھیج دیا گیا اور عمران کا رشتہ شبانہ سے طے ہو گیا مگر توہم پرستی کا شکار لوگوں نے عمو اور شبانہ کو جدا ہونے پر مجبور کر دیا۔ شبانہ کی شادی کسی اور سے ہو گئی اور ایک روز گھریلو جھگڑے میں شبانہ یہ دنیا چھوڑ کر چلی گئی۔ عمو خود کا خاتمہ کرنے کا سوچنے لگا اور یوں وہ خطرات سے کھیلنے لگا۔ عمو نے دکھی لوگوں کی مدد کو اپنا مقصد بنالیا۔ عمران کی کہانی نے مجھے افسردہ کر دیا۔ پھر جشن کے دن ہمیں راج بھون لے جایا گیا۔ پریوں کے چناؤ کے بعد عمران نے وہاں بونگوں پر کھڑا ہونے کا کرتب دکھایا اور مقابلہ جیت لیا۔ رتنا دیوی عمران سے متاثر ہوئی اور انعام میں ایک جرمن جیپ دی۔ پھر سامبر مقابلے والا دن آ گیا۔ میں اور جارج مدِمقابل تھے۔ میں نے جارج پر حملے کیے مگر پھر اچانک میری گردن جارج کے آہنی شکنجے میں آگئی۔ جارج مجھے سر سے بلند کر کے زمین پر پٹخنا چاہتا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ چاقو سائبان میں ہے اور جارج اس سے بے خبر ہے۔ جارج نے مجھے ہوا میں اٹھالیا۔ وہ مجھے زمین پر پٹخنے والا تھا کہ میں نے سائبان سے چاقو حاصل کر کے جارج کی گردن پر وار کیے اور پے در پے کئی وار کر کے جارج کو جہنم واصل کر دیا۔ زخمی ہونے کے باعث مجھے زرگاں کے سرکاری اسپتال میں داخل کر دیا گیا۔ عمران نے راہزنی کی واردات کا ڈراما کر کے انعام میں ملنے والی جیپ غائب کر دی پھر ہمیں حمیدہ سمیت زرگاں سے نکلنے کا راستہ دیا گیا۔ مگر یہ سب دھوکا تھا، ایک محدود فاصلے پر پہنچنے کے بعد حکم کے سپاہی ہمارے پیچھے آنے لگے۔ تاہم اس موقع پر عمران کی چھپائی ہوئی جیپ ہمارے کام آئی اور ہم اپنے تعاقب میں آنے والوں کو جل دینے میں کامیاب ہو گئے اور بخیریت مندر کے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ وہاں سب نے ہمارا استقبال کیا۔ پھر وہاں رہتے ہوئے میں نے سلطانہ کو آفتاب سے چوری چھپے ملتے دیکھا۔ میں نے بات کی تہ تک پہنچنے کے لیے منصوبہ بنایا اور سلطانہ اور آفتاب کا پیچھا کیا۔ سلطانہ ایک مندر میں چلی گئی۔ ہم نے آفتاب سے پوچھنے کی کوشش کی مگر وہ بھاگ نکلا۔ اچانک مندر کے باہر گولی چلنے کی آواز گونجی۔ میں نے لپک کر کسی کو گھوڑا گاڑی میں گھستے دیکھا۔ ایک ٹریکٹر ٹرالی اور کچھ لوگ گھوڑا گاڑی کے پیچھے لپکے۔ ہم بھی اس پر سوار ہو گئے۔ راستے میں گھوڑا گاڑی سے فائرنگ ہوئی اور دو تین گھڑ سوار اپنی جان سے گئے۔ اچانک ایک بستی آنے پر ٹریکٹر ٹرالی ایک احاطے میں رک گئی۔ یہ گاؤں کا شفاخانہ تھا۔ یہ سلطانہ اور آفتاب تھے۔ انہوں نے وہاں موجود مریضوں اور اسٹاف کو یرغمال بنالیا اور اپنی باتیں منوانے کے لیے آفتاب نے ایک ایک کر کے یرغمالیوں کو مارنا شروع کر دیا۔ حکم کے سپاہیوں نے اسپتال کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ عمران نے آفتاب سے وا کی ٹاکی پر بات کی مگر آفتاب اپنی بات پر اڑا رہا۔ وہ ہاشم رازی کو رہا کروانا چاہتا تھا۔ ڈاکٹر لی وان بھی یرغمالیوں میں شامل تھا اور آفتاب کے بات نہ ماننے کی وجہ یہ تھی کہ اس جگہ ماریا موجود تھی جواب آفتاب کے قبضے میں تھی۔ ماریا کی وجہ سے وہاں کافی ہلچل مچ گئی۔۔۔۔ رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسپتال میں گھسنے کی کوشش کرتا ہے مگر عمران کے بروقت مطلع کرنے کی وجہ سے آفتاب انہیں مار بھگاتا ہے۔ میری وا کی ٹاکی پر سلطانہ سے بھی بات ہوتی ہے۔ ہاشم رازی کو بحفاظت اسپتال پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہمیں کھیت میں بھرت نامی نوجوان ملتا ہے جو ہمیں اپنے ساتھ گھر لے جاتا ہے۔ پھر عمران بھرت کے ہاتھ انگریز افسر کو ملاقات کا پیغام بھیجتا ہے اور ہماری اس سے ملاقات ہوتی ہے۔ عمران اسے اپنی باتوں سے قائل کرلیتا ہے کہ وہ سلطانہ کے بدلے ماریا کو وہاں سے بحفاظت نکال سکتا ہے۔ انگریز افسر راضی ہو جاتا ہے اور ہمیں خاموشی سے اسپتال کے قریب ایک گھر میں پہنچا دیا جاتا ہے۔ ہمیں رائفلیں اور ایمونیشن بھی دیا جاتا ہے۔ اچانک کسی جوان لڑکی یا لڑکے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ ہاشم میگافون پر اسے مار کر پھینکنے کی دھمکی دیتا ہے۔ اسپتال کے اردگرد ہلچل مچ جاتی ہے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

میں نے ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ ہلکی روشنی میں مجھے ایک چونکا دینے والا منظر نظر آیا۔ تیرہ چودہ برس کا ایک لڑکا تنومند ہاشم کی گرفت میں تھا۔ ہاشم نے اس کی دبلی پتلی گردن اپنے بازو کے شکنجے میں جکڑ رکھی تھی اور اس کے سر سے رائفل کی نال لگا رکھی تھی۔ لڑکا کسی چڑیا کی طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ رو رہا تھا اور غالباً جان بخشی کے لیے منت سماجت بھی کر رہا تھا۔ اس کے خدوخال نے مجھے مزید چونکایا، وہ مقامی نہیں تھا۔ اس کے نقوش بتا رہے تھے کہ وہ شاید جاپانی ہے اور آج صبح قتل ہونے والے ڈاکٹر لی وان سے اس کا کوئی رشتہ ہے۔

چند سیکنڈ بعد اس خیال کی تصدیق بھی ہو گئی۔ ہاشم میگافون پر پھر دہاڑا۔ اس نے گھیرا ڈالنے والوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”یہ جس کی لاش نیچے آرہی ہے، یہ لی وان کا پوتا ہے۔ امید ہے کہ پوتے کو دیکھ کر دادا خوش ہو جاوے گا۔ اس کے بعد اس انگریز کی باری آوے گی۔۔۔“

ہمیں ہرگز معلوم نہیں تھا کہ آنجہانی ڈاکٹر لی وان کے ساتھ اس کا کوئی عزیز بھی یہاں اسپتال میں پھنسا ہوا ہے۔ اب اس لڑکے کو دیکھ کر حقیقت کا پتا چل رہا تھا۔ روتا بلکتا لڑکا انگریزی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ اس کا کوئی کوئی لفظ ہی سمجھ میں آتا تھا۔ وہ ہاشم رازی کو انکل کہہ کر مخاطب کر رہا تھا اور اس سے اپنی جان کی بھیک مانگ رہا تھا۔ یقیناً اس سے پہلے اس نے لہو نچکاں لاشیں دیکھی تھیں جن میں اس کے دادا کی لاش بھی شامل تھی۔ موت کا خوف اس لڑکے کو پوری طرح جکڑے ہوئے تھا۔ وہ پاؤں سے ننگا تھا۔ سر پر پی کیپ تھی اور اس نے دھاری دار سویٹر پہن رکھا تھا۔

عمران نے بھی ٹیلی اسکوپ کے ذریعے یہ منظر دیکھا۔ یہ فیصلے کا وقت تھا۔ دوسری کئی لاشوں کی طرح یہ بچہ بھی لاش میں تبدیل ہو کر چھت سے احاطے میں گرنے والا تھا۔ ہاشم رازی کی آواز کی وحشت گواہی دے رہی تھی کہ وہ کسی بھی وقت بچے کے سر میں گولی مار دے گا۔

میگافون پر انگریز افسر اینڈرسن کی آواز گونجی۔ وہ گلابی اردو بول رہا تھا۔ اس نے ہاشم کو اس عمل سے باز کرنے کی کوشش کی۔ جواب میں ہاشم نے کہا کہ وہ لوگ انہیں ماریا سمیت یہاں سے نکلنے کا راستہ دیں۔ اینڈرسن نے دوٹوک لہجے میں کہا کہ ایسا نہیں ہوسکتا۔ ”کمٹمنٹ“ کے مطابق انہیں پہلے ماریا کو چھوڑنا پڑے گا۔ تاہم اس دوٹوک موقف کے ساتھ ساتھ اینڈرسن نے ہاشم سے صبح تک کی مہلت بھی مانگی تاکہ مزید مشورہ کیا جاسکے۔

مشورے کی بات پر ہاشم رازی ایک دم آگ بگولا ہو گیا۔ وہ دہاڑا۔ ”تم ذلیل دھوکے باز ہو۔ تمہارا مشورہ ہمیں صرف دھوکا دینے کے لیے ہے۔ تم اپنی چالیں چلنے کے لیے وقت چاہ رہے ہو۔ اور یہ وقت میں تمہیں نا ہیں دوں گا۔ بالکل نا ہیں دوں گا۔“

وہ روتے چلاتے بچے کو کھینچ کر منڈیر کے قریب لے آیا۔ تاہم وہ دونوں ابھی تک پانی والی ٹینکی کی اوٹ میں

تھے۔ ہاشم اور اینڈرسن کے درمیان ہونے والے مکالمے کے دوران میں ہی عمران نے اسنیپر گن کے بیرل کو گن کے ساتھ اٹیچ کرلیا تھا۔ اس نے گن کو کھڑکی کی درز میں رکھا۔ ایک گھٹنا زمین پر ٹکایا اور آنکھ گن کی ٹیلی اسکوپ سے لگا دی۔ وہ ایک انتہائی قدم اٹھانے جارہا تھا۔ غالباً اس نے یہ نتیجہ نکال لیا تھا کہ اس قدم کے سوا اور کوئی چارہ نہیں۔ اب یہ منٹوں کا نہیں سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ اگر ہم لڑکے کی جان بچانا چاہتے تھے تو پھر فوری ایکشن کی ضرورت تھی۔ اس ایکشن کے لیے ہم سب سے نزدیک اور مناسب ترین جگہ پر موجود تھے۔ سوال بس ایک ہی تھا۔ ہمیں ہاشم پر حملہ کرنا چاہیے یا نہیں؟ یقینی بات تھی کہ عمران نے بھی اس بارے میں ضرور سوچا ہوگا۔ سنگین صورتِ حال میں وہ بہت تیزی سے فیصلہ کرتا تھا اور اب بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ تین چار سیکنڈ کے اندر وہ اپنے اردگرد سے یکسر بے خبر ہوگیا۔ اسنیپر گن جیسے اس کے جسم کا حصہ بن گئی تھی۔ اس کی انگلی لبلبی پر تھی اور آنکھ دوربین سے لگی ہوئی تھی۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایک خطرناک ترین نشانہ لینے جارہا ہے۔ اسے اپنے ٹارگٹ یعنی ہاشم کا بہت تھوڑا حصہ نظر آرہا تھا اور جو آرہا تھا، وہ بھی تین چوتھائی لڑکے کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے اپنے والی ٹیلی اسکوپ سے دیکھا۔ لڑکے کے سر کے پیچھے ہاشم کے سر کے بال اور نصف پیشانی ہی دکھائی دے رہی تھی۔

''غلطی کی گنجائش نہیں ہے عمران۔'' میں نے سرگوشی کی۔

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ لکڑی کی طرح ساکت ہو چکا تھا۔

میں نے کہا۔ ''یہ بھی سوچ لینا کہ اس کے بعد کیا ہو گا؟''

اس نے سر کو موہوم سی حرکت دی۔ جیسے کہہ رہا ہو کہ سوچ لیا ہے۔

ہاشم چنگھاڑا۔ ''یہ لو سنبھال لو اس کو بھی۔'' اس کے ساتھ ہی شاید اس نے فائر کرنا چاہا تھا لیکن اس سے پہلے عمران لبلبی دبا چکا تھا اور یہ کسی عام شخص کا فائر نہیں تھا۔ یہ وہ ماہر نشانہ باز تھا جو ہر شام سیکڑوں لوگوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کرتا تھا اور انہیں ورطۂ حیرت میں ڈال دیتا تھا۔ وہ موت کا کھلاڑی تھا اور قسمت کی دیوی اس کے کندھوں پر سوار رہتی تھی۔

ٹیلی اسکوپ میری آنکھوں پر تھی۔ میں نے ہاشم رازی کو اچھل کر لڑکے سے الگ ہوتے اور پھر ٹینکی کے قریب گرتے دیکھا۔ لڑکا چلاتا ہوا چھت پر چکرانے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ غالباً چند لمحوں کے لیے اس نے یہ بھی سوچا کہ چھت سے نیچے چھلانگ لگا دے لیکن چھت بہت اونچی تھی۔ اسی دوران میں سیڑھیوں کی طرف سے آفتاب خاں لپک کر آیا اور وحشت زدہ لڑکے کو دبوچ کر تاریکی میں اوجھل ہوگیا۔

میں نے ٹیلی اسکوپ آنکھوں سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ''ہاشم مرگیا ہے۔ گولی اس کے ماتھے پر لگی ہے۔''

''مجھے پتا ہے۔'' عمران نے کہا۔

''کہیں آفتاب خاں مریضوں پر برسٹ نہ چلا دے۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ وہ ایسا کرے گا لیکن اگر باہر سے کوئی حرکت ہوئی تو پھر وہ ضرور وحشی ہوجائے گا۔''

اسی دورن میں ملیارڈ جھک کر دوڑتا ہوا اس برساتی نما کمرے میں آگیا۔ اس کے گلے میں بھی ٹیلی اسکوپ جھول رہی تھی۔ وہ ہانپی ہوئی لرزاں آواز میں بولا۔ ''بہت خوب! مجھے لگتا ہے کہ تمہاری گولی نے ہاشم کو ہٹ کیا ہے۔ وہ گرا پڑا ہے۔''

''لیکن تم لوگوں نے باہر سے کسی طرح کی کارروائی نہیں کرنی۔ ورنہ یہ لوگ سب کچھ بارود سے اڑا دیں گے۔ کچھ باقی نہیں بچے گا۔'' عمران نے کہا۔ ملیارڈ اٹھا اور جھک کر دوڑتا ہوا واپس چلا گیا۔ یقیناً وہ عمران کا یہ پیغام اینڈرسن تک پہنچانا چاہ رہا تھا۔

صرف دو تین منٹ بعد مسٹر اینڈرسن خود بھی ہمارے پاس چھت پر چلا آیا۔ وہ بھی ہانپا ہوا تھا۔ جوش کے سبب اس کا سرخ چہرہ تمتما رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ''جناب! ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جس شخص کی وجہ سے یہ کام زیادہ بگڑ گیا تھا، وہ ختم ہو گیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے پرانی شرطوں پر بات ہوسکتی ہے اور میرے خیال میں انہیں قائل بھی کیا جاسکتا ہے۔''

اینڈرسن نے کہا۔ ''میں خود بھی چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ بغیر کسی مزید خون خرابے کے حل ہو جائے۔ تم دونوں نے کہا تھا کہ تم ان لوگوں سے مذاکرات کر سکتے ہو۔ اگر تم تیار ہو تو میں تم دونوں کو اندر بھجوا سکتا ہوں لیکن... لیکن... یہ تمہارے لیے بہتر نہیں رہے گا۔ تم ہندو آفیسرز کے سامنے آنا نہیں چاہتے۔'' اس کی کشادہ پیشانی پر چند لمحے کے لیے سوچ کی لکیریں نظر آئیں پھر وہ تیزی سے بولا۔ ''میں ایک واکی ٹاکی کا انتظام کرتا ہوں۔ ایک سیٹ اندر بھجواتا ہوں، دوسرا تمہیں دے دیتا ہوں۔''

''میرے خیال میں یہ طریقہ ٹھیک رہے گا۔'' عمران نے کہا۔ پھر سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

ہم اینڈرسن وغیرہ کو یہ نہیں بتا سکتے تھے کہ ہمارے درمیان پہلے سے وائرلیس رابطہ موجود ہے۔ ویسے یہ رابطہ زیادہ قابلِ بھروسا بھی نہیں تھا۔ ہمارا ''سیٹ'' کسی وقت اڑیل ٹٹو کی طرح کوئی بات بھی مان کر نہیں دیتا تھا۔

قریباً پانچ منٹ کے اندر ایک اچھی حالت کا واکی ٹاکی ہمارے پاس آن موجود ہوا۔ اس کا دوسرا سیٹ اندر آفتاب خاں تک پہنچا دیا گیا تھا۔ عمران نے مسٹر اینڈرسن سے کہا۔ ''جناب! ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔ میں آپ کا اور اپنا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتا۔ آپ جلدی سے میرے لیے دو باتوں کی وضاحت فرما دیں۔''

''کہو۔'' اینڈرسن نے افسرانہ شان سے جواب دیا۔

''پہلی بات تو یہ جناب کہ آپ کا اور ہمارا مفاد اس وقت ایک ہی ہے۔ ہم اس معاملے کو اس طرح حل کرنا چاہتے ہیں کہ محترمہ ماریا اور سلطانہ دونوں کی زندگی بچ جائے۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے کہ اس حوالے سے ہمارا ارادہ کتنا مضبوط ہے۔ اندر موجود لوگوں میں سے بدترین شخص کو ہم نے شوٹ کر دیا ہے۔ اب باقی لوگوں سے بات چیت نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔ میری درخواست یہ ہے کہ آپ اس سلسلے میں ہم پر اعتماد کریں اور ہمیں یہ بات چیت تنہائی میں کرنے کی اجازت دیں۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ میں یا مسٹر ملیارڈ یہاں موجود نہ ہوں؟''

''بہت معذرت کے ساتھ میرا مطلب یہی ہے جناب! یوں ہمیں بات چیت کرنے میں زیادہ آسانی رہے گی۔''

اینڈرسن چند لمحوں کے لیے متذبذب نظر آیا۔ پھر اس نے اثباتی انداز میں سر ہلا کر ہامی بھر لی۔ عمران نے کہا۔ ''بعد میں، میں آپ کو ساری بات چیت سے تفصیلاً آگاہ کر دوں گا جناب۔''

''اوکے... اوکے! دوسری بات کیا ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''ہم ان سے ''کمٹمنٹ'' کی بات کریں گے۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ اپنے وعدے کی پاسداری کریں۔ باہر سے بھی پاسداری ہوگی۔ اگر وہ محترمہ ماریا کو چھوڑ دیتے ہیں تو انہیں یہ رعایت دی جائے گی کہ وہ باقی یرغمالیوں کو نل پانی کی حدود میں پہنچنے کے بعد آزاد کریں۔ اور نل پانی پہنچنے تک ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوگی۔''

''بالکل... تم لوگ ان سے اس ''کمٹمنٹ'' کی بات کر سکتے ہو۔ میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی طرف سے ایک بار پھر گارنٹی دیتا ہوں کہ اگر وہ مس ماریا کو رہا کر دیں تو ہم بھی اپنے عہد کی پاسداری کریں گے۔ یہ پاسداری ہم پہلے بھی کر رہے تھے۔ جو کام بھی خراب ہوا ہے، وہ ہماری طرف سے نہیں ان کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے اپنے پیش امام صاحب کو زبان دے کر اس سے روگردانی کی۔ ان کے لیے شرمندگی کا باعث بنے۔''

میں نے کہا۔ ''جناب! اس ساری صورتِ حال کا ذمے دار وہ اکیلا شخص تھا جو ابھی دس منٹ پہلے مارا گیا ہے۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' اینڈرسن نے کہا۔ ''ہماری اور تم دونوں کی توقعات ٹھیک ثابت ہوں۔ میری اور محترم حکم جی کی طرف سے تم انہیں معاہدے کی پاسداری کی پوری ضمانت دے سکتے ہو۔''

طے شدہ پروگرام کے مطابق اینڈرسن نیچے چلا گیا۔ تاہم اس کا ماتحت آفیسر ملیارڈ اور دو انگریز رائفل مین چھت پر ہی رہے لیکن وہ برساتی نما کمرے کے اندر نہیں تھے۔ یوں ہم اپنی مرضی سے آفتاب اور سلطانہ وغیرہ سے بات کر سکتے تھے۔ حالانکہ اس بات کا اندیشہ بھی موجود تھا کہ کسی ذریعے سے اینڈرسن وغیرہ ہماری بات چیت سن نہ لیں۔

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کیا خیال ہے، اپنی طرف سے آفتاب کو مسٹر اینڈرسن وغیرہ کی ضمانت دی جاسکتی ہے؟''

''اس کے سوا ہم کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ویسے سنا تو یہی تھا کہ یہ گورا اینڈرسن وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔ شاید تم ہی نے بتایا تھا۔''

''اور مجھے گیتا مکھی نے بتایا تھا۔ اس نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہوا ہے اور رات رات کا مزہ لیا ہوا ہے۔ شاید اس نے اپنا کوئی ذاتی تجربہ بیان کیا ہو۔''

''عمران! میرے خیال میں ہمیں اور وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ تم بات کرو آفتاب سے۔''

عمران نے واکی ٹاکی آن کیا۔ پہلی ہی کوشش میں آفتاب سے رابطہ ہوگیا۔ اس کی دہاڑتی آواز سنائی دی۔ ''تم لوگوں نے اپنی موت پر خود مہر لگایا ہے۔ اب ام کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا۔ کتے کا موت مارے گا سب کو اور سب

سے پہلے یہ بھینسے کے منہ والا تمہارا گورا افسر مرے گا...''

عمران نے کہا۔ ''میں عمران بول رہا ہوں آفتاب... مجھے افسوس ہے کہ...''

''ام اب کسی کا بکواس سننا نہیں چاہتا۔ ان لوگوں نے ہاشم صاحب کو شہید کر دیا ہے۔ اب ان کو بھی موت کا مزہ چکھنا پڑے گا۔ ام ان کو صرف ایک گھنٹے کا مہلت دیتا ہے۔ یہ لوگ یہاں سے امارے جانے کا انتظام کرے۔ ورنہ چارپائی لے کر آئے اور احاطے میں سے اپنے ذلیل افسر کا لاش اٹھا کر لے جائے۔ صرف ایک گھنٹا... پورے ساٹھ منٹ۔'' مہلت کی بات سے اندازہ ہو رہا تھا کہ ہاشم کی نسبت آفتاب خاں میں لچک موجود ہے۔

عمران نے دھیمے دوستانہ لہجے میں کہا۔ ''آفتاب خاں! میری بات کا بُرا نہ ماننا۔ ہاشم صاحب کا رویہ ایک دم بہت سخت ہو گیا تھا۔ شاید ان کی جان جانے کی وجہ بھی یہی ہے۔ انہوں نے امام صاحب کی بات ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ حالانکہ وہ اپنی طرف سے پوری گارنٹی دے رہے تھے۔''

آفتاب گرجا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے، ام اس میم کو چھوڑ دے گا تو یہ ام پر حملہ نہیں کرے گا؟ یہ ایک سیکنڈ کا دیر نہیں لگائے گا اور امارا انکا بوٹی کر دے گا۔ اس گورے افسر کا زیادہ اہمیت نہیں ہے ان لوگوں کی نظروں میں۔''

''اہمیت ہے آفتاب... اہمیت ہے۔'' میں نے زور دے کر کہا۔ ''ابھی پانچ منٹ پہلے یہاں کے انچارج افسر اینڈرسن سے ہماری بات ہوئی ہے۔ وہ ہر صورت میں اپنے اس بندے کو بچانا چاہتے ہیں۔ پھر بہت سے دوسرے لوگ تمہارے پاس اندر موجود ہیں۔ ان لوگوں کے بے شمار وارث یہاں دھرنا دیے بیٹھے ہیں۔ ان کو ہر صورت اپنے عزیز زندہ چاہیے ہیں۔ وہ افسروں پر مسلسل دباؤ ڈال رہے ہیں۔ لی وان کا پوتا بھی تمہارے پاس موجود ہے۔ ماریا کو چھوڑنے کے بعد بھی تمہیں کچھ خاص گھاٹا نہیں ہونے والا ہے۔''

عمران بولا۔ ''اور اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ ہم نے مسٹر اینڈرسن کے ذہن کو پوری طرح ٹٹولا ہے۔ اس کا ارادہ یہی ہے کہ اگر ماریا کو یہاں رہا کر دیا جائے اور باقی لوگوں کو تل پانی کے اندر جا کر چھوڑ دیا جائے تو وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔''

''ام کیسے یقین کرلے اس بات پر؟ اس انگریز کے دماغ کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔'' آفتاب کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

میں نے کہا۔ ''تم ہماری بات پر اس لیے یقین کرو کہ یہ مسئلہ جتنا تمہارا ہے، اتنا ہی ہمارا بھی ہے۔ میں سلطانہ کو زندہ دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے اس کی ضرورت ہے، میرے بچے کو اس کی ضرورت ہے۔''

''کچھ بھی ہے۔ ام یہاں سے نکلنے سے پہلے اس سفید کتیا کو نہیں چھوڑ سکتا۔ کسی صورت نہیں۔'' اس کے الفاظ سخت تھے لیکن لہجے میں تھوڑا سا ڈھیلا پن بھی محسوس ہوتا تھا۔

میں نے کہا۔ ''تم سلطانہ سے مشورہ کرو۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بھی خون خرابا نہیں چاہے گی۔ کیا تم اس سے میری بات کرا سکتے ہو؟''

''بالکل نہیں۔ وہ نیچے ہے۔ وہاں سے ایک منٹ کے لیے بھی نہیں ہل سکتا۔'' آفتاب نے کہا۔

میرے، عمران اور آفتاب کے درمیان یہ گفتگو قریباً آدھ گھنٹا جاری رہی۔ ہاشم رازی کی اچانک موت کے غم نے آفتاب کو ہیجان میں مبتلا کر رکھا تھا۔ تاہم اس کے ساتھ ساتھ وہ یہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ ہاشم رازی کا رویہ غیر معمولی طور پر سخت تھا۔ غالباً یہ رویہ آفتاب اور سلطانہ کے لیے بھی اچنبھے کا باعث بنا تھا۔ آفتاب یقیناً ہاشم رازی کی موت کی وجہ انگریز اور ہندو فوجیوں کو سمجھ رہا تھا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اسے اسپتال کے ساتھ والی چھت سے ہم نے شوٹ کیا ہے۔

ہاشم اس سارے ''سین'' میں آندھی کی طرح آیا اور طوفان کی طرح رخصت ہو گیا تھا۔ اب اس ساری صورتِ حال میں فیصلے کی طاقت ایک بار پھر آفتاب کے پاس تھی اور اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ پہلے والا فیصلہ برقرار رکھنا چاہتا ہے۔ یعنی ماریا کو چھوڑنا اور باقی یرغمالیوں کے ساتھ روانہ ہونا۔

قریباً دس منٹ بعد آفتاب نے ہم سے وا کی ٹاکی پر رابطہ کیا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اس نے خود رابطہ کیا تھا۔ ایک بار پھر ہمارے اور اس کے درمیان گفت و شنید شروع ہوئی۔ وہ سمجھوتے کے مطابق ماریا کو چھوڑنے پر رضامند تو تھا لیکن ایک شرط کے ساتھ اور وہ شرط بھی کچھ اتنی زیادہ سخت نہیں تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اسپتال کے احاطے سے نکلتے وقت اپنے ساتھ دس یرغمالی بٹھائے گا، ان میں زخمی انگریز اور لی وان کا پوتا بھی شامل ہوں گے۔ ان میں کوئی عورت نہیں ہو گی۔ یہ سب کچھ تو پہلے ہی طے ہو چکا تھا۔ نئی شرط یہ تھی کہ احاطے سے نکلتے ہوئے ماریا بھی ان کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوگی۔ بہرحال، گاؤں سے باہر نکلنے کے فوراً بعد وہ ماریا کو گاڑی سے اتار دے گا۔

آفتاب کی یہ نئی شرط فوری طور پر قابلِ قبول نہیں تھی تو اسے ناقابلِ قبول بھی نہیں کہا جا سکتا تھا۔ اس بارے میں انگریز افسروں سے بات کی جا سکتی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ شاید وہ یہ شرط مان بھی جائیں گے۔

غالباً آفتاب خاں کو اندیشہ تھا کہ یرغمالیوں کے ساتھ اسپتال کے اندر سے نکل کر گھوڑا گاڑی میں سوار ہونے کا مرحلہ خاصا مشکل ہوگا۔ وہ اچانک حملے کے خطرے سے دوچار ہوں گے۔ اس کے بعد جب وہ گھوڑا گاڑی میں بیٹھ کر گاؤں کی گلیوں سے گزریں گے تو تب بھی خطرے میں ہوں گے۔ لیکن گاؤں سے نکل کر کھلے راستے پر پہنچنے کے بعد وہ نسبتاً محفوظ ہو جائیں گے۔ تب وہ ماریا کو اتار دے گا۔

ہم نے آفتاب خاں سے پندرہ منٹ کا وقت لیا اور وا کی ٹاکی پر سلسلہ منقطع کر دیا۔ ہم نے آفیسر منیارڈ سے کہا کہ وہ اینڈرسن صاحب کو یہاں بلائے۔ منیارڈ گیا اور پانچ منٹ میں اینڈرسن کو لے آیا۔ اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ کی یہ ساری آمد و رفت بڑی رازداری سے ہو رہی تھی۔ ہندو آفیسر اور فوجی اس سارے معاملے سے بے خبر تھے۔ عام لوگوں کو بھی اس بات کی بھنک نہیں پڑنے دی گئی تھی کہ اس رہائشی مکان کی چھت پر کون موجود ہے اور یہاں کس طرح کے مذاکرات چل رہے ہیں۔

عمران نے پُرامید لہجے میں کہا۔ ''جناب اینڈرسن صاحب! ہمارا خیال ہے کہ یہ معاملہ حل کے قریب آ گیا ہے۔ بس ایک چھوٹی سی رکاوٹ ہے۔ ہاشم کی موت کے بعد اس کے ساتھیوں نے ایک چھوٹی سی شرط رکھی ہے۔ وہ اپنے تحفظ کے حوالے سے زیادہ محتاط ہوئے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ محترمہ ماریا کو اسپتال میں نہیں بلکہ گاؤں سے باہر کھلی جگہ پر نکل کر چھوڑیں گے۔''

''کھلی جگہ سے کیا مطلب ہے؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ گاؤں کی آبادی سے نکلنے کے فوراً بعد۔'' میں نے جواب دیا۔

اینڈرسن نے سگار کے دو طویل کش لیے پھر بولا۔ ''تم دونوں کا کیا خیال ہے، اس میں کوئی چکر بازی تو نہیں ہوگی؟''

''میں نے تفصیلی بات کی ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''ہاشم کی موت کے بعد وہ لوگ کچھ ڈرے ہوئے ہیں۔ شاید انہیں خطرہ ہے کہ گاڑی میں منتقل ہونے کے دوران میں ان پر حملہ نہ ہو جائے۔''

میں نے کہا۔ ''مسٹر اینڈرسن! آپ ان معاملوں میں زیادہ بہتر فیصلہ دے سکتے ہیں لیکن جو چیز مجھ جیسے بندے کو بھی نظر آ رہی ہے، وہ یہ ہے کہ یہ پورا گاؤں فورس کے گھیرے میں ہے۔ عمارت کے اندر کی نسبت گھوڑا گاڑی میں ان لوگوں کی پوزیشن کہیں زیادہ کمزور ہوگی۔ اگر وہ گاؤں سے نکلتے ہی محترمہ ماریا کو رہا کرنے کی بات کر رہے ہیں تو یہ سمجھ میں آتی ہے۔''

اس معاملے میں ہمارے درمیان چند منٹ بات ہوئی۔ دو چار منٹ کے لیے سیکنڈ آفیسر منیارڈ بھی اس میں شامل ہوا۔ آخر طے ہوا کہ اگر حملہ آور باقی ساری شرائط مان رہے ہیں تو ان کو یہ گنجائش دے دی جائے۔ اینڈرسن وغیرہ ابھی تک یہی سمجھ رہے تھے کہ اندر دو سے زیادہ حملہ آور موجود ہیں۔

اینڈرسن کی موجودگی میں ہی ہم نے وا کی ٹاکی پر آفتاب خاں سے رابطہ کیا۔ اس رابطے میں ساری تفصیلات طے ہو گئیں۔ ہم نے آفتاب کو بتایا کہ دو گھوڑوں والی بڑی گھوڑا گاڑی تیار ہے۔ دو اضافی گھوڑے بھی موجود ہیں۔ راستے کے لیے راشن وغیرہ بھی مہیا کیا جا رہا ہے۔

آفتاب بولا۔ ''ٹھیک ہے، ام آدھ گھنٹے کے اندر اندر تیس عورتوں اور مردوں کو چھوڑ دے گا۔ دس بندہ امارے ساتھ رہے گا۔ ام ایک بار پھر سب لوگوں کو بتانا چاہتا ہے کہ اگر ہمارے خلاف کوئی حرکت ہوا تو ان سب میں سے کوئی ایک بھی زندہ حالت میں نہیں ملے گا۔''

اینڈرسن کے اشارے پر عمران نے اس سے پوچھا۔ ''کیا تم ماریا یا آفیسر ٹام سے بات کرا سکتے ہو؟''

''نہیں، ابھی کسی سے بات نہیں ہو سکتا۔'' اس نے بھڑک کر کہا۔ ''ابھی تم فوجیوں سے کہو کہ وہ گھوڑا گاڑی کو احاطے میں لے کر آئیں اور برآمدے کے پاس بائیں طرف کھڑا کر کے باہر نکل جائیں۔ پھاٹک کے سامنے اور آس پاس کوئی کالا گورا فوجی نہیں ہونا چاہیے۔ پوری تسلی ہونے کے بعد ہی ہم لوگوں کو چھوڑے گا۔''

آدھ گھنٹے کے اندر اندر یہ سب کچھ ہو گیا۔ آفتاب نے ایک بار پھر چھت پر چڑھ کر اردگرد کا جائزہ لیا۔ وہ ہمیں واضح دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ پانی والی گول ٹینکی کے پیچھے بس اس کے ہیولے کی جھلک ہی دکھائی دیتی تھی۔ ہاشم کی اچانک موت کے بعد وہ زیادہ محتاط ہو چکا تھا۔ ہمارے اندازے کے مطابق ہاشم کی لاش بھی ابھی تک ٹینکی کے آس پاس ہی پڑی تھی۔

آفتاب نیچے چلا گیا۔ کچھ دیر بعد ہم نے دھڑکتے دلوں کے ساتھ دیکھا کہ اسپتال کا ایک اندرونی دروازہ کھلا اور ایک قطار میں کچھ لوگ باہر نکلے۔ ان میں چھ سات عورتیں اور تین بچے بھی شامل تھے۔ ان لوگوں کی کل تعداد تیس کے قریب رہی ہوگی۔ میں نے ٹیلی اسکوپ کے ذریعے دیکھا۔ ان میں سے کچھ افراد زخمی بھی تھے۔ ایک مریض کی ٹانگ پر پلاستر تھا اور وہ بیساکھی کے سہارے باہر آرہا تھا۔ قریباً بہتر گھنٹے کے اعصاب شکن دباؤ کے بعد ان لوگوں کو کھلی ہوا میں سانس لینا نصیب ہوا تھا۔ ان کا یہ سفر موت سے زندگی کی طرف تھا۔ وہ احاطے میں پہنچے اور باہر نکل آئے۔ پھاٹک سے پچیس تیس میٹر کی دوری پر ان کے لواحقین موجود تھے۔ وہاں رقت آمیز مناظر دیکھنے میں آئے۔ لوگ ایک دوسرے سے لپٹ رہے تھے اور دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے۔ ایک فاقہ زدہ یرغمالی عورت جس کا شوہر آفتاب خاں کی گولی کا شکار ہو کر مر گیا تھا، باہر آکر بے ہوش ہوگئی اور لوگ اسے اٹھا کر اندر لے گئے۔

صبح چار بجے کے قریب وہ مرحلہ شروع ہوا جس کا ہر کسی کو شدت سے انتظار تھا۔ آفتاب خاں نے وائی ٹاکی پر بتایا۔ ''ام لوگوں کو لے کر باہر نکل رہا ہے۔ ام ایک بار پھر کہہ رہا ہے کہ احاطے کے آس پاس اور پھاٹک کے قریب کسی کو موجود نہیں ہونا چاہیے۔''

''کوئی موجود نہیں ہے۔'' عمران نے کہا۔ ''اور تم سے بھی گزارش ہے کہ خود کو پُرسکون رکھو۔ اب جو کچھ ہونا ہے، وہ سب طے ہے۔ کوئی چکر، کوئی چالبازی اب یہاں نہیں ہے۔''

چند منٹ بعد ہم نے چھت پر سے اسپتال کے برآمدے کا منظر دیکھا۔ منیارڈ بھی ہمارے ساتھ موجود تھا۔ اندرونی دروازہ کھلا اور یرغمالیوں کی قطار باہر نکلی۔ ان سب کے ہاتھ پشت پر مضبوطی سے بندھے ہوئے تھے۔ وہ سر جھکائے چل رہے تھے۔ ان میں ہمیں ڈاکٹر لی وان کا سہما ہوا پوتا بھی نظر آیا۔ سب سے آخر میں ماریا تھی۔ اس کے ہاتھ بھی پشت پر کسے گئے تھے۔ آفتاب نے اپنی طاقتور سیون ایم ایم کی نال اس کی پشت سے لگا رکھی تھی۔ یقیناً اس رائفل کے دو تین برسٹ چند سیکنڈ میں ان دس گیارہ یرغمالیوں کا خاتمہ کر سکتے تھے۔ پھر ہم نے سلطانہ کو دیکھا۔ اس کا یہ روپ میں پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چادر میں اس طرح لپیٹا ہوا تھا کہ بس آنکھیں ہی نظر آتی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں ایک چھوٹی نال کی رائفل تھی۔ اس کا رائفل تھامنے کا انداز اور اس کا اعتماد بتاتا تھا کہ وہ اسلحہ شناس ہے اور بوقتِ ضرورت اسے بے دریغ استعمال بھی کر سکتی ہے۔ وہ یرغمالیوں کی قطار کی بائیں جانب تھی۔ صرف زخمی انگریز آفیسر نام وہ شخص تھا جس کے ہاتھ پشت کے بجائے سامنے کی طرف باندھے گئے تھے۔ ٹیلی اسکوپ میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے کندھے پر گہرا زخم ہے۔ وہ لنگڑاتا ہوا بہ مشکل چل پا رہا تھا۔

یرغمالیوں کی قطار احاطے میں کھڑی گھوڑا گاڑی کی طرف بڑھی۔ یہ بے حد تناؤ بھرے لمحے تھے۔ اسپتال کے اردگرد گلیوں میں اور گھروں کی چھتوں پر سیکڑوں سپاہی اور گارڈز موجود تھے۔ ان میں سے بہت سے براہِ راست یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

ابھی پہلا یرغمالی گھوڑا گاڑی میں داخل ہوا تھا کہ وہ کچھ ہوا جس کی توقع کسی کو نہیں تھی۔ اوپر تلے دو فائر ہوئے۔ میں نے آفتاب کو ایک دم لڑکھڑاتے اور جھکتے دیکھا... اس کے ساتھ ہی آفتاب نے اپنی رائفل کا ٹریگر دبا دیا۔ تڑتڑ کی لرزہ خیز آواز گونجی۔ کئی گولیاں ماریا کے جسم کے آر پار ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی سلطانہ نے بھی اوپر تلے فائر کیے۔ میں نے یرغمالیوں میں سے کم از کم دو افراد کو زمین بوس ہوتے دیکھا۔

ایک دم کہرام مچ گیا اور شب کا سناٹا چنگھاڑتی آوازوں سے چکنا چور ہو گیا۔ کئی طرف سے فائر ہونے لگے۔ میں نے دیکھا کہ زخمی آفتاب تیزی سے رینگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہو گیا ہے۔ رائفل بدستور اس کے ہاتھ میں تھی۔ سلطانہ مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔ لگتا تھا کہ وہ بھی کسی اوٹ میں ہو گئی ہے۔ گھوڑا گاڑی کا ایک گھوڑا زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

دفعتاً میں نے عمران کو دیکھا۔ وہ میرے پہلو میں نہیں تھا۔ وہ تیزی سے دوڑتا ہوا چھت کے آخری کنارے کی طرف جا رہا تھا۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ کسی کے پیچھے لپکا ہے۔ چھت کی منڈیر تک پہنچ کر اس نے ہوا میں جست لگائی۔ یہ ویسی ہی جست تھی جیسی پیراک سوئمنگ پول میں کودنے کے لیے لگاتے ہیں لیکن عمران کے نیچے سوئمنگ پول نہیں تھا۔ پھر مجھے اندازہ ہوا کہ وہ پرالی کے ایک بڑے ڈھیر پر گرا ہے اور وہاں سے لڑھک کر زمین پر آگیا ہے۔ اٹھ کر وہ پھر کسی کے پیچھے لپکا۔ اب میں نے بھاگنے والے کا سایہ بھی دیکھ لیا۔ وہ برق رفتاری سے کھیتوں کی طرف جا رہا تھا۔

ایک دم میری سمجھ میں آگیا کہ عمران کس کے پیچھے دوڑا ہے۔ جن دو فائرز کی وجہ سے ہنگامہ شروع ہوا، وہ ہماری

دائیں جانب والی دو تین چھتوں میں سے کسی ایک چھت پر سے ہوئے تھے۔ غالباً عمران نے فائر کرنے والے کو دیکھ لیا تھا اور اب اس کو پکڑنا چاہ رہا تھا۔ اس شخص نے بھاگتے بھاگتے ایک دم پلٹ کر عمران پر گولی چلائی۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ عمران نے نیچے گر کر خود کو بچایا تاہم اس وقت یہ اندیشہ بھی میرے ذہن میں آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ عمران نے نیچے لیٹے لیٹے دو جوابی فائر کیے لیکن یہ فائر مدِمقابل کو لگے نہیں۔ میں نے اسے برق رفتاری سے گنے کے کھیتوں میں اوجھل ہوتے دیکھا۔

جونہی عمران کھڑا ہوا، میں نے ایک اور لرزہ خیز منظر دیکھا۔ ایک جانب سے ایک اور لمبا تڑنگا شخص برآمد ہوا۔ اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ اس کا ارادہ عیاں تھا، وہ عقب سے عمران کو نشانہ بنانا چاہ رہا تھا۔ یہ بس سیکنڈوں کا کھیل تھا۔ میں نے ٹیلی اسکوپ پھینک کر رائفل پکڑی۔ ابھی مجھے رائفل سیدھی کرنے اور نشانہ لینے میں تین چار سیکنڈ لگنے تھے اور میرا نشانہ بہت اچھا بھی نہیں تھا لیکن یہ تین چار سیکنڈ شروع ہونے سے پہلے ہی وہ کچھ ہو گیا جس کی توقع نہیں تھی۔ قریبی کھیت میں سے ایک ہیولا سا نکلا اور برق رفتاری سے رائفل بردار پر جا پڑا۔ یہ ایک کتا تھا۔ اس کی آواز کھیتوں کے درمیان دور تک گونجی۔ میں نے کتے اور رائفل بردار کو اوپر نیچے گرتے دیکھا۔ دونوں گتھم گتھا تھے۔ ان کے درمیان فائر کا شعلہ لپکا... یہ وہ وقت تھا جب عمران کو اندازہ ہوا کہ اس کے عقب میں کیا ہوا ہے... عمران پلٹا۔ مگر تب تک کھیل ختم ہو گیا۔ تنومند کتے نے ایک دم رائفل بردار کو چھوڑا اور کھیتوں میں اوجھل ہو گیا۔ یوں لگا جیسے وہ فائر کی خوفناک آواز سے بدک گیا ہے لیکن جو کچھ بھی تھا، کتا اپنا کام کر گزرا تھا۔ رائفل بردار بے سدھ پڑا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، دیوہیکل کتے کی اچانک جست کے سبب اس کی رائفل سے گولی چل گئی تھی۔ رائفل کا رخ اوپر کی طرف تھا اس لیے گولی نے رائفل بردار کو ہی نشانہ بنا ڈالا تھا۔ پگھلا ہوا قریباً بیس گرام سیسہ رائفل بردار کی ٹھوڑی کے نچلے حصے میں داخل ہوا تھا اور اس کا تالو پھاڑ کر کھوپڑی میں گھس گیا تھا۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ کوئی اور نہیں، وہی کتا ہے جو پچھلے دو تین دن سے ہمارے اردگرد منڈلا رہا تھا۔

آفتاب کو گولی لگنے سے لے کر، کتے کے نمودار ہونے اور پھر نامعلوم رائفل بردار کی ہلاکت تک کے سارے واقعات صرف آٹھ دس سیکنڈ کے اندر ہی رونما ہوئے۔ عمران دوڑتا ہوا دوبارہ گھر میں داخل ہوا اور سیڑھیاں چڑھ کر پھر چھت پر آگیا۔ اسپتال کے احاطے کے اندر قیامت برپا تھی۔ اندھا دھند فائرنگ ہو رہی تھی۔ ہمیں احاطے میں کم از کم پانچ لاشیں نظر آرہی تھیں۔ ان میں سے ایک واضح طور پر ماریا کی تھی۔ وہ اوندھی پڑی تھی، اس کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

''اب یہ لوگ سلطانہ اور آفتاب کو نہیں چھوڑیں گے۔'' عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔

میرے سینے میں کچھ ٹوٹ کر بکھر گیا اور اس کی کرچیاں پورے جسم میں پھیل گئیں... ''ہمیں کیا کرنا چاہیے؟'' میں نے کراہتی ہوئی سی آواز میں پوچھا۔

عمران نے جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں احاطے پر جمی تھیں۔ جنریٹر چل رہا تھا۔ بلب کی مدھم روشنی میں سب کچھ نظر آرہا تھا۔ درجنوں مسلح گارڈز اور کمانڈوز نے ایک دم تین اطراف سے اسپتال پر ہلّا بول دیا تھا۔ وہ بارش کی طرح گولیاں برساتے ہوئے اسپتال کے احاطے میں گھس گئے اور مختلف چیزوں کی آڑ لے لی۔ کمانڈوز کی ایک ٹولی احاطے کا ایک بغلی دروازہ توڑ کر اندر گھس گئی۔ انہوں نے برآمدے کے بالکل قریب پوزیشن لے لی۔ ان کی اندھا دھند فائرنگ نے اسپتال کے سارے اندرونی شیشے توڑ ڈالے۔ ہر طرف شعلے لپکتے نظر آئے اور دھواں پھیل گیا۔ میں ٹیلی اسکوپ سے دیکھ رہا تھا۔ تب اچانک میری نظر ایک منظر پر پڑی اور ہر امید دم توڑ گئی۔ یہ آفتاب خاں کی لاش تھی۔ وہ برآمدے کے ایک چوکور ستون کے پیچھے اوندھا پڑا تھا۔ اس کے لباس پر خون کے دھبوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کا سارا جسم چھلنی ہو گیا ہے۔ اس کی لمبے بیرل والی سیون ایم ایم رائفل بھی اس کے پاس پڑی تھی۔

میں نے کہا۔ ''عمران! سلطانہ اکیلی رہ گئی ہے شاید۔'' اس کے ساتھ ہی میں نے ٹیلی اسکوپ عمران کی طرف بڑھائی اور برآمدے کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا۔ عمران نے دیکھا اور اس کے ہونٹ بھی سکڑ گئے۔

''اس کا مطلب ہے کہ جوابی فائر صرف سلطانہ کر رہی ہے۔'' عمران نے کہا۔

''اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ اور میرا خیال ہے کہ وہ... دو تین منٹ سے زیادہ نہیں نکال سکے گی۔'' میری آواز رندھ گئی۔

احاطے کے اندر اور برآمدے کے آس پاس کمانڈوز کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں سفید فام کمانڈوز بھی تھے۔ ماریا کی موت نے گھیراڈالنے والوں کو جیسے وحشی کر دیا

تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ اسی جگہ آفتاب اور سلطانہ کا قیمہ کر دینا چاہتے ہیں۔

''کیا خیال ہے عمران... اسے بچانے کی کوشش کریں؟'' میں نے لرزاں آواز میں پوچھا۔

''کوشش کرنی چاہیے لیکن اس کے لیے ہمیں نیچے جانا ہوگا۔ سب کے سامنے آنا ہوگا۔ کیا تم اس کے لیے تیار ہو...؟''

''میں تیار ہوں۔'' میں نے کہا۔

عمران ایک سیکنڈ ضائع کیے بغیر اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم دوڑتے ہوئے سیڑھیاں اترے پھر ایک گلی سے گزر کر اسپتال کی طرف آگئے۔ لوگ کونے کھدروں میں چھپے ہوئے تھے۔ ہر طرف دہشت برس رہی تھی۔ ہم پھاٹک پر پہنچے۔ ہندو گارڈز نے ہمیں دیکھا۔ ان میں سے کچھ نے ہمیں پہچان لیا۔ ان کی آنکھوں میں ہراس آمیز حیرت نظر آئی۔ پانڈے کے ایک ماتحت کا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑھا۔ یہی وقت تھا جب عمران کی نظر نیارڈ پر پڑ گئی۔ وہ انگریزی میں بولا۔ ''مسٹر نیارڈ! بات سنیے۔''

نیارڈ بھی ہمیں کھلے عام سب کے سامنے دیکھ کر حیران ہوا۔ عمران اسے ایک طرف لے گیا۔ ان دونوں کے درمیان بس چار پانچ جملوں کا تبادلہ ہوا۔ احاطے میں ہونے والی فائرنگ شدید ہوتی جارہی تھی۔ لگتا تھا کہ سلطانہ نے کہیں اچھی پوزیشن لی ہوئی ہے اور بھرپور جواب دے رہی ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ عمران نے نیارڈ سے کیا کہا ہے۔ یقیناً اس نے اس سے درخواست کی تھی کہ اسے آگے جانے کا موقع دیا جائے۔ وہ سلطانہ کو ہتھیار ڈالنے اور گرفتاری دینے پر آمادہ کردے گا۔ نیارڈ کے تاثرات سے اندازہ ہوا کہ عمران کی بات کا اس پر مثبت اثر ہوا ہے۔ وہ تیزی سے پیچھے گیا۔ غالباً آپریشن انچارج مسٹر اینڈرسن سے اجازت لینے گیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گیا تھا، دوڑتا ہوا ہی واپس آیا۔ اس دوران میں ہندو سپاہی ہمیں شعلہ بار نظروں سے دیکھتے رہے تھے۔ واپس آتے ہی نیارڈ نے ہم دونوں کو ساتھ لیا اور چکر کاٹ کر احاطے کے اس بغلی دروازے پر پہنچا جسے توڑ کر کمانڈوز چار پانچ منٹ پہلے اندر گھسے تھے۔

احاطے میں داخل ہونے سے پہلے نیارڈ نے میری اور عمران کی رائفلیں لے کر اپنے ساتھیوں کو تھما دیں۔ اس کے بعد اس نے بلند آواز میں کمانڈوز کو حکم دیا کہ وہ کچھ دیر کے لیے فائرنگ روک دیں... فائرنگ مدھم ہوئی اور پھر رک گئی۔ تاہم کمانڈوز نے اپنی پوزیشنیں برقرار رکھیں۔ رائفلوں کے کندے ان کے شانوں سے لگے رہے اور نگاہیں ٹارگٹ پر جمی رہیں۔ اندازہ ہوا کہ سلطانہ اسٹور روم کے قریب ایک دس فٹ اونچی گیلری میں موجود ہے... اور اس کے اندر سے جوابی فائر کر رہی ہے... قیامت خیز فائرنگ میں وقفہ آیا تو دبی ہوئی آوازیں ابھر آئیں۔ ایک آواز کسی شدید زخمی کی تھی جو برآمدے کے اندرونی حصے میں پڑا تھا اور مدد کے لیے تڑپ رہا تھا... دوسری آواز احاطے میں تڑپتے پھڑکتے زخمی گھوڑے کی تھی۔ اس کے علاوہ احاطے کے باہر اور ارد گرد کی چھتوں پر گونجنے والی صدائیں تھیں۔ مسلح فوجی اور کمانڈوز ایک دوسرے کو پکار رہے تھے۔ ہدایات دے رہے تھے یا لے رہے تھے۔

''آجاؤ اندر۔'' نیارڈ نے ہم دونوں کو ایک ساتھ مخاطب کر کے کہا۔

ہم دیوار کے ساتھ ساتھ چلتے نیارڈ کے پیچھے، برآمدے تک پہنچے اور ایک چھوٹی سی دیوار کی اوٹ میں ہو گئے۔ میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ آفتاب خاں کی لاش بس آٹھ دس قدم کے فاصلے پر چوکور ستون کے پیچھے پڑی تھی۔ لگتا تھا کہ کمانڈوز نے وحشت میں اس کی لاش پر بھی گولیاں برسائی ہیں۔ چوکور ستون کی اوٹ میں کھڑے ایک انگریز نے بھاگ کر اپنی پوزیشن تبدیل کی تو گیلری کی طرف سے فوراً رائفل کا فائر ہوا۔ کمانڈو بال بال بچا۔

نیارڈ نے ہاتھ میں پکڑا ہوا میگافون میری طرف بڑھایا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! گولی چلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ تم اپنی رائفل نیچے پھینک دو اور خود بھی باہر آجاؤ۔ نیارڈ صاحب نے وعدہ کیا ہے، تم پر فائر نہیں کیا جائے گا۔''

کچھ دیر تک مکمل خاموشی رہی پھر اندر سے چلا کر کچھ کہا گیا۔ یہ سلطانہ ہی تھی۔ الفاظ سمجھ میں نہیں آئے لیکن آواز واضح طور پر پہنچ رہی تھی۔ میں نے میگافون ایک طرف رکھ دیا اور بلند آواز سے کہا۔ ''سلطانہ! یہ لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔ تم فوراً رائفل باہر پھینک دو اور ہاتھ اٹھا کر نکل آؤ۔''

جواب میں سلطانہ نے پھر چلا کر کچھ کہا۔ اس مرتبہ الفاظ بھی ہماری سمجھ میں آئے۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''نا ہیں مہروج... میں بندوک نا ہیں پھینکوں گی۔ میں... آخری دم تک لڑوں گی...'' اس کی آواز میں زخمی شیرنی جیسا درد موجود تھا اور طنطنہ بھی۔ یہ اسی راجپوت لڑکی کی آواز تھی جو سر جھکانے سے سر کٹانا بہتر سمجھتی تھی۔ یہ آواز کہہ رہی تھی... ''ہوا'' کو زنجیریں کون پہنا سکتا ہے اور میں گھنے جنگلوں کی مست ''ہوا'' ہوں۔ اور سمندر کو قید کون کر سکتا ہے؟ میں ساحلوں کے گھیرے میں نہ رہنے والا سمندر ہوں اور حق کی آواز کو کوئی ''حکم'' کیسے دبا سکتا ہے اور میں حق کی وہی سرکش آواز ہوں۔

میں نے ہر دور میں ظلم کو للکارا ہے۔ میں ہر دور میں لہولہان ہوئی ہوں اور ہر آنے والے دور میں نئی طاقت اور نئے جوش کے ساتھ ابھری ہوں۔

میں نے اور عمران نے دیکھ لیا تھا کہ سلطانہ موت کے گھیرے میں ہے۔ کسی بھی وقت اس کی جان جاسکتی ہے۔ یہ گھنٹوں یا منٹوں کی نہیں، سیکنڈوں کی بات تھی۔ ہم سلطانہ کو بچانا چاہتے تھے۔ کم از کم وقتی طور پر بچانا چاہتے تھے۔ وہ زندہ گرفتار ہو جاتی تو پھر شاید اس کی زندگی کے لیے کوئی راستہ بھی نکل آتا، کوئی وسیلہ بھی پیدا ہو جاتا۔ انہونیوں کی گنجائش تو ہر جگہ موجود ہوتی ہے۔ امید کی آنکھیں ہمیشہ کرشموں کی راہ دیکھتی ہیں اور کبھی کبھی یہ انتظار رنگ بھی لاتا ہے۔

اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جاتا تو اس موجودہ واقعے میں سلطانہ کا کردار سنگینی میں سب سے کم تھا۔ خون خرابے کے اصل ذمے دار آفتاب اور پھر ہاشم رازی تھے۔ ممکن تھا کہ سلطانہ کے گرفتار ہو جانے کی صورت میں مسٹر اینڈرسن اور دوسرے انگریز عہدیداروں کے دلوں میں اس کے لیے رحم کی کوئی رمق پیدا ہو جاتی۔ میرا اپنا اندازہ بھی یہی تھا کہ مسٹر اینڈرسن اور نیارڈ وغیرہ سلطانہ کو زندہ گرفتار کرنا چاہتے ہیں۔

سلطانہ کا انکار سننے کے بعد کمانڈوز نے پھر گیلری کا نشانہ لے لیا تھا۔ اب مسٹر اینڈرسن خود بھی وہاں آن موجود ہوا تھا۔ اس کے اپنے ہاتھ میں بھی جدید ماؤزر تھا۔ اس کے صرف ایک اشارے پر ایک بار پھر سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو سکتی تھی۔ میں مسٹر اینڈرسن کے سامنے آگیا۔ میں نے کہا۔ ''جناب! آپ ان لوگوں سے کہیں کہ کوئی فائر نہ کرے۔ میں سلطانہ سے بات کر رہا ہوں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ وہ گرفتاری دے دے گی۔''

''جو کچھ کرنا ہے، جلدی کرو۔'' مسٹر اینڈرسن کا لہجہ سخت تھا۔

میں کمانڈو اور مسٹر نیارڈ کی ہدایات کو نظر انداز کرتا ہوا تھوڑا سا اور آگے چلا گیا۔ میں نے پکار کر کہا۔ ''سلطانہ! میں تمہارا شوہر ہوں۔ میں... زندگی میں پہلی بار تم سے کچھ مانگ رہا ہوں۔ انکار نہ کرنا سلطانہ... بات تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے لیکن مان لو۔ رائفل کھڑکی سے باہر پھینک دو اور خود بھی نکل آؤ...''

چند سیکنڈ بعد سلطانہ کی گلوگیر آواز ابھری۔ ''مہروج... خدا کے لیے... مجھے اتنی بڑی آزمائش میں نا ہیں ڈالو۔ یہ بڑا سخت امتحان ہے۔''

''سخت امتحانوں میں سے ہی بہتری کا راستہ بھی نکل آتا ہے سلطانہ... اور مجھے امید ہے نکلے گا۔ میری اور بالو کی خاطر بات مان لو۔ باہر نکل آؤ۔ میں نے بڑے صاحب سے بات کی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔ تم بس کھڑکی کھول کر رائفل باہر پھینک دو۔''

وہ خاموش رہی۔ یوں لگا کہ وہ فیصلے کی سولی پر لٹک رہی ہے۔ مسٹر اینڈرسن نے دیوار کی اوٹ سے دہاڑ کر کہا۔ ''میں ایک منٹ سے زیادہ نہیں دے سکتا۔ اسے کہو باہر نکل آئے۔''

کمانڈوز اب آگے بڑھتے ہوئے گیلری کے بالکل قریب پہنچ گئے تھے۔ میں نے ایک بار پھر کہا۔ ''سلطانہ... باہر آجاؤ... میری خاطر۔''

پندرہ بیس سیکنڈ... پندرہ بیس گھنٹوں کی طرح گزرے۔ پھر ہم نے دیکھا کہ گیلری کا دروازہ کھلا۔ سلطانہ باہر نکلی۔ وہ ابھی تک اسی لباس میں تھی جس میں پونم پور کے مندر میں گئی تھی۔ اس کے جسم پر لہریے دار ساڑی تھی، کانوں میں چاندی کے جھمکے، کلائیوں میں وہی پیلی اور سرخ چوڑیاں تھیں جو اسے آفتاب نے لاکر دی تھیں۔ یہ سب کچھ ایک ہندو ناری کا روپ دھارنے کے لیے تھا۔ میں نے دیکھا اس کی ساڑی کندھے پر سے خون آلود ہے۔ یقیناً وہ زخمی بھی تھی۔ اس کے ہر وقت قندھاری اناروں کی طرح دہکنے والے رخسار زرد نظر آتے تھے۔ اس کی سیاہ آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے رائفل پھینک دی۔ یہ رائفل پُرشور انداز میں سیڑھیوں سے لڑھکتی ہوئی نیچے آگئی۔ یہی وقت تھا جب میری نظر سیکنڈ آفیسر نیارڈ پر پڑی۔ اس نے کمانڈوز کی طرف دیکھ کر آنکھوں سے کوئی اشارہ کیا۔ اگلا لمحہ قیامت کا تھا۔ ایک ساتھ تین چار رائفلوں سے تڑتڑ کی خوفناک آواز بلند ہوئی۔ سلطانہ کا جسم اچھل کر پیچھے کی طرف گیا۔ گیلری کی دیوار سے ٹکرایا اور پھر سیڑھیوں سے لڑھکتا ہوا نیچے آگیا۔

''سلطانہ!'' میرے سینے کی گہرائی سے پکار بلند ہوئی۔ میں بے ساختہ اس کی طرف لپکا۔

میں اس کے اوپر گر گیا۔ ان حشر خیز لمحوں میں شاید میرے دماغ کے اندر یہ آیا تھا کہ میں اس کے اوپر گر جاؤں گا تو وہ مزید گولیوں کی زد سے محفوظ ہو جائے گی۔ لیکن اسے

مزید گولیوں کی ضرورت ہی کہاں تھی؟ اس کا سینہ چھلنی ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ یہ شاید اس کی زندگی کے آخری دو تین سیکنڈ تھے۔ ''مہروج'' وہ بس اتنا ہی کہہ سکی... وہ مر چکی تھی۔ میرے زخموں پر اپنے محبت بھرے ہونٹ رکھنے والی، میرے رستے کے کانٹے اپنی پلکوں سے چننے والی، میری خاطر اپنا سب کچھ لٹا دینے والی مر چکی تھی اور اس کا سر میری بانہوں میں تھا۔

...میں پلٹا... مجھے اپنے سامنے کچھ نظر نہیں آیا۔ بس ایک سرخ چادر تھی جو آنکھوں کے سامنے تن گئی تھی۔ اس چادر کے اندر سے کمانڈوز کے منحوس چہرے پرچھائیوں کی طرح نظر آتے تھے۔ میں دہاڑا۔ مجھے نہیں معلوم میں نے کیا کہا اور کس کو کہا۔ ہاں، یہ ضرور تھا کہ اس آواز کی گونج مجھے اپنے پورے جسم میں اور سارے در و دیوار میں محسوس ہوئی۔ میں اپنے قریب ترین انگریز کمانڈو کی طرف بڑھا۔ یہ انہی میں سے تھا جنہوں نے میری نہتی سلطانہ پر گولی چلائی تھی۔ اس کے جسم کو چھلنی کیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کمانڈو نے میری طرف رائفل سیدھی کی ہے۔ اس وقت یہ قاتل رائفل مجھے دنیا کی حقیر ترین چیز محسوس ہوئی۔ میں کمانڈو سے ٹکرایا اور اسے اپنے نیچے لیتا ہوا دور جا گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے منیارڈ کو دیکھا۔ وہ میری طرف رائفل سیدھی کر رہا تھا۔ ایک طرف سے عمران عقاب کی طرح جھپٹا اور منیارڈ کی رائفل کی نال اوپر اٹھا دی۔

اچانک میرے سر پر کوئی بہت وزنی چیز لگی۔ اس کے ساتھ ہی محسوس ہوا کہ درجنوں ہاتھوں نے مجھے دبوچ لیا ہے۔ ایک بار پھر کوئی وزنی شے سر سے ٹکرائی۔ میری آنکھوں کے سامنے تنی ہوئی سرخ چادر کا رنگ تبدیل ہونے لگا۔ وہ بتدریج سیاہ ہوتی چلی گئی۔

☆☆☆

پتا نہیں میں کتنی دیر بے ہوش رہا اور کس حال میں رہا۔ دوبارہ حواس بحال ہوئے تو میرے اردگرد لالٹین کی مدھم روشنی تھی۔ میں کچھ دیر تک بالکل خالی ذہن کے ساتھ لیٹا رہا۔ پھر دھیرے دھیرے مجھے احساس ہوا کہ مجھ پر کیا قیامت بیت چکی ہے۔ میں جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میرے سر سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھیں۔ لیکن شاید اس سے دس گنا زیادہ درد بھی ہوتا تو مجھے وہ کرنے سے نہ روک سکتا جو میں نے کیا۔ میں اٹھا اور نیم دیوانگی کی سی کیفیت میں ''سلطانہ... سلطانہ...'' پکارنے لگا۔ پھر میں کمرے کے بند دروازے پر پل پڑا۔ میں نے دو ہتڑ چلائے، اسے ٹھوکریں رسید کیں۔ میری آواز نے در و دیوار کو لرزا دیا۔ میں چلا رہا تھا۔ ''دروازہ کھولو حرام زادو... تم نے اسے مار دیا۔ میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گا، میں تمہیں زندہ جلا دوں گا۔ میں سب کو راکھ کر دوں گا۔ میرا کچھ نہیں بچا۔ کان کھول کر سن لو۔ کسی کا کچھ نہیں بچے گا۔ کسی کا نہیں بچے گا۔'' میں پھر دروازے پر حملہ آور ہوا۔ چوبی دروازہ بہت مضبوط تھا پھر بھی چٹخنے لگا۔

ایک طرف سے عمران نمودار ہوا اور اس نے مجھے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ ''ہوش کرو تابی! اس طرح کچھ نہیں ہو گا۔ جانے والی جا چکی ہے... اب صبر اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔''

میں نے اسے دھکا دے کر پیچھے ہٹایا۔ ''تم لو صبر اور ہمت سے کام، میں نہیں لوں گا۔ میں مر جاؤں گا اور ان سب کو مار ڈالوں گا۔ انہوں نے میری نہتی سلطانہ کو مارا ہے۔ وہ میرے کہنے پر باہر آئی تھی۔ میرے کہنے پر اس نے خود کو حوالے کیا تھا۔ اس سفید سور منیارڈ اور اینڈرسن نے مروایا اسے۔ انہوں نے دھوکا دیا۔''

عمران نے ایک بار پھر مجھے بازوؤں میں بھرا۔ ''نہیں تابی! موت کا وقت مقرر ہے۔ جو ہوا ایسے ہی ہونا تھا۔ اور کیا پتا... یہ اچھا ہی ہوا ہو۔ وہ پکڑی جاتی تو اس کی موت مشکل ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اسے معاف تو نہیں کرنا تھا نا۔ یہ تو اس کی بوٹیاں نوچنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اب اسے خدا کی رضا سمجھو۔ اپنے آپ کو سنبھالو تابی۔''

درد میری برداشت سے باہر تھا۔ میں کراہا۔ ''مجھے چھوڑ دو۔ مر جانے دو مجھے۔ اس کے پاس چلے جانے دو۔''

میں نے خود کو چھڑانے کے لیے زور لگایا۔ عمران نے مجھے نہیں چھوڑا۔ میں نے اسے زوردار جھٹکے دیے۔ کوئی اور ہوتا تو مجھے گرفت میں نہ رکھ سکتا مگر اس کے فولادی بازوؤں نے مجھے گھیرے رکھا۔ میں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر زور لگایا۔ اس کی گردن پیچھے مڑ گئی مگر بازوؤں کی گرفت برقرار رہی۔ میں پھنکارا۔

''تم نے کیا کیا... تم نے بھی بس تماشا دیکھا؟ میری طرح تم نے بھی اسے مرنے دیا۔ ہماری آنکھوں کے سامنے وہ چھلنی ہو گئی۔ مجھے چھوڑ دو۔''

میں نے پورا زور لگایا۔ ہم دونوں دیوار سے ٹکرائے پھر پختہ فرش پر گر گئے لیکن عمران نے مجھے چھوڑا نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ میں پھر دروازے پر پل پڑوں گا۔ اسے توڑ دوں گا یا خود کو شدید زخمی کر لوں گا۔ اس کی مضبوط گرفت اس کی

دوستی ہی کی طرح ناقابلِ شکست تھی۔

کچھ دیر بعد میری وحشت ایک دم شدید غم واندوہ میں ڈھل گئی۔ میں نے خود کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ اپنا سر اس کے سینے سے ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ ہم اسی طرح فرش پر گرے رہے۔ میں روتا رہا، وہ مجھے اپنے سینے سے بھینچتا رہا، میرا سر چومتا رہا۔ مجھے لگا میرے جسم کا سارا پانی آنکھوں کے راستے نچڑ جائے گا۔ میری نگاہوں میں چند دن پہلے کے وہ مناظر تھے جب مندر کے تہ خانے میں وہ میرے ساتھ تھی۔ شب کے اندھیرے میں وہ اپنی تمام تر نسوانیت اور حلاوت کے ساتھ میرے اندر سما جاتی تھی۔ وہ ہولے ہولے میرا نام پکارتی تھی۔ میں اس کے کانوں میں محبت بھری سرگوشیاں کرتا تھا۔ وہ جواب دیتی تھی۔ وہ نل پانی کی ان سہانی شاموں کا سپنا دیکھتی تھی جب ہم دیوان کے وسیع احاطے میں گیندے اوزموتیے کے پھولوں کی کیاریوں کے درمیان ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے دور تک چلتے چلے جاتے۔ ہمارا بالو ہماری بانہوں میں ہوتا اور ہم باری باری اس کے گال چومتے۔ وہ اب اپنے اس سپنے سمیت مٹی کے نیچے سو رہی تھی، کبھی نہ اٹھنے کے لیے۔ وہ بس تین چار دن کے اندر ہی سوکھی ریت کی طرح میری مٹھی میں سے پھسل گئی تھی۔

میں رو رو کر نڈھال ہو گیا۔ میں نے جسم کا درد سہنا تو کسی حد تک سیکھ لیا تھا لیکن دل کا درد سہنا مجھے کہاں آتا تھا؟ میں تڑپ تڑپ کر نیم جان ہو گیا تو عمران کے ساتھ ہی چٹائی پر نیم دراز ہو گیا۔ شاید یہ نیم بے ہوشی کی سی کیفیت تھی۔

دوبارہ میری آنکھ کھلی تو بدستور اندھیرا تھا۔ لالٹین روشن تھی۔ مجھے اندازہ ہوا کہ یہ بالکل بند جگہ ہے۔ کوئی کھڑکی، روشن دان، کوئی درز کچھ بھی نہیں۔ بس وزنی چوبی دروازے کے اندر ایک چوکور خانہ سا تھا اور وہ بھی بند تھا۔ یہاں رات اور دن کی تمیز مشکل تھی۔ عمران میرے سرہانے بیٹھا تھا۔ میرے سر کے زخم سے رسنے والے خون کو روئی سے پونچھ رہا تھا۔

''ہم کہاں ہیں عمران؟'' میں نے پوچھا۔

''زرگاں میں۔''

میں نے اردگرد دیکھ کر کہا۔ ''زرگاں کی جیل میں؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

''کب پہنچے ہم یہاں؟''

''کل رات۔''

''اور سلطانہ؟'' میری آواز دکھ کے بوجھ سے بیٹھ گئی۔

''وہ بھی آ گئی تھی۔ اسے کل رات دفن کیا گیا۔ یہاں زرگاں میں اس کے کچھ عزیز موجود ہیں۔ اس کی میت انہیں دے دی گئی تھی۔''

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ آنکھوں سے تازہ گرم آنسو رسنے لگے۔ عمران کہہ رہا تھا۔ ''اس کا جنازہ کڑے پہرے میں پڑھا گیا۔ شاید پندرہ بیس لوگ ہی ہوں گے۔ لیکن پتا چلا ہے کہ آج دوپہر زرگاں میں ہزاروں لوگوں نے اس کی غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی ہے۔''

اسپتال میں سلطانہ کے آخری لمحات میری نگاہوں میں گھومنے لگے۔ میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ہمارا اندازہ غلط نکلا عمران! ہمارا خیال تھا کہ شاید یہ گورے اسے زندہ پکڑنا چاہتے ہیں لیکن وہ نہیں چاہتے تھے۔ میں نے خود اس سفید سور خیار ڈ کو اشارہ کرتے دیکھا تھا۔ اس کے اشارے پر ہی سپاہیوں نے گولیاں چلائیں۔''

عمران نے طویل سانس لی۔ ''تم ٹھیک کہتے ہو۔ ان چٹی چمڑی والوں کو سمجھنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ دراصل انہوں نے سوچ لیا تھا کہ سلطانہ والا معاملہ وہیں پر ختم کر دینا ہے۔ اپنے حساب سے انہوں نے ٹھیک ہی سوچا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ سلطانہ کو زندہ پکڑا گیا تو اسے مارنے اور نہ مارنے کا مسئلہ بہت بڑا ایشو بن جائے گا۔ بہت سی مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔ راجواڑے کے حالات تو پہلے ہی سے بہت خراب ہیں۔''

میں نے سسک کر کہا۔ ''عمران! یہ سب کیوں ہوا؟ سب کچھ تو ٹھیک ہونے جا رہا تھا۔ سب کچھ طے ہو گیا تھا۔ وہ گولی کس نے چلائی جس نے آفتاب کو زخمی کیا اور پھر ہنگامہ شروع ہو گیا۔''

عمران نے کہا۔ ''وہ ایک نہیں دو گولیاں تھیں۔ اور مجھے یقین ہے وہ اس بندے نے چلوائیں جو اس راجواڑے میں ہمارا سب سے کمینہ اور خطرناک دشمن ہے... وہ پانڈے نے چلوائیں۔ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ یہ سب کچھ خوش اسلوبی سے ہو جائے۔ سلطانہ بچ کر یہاں سے نکل جائے۔''

میرا لہو کھول گیا۔ میں نے کہا۔ ''تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ پانڈے نے چلوائیں؟''

''یہ گولیاں ہمارے پیچھے والی ایک چھت سے چلائی گئی تھیں۔ میں نے اس بندے کا سایہ دیکھ لیا تھا۔ وہ چھت سے کودا اور بھاگ نکلا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ شاید تم نے بھی اسے دیکھا ہو۔ وہ ایک پاؤں ذرا دبا کر بھاگ رہا تھا۔ پانڈے کا ایک چوڑی ناک والا ماتحت بھی ایک پاؤں دبا کر

چلتا ہے۔ سریش نام ہے اس کا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ وہی بندہ تھا۔''

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب تو یہ ہے کہ... ماریا کی جان جانے کے علاوہ اور بھی جو جو کچھ ہوا، اس کا ذمے دار یہی رنجیت پانڈے ہے۔''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ سب کچھ ٹھیک جا رہا تھا اور مجھے سو فیصد یقین ہے کہ اپنے دوسرے ساتھی کیپٹن ٹام اور باقی پرفالیوں کی جان بچانے کے لیے ان گوروں نے سلطانہ اور آفتاب کو نل پانی میں داخل ہونے دینا تھا۔''

ایک جاں گسل افسوس اور دکھ نے مجھے گھیر لیا۔ واقعی اگر وہ دو گولیاں نہ چلتیں تو حالات اس وقت کتنے مختلف ہوتے۔ ہو سکتا تھا کہ اب سلطانہ کے علاوہ ہم دونوں بھی نل پانی کے خوب صورت دیوان میں ہوتے۔ وہ اپنے بچے کو بانہوں میں لے کر نہال ہو رہی ہوتی۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کے ستارے چمکتے۔ لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ اس کی جگہ ایک ناقابلِ تلافی دکھ تھا۔ ایک آگ تھی جو میری رگوں میں دوڑ رہی تھی اور میرے تن بدن کو بار بار بھسم کر رہی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ''عمران! وہ دوسرا بندہ کون تھا جس پر کتے نے حملہ کیا؟''

''وہ یقیناً سریش کمار کا کوئی ساتھی ہوگا۔''

میری نگاہ میں سارا منظر پھر سے گھوم گیا۔ اس شخص کا عقب سے عمران کو نشانہ بنانے کی کوشش کرنا۔ کھیت میں سے اچانک جسیم کتے کا نکلنا اور اس پر جا پڑنا۔ کتے کی لرزہ خیز آوازیں، اس شخص کی دردناک چنگھاڑ، پھر گولی کا چلنا اور کتے کا پلک جھپکتے میں اوجھل ہونا...

میں خالی خالی نظروں سے عمران کو دیکھتا رہا۔ میں نے کہا۔ ''عمران! یہ کتا وہی تھا نا جس کی رسّی تم نے کھیتوں میں کھولی تھی؟''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کتا بڑا وفادار جانور ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا ہی ہوگا، وہ تب سے ہمارے آس پاس ہی تھا۔'' عمران نے کہا۔

میرا خیال تھا کہ عمران کچھ اور بھی کہے گا... اس نے کچھ نہیں کہا... لیکن میرے ذہن میں وہ تمام الفاظ گونجنے لگے جو عمران نے اپنی روداد بیان کرتے ہوئے کہے تھے... اس نے جانوروں کے ساتھ اپنے خصوصی اور حیرت انگیز تعلق کا تذکرہ کیا تھا۔ وہ خاص کشش جس کی وجہ سے وہ پہلے جان صاحب کی مردم شناس نظر میں آیا اور پھر اسٹار سرکس میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہوا۔ بعد ازاں امریکن پروفیسر رچرڈ رچی نے عمران کی اس انوکھی صلاحیت کو ''اسپیشل اٹینسل ماسٹری'' کا نام دیا تھا۔ اس نے کہا تھا کہ وقتی طور پر یہ صلاحیت عمران کے اندر دب گئی ہے یا کہہ لیا جائے کہ زائل ہو گئی ہے لیکن امکان ہے کہ یہ کچھ عرصے بعد پھر بحال ہو جائے گی۔

تو کیا وہ صلاحیت بحال ہو رہی تھی؟

''کیا سوچ رہے ہو؟'' عمران نے کہا۔

''یہی کہ اگر وہ کتا اچانک نمودار نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟''

''یہ ''اگر'' بڑا عجیب لفظ ہے تابی! اس کے بارے میں زیادہ غور نہیں کرنا چاہیے۔ جو ہو گیا وہ ہو گیا۔ اب آئندہ کے بارے میں سوچنا چاہیے۔''

اچانک ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ واضح طور پر کوئی بڑا بارودی دھماکا تھا۔ در و دیوار لرز گئے۔ اس کے فوراً بعد رائفلوں کی گرج سنائی دی۔ جیل کے آس پاس کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔ ''یہ سب کیا ہے؟'' میں نے عمران کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔

''لگتا ہے کہ زرگاں میں گڑبڑ چل رہی ہے۔ رات کو تم تو سوئے پڑے تھے، پر میں گولیوں کی آوازیں سنتا رہا ہوں۔ رات تین بجے کے قریب دستی بموں کے کئی دھماکے بھی ہوئے تھے۔''

''تمہارا کیا اندازہ ہے؟''

''کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لوگ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ہوں۔ گڑبڑ تو یہاں پہلے سے ہی چل رہی تھی۔''

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی کوٹھڑی کے وزنی چوبی دروازے پر کھٹ پٹ ہوئی اور دروازے میں موجود چوکور خانہ کھل گیا۔ اس ڈیڑھ فٹ مربع کے خانے میں اب ایک موٹی آہنی سلاخ نظر آ رہی تھی۔ دوسری طرف ایک باوردی گارڈ موجود تھا۔ اس کے عقب میں ایک دوسرا گارڈ مسلح کھڑا تھا۔ پہلے گارڈ نے چوکور خانے میں سے کھانے کے برتن اندر پہنچا دیے۔ ایک قہر آلود نگاہ ہم پر ڈالی اور بغیر کچھ کہے چوکور خانہ پھر سے بند کر دیا۔ کوٹھڑی میں ایک بار پھر صرف لالٹین کی روشنی رہ گئی۔

عمران نے مجھے کھانا کھلانا چاہا مگر میرے لیے یہ ممکن نہیں تھا۔ گلے میں کانٹے سے پڑے ہوئے تھے۔ وہ اسپتال کے اندر تین دن تک بھوکی پیاسی رہی اور پھر آزاد فضا میں سانس لینے سے پہلے ہی گولیوں سے چھلنی ہو گئی۔ اس کا زرد چہرہ، اس کی آنکھوں کے سیاہ حلقے، اس کے سوکھے

ہونٹ، سب کچھ میری نگاہوں میں گھوما.... میں ٹھنڈے فرش پر ایک کونے میں لیٹ گیا اور بازو موڑ کر اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔ ماں کی موت کے بعد یہ دوسرا بڑا صدمہ تھا جو میں نے جھیلا تھا اور اس نے مجھے اندر سے جھلسا ڈالا تھا۔ دھیرے دھیرے مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔ میں نے تصور کی آنکھ سے دیکھا۔ وہ سارے گہنے پہنے آنکھوں میں کاجل لگائے میرے سامنے کھڑی ہے۔ میرے کانوں میں جیسے اس کی جیتی جاگتی آواز گونجی۔ ''مہروج! آپ نے کھانا کیوں نا ہیں کھایا؟ آپ کو پتا اچ ہے کہ آپ نا ہیں کھائیں گے تو میں بھی نا ہیں کھاؤں گی۔ بھوکی اچ رہوں گی۔''

میں تصور میں کراہا۔ ''سلطانہ! کہاں چلی گئی ہو تم؟ میں تو ٹوٹا پھوٹا برباد پردیسی تھا۔ تم نے مجھے پھر سے جینا سکھایا۔ مجھے پھر سے زندگی دی... میرے زخموں پر مرہم رکھا۔ میری ناتوانیوں کو سہارا دیا۔ میرے لیے ساری دنیا سے ٹکر لے لی لیکن مجھے اکیلا نہیں چھوڑا۔ اب کیوں چھوڑ گئی ہو مجھے؟ تم نے کہا تھا... میں جب بلاؤں گا تم آؤ گی... دیکھو، میں بلا رہا ہوں تمہیں... مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ ہمارے بچے کو تمہاری ضرورت ہے... وہ معصوم تمہاری راہ دیکھتا ہوگا۔ ایک بار آجاؤ سلطانہ... پھر میں تمہیں اپنی بانہوں میں چھپا لوں گا۔ تمہیں اتنی دور لے جاؤں گا کہ اس آگ کی گرم ہوا بھی تمہیں چھو نہ سکے۔''

وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہی۔ اس کے کانوں میں سنہری جھمکے ہلتے رہے۔ اس کے سینے پر طلائی ہار چمکتا رہا۔ وہ بولی۔ ''مجھے میری غلطیوں پر معاف کر دینا مہروج... میں اب آ نا ہیں سکتی۔ لیکن میں ہمیشہ آپ کے پاس رہوں گی... میں موتیے اور گیندے کے پھولوں میں آپ کو ملوں گی... اور چاندنی راتوں کی ٹھنڈک میں اور صبح دم چلنے والی ہوا میں... اور مہروج! جب کسی تپتی دوپہر میں برسات کے بادل چھائیں گے تو میں آپ کے پاس آجاؤں گی... جب سردیوں کی نرم دھوپ آپ کے شہر میں پھولوں اور بچوں کے منہ چومے گی تو میں آپ کے آس پاس ہی ہوں گی... ہاں، میں آپ کو اور اپنے بالو کو چھوڑ کر کہاں جا سکتی ہوں۔''

اس کا ہیولا مدھم ہوتا چلا گیا... پھر اوجھل ہو گیا۔ میری جلتی آنکھوں میں نمی تھی... اس کا تصور آنکھوں میں بسائے بسائے میں سو گیا۔

دوبارہ میں زوردار آوازوں کی وجہ سے جاگا۔ گارڈ چلا رہے تھے۔ کسی قریبی کوٹھڑی کا دروازہ زور سے کھلا پھر بند ہو گیا۔ تب ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی دھماکے سے کھلا۔ مسلح گارڈز نے دو افراد کو اندر دھکیلا، پھر ایک تیسرے شخص کو اٹھا کر بیدردی سے کوٹھڑی کے پختہ فرش پر پھینکا اور دروازہ دوبارہ باہر سے لاک کر دیا۔

میری طرح عمران بھی جاگ گیا تھا اور حیرت سے یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ جس شخص کو اٹھا کر فرش پر پٹخا گیا تھا، وہ بے ہوش تھا۔ وہ حلیے سے مسلمان لگتا تھا۔ اس کی کھچڑی داڑھی خون سے رنگین تھی۔ باقی دو افراد میں سے ایک شخص کو دیکھ کر میں اور عمران بری طرح چونکے۔ ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی کہ اسے یہاں دیکھیں گے اور وہ بھی اس حالت میں۔ وہ بھرت تھا۔ اس کے نفیس کپڑے پھٹے ہوئے تھے اور چہرے پر ضربوں کے نیلگوں نشان تھے۔ بھرت بھی ہمیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ شاید اسے بھی پتا نہیں تھا کہ وہ اس جیل کے اندر ہماری ہی کوٹھڑی میں بند کیا جائے گا۔ ہم کچھ دیر تک ساکت و جامد ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے۔ ''یہ تمہارے ساتھ کیا ہوا بھرت؟'' عمران نے پوچھا۔

''جو کچھ میرے ساتھ ہوا ہے، وہ زرگاں میں بہت سے لوگن کے ساتھ ہو رہا ہے اور ان میں زیادہ تر مسلمان ہی ہیں۔ زرگاں میں گوروں اور حکم جی کے سپاہیوں کے خلاف بغاوت پھوٹ پڑی ہے۔'' بھرت کا لہجہ انکشاف انگیز تھا۔

''یہ بغاوت نہیں، یہ زندگی اور موت کی جنگ ہے اور یہ جنگ ہم جیتیں گے۔'' بھرت کے ساتھ کوٹھڑی میں بند کیا جانے والا دوسرا شخص جوش سے بولا۔

اس کی عمر اٹھائیس تیس سال رہی ہوگی۔ وہ اپنے لباس اور حلیے سے مسلمان نظر آتا تھا۔ اس کے سر پر کسی کند آلے کا زخم تھا۔ رائفل کی ایک گولی اس کی پنڈلی کا گوشت چیرتی ہوئی گزر گئی تھی۔ اس زخم پر ایک خون آلود پٹی بندھی تھی۔

''تم کون ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا کوئی نام نہیں۔ میں بس مسلمان ہوں اور ان سور خور گوروں کو اپنے شہر سے نکالنا چاہتا ہوں۔ یہ ہمارا خون چوسنے والے درندے ہیں، یہ ہماری عزتوں کے قاتل ہیں۔ یہ مٹھی بھر پلید جانور ہمارے راجواڑے پر حکومت نہیں کر سکتے۔ ہم انہیں یہاں سے مار بھگائیں گے۔''

ہم نے دیکھا کہ جس بے ہوش شخص کو بیدردی سے فرش پر پھینکا گیا تھا، وہ آخری ہچکیاں لے رہا تھا۔ جو کھانا ہمارے لیے اندر آیا تھا، اس میں پانی بھی موجود تھا۔ عمران نے اسے پانی پلانے کی کوشش کی۔ یہ پانی اس کی باچھوں سے بہہ گیا۔ ہم نے پہرے داروں کو آوازیں دیں لیکن کسی نے نہیں سنیں۔ ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ ادھیڑ عمر شخص جان

کی بازی ہار گیا۔ اس کے سینے پر تلوار کا گھاؤ تھا اور یہاں پہنچنے سے پہلے ہی اس کا بہت سا خون بہہ چکا تھا۔ میں نے دیکھا، اس کے گلے میں دو تین تعویذ تھے۔ اس کے بازو پر امام ضامن بندھا ہوا تھا۔ یہ امام ضامن یقیناً اس کے کسی پیارے نے اسے باندھا تھا اور باندھ کر اس لڑائی میں بھیجا تھا جو گوروں کے خلاف لڑی جا رہی تھی یا لڑنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

کچھ دیر بعد مسلح گارڈز نے دروازہ کھولا۔ کم از کم چار رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں اور یہاں یہ اکیلے چار گارڈز ہی نہیں تھے۔ ہم دیکھ سکتے تھے کہ یہاں ہر طرف باوردی گارڈز موجود ہیں۔ مرجانے والے شخص کی لاش گھسیٹ کر باہر نکالی گئی۔ بھرت کے ساتھ اندر آنے والا دوسرا شخص چلایا۔ ''تم گوروں کا ساتھ دے رہے ہو۔ تم کتوں کی موت مرو گے۔ تمہارا نام و نشان مٹ جائے گا اس راجواڑے سے۔ تم نے...''

ابھی اس کا فقرہ منہ میں ہی تھا کہ ایک ہندو گارڈ نے رائفل کا دستہ پورے زور سے گھما کر اس کے منہ پر مارا۔ وہ دیوار سے ٹکرایا اور زمین بوس ہو گیا۔ وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔ کچھ دیر کے لیے تو ہمیں یہ خدشہ محسوس ہوا کہ شاید وہ بھی ختم ہو گیا ہے مگر ایسا نہیں تھا۔ تین چار منٹ بعد وہ کسمسانے اور بڑبڑانے لگا۔ اس کی بے ہوشی نیم بے ہوشی میں بدل گئی تھی۔

''تم اسے جانتے ہو؟'' عمران نے بھرت سے پوچھا۔

''نا ہیں... لیکن ظاہر ہے کہ یہ ان لوگوں میں شامل ہے جو زرگاں کے اندر پچھلے دو دن سے مختلف کارروائیاں کر رہے ہیں۔ شاید تم کو پتا نہ ہو، باغیوں نے جامع مسجد کے علاقے میں فوجیوں کا ایک بڑا ڈپو دھماکے سے اڑا دیا ہے۔ وہاں پندرہ بیس سپاہی زندہ جل مرے ہیں۔ ان میں تین چار گورے بھی شامل ہیں۔''

''ہاں، ایک بڑا دھماکا تو ہوا تھا آج آدھی رات کے وقت۔'' عمران نے کہا۔

''یہ وہی ڈپو والا دھماکا تھا۔ اس کے بعد زرگاں میں حکم کے سپاہیوں اور گورے فوجیوں پر کئی جگہ حملے ہوئے ہیں۔ گوروں کے کئی گھروں کو بھی آگ لگائی گئی ہے۔ ان کی عورتیں اور بچے پناہ کے لیے راج بھون کی طرف جا رہے ہیں۔''

''تم کس جرم میں پکڑے گئے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''بے گناہی کے جرم میں۔'' وہ تاسف سے بولا اور اپنی پیشانی سے رسنے والا خون پونچھنے لگا۔

ہم کونے میں بچھی ہوئی چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ''کسی شک میں پکڑا گیا ہے تمہیں؟'' عمران نے دریافت کیا۔

''شک میں نا ہیں، وشواس میں پکڑا گیا لیکن یہ بالکل جھوٹا وشواس تھا۔'' بھرت نے آہ بھری۔

''تمہارے گھر والے اور چچی وغیرہ تو خیریت سے ہیں نا؟''

''میرے آنے تک تو خیریت سے تھے، اب کا پتا نا ہیں۔''

تفصیل بتاتے ہوئے بھرت نے کہا۔ ''سچ پوچھیں تو زرگاں شہر میں بہت خون خرابا ہو رہا ہے۔ بلوائیوں نے جگہ جگہ آگ لگا دی ہے۔ آپ کو آواز آ رہی ہوگی... سنیں اب بھی گولیاں چل رہی ہیں۔''

واقعی کہیں گولیاں چل رہی تھیں۔

بھرت نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''شہر میں فساد کی خبریں سن کر میں گاؤں سے یہاں پہنچا تھا۔ آپ کو پتا ہے نا، میرے بڑے بھیا یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مجھے ان کی چنتا تھی۔ میں یہاں اپنے ایک دوست مدن کے پاس ٹھہرا ہوا تھا۔ کل رات ایک انگریز فیملی مدن کے پاس پناہ کے لیے آئی۔ اس میں اٹھائیس تیس سال کی ایک جواں سال ناری اور اس کے دو بچے تھے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ لڑکے کی عمر سات آٹھ سال ہووے گی، لڑکی چار پانچ برس کی تھی۔ یہ مدن دراصل سرکاری ملازم بھی ہے۔ یہ اسی انگریز عورت کرسٹی کے محلے میں رہتا ہے۔ اس عورت نے سوچا ہووے گا کہ یہاں وہ محفوظ ہو جاوے گی۔ لیکن اسے پتا نا ہیں تھا کہ بغاوت پھوٹنے کے بعد بہت کچھ بدل چکا ہے۔ پرائے، اپنے بن گئے ہیں اور دوستوں نے دشمنوں کا روپ دھار لیا ہے۔ مدن نے کرسٹی کو پناہ تو دے دی لیکن اندر خانے اس کی نیت خراب ہو گئی۔ اس نے اپنی پتنی سے کہا کہ کرسٹی اور اس کے بچے یہاں گھر میں محفوظ نا ہیں ہیں۔ بلوائیوں کو شک ہو گیا تو وہ انہیں گھسیٹ کر یہاں سے لے جاویں گے اور گلی میں جا کر ان کی ہتھیا کر دیویں گے۔ شاید میں نے بتایا نہیں، یہ کرسٹی محلے دار ہونے کے کارن مدن کی پتنی کی سہیلی بھی تھی۔ وہ بھی ڈر گئی کہ کہیں کرسٹی اور اس کے بچوں کے ساتھ کچھ ہو نہ جاوے۔ مدن نے کہا کہ وہ کرسٹی کو اپنی باغ والی حویلی میں لے جاتا ہے۔ وہ اسے وہاں لے گیا۔ وہاں اس کے دو دوست بھی موجود تھے۔ تیسرا میں تھا۔ باغ والی حویلی میں پہنچ کر مجھے پتا چلا کہ مدن کی نیت کیا ہے...''

میں نے بھرت کو روکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری بات کاٹ رہا ہوں... کہیں یہ مدن وہ... منیجر مدن تو نہیں جو لال بھون میں کام کرتا ہے؟''

بھرت نے کہا۔ ''مجھے لال بھون کا تو پتا نا ہیں لیکن اتنا جانت ہوں کہ وہ منیجر ہے۔ اس کے بال جلدی سفید ہو گئے ہیں اس لیے کبھی کبھی خضاب بھی لگاوت ہے۔''

میں اور عمران جان گئے کہ وہ اسی منیجر مدن کی بات کر رہا ہے جو لال بھون میں ''پریوں'' کی تربیت کے کام میں میڈم صفورا کی مدد کرتا تھا۔ دیکھنے میں وہ جنٹل مین لگتا تھا لیکن اب جو صورتِ حال سامنے آ رہی تھی، وہ کسی دوسری طرف اشارہ کر رہی تھی۔

میں نے بھرت سے کہا کہ وہ اپنی بات جاری رکھے۔ بھرت نے تفصیل میں جاتے ہوئے جو کچھ بتایا، اس کا لبِ لباب کچھ یوں ہے۔

مدن اور اس کے دونوں دوستوں کی نیت کرسٹی پر خراب ہو چکی تھی۔ یہ بات نہیں تھی کہ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کبھی عورت نہیں دیکھی تھی۔ ہاں، یہ بات ضرور تھی کہ انہوں نے کبھی گوری عورت نہیں دیکھی تھی۔ جس طرح ٹکٹیں جمع کرنے کے شوقین ہر طرح کی ٹکٹیں اپنے البم میں جمع کرنا چاہتے ہیں، ایسے ہی عیاش لوگ ہر طرح کی اور ہر رنگ ڈھنگ کی عورت کے ساتھ شب بسری کی خواہش رکھتے ہیں۔ کچھ یہی کیفیت مدن اور اس کے دوستوں کی تھی۔ وہ کسی انگریز میم کی قربت کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے لیکن جو سنسنی خیز اور خطرناک صورتِ حال پیدا ہوئی تھی، اس نے انہیں یہ موقع فراہم کر دیا تھا کہ وہ ایک میم کو اپنے تصرف میں لائیں۔ دوسری طرف میم کرسٹی بھی اچھی طرح جان گئی تھی کہ اگر وہ اپنی اور اپنے معصوم بچوں کی جان بچانا چاہتی ہے تو اسے مدن کمار کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا۔ مدن کمار نے اسے مجبور کیا کہ وہ نہا دھو کر ہندوستانی کپڑے پہنے، خوشبو لگائے اور ان سب کو شراب پلائے۔ درحقیقت یہ لوگ اپنے طور پر یہ حتمی نتیجہ نکال چکے تھے کہ انگریزوں اور ان کے پٹھو حکم جی کے خلاف، یہ خونی ایجی ٹیشن کامیاب ہونا ہے اور کرسٹی اور اس جیسی دوسری عورتوں کی حیثیت مالِ غنیمت سے زیادہ نہیں۔

بھرت فطرتاً اچھا آدمی تھا۔ جو کچھ مدن اور اس کے دوست کرنے جا رہے تھے وہ اسے کسی طور قبول نہیں تھا۔ اس نے انہیں باز رکھنے کی کوشش کی لیکن وہ باز نہیں آئے۔ ان کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ نوبت گالم گلوچ تک آئی۔ بھرت نے کہا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دے گا، وہ جا کر چوکی میں اطلاع کرے گا۔ بھرت کے یہ تیور دیکھ کر مدن کمار اور اس کے دوستوں نے بھرت کو ایک اسٹور روم میں بند کر دیا۔ بھرت شور مچاتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ کسی طرح وہاں سے نکل سکے لیکن کامیاب نہیں ہوا۔ مدن اور اس کے دونوں دوستوں نے کرسٹی کے ساتھ عیاشی شروع کر دی۔ کرسٹی کے دونوں بچے بالائی منزل کے ایک کمرے میں سہمے ہوئے بیٹھے رہے۔ کرسٹی کو امید تھی کہ وہ اپنی اور بچوں کی جان بچانے میں کامیاب ہو جائے گی اور اس کی ''خدمات'' کے عوض یہ ہندوستانی اسے کسی محفوظ مقام تک پہنچا دیں گے لیکن جو کچھ ہوا، اس کا علم کرسٹی کو نہیں تھا اور مدن وغیرہ بھی بے خبر تھے۔

حکم کے وفادار سپاہیوں کی ایک گھوڑا گاڑی اس عمارت کے پاس سے گزری۔ ان سپاہیوں میں ایک گورا افسر بھی شامل تھا۔ ان لوگوں نے بالائی منزل کی ایک کھڑکی میں ایک سفید فام بچی کو روتے ہوئے دیکھ لیا۔ یہ کرسٹی ہی کی بچی تھی۔ سپاہیوں نے حقیقتِ حال جاننے کے لیے عمارت کے اندر آنا چاہا... مدن کے چوکیدار نے رنگ رلیوں میں مصروف مدن کمار کو اطلاع دی۔ اسی دوران میں سپاہیوں نے پھاٹک پھلانگ کر اندر آنے کی کوشش کی۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کے پاس اسلحہ تھا۔ مدن تو قدرے ڈرپوک بندہ تھا مگر اس کے ساتھیوں نے گولی چلا دی۔ دوسری طرف سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی۔ ایک گولی کھڑکی کا شیشہ توڑ کر آئی اور کرسٹی کے سر کے سنہری بالوں میں سرخ پھول کھل گیا۔ وہ چند سیکنڈ میں دم توڑ گئی۔ حکم کے سپاہیوں میں سے ایک کو عمارت کے احاطے میں گولی لگی اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ دوسرا شدید زخمی ہوا۔ باقی دو بھاگ کھڑے ہوئے۔ شاید انہیں اندر سے اتنی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ اب یقیناً وہ کمک لینے گئے تھے۔ مدن اور اس کے ساتھیوں کی سمجھ میں یہ بات آ گئی کہ اب انہیں فوراً یہاں سے کھسکنا ہو گا۔ تاہم جاتے جاتے انہوں نے بھرت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا۔ وہ اسٹور روم میں آئے۔ مدن تو بھرت سے گالم گلوچ کرتا رہا جبکہ اس کے دونوں ساتھیوں نے اچانک عقب سے بھرت کو دبوچ لیا۔ اس کے منہ پر بڑی سختی سے ایک بدبودار رومال رکھ دیا گیا۔ چند سیکنڈ میں بھرت بے ہوش ہو گیا۔

جب آدھ پون گھنٹے بعد وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آیا اور اس نے بوجھل آنکھوں سے اپنے اردگرد دیکھا تو خود کو عجیب حالت میں پایا۔ وہ بالکل برہنہ تھا اور کرسٹی کی برہنہ لاش کے ساتھ بستر پر پڑا تھا۔ کرسٹی کی برہنہ لاش کے اوپر

چادر ڈال دی گئی تھی۔ ان کے اردگرد کئی گورے اور مقامی فوجی موجود تھے۔ گورے فوجیوں نے اسے ٹھوکریں ماریں اور گندی گالیاں دیں۔ اسے کرسٹی کے روتے ہوئے بچوں کے سامنے لایا گیا۔ بچوں نے بھی تصدیق کی کہ بھرت ان بندوں کا ساتھی ہے جنہوں نے ان کی ماما کو پکڑا تھا۔ بھرت نے بہت دہائی دی مگر اس کی کسی نے نہیں سنی۔ اس کی مدہوشی کو بھی شراب اور منشیات کی مدہوشی سے ہی تعبیر کیا گیا اور اب بھرت یہاں اس جیل میں تھا۔ پکڑ دھکڑ کی وجہ سے جیل میں گنجائش کم پڑ رہی تھی۔ لہٰذا بھرت کو بھی دیگر دو قیدیوں کے ہمراہ ہماری کوٹھری میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ہم نے پوری توجہ سے بھرت کی روداد سنی اور بیچ میں سوالات بھی کیے۔ بھرت نے باہر کے حالات کی مزید تفصیل بتاتے ہوئے کہا۔ ''ماریا کی موت کا گورا جاتی کے لوگن (انگریز کمیونٹی) نے بہت سوگ منایا ہے۔ ماریا کو گورا قبرستان میں جارج کے پہلو میں دفن کیا گیا ہے۔ سرجن اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ نے سوگند کھائی ہے کہ وہ ماریا کے قاتلوں کو عبرتناک انجام سے دوچار کریں گے۔''

''اس زخمی افسر کیپٹن ٹام کا کیا بنا؟'' عمران نے پوچھا۔

''وہ خبیث بچ گیا ہے۔ سنا ہے کہ اسے بچانے کے لیے پولیس افسر رنجیت پانڈے نے خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ وہ اسے برستی گولیوں میں اپنا ''کور'' دے کر احاطے سے باہر لے آیا تھا۔''

عمران نے کہا۔ ''لیکن ٹام کو اور باقی لوگوں کو خطرے میں ڈالنے والا بھی تو یہی کتا پانڈے تھا۔''

''کیا مطلب؟'' بھرت نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔'' عمران بات گول کر گیا۔ پھر موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ''آفتاب اور ہاشم کی لاشوں کا کیا بنا؟''

''ان کی لاشیں کسی نے وصول ہی نا ہیں کیں۔ ان کا جو کچھ کیا ہو گا، حکم کے سپاہیوں نے ہی کیا ہو گا یا پھر ہو سکت ہے کہ انہیں امام مسجد قادر بخش صاحب کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ کچھ کٹر قسم کے لوگن یہ الزام بھی لگا رہے ہیں کہ امام قادر بخش صاحب کے دہشت گردوں سے رابطے ہیں اور ان کی بدعہدی کی وجہ سے ماریا کی جان گئی ہے۔ حالانکہ سب جانت ہیں کہ امام صاحب نے معاملے کو سنبھالنے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کی۔ یہ ہاشم رازی کی ہٹ دھرمی تھی جس کے کارن معاملہ بگڑتا چلا گیا۔ بہرحال، جتنے منہ اتنی باتیں ہیں۔ کچھ لوگن کا یہ بھی خیال ہے کہ آپ دونوں یعنی آپ اور تابش، گورے افسروں کے ساتھ مسلسل رابطے میں تھے اور ماریا کے بدلے میں سلطانہ بی بی کا جیون بچانا چاہت تھے...''

عمران نے کہا۔ ''اب باہر کے حالات کیا ہیں بھرت؟ کیا تم سمجھتے ہو کہ گوروں اور حکم کے وفادار سپاہیوں کے خلاف عام لوگوں کی یہ بغاوت کامیاب ہو جائے گی؟''

بھرت نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ''ابھی وشواس سے کچھ نا ہیں کہا جا سکتا۔ فی الوقت جو بھی کارروائیاں ہو رہی ہیں، ان میں زیادہ تر مسلمان ہی حصہ لے رہے ہیں۔ کہیں کہیں کچلی جاتیوں کے ہندو اور بودھ بھی اس میں شریک ہیں۔ لیکن ظاہر ہے کہ گوروں اور حکم جی کے پاس جدید اسلحہ اور طاقت ہے۔ ایک باقاعدہ فوج ہے۔ جب تک تل پانی میں چھوٹے سرکار کی طرف سے کوئی حرکت نا ہیں ہووے گی، اس لڑائی کا فوری نتیجہ نکلنا آسان نا ہیں ہے...''

''غلط... بالکل غلط۔'' اچانک فرش پر لیٹے زخمی نے دہاڑ کر کہا اور اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ وہ جوش سے بولا۔ ''زرگاں کے جی داروں میں اتنی طاقت ہے کہ وہ اکیلے ہی ان مٹھی بھر گوروں کو چیر کر چیل کوؤں کے آگے پھینک دیں۔ انور خاں ہمارا سالار ہے... اور اب وہ ہمارے درمیان ہے۔ اس شیر کے ہوتے ہوئے ہمیں کسی اور کی مدد کی ضرورت نہیں۔ دنیا جانتی ہے کہ انور خاں کا ایک ایک جاں نثار... کرائے کے ان سو سو ٹٹوؤں پر بھاری ہے...''

انور خاں کا نام سن کر میں چونکا۔ اس کا روشن چہرہ، اس کی کشادہ پیشانی، اس کا چوڑا سینہ اور اس کا پُرجوش انداز... سب کچھ ایک لمحے میں میری نگاہوں کے سامنے گھوم گیا۔ زرگاں کے مسلمان انور خاں کی آواز پر لبیک کہتے تھے۔ یہ انور خاں ہی تھا جس نے سلطانہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے بعد جارج گورا کو آڑے ہاتھوں لیا تھا... انور کی قیادت میں سیکڑوں پُرجوش لوگوں نے جارج گورا کی رہائش گاہ پر ہلا بولا تھا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ اب یہ زخمی شخص بتا رہا تھا کہ انور خاں پھر زرگاں میں ہے اور باغی گروہوں کی قیادت کر رہا ہے۔ اگر واقعی ایسا تھا تو پھر یہ حوصلہ افزا صورتِ حال تھی۔ میں نے زخمی شخص سے پوچھا۔ ''تم کیسے جانتے ہو کہ انور خاں یہاں ہے؟''

''بچہ بچہ جانتا ہے۔ یہ جو انگریزوں اور دیسی انگریزوں کی دم میں نمدہ فٹ ہو رہا ہے، یہ یونہی نہیں ہو رہا۔ لوگ جانتے ہیں کہ شیر بھیڑوں میں گھس آیا ہے اور اب ان

بھیڑوں کو بھاگتے ہی بنے گی۔ تم دیکھنا چند دن کے اندر زرگاں کی گلیوں میں حکم کے بھاڑے کے ٹٹوؤں اور ان گوروں کی لاشیں کھیتی جائیں گی۔''

بھرت نے کہا۔ ''بے شک انور خاں دلیر شخص ہے۔ بہت سے لوگن اس سے ہمدردی بھی رکھتے ہیں لیکن مسئلہ تو یہ ہے کہ وہ زرگاں میں ابھی تک کہیں نظر نا ہیں آیا۔ یہی کارن ہے کہ ابھی تک بہت سے لوگن یہ وشواس نا ہیں کر رہے کہ وہ واقعی یہاں موجود ہے۔''

''وہ ہے... وہ ہے۔ میں نے خود اسے دیکھا ہے اور باقی بھی جلد دیکھیں گے۔'' زخمی شخص پورے اعتماد سے بولا۔ ''کل جن جاں بازوں نے اسلحہ گودام میں آگ لگائی ہے، ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔''

اسی دوران میں ایک اور بڑے دھماکے کی آواز سنائی دی۔ یہ دھما کا شہر کے وسط میں کہیں ہوا تھا۔ گونج سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ بھی ایک بڑا دھما کا ہے... اس کے ساتھ ہی چھوٹے ہتھیاروں کی فائرنگ بھی سنائی دینے لگی۔ زخمی شخص نے پُرجوش انداز میں ایک فاتحانہ نعرہ بلند کیا اور پھر اپنے گلے میں موجود چاندی کے ایک چمکیلے تعویذ کو کئی بار چوما۔

ہم کچھ دیر تک کان لگا کر سنتے رہے۔ قریباً پانچ منٹ بعد فائرنگ تھم گئی۔ زخمی شخص نے عمران اور بھرت کے پوچھنے پر اپنا نام ابراہیم بتایا۔ وہ بولا۔ ''آج رات بارہ بجے تک پورے شہر میں کارروائیاں ہوں گی۔ آج بڑا مبارک دن ہے۔''

''مبارک دن؟'' میں نے پوچھا۔

''آج چاند کی سات تاریخ ہے اور بدھ کا دن ہے۔ چاند کی سات اور بدھ کا دن ان گوری چمڑی والوں کے لیے بہت منحوس ہے۔ اسی طرح اگر چاند کی پانچویں اور تیرھویں تاریخ کو بدھ کا دن آئے گا تو وہ بھی ان گوروں اور حکم کے ہرکاروں کے لیے بڑا نحس ہوگا۔ اور میرا تو خیال ہے کہ اب آنے والا ہر دن ہی ان مردودوں کے لیے نحس ہوگا۔ بہت جلد ان کا بیڑا غرق ہونے والا ہے۔ ان کا ظلم ہی ان کے گلے کا پھندا بننے والا ہے۔''

''یہ چاند کی تاریخوں والی بات کس نے بتائی ہے؟'' بھرت نے ابراہیم سے پوچھا۔

ابراہیم نے چاندی کے تعویذ کو چوما اور عقیدت سے بولا۔ ''ہمارے حضرت صاحب نے۔ اور یہ ہوائی باتیں نہیں ہیں۔ نہ ہی تم ان کو وہم سمجھ سکتے ہو۔ ان گوری چمڑی والوں کے دن اس راجواڑے میں پورے ہو چکے ہیں۔ اب ان کو یہاں سے بھاگنا ہے یا کتّے کی موت مرنا ہے۔'' اس نے ایک بار پھر پُرجوش نعرہ لگایا۔

کوٹھڑی کے چوبی دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھلا اور ایک گارڈ نے شعلہ بار نظروں سے ہمیں گھورا۔ وہ زخمی ابراہیم کو مخاطب کر کے بولا۔ ''گندے گٹر کی طرح زیادہ ابلتا مت جا۔ چپ کر کے بیٹھ ورنہ ابھی گلا کاٹ کر پھینک دیویں گے۔''

ابراہیم پھنکارا۔ ''گلا کاٹ بھی دو گے تو یہ آواز بند نہیں ہوگی۔ تم کتنے گلے کاٹو گے، کتنی آوازیں بند کرو گے؟''

گارڈ نے زہرناک لہجے میں کہا۔ ''دوسروں کا تو کہہ ناہیں سکتا لیکن تیری بولتی ضرور صبح تک بند ہو جاوے گی۔'' اس کے ساتھ ہی اس نے چوکور خانے کا پٹ زور سے بند کر دیا۔

ابراہیم نے بلند آواز میں اسے کوسا پھر دروازے کی طرف تھوک دیا۔

گارڈ کی دھمکی اور اس کا لہجہ قابلِ غور تھے۔ ''یہ کیا کہہ کے گیا ہے؟'' عمران نے ابراہیم سے پوچھا۔

''جان سے مارنے کی دھمکی دیتے ہیں لیکن نہیں مار سکتے۔ جب تک میری زندگی ہے، کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔'' اس نے ایک بار پھر عقیدت سے چاندی کے تعویذ کو چوما۔ اس کے چہرے پر فکر تردد کا نشان تک نہیں تھا۔

ابراہیم ان ہزاروں لوگوں میں سے ایک تھا جن کے دلوں میں انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم جی کے خلاف شعلے بھڑک رہے تھے۔ سلطانہ کی موت کے بعد یہ شعلے کچھ اور بلند ہو گئے تھے... وہ مرنا یا مار دینا چاہتے تھے...

رات بھر فائرنگ کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ علی الصباح مسلح گارڈز آئے۔ انہوں نے ابراہیم کو بتایا کہ بڑے صاحب محترم اینڈرسن اس سے بات کرنا چاہتے ہیں۔ ابراہیم نے جانے میں پس وپیش کی لیکن وہ اسے گھسیٹ کر باہر لے گئے۔ ہمیں مختلف آوازوں سے اندازہ ہوا کہ اردگرد کی کوٹھڑیوں سے بھی کچھ قیدیوں کو نکال کر لے جایا جا رہا ہے۔ ایسے کچھ قیدی مزاحمت بھی کر رہے تھے۔

صرف آدھ گھنٹے بعد ساری صورتِ حال سامنے آگئی اور یہ کافی سنگین تھی۔ یہ سنگین صورتِ حال ہمیں دکھانے کے لیے گارڈز نے ہماری کوٹھڑی کے دروازے میں موجود چھوٹا چوکور پٹ کھول دیا۔ آہنی سلاخ کی دوسری جانب دس پندرہ فٹ کے فاصلے پر موجود ایک دوسرا دروازہ بھی کھول دیا گیا تھا۔ اب ہمیں جیل کے ایک چھوٹے احاطے کا منظر دکھائی

دے رہا تھا۔ یہاں ایک سرسری سماعت کی عدالت لگی ہوئی تھی۔ بس ایک لمبی میز تھی جس کے پیچھے اسٹیٹ کے چار فوجی افسر بیٹھے تھے۔ دو مقامی اور دو انگریز تھے۔ انگریزوں میں تمتماتے چہرے والا اینڈرسن بھی تھا۔ اسے دیکھ کر میری رگوں میں لہو کی جگہ آگ بہنے لگی۔ سلطانہ کی اچانک موت کے مناظر نگاہوں میں گھوم گئے۔

اسٹیٹ کے فوجی افسروں کے سامنے ایک قطار میں قریباً پندرہ افراد کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ مضبوط رسیوں سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ پاؤں کو بھی اسی طرح باندھ دیا گیا تھا۔ ان کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ابراہیم بھی ان میں شامل تھا۔ لگتا تھا کہ ان قیدیوں کی قسمت کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اینڈرسن نے پاٹ دار آواز میں کہا۔ ''تم لوگوں پر یہ الزام ثابت ہوتا ہیں کہ تم نے عام شہریوں پر حملے کیے۔ اگیشلی تم نے برٹش عورتوں اور بچوں کا مرڈر کیا۔ ان کی پراپرٹی کو نقصان پہنچایا... اور کھلے عام بغاوت کی... اس کے علاوہ دوسروں کو بغاوت پر اکسایا۔ ان کرائمز کے لیے یہ کورٹ تم کو سزائے موت دیتا...''

قیدیوں میں سے دو افراد چلّانے لگے۔ ان میں ایک ابراہیم تھا۔ وہ اینڈرسن کے فیصلے کو یکسر رد کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ انہوں نے عورتوں اور بچوں کو نہیں، اپنے ساتھ لڑنے والے مسلح لوگوں کو مارا۔ ان ظالموں کو مارا جنہوں نے یہاں کے لوگوں کا جینا حرام کیا ہوا ہے۔

اینڈرسن اور دیگر افسروں کے چہرے پتھر کی طرح سپاٹ تھے۔ ان پر ان باتوں کا بالکل اثر نہیں ہو رہا تھا۔ ایک نوجوان قیدی کا رنگ یکسر ہلدی نظر آیا۔ اس نے التجا کے لہجے میں کچھ کہا۔ شاید افسروں کی منت سماجت کی۔ غالباً وہ کہہ رہا تھا کہ وہ اپنی مرضی سے ان لوگوں میں شامل نہیں ہوا۔ موت کو بالکل سامنے دیکھ کر اس کے اوسان خطا ہو گئے تھے۔ اس کی حالت ترس ناک تھی مگر یہاں انہیں ترس کھانے کے لیے نہیں، شوٹ کرنے کے لیے کھڑا کیا گیا تھا۔

اس لڑکے کو دیکھ کر نہ جانے کیوں مجھے لی وان کا تیرہ چودہ سالہ پوتا یاد آگیا۔ وہ بھی تو ایسے ہی روپا بلکا تھا۔ بھرت کی زبانی ہمیں معلوم ہوا تھا کہ اسپتال کے خونی ہنگامے میں وہ بچ گیا ہے۔ ابراہیم دہاڑنے لگا۔ ''تم گوری چمڑی والوں کی موت بڑی دردناک ہوگی۔ کتّوں کی طرح زرگاں کی گلیوں میں گھسیٹے جاؤ گے۔ موت کو ترسو گے لیکن موت نہیں ملے گی۔'' پھر اس نے اپنا سینہ تان لیا۔ جیسے گولی کھانے کے لیے بالکل تیار ہو گیا ہو۔

اس کو دیکھ کر اور کئی افراد نے بھی سینے تان لیے اور آنکھیں بند کر لیں۔ ان میں سے اکثر منہ ہی منہ میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ رائفل اسکواڈ بالکل تیار کھڑا تھا۔ یہ چھ باوردی سپاہی تھے جو جدید رائفلیں کندھوں سے لگائے بالکل تیار حالت میں کھڑے تھے۔ اینڈرسن نے اپنے ہاتھ میں سفید رومال پکڑ لیا تھا۔ رومال کے اس اشارے پر قیدیوں پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو جانا تھی۔ یہ بڑا تکلیف دہ منظر تھا۔ مجھے کچھ عرصے پہلے اسحاق کی دردناک موت یاد آگئی۔ دو مسلح سپاہی آگے بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں تیز دھار چاقو تھے۔ انہوں نے قیدیوں کے تعویذ اور امام ضامن وغیرہ کاٹ کر ان کے جسموں سے علیٰحدہ کر دیے۔ ایک پارسی نوجوان کے لباس سے ایک چھوٹی سی... پاکٹ سائز کی مذہبی کتاب بھی نکلی۔ یہ اشیا قیدیوں کے جسموں سے علیٰحدہ کرنے کے بعد قیدیوں کو بتایا گیا کہ وہ اپنے اپنے عقیدے کے مطابق خدا سے گناہوں کی معافی مانگ لیں، انہیں گولی ماری جا رہی ہے۔

نوجوان لڑکا آخری کوشش کے طور پر پھر منت سماجت کرنے لگا۔ آٹھ دس سیکنڈ بعد اس کی آواز فائرنگ کی خوفناک آواز میں دب گئی۔ فائرنگ اسکواڈ نے اندھا دھند برسٹ چلائے اور پندرہ کے پندرہ قیدیوں کو چھلنی کر دیا۔ ان کے جسم اوندھے سیدھے گرے اور تیزی سے خون اگلنے لگے...

ہماری طرح یہ منظر جیل کے اور بھی بہت سے قیدیوں نے دیکھا۔ ایک وحشت زدہ سی خاموشی نے سب کو گھیرے میں لے لیا۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر مقدمہ چلا تھا۔ استغاثہ اور صفائی کے دلائل سنے گئے تھے اور سزائے موت دے دی گئی تھی۔ کچھ دیر بعد دروازے کا چوکور روزن بند کر دیا گیا اور ہماری کوٹھڑی میں صرف لالٹین کی مدھم روشنی باقی رہ گئی۔

''یہ لوگن درندگی پر اتر آئے ہیں۔ انصاف کے تقاضے پورے کیے بغیر نردوشوں کو مارا جا رہا ہے۔'' بھرت نے تاسف سے کہا۔

''جب پاؤں تلے سے زمین کھسکنے لگے تو ظالم حکمراں ایسی ہی حرکتیں کرتے ہیں۔'' عمران نے بوجھل لہجے میں کہا۔

زخمی ابراہیم نے دو گھنٹے پہلے جن برتنوں میں ناشتا کیا تھا، وہ اسی طرح ایک کونے میں پڑے تھے۔ اس کی خون میں بھیگی ہوئی ایک پٹی بھی ایک گوشے میں رکھی تھی لیکن وہ خود اب نہیں تھا۔

صاف ظاہر تھا کہ ان پندرہ قیدیوں کو سرِعام سزا اس لیے دی گئی ہے کہ دیگر قیدی عبرت پکڑیں اور عملے کے احکام

بر بے چوں چراں عمل کریں۔ اس سزا کے بعد دروازے کا وزن بند ہو چکا تھا اور ہمیں امید نہیں تھی کہ وہ جلد ہی دوبارہ کھلے گا۔ مگر ہمارا یہ اندازہ غلط نکلا۔ دروازے کی دوسری جانب ایک دو منٹ تک کھٹ پٹ ہوتی رہی۔ یوں لگا جیسے کوئی وزنی کرسی گھسیٹ کر دروازے کے پاس لائی گئی ہے۔ پھر روزن یعنی چوکور خانے کا چھوٹا سا دروازہ کھول دیا گیا۔ دوسری طرف کا منظر تعجب خیز تھا۔ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر مسٹر اینڈرسن بڑی شان سے ایک صوفہ نما نشست پر بیٹھا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں سگار اور دوسرے میں وہسکی کا جام تھا۔ اس کا سرخ چہرہ ہمیشہ سے زیادہ تمتمارہا تھا۔ اس کے عقب میں دو مسلح انگریز فوجی موجود تھے۔ وہ اپنے چمکیلے جوتے والے ایک پاؤں کو مسلسل ہلا رہا تھا۔

میرا خون ایک بار پھر رگوں میں سیال آگ کا روپ دھار گیا۔ جی چاہا کہ اردگرد کی ساری رکاوٹوں سے ٹکرا جاؤں، ان کو توڑ دوں یا خود ختم ہو جاؤں... اور اگر ان کو توڑ دوں تو پھر اس تمتمائے چہرے والے سفید شیطان پر جا پڑوں اور خالی ہاتھوں سے اس کا جسم پھاڑ کر رکھ دوں۔

اس نے سگار کا دھواں فضا میں چھوڑا اور بولا۔ ''افسوس ہے کہ مجھے تمہیں یہاں دیکھنا پڑ رہا ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''ہمیں بھی افسوس ہے کہ ہم یہاں ہیں۔ آپ نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا۔ ہمارے درمیان کچھ طے ہوا تھا۔''

اینڈرسن نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ اس کے پیچھے کھڑے دونوں انگریز محافظ ایک طرف اوجھل ہو گئے۔

اینڈرسن بولا۔ ''ہمارے درمیان جو کچھ طے ہوا تھا، اس کی پہلی شرط تو یہی تھی کہ تم دونوں ہندو سپاہیوں کے سامنے نہیں آؤ گے۔ لیکن جب تم آ گئے اور بہت سے لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا تو پھر ہمارا معاہدہ بھی ختم ہو گیا۔''

عمران نے جواب دیا۔ ''ہم اس وقت سامنے آئے تھے جب سارا کھیل بگڑ چکا تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ کم از کم سلطانہ کو ہی بچایا جا سکے اور پھر...''

یکا یک عمران کو خاموش ہونا پڑا۔ ایک طرف سے وزنی بوٹوں کی کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر رنجیت پانڈے ہاتھ میں کچھ کاغذات لیے نمودار ہوا۔ اس کی پگڑی میں ایک سرخ رنگ کی پٹی کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے ایک فاتحانہ نظر ہم پر ڈالی اور پھر مسٹر اینڈرسن کی طرف متوجہ ہو گیا۔ اس نے کاغذات مسٹر اینڈرسن کے حوالے کیے اور دھیمے لہجے میں کچھ کہا بھی۔ ''ویل ڈن... ویل ڈن۔'' اینڈرسن نے سر ہلایا۔

ہم پر ایک اور ترچھی نظر ڈال کر وہ واپس چلا گیا۔ بڑی زہریلی کمینگی تھی اس نظر میں۔

عمران نے اینڈرسن سے مخاطب ہو کر کہا۔ ''لگتا ہے پانڈے صاحب کی پروموشن ہو گئی ہے۔''

''کیوں نہیں... کیوں نہیں۔ ہمیں اچھے اور قابل ساتھیوں کی قدر کرنا آتی ہے۔ پانڈے نے اٹھارا گاؤں میں کارکردگی دکھائی ہے۔''

''ہاں کارکردگی تو اس نے واقعی دکھائی ہے۔'' عمران نے ہولے سے کہا۔

''تم کیا کہہ رہے ہو؟'' اینڈرسن نے پوچھا۔

''کچھ نہیں... آپ... پانڈے صاحب کی کارکردگی کا بتا رہے تھے۔''

اینڈرسن نے گلاس میں سے ایک سنہری گھونٹ لیا اور بولا۔ ''اسپتال میں اندھا دھند فائرنگ کے وقت پانڈے نے زخمی کپتان ٹام بریرے کو بچانے میں زبردست کردار ادا کیا۔ وہ برستی گولیوں میں اس تک پہنچا اور اسے اپنی اوٹ میں لے کر فائرنگ کی زد سے نکال لیا۔ اور یہی نہیں، اس سے صرف دو منٹ پہلے وہ ایک اور اہم کارنامہ انجام دے چکا تھا۔''

''وہ بھی بتا دیجیے جناب۔'' عمران نے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''اس نے اپنی جان خطرے میں ڈال کر اس جنونی قاتل آفتاب خان کو شوٹ کیا۔ اگر وہ جلد ہی ایسا نہ کرتا تو شاید اور کئی لوگوں کی جان جاتی... بہرحال، وہ تیسرا بندہ کہیں نہیں مل سکا جو آفتاب اور سلطانہ کے ساتھ تھا۔''

عمران خاموش رہا۔ ہم جانتے تھے کہ تیسرے بندے کا سرے سے وجود ہی نہیں تھا۔ یہ ساری گفتگو حسبِ سابق انگلش میں ہو رہی تھی۔ عمران چند سیکنڈ خاموش رہا، پھر اینڈرسن کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گویا ہوا۔ ''واقعی جناب! وہاں پانڈے صاحب کی کارکردگی زبردست رہی ہے۔ بلکہ مجھے تو یقین ہے کہ محترمہ ماریا کی موت کا ''کریڈٹ'' بھی پانڈے صاحب کو ہی جاتا ہے۔''

''کیا مطلب؟ کیا کہنا چاہتے ہو تم؟'' اینڈرسن نے عمران کو گھورا۔

عمران نے کہا۔ ''آپ نے سوچا ہے کہ وہ گولی کس نے چلائی جس کی وجہ سے یہ ساری گڑبڑ ہوئی اور محترمہ ماریا سمیت کئی افراد کی جان چلی گئی؟''

اینڈرسن نے سگار کا گہرا کش لے کر دھواں فضا میں چھوڑا۔ دھوئیں کے پس منظر میں وہ قیدی مزدور نظر آ رہے تھے جو ''سرسری عدالت'' کے فرش پر سزائے موت پانے والے قیدیوں کا خون صاف کر رہے تھے۔ کسی ساتھ والی راہداری میں پہرے داروں کے جوتوں کی ٹھک ٹھک گونج رہی تھی۔ ماحول میں عجیب سی سہمی ہوئی خاموشی تھی۔ اینڈرسن نے ایک ابرو اٹھائی اور انگلش اسٹائل میں بولا۔ ''مجھے یقین ہے گولی چلانے والا کوئی باسٹرڈ مقامی ہوگا۔ اور ہو سکتا ہے کہ مسلمان ہی ہو۔ وہ نہیں چاہتا ہوگا کہ سر جارج کی معزز بہن اس صورتِ حال میں سے زندہ سلامت نکل جائے۔ اس نے کسی قریبی چھت پر سے فائرنگ کی اور سب کچھ درہم برہم کر دیا۔ یہ مسلمان زیادہ تر ہوتا ہی جنونی ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''اگر میں یہ کہوں کہ گولی چلانے والا اور اس سارے معاملے کو خراب کرنے والا آپ کا چہیتا افسر رنجیت پانڈے تھا تو پھر...''

''میں تمہاری اس بکواس پر ہرگز یقین نہیں کروں گا۔''

''بہت اعتماد ہے آپ کو اس پر؟''

''اعتماد بھی ہے۔ اس کے علاوہ جب وہ گولیاں چلیں، اس وقت وہ میرے ساتھ موجود تھا۔''

''اس نے وہ خود نہیں چلائیں۔ اس کے ساتھیوں نے یہ کام کیا۔''

''کیا میں شکل سے تمہیں اتنا گاؤدی نظر آتا ہوں کہ تمہاری باتوں پر بھروسا کروں گا؟''

''اسی لیے تو آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔''

اینڈرسن جھنجلائے ہوئے انداز میں بولا۔ ''اپنی اطلاع تم اپنے پاس رکھو۔ میں تم دونوں سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں اور مجھے اپنے سوالوں کا صحیح صحیح جواب چاہیے؟''

عمران نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''اگر ہم آپ سے تعاون کریں تو ہمارے بچنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے؟''

اینڈرسن نے دھواں نتھنوں سے خارج کیا۔ ''تم نے اسپتال والے ہنگامے میں سب کے سامنے آ کر غلطی کی۔ اس غلطی کا خمیازہ تو تمہیں بھگتنا پڑے گا۔ کیا خمیازہ ہوگا، ابھی اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔''

''آپ کیا پوچھنا چاہتے ہیں؟'' عمران نے کہا۔

''انور خاں کے بارے میں۔ ہم جانتے ہیں کہ وہ ٹابش کا ساتھی رہا ہے۔ وہ اس وقت یہاں زرگاں میں موجود ہے۔ یہاں ہونے والی تخریبی کارروائیوں میں اس کا بھی بڑا ہاتھ ہے۔ میں ٹابش سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہاں زرگاں میں انور خاں کا ٹھکانا کہاں ہو سکتا ہے۔ مجھے زرگاں میں اس کے قریبی دوستوں کے کوائف بھی درکار ہیں۔''

میں اب تک ہونے والی گفتگو میں بالکل خاموش رہا تھا۔ میری آنکھیں اینڈرسن کی دید سے جل رہی تھیں اور سینے میں آتشیں طوفان ابل رہا تھا۔

اینڈرسن نے عمران سے توجہ ہٹا کر میری طرف دیکھا اور بولا۔ ''ہاں... انور خاں کے بارے میں تم کیا بتا سکتے ہو ہمیں...''

میں خاموش رہا۔ عجیب سی بے حسی طاری تھی مجھ پر۔

اینڈرسن پھنکارا۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں آپ جناب سے... اپنے ساتھی انور خاں کے بارے میں کیا جانتے ہو تم؟''

میں نے اینڈرسن کی نیلگوں آنکھوں میں براہِ راست دیکھتے ہوئے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''میں صرف اتنا جانتا

ہوں کہ انور خاں تم جیسے سارے سفید کتوں کی ٹانگیں چیرنے کا ارادہ رکھتا ہے اور وہ ضرور چیرے گا۔ اور اگر کسی وجہ سے وہ یہ کام نہ کر سکا تو پھر کوئی اور کرے گا۔ میں کروں گا یا میرے جیسا کوئی دوسرا۔ لیکن کچھ بھی ہو، اس راجواڑے میں تم ڈیلیوں کی بدمعاشیوں کے دن گزر گئے ہیں... گزر گئے ہیں۔'' میں نے آخری الفاظ اتنی بلند آواز میں کہے کہ... درودیوار میں گونج محسوس ہوئی۔

میرا یہ جواب اور لب و لہجہ بالکل غیر متوقع تھا۔ پہلے اینڈرسن کی آنکھوں میں شدید حیرت نظر آئی پھر اس کا چوڑا چکلا سرخ چہرہ سرخ تر ہوتا چلا گیا۔ وہ دانت پیس کر بولا۔ ''باسٹرڈ... بدذات کالے... تیری یہ جرأت...'' وہ صوفے پر سے کھڑا ہو گیا۔ اس نے چٹکھاڑ کر آواز دی۔ ''جوزف... ڈیوی... ادھر آؤ... جلدی کرو۔''

پھر اس نے فرطِ طیش میں جھپٹ کر اپنا توانا بازو دروازے کے چوکور خلا سے اندر کھسا دیا۔ وہ میری گردن پکڑنا چاہ رہا تھا لیکن میری گردن اس کی پہنچ سے قریباً ایک فٹ دور تھی۔ اس نے ہاتھ باہر نکالا اور خوفناک آواز میں دہاڑا۔ ''لگتا ہے سامبر مقابلے نے تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں رہنے دیے۔ اس جھوٹی فتح کی زہریلی خماری تیرے دماغ کو چڑھ گئی ہے۔ میں تیرا علاج کرتا ہوں۔ بڑا کارگر علاج کرتا ہوں۔ اگر آج کے بعد تجھے ایسے کمینے پن کی شکایت ہوئی تو میرا نام بدل دینا...''

یہی وقت تھا جب دونوں انگریز گارڈز لپکتے ہوئے موقع پر پہنچ گئے۔ اینڈرسن نے ان میں سے ایک کے ہاتھ سے ٹرپل ٹو رائفل لی اور دروازے کے چوکور خلا میں سے میرا نشانہ لے لیا۔ اندازہ ہوا کہ وہ پہلے قدم کے طور پر میری ٹانگ کو نشانہ بنانا چاہتا ہے۔ اس نے بے دریغ گولی چلائی جو میری ٹانگ کو تقریباً چھوتے ہوئے گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ میری ٹانگوں پر دوسرا فائر کرتا، عمران تڑپ کر چوکور خلا کے سامنے آ گیا۔ ''نہیں جناب! گولی نہ چلائیں۔ میں اس کی غلطی کے لیے معافی چاہتا ہوں۔ اس نے غلطی کی ہے لیکن...''

''تم آگے سے ہٹ جاؤ باسٹرڈ۔ ورنہ تمہیں بھی شوٹ کر دوں گا۔'' اینڈرسن دہاڑا۔ اس نے رائفل کندھے سے لگا رکھی تھی اور اس کی انگلی ٹریگر پر تھی۔

عمران نے پھر لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔ ''بیوی کی موت کے بعد یہ اپنے حواس میں نہیں ہے جناب! اول فول بک رہا ہے۔ ہوش ٹھکانے آئیں گے تو آپ سے معافی مانگے گا۔''

''ہوش تو اس کتے کے ابھی ٹھکانے آ جاتے ہیں۔ تم پیچھے ہٹو۔'' اینڈرسن پھر گرجا۔

عمران اپنی جگہ ڈٹا رہا اور دو تین منٹ کی کوشش سے اینڈرسن کا پارا نیچے لانے میں کامیاب ہو گیا۔ اس تند و تیز گفتگو کے آخر میں اینڈرسن نے پھنکارتے لہجے میں کہا۔ ''میں تم دونوں کو کل اس وقت تک کی مہلت دیتا ہوں۔ تمہیں انور خاں کے بارے میں میرے ہر سوال کا جواب دینا ہوگا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو تمہارے ساتھ جو کچھ بھی ہوگا، اس کے ذمے دار تم خود ہو گے۔'' وہ اپنے بھاری بوٹوں سے فرش کو کوٹتا ہوا اور گالیاں بکتا ہوا باہر چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد عمران نے مجھے سمجھانے بجھانے کی کوشش کی لیکن مجھ پر تو جیسے اس کی باتوں کا کچھ اثر ہی نہیں ہو رہا تھا بلکہ اردگرد کا سارا ماحول ہی مجھ پر بے اثر تھا۔ ایک عجیب سی بے حسی طاری تھی۔ نگاہوں کے سامنے صرف سلطانہ کا دم توڑتا ہوا چہرہ تھا۔ اکھڑی سانسیں، مجھے حسرت سے تکتی نظریں اور پھر اس کے بعد رنجیت پانڈے کی منحوس شکل۔ اس کا چہرہ میرے لیے دنیا کی سب سے قابلِ نفرت شے بن گیا تھا۔ اسی شخص کی مکاری نے اسپتال میں بساط الٹی تھی۔ اس شیطان نے بارود کو چنگاری دکھا کر سب کچھ ختم کیا تھا۔

اینڈرسن نے ہمیں انور خاں کے حوالے سے چوبیس گھنٹے کی مہلت دی تھی لیکن یہ مہلت پوری ہونے سے پہلے ہی ایک ایسا واقعہ ہو گیا کہ ہمیں اس امتحان سے گزرنے کی ضرورت نہ رہی۔ وہ سارا دن ہی عجیب سے تناؤ اور غیر یقینی کیفیت میں گزرا۔ صبح سویرے جس طرح پندرہ قیدیوں کو سب کے سامنے گولیوں سے اڑا دیا گیا تھا، وہ ناقابلِ فراموش منظر تھا۔ ان قیدیوں کی آخری کراہیں جیسے ابھی تک درودیوار میں گونج رہی تھیں۔ عمران کے بے حد اصرار پر میں نے شام کے وقت کھانے کے دو تین لقمے لیے اور پھر ایک گوشے میں پڑ کر لیٹ گیا۔ بھرت ایک خوش گفتار شخص تھا مگر اس کوٹھڑی میں آنے کے بعد سے بالکل خاموش تھا۔ اس پر نہایت سنگین نوعیت کے الزامات تھے اور وہ آج دیکھ ہی چکا تھا کہ سزا دینے میں یہ گورے کتنے سفاک اور بے حس ہیں۔ عمران کی خوش کلامی بھی سنجیدگی کی گمبھیرتا میں چھپی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے موجودہ صورتِ حال سے عہدہ برآ ہونے کے بارے میں سوچ رہا ہے۔

رات کوئی نو دس بجے کا وقت ہوگا۔ بھرت نڈھال سا

سو رہا تھا۔ عمران ایک گوشے میں اکڑوں بیٹھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر سرگوشی میں بولا۔

''ادھر آؤ۔ تمہیں ایک چیز دکھاؤں۔''

جب اس نے دوسری بار اصرار سے کہا تو میں اٹھ کر اس کے پاس گیا۔ اٹھنے بیٹھنے سے میرے سر کے گومڑوں میں ٹیسیں اٹھتی تھیں لیکن ایسی ٹیسوں کو میں نے اب خاطر میں لانا چھوڑ دیا تھا۔ اپنے زخموں کے حوالے سے میں ایسی بے پروائی برتتا تھا کہ کبھی کبھی بھول ہی جاتا تھا کہ مجھے زخم لگا ہے۔ میں عمران کے پاس پہنچا تو اس نے انگلی سے پتھریلی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے غور کیا اور حیران رہ گیا۔ یہاں کسی نکیلی شے سے انگریزی کے پانچ حرف کندہ کیے گئے تھے۔ ان حرفوں سے جو لفظ بنتا تھا وہ ''جیکی'' تھا۔

عمران نے کہا۔ ''لگتا ہے تمہارے روحانی استاد بارونداجیکی نے اسی کوٹھڑی میں اپنے اسیری کے دن گزارے تھے۔''

میں ششدر رہ گیا۔ اگر واقعی ایسا تھا تو یہ حیرت انگیز اتفاق تھا۔ میں نے چاروں طرف سر گھما کر پہلی بار اس کوٹھڑی کو بغور دیکھا۔ یہ قریباً دس ضرب بارہ فٹ کی مختصر جگہ تھی۔ یہاں رات اور دن میں تمیز کرنا ناممکن تھا۔ کوٹھڑی کی عقبی دیوار کے ساتھ موٹے لوہے کا ایک چھوٹا سا زنگ آلود دروازہ تھا۔ یہ دروازہ قریباً پانچ ضرب چار فٹ کے ایک بدبودار غسل خانے میں کھلتا تھا۔ تو یہ تھی وہ جگہ جہاں جارج گورا نے بارونداجیکی کو رکھا اور اس پر ستم کے پہاڑ ڈھائے۔

عمران نے لالٹین کی روشنی میں مجھے کوٹھڑی کا ایک اور گوشہ دکھایا۔ یہاں جیکی کے نام کا پہلا حرف ''جے'' اور اس کی محبوبہ شکنتلا کے نام کا پہلا حرف ''ایس'' کندہ تھا۔ ان دو حرفوں کے اوپر یقیناً کوئی رومانی فقرہ لکھا گیا تھا مگر اس فقرے کو بعد ازاں رگڑ کر اس طرح مٹا دیا گیا تھا کہ اسے پڑھنا مشکل تھا۔ ظاہر ہے یہ کام جیل کی انتظامیہ نے ہی کیا ہوگا۔ اب اس بات میں شبے کی گنجائش نہیں تھی کہ بارونداجیکی نے اپنی قید کے دن یہاں کاٹے تھے۔ یا کم از کم اپنی قید کا کچھ عرصہ یہاں کاٹا تھا۔

ہم لالٹین کی زرد روشنی میں ان دیواروں کو بغور دیکھتے رہے۔ یہ جگہ میرے لیے ایک دم تاریخی حیثیت اختیار کر گئی تھی۔ ایک جگہ جیکی کا سب سے پسندیدہ فقرہ لکھا ہوا نظر آیا۔ ''نو پین... نو گین۔'' یعنی درد نہیں تو کامیابی بھی نہیں۔

... ہاں، یقیناً یہی وہ جگہ تھی جہاں جیکی رہا تھا۔ یہاں کی دیواروں پر اس کا لمس تھا۔ یہاں کی فضا میں اس کی سانسیں رچی ہوئی تھیں۔

رات گہری ہو گئی۔ میں سونے کے لیے لیٹا تو جیکی کا تصور میرے سامنے آ گیا۔ کٹا پھٹا اپاہج جسم، مدقوق چہرہ، اندر دھنسی ہوئی لیکن چمکیلی آنکھیں۔ میں نے سوچا، وہ بھی ایسے ہی اس فرش پر چت لیٹتا ہوگا۔ ایسے ہی لالٹین کی زرد روشنی میں سیاہی مائل چھت کو دیکھتا ہوگا۔ اپنی شکنتلا کو یاد کرتا ہوگا۔ ایک دم مجھے لگا کہ وہ میرے آس پاس ہے۔ اس کی روح اپنے اس پرانے مسکن میں موجود ہے۔ میں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''جیکی! تم نے اس تاریک کوٹھڑی میں کرب کے جو شب و روز گزارے تھے، ان کا مداوا تو شاید کوئی نہ کر سکے لیکن تیرے بدترین دشمن جارج کو اس کے انجام تک میں نے پہنچا دیا ہے۔ اس نے تیرے ہاتھ پاؤں کٹوا کر تجھے اس تاریک قبر میں پھنکوایا تھا، آج وہ خود ''گورا قبرستان'' کی ایک قبر میں موجود ہے...''

میں تصور میں جیکی سے محوِ کلام تھا جب اچانک مجھے اس چاقو کا خیال آیا جو جارج کی موت کی یادگار تھا اور میں نے اپنے پاس محفوظ کیا ہوا تھا۔ میں نے جلدی سے جیبیں ٹٹولیں۔ ہماری گرفتاری کے وقت یقیناً وہ چاقو بھی دوسری اشیا کے ساتھ فوجیوں کے پاس چلا گیا تھا... میں اس بارے میں سوچ رہا تھا جب یکایک ایک بار پھر جیل کی چار دیواری سے باہر دھماکے سنائی دیے۔ عمران کا کہنا تھا کہ یہ دستی بموں کے دھماکے ہیں۔ ساتھ میں فائرنگ بھی شروع ہو گئی۔ اس مرتبہ یہ فائرنگ کافی شدید تھی اور لگتا تھا کہ جیل کے آس پاس ہو رہی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے دو طرفہ فائرنگ شدت پکڑ گئی۔ عمران اور بھرت بھی اٹھ کر بیٹھ گئے۔

عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ ''مجھے لگتا ہے کہ جیل پر حملہ ہوا ہے۔''

''ایسے ہی لگت ہے۔'' بھرت بولا۔

ہم فائرنگ اور دھماکوں کی آوازوں کو بغور سنتے رہے۔ یہ آوازیں قریب آتی جا رہی تھیں۔ پھر اس کے ساتھ نعروں کی مدھم گونج بھی سنائی دینے لگی۔ ''یہ تو لگتا ہے کہ جیل کے احاطے میں لڑائی ہو رہی ہے۔'' میں نے خیال ظاہر کیا۔

''اور لڑنے والے کافی زیادہ تعداد میں ہیں۔'' عمران نے اضافہ کیا۔

جلد ہی ہمیں اندازہ ہو گیا کہ جیل پر ایک بڑا حملہ ہوا ہے اور کچھ لوگ جیل توڑنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

ہر گزرتے لمحے کے ساتھ ہنگامہ شدت اختیار کرتا

گیا۔ چھوٹے بڑے ہتھیاروں کی فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ بارود کی تیز بو ہماری بند کوٹھڑی تک پہنچ رہی تھی۔ یوں لگا کہ اب کچھ ہی دیر میں ہمیں ایک نئی صورتِ حال کا سامنا ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ جارج کی جیل پر مارے جانے والا یہ زبردست شب خون کامیاب ہو جاتا اور ہم اپنی کوٹھڑی کے دروازے کو اپنے سامنے کھلا پاتے۔ اب سوچنے کی بات یہ تھی کہ اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں کیا کرنا ہے؟ اس سوال کا جواب ہمارے ذہن تیزی سے سوچ رہے تھے۔

تین چار منٹ بعد محسوس ہونے لگا کہ لڑائی ہماری کوٹھڑیوں کے آس پاس ہی ہو رہی ہے۔ اس کے ساتھ یہ بھی محسوس ہونے لگا کہ جیل کا دفاع کرنے والے بھی جم کر لڑ رہے ہیں۔ ہم نے اپنی کوٹھڑی کے قریب ہی کسی انگریز افسر کی للکارتی ہوئی آواز سنی۔ وہ اپنے ماتحتوں کو ہدایات دے رہا تھا اور ''کالے باغیوں'' کو گالیوں سے نواز رہا تھا۔ دو تین ایسے دھماکے بھی سنائی دیے جو دستی بموں کے دھماکوں سے مختلف تھے۔ عمران نے کہا۔ ''شاید راکٹ لانچر ہے۔''

یہ فیصلہ کن معرکہ آٹھ دس منٹ جاری رہا، یکا یک صورتِ حال پلٹی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ فائرنگ کی آوازیں قدرے فاصلے پر چلی گئیں۔ پھر یوں لگا جیسے جیل پر حملہ کرنے والے پسپا ہو رہے ہیں۔ غالباً جیل کی چھت پر سے بھی گارڈز نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی تھی۔ قریباً پندرہ منٹ مزید یہ ہنگامہ جاری رہا۔ ہم اس بند کوٹھڑی میں صرف اندازے ہی لگا سکتے تھے۔ ہماری کوٹھڑی کے عین سامنے بھی گارڈز کافی تعداد میں موجود تھے۔ ان کی آوازوں سے جوش و خروش کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی دوران میں فائرنگ کی آوازیں مزید فاصلے پر چلی گئیں۔ یوں محسوس ہوا کہ انتظامیہ کے مسلح لوگ، بھاگتے ہوئے حملہ آوروں کا پیچھا کر رہے ہیں۔ تھوڑی ہی دیر میں ہماری کوٹھڑیوں کے سامنے گارڈز کا جمگھٹا ہوا۔ کوٹھڑیوں کے دروازے کھلنے لگے اور پکڑے جانے والے لوگوں کو گالیوں کی بوچھاڑوں کے ساتھ کوٹھڑیوں میں ٹھونسا جانے لگا۔ ہماری کوٹھڑی کا دروازہ بھی کھلا اور ایک زخمی قیدی کو بیدردی سے دھکا دے کر کوٹھڑی کے گندے فرش پر پھینک دیا گیا۔ میں نے انگریز افسر منیارڈ کو دیکھا، اس نے نفرت سے قیدی پر تھوکا اور اسے ''کالے ذلیل... سور'' کے خطابات دیے۔

وزنی دروازے کو ایک بار پھر دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ زخمی کا ایک بازو کلائی پر سے ٹوٹ چکا تھا اور عجیب انداز میں مڑا ہوا تھا۔ اس کے سر پر بھی زخم تھا اور اس زخم سے بہنے والے خون نے اس کے پورے چہرے کو لتھڑا ہوا تھا۔ بس اس کی آنکھیں ہی دیکھی جا سکتی تھیں۔ وہ نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھا۔ میں نے اسے پہچان لیا... ''انور خاں تم؟'' میرے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ مجھے اپنی نگاہ پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔

انور خاں کوئی جواب نہ دے سکا۔ بس کھنچ کھنچ کر سانس لیتا رہا۔ تب میں نے دیکھا کہ اس کے سینے سے بھی خون بہہ رہا تھا۔ یہاں کسی رائفل کی سنگین یا کوئی اور تیز دھار چیز لگی تھی۔

عمران نے بھی سن لیا تھا کہ میں نے زخمی کو کس نام سے پکارا ہے۔ وہ بھی جلدی سے پاس آ گیا۔ چوبی دروازے کا چوکور خانہ کھلا۔ ایک مقامی گارڈ نے ایک چھوٹا سا چرمی تھیلا ہماری طرف پھینکا اور پھنکارا۔ ''اس کی مرہم پٹی کرو۔''

چرمی تھیلے میں مرہم پٹی کا سامان تھا لیکن یہ انور خاں کے زخموں کے لیے کافی نہیں تھا۔ وہ زخموں سے چور... بے بسی کی تصویر بنا ہمارے سامنے پڑا تھا۔ مجھے اپنی آنکھوں پر بھروسا نہیں ہو رہا تھا۔ ابھی کل کی بات تھی، ابراہیم نامی شخص انور خاں کے حوالے سے کتنے جوش و خروش کا اظہار کر رہا تھا۔ اسے کامل یقین تھا کہ انور خاں زرگاں کے لیے نجات دہندہ کا کردار ادا کرنے والا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انور خاں کی قیادت میں حکم کے باغی زرگاں میں تہلکہ مچانے والے ہیں۔ وہ بہت جلد سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیں گے۔ اس حوالے سے اس بے چارے نے بڑے جوش سے چاند کی سات تاریخ اور بدھ کا ذکر بھی کیا تھا۔

لیکن یہ تو قعات غلط ثابت ہوئی تھیں۔ بے شک انور اور اس کے ساتھیوں نے ایک بہت دلیرانہ قدم اٹھایا تھا۔ وہ جارج کی جیل توڑنے کے لیے بڑی قوت سے حملہ آور ہوئے تھے لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی تھی۔ اور اس ناکامی سے بھی بڑھ کر مایوس کن بات یہ تھی کہ انور خاں خود بھی شدید زخمی حالت میں یہاں موجود تھا۔ اس کے زخموں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ اس نے آخری وقت تک کوشش کی ہے کہ اسے زندہ نہ پکڑا جا سکے لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

''انور خاں... آنکھیں کھولو۔ مجھے دیکھو... میں تابش ہوں۔'' میں نے اس کے کندھوں کو ہلایا۔

اس نے پلکیں اٹھائیں۔ تھوڑی دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اثبات میں سر ہلایا۔ یوں اس نے مجھے سمجھایا کہ وہ مجھے پہچان گیا ہے۔

اس نے خشک، خون آلود ہونٹوں پر زبان پھیری۔ میں نے اسے پانی پلایا۔ عمران اور بھرت اس کے سر سے بہنے والا خون بند کرنے میں مصروف ہو گئے۔ اس کی کلائی کی حالت بھی تشویش ناک تھی۔ میں نے دیکھا کہ وہ کچھ کہنے کی کوشش کر رہا ہے۔ میں نے اپنا کان اس کے ہونٹوں کے قریب کیا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''... مجھے ختم کر دو... یہ لوگ مجھے... بہت بُری موت مارنا چاہتے ہیں...''

عمران نے عجیب گونجتے سے لہجے میں کہا۔ ''ہم ایسا نہیں ہونے دیں گے انور خاں... تم حوصلہ رکھو۔''

انور خاں نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ کون ہے۔ میں نے اس کا کندھا دباتے ہوئے کہا۔ ''یہ دوست ہے اپنا... پاکستان سے آیا ہے...''

انور خاں کی خون آلود آنکھوں میں چمک نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھا کر عمران کے ہاتھ پر رکھا اور ایک بار پھر دھیمی آواز میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں... آخری فتح ہماری ہوگی۔ ان گوروں کو ہمارا راجواڑہ چھوڑنا ہوگا۔ لوگ جاگ پڑے ہیں... وہ قربانیاں دے رہے ہیں...''

زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے انور خاں پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ اسے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا مگر وہ یہاں ہمارے درمیان اس تاریک سرد کوٹھڑی میں موجود تھا۔ ہم کئی گھنٹے تک اس کی تیمارداری میں مصروف رہے۔ اس کی حالت قدرے اچھی ہو گئی۔ اس کی باتوں سے پتا چلا کہ رات کو قریباً چار سو مسلح جاں بازوں نے جیل پر حملہ کیا تھا۔ ان کو یقیناً کامیابی سے ہمکنار ہو جانا تھا۔ یہ زبردست منصوبہ بندی تھی لیکن عین موقع پر ایک شخص نے دغا کیا اور بازی پلٹ دی۔ ہم نے انور خاں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ وہ شخص کون تھا مگر انور خاں نے اس بارے میں خاموشی اختیار کی۔

میں نے آج انور خاں کو کئی ماہ کے بعد دیکھا تھا۔ میں اس سے تل پانی کے حالات پوچھنا چاہتا تھا۔ اپنے دوست ڈاکٹر چوہان، کپتان اجے، عبدالرحیم اور شکنتلا وغیرہ کے بارے میں جاننا چاہتا تھا۔ مگر انور کی حالت ایسی نہیں تھی کہ وہ ان سوالوں کے جواب دے سکتا۔ اس سے صرف اتنا پتا چلا کہ ڈاکٹر چوہان بھی یہاں زرگاں میں موجود ہے۔

سارا دن انور خاں کی حالت کبھی بگڑتی اور کبھی سنبھلتی رہی۔ اس کے سینے پر شدید اندرونی ضرب آئی تھی اور اس وجہ سے اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔

شام کے وقت انور خاں سو گیا۔ عمران نے دیوار سے ٹیک لگا رکھی تھی۔ اس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ وہ کہنے لگا۔ ''صحیح کہتے ہیں تابی! تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ ہم نے ہندوستان میں انگریزوں کی آمد، ان کے قبضے، ان کی چالاکیوں اور ریشہ دوانیوں کے بارے میں صرف پڑھا اور سنا تھا، آج ہم وہ سب کچھ یہاں اس بھانڈیل اسٹیٹ میں دیکھ رہے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ ماحول بھی وہی ہے۔ یہاں ہندوقوں اور مشین گنوں کے ساتھ تلواریں اور کلہاڑیاں بھی ہیں۔ موٹر کاروں کے ساتھ گھوڑے اور گھوڑا گاڑیاں بھی ہیں۔ یہاں بھی ان مٹھی بھر گوروں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کر رکھا ہے اور اپنے لیے کٹھ پتلیاں ڈھونڈی ہوئی ہیں۔ اور ابھی انور خاں بتا رہا تھا کہ خیر سے میر جعفر اور میر صادق جیسے لوگ بھی یہاں موجود ہیں۔''

میں نے کچھ نہیں کہا۔ بس عمران کی باتیں سنتا رہا اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے بولنا بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ میں بس خاموش رہنا چاہتا تھا۔

عمران بولا۔ ''جب ہم یہاں آئے تھے تو ہم نے سمجھا تھا کہ حکم جی زرگاں کے حکمراں ہے اور انگریز اس کے ساتھ تعاون کرتے ہیں لیکن اب کھلا ہے کہ یہاں کے تو حکمراں ہی یہ انگریز ہیں۔ حکم جی کو ایک ڈمی کے طور پر سامنے رکھا گیا ہے۔ وہ شراب اور عورت کے نشے میں غرق رہتا ہے۔ عملی طور پر اس نے یہاں کی باگ ڈور سر جن اسٹیل اور اینڈرسن جیسے لوگوں کو تھما رکھی ہے۔''

رات کسی وقت زرگاں کے وسطی علاقے میں پھر فائرنگ شروع ہو گئی۔ پھر یہ فائرنگ اور بھی دو تین علاقوں تک پھیل گئی۔ ہم اس قبر نما کوٹھڑی میں بس آوازیں ہی سن سکتے تھے۔ باہر کی دنیا سے ہمارا رابطہ فقط اس ڈیڑھ ضرب ڈیڑھ فٹ کے چوکور خلا کے ذریعے تھا۔ اس خلا میں سے ہمیں کھانا اور ضرورت کی دیگر اشیا پہنچائی جاتی تھیں۔ یہ اشیا فراہم کرنے والے تین شفٹوں میں کام کرتے تھے۔ رات کی شفٹ میں کام کرنے والا ایک گہرا سانولا ہندو تھا۔ پتا نہیں کیوں اس کا لہجہ اور آواز مجھے کچھ پہچانی سی لگتی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ آواز کچھ دن پہلے میں نے کہیں سنی ہے۔ کہاں؟ یہ یاد نہیں پڑتا تھا۔ میں نے اس بارے میں عمران سے پوچھا تو وہ بھی کوئی واضح جواب نہ دے سکا۔ بہرحال یہ آواز میرے ذہن میں کھٹکتی رہی۔

رات کو پھر سلطانہ کی موت کے دردناک مناظر نظروں کے سامنے گھومتے رہے... یہ سوچ کر میری آنکھیں نم ہوتی

رہیں کہ معصوم بالو اب کبھی اپنی ماں کو نہ دیکھ سکے گا۔ اس کو کبھی پتا ہی نہیں چلے گا کہ ماں کا محبت بھرا لمس کیا ہوتا ہے۔ یہ سوچ کر میرا دل ڈوبنے لگا کہ اگر میں موت کے اس گھیرے سے نکل کر واپس فتح پور کے مندر تک پہنچنے میں کامیاب ہوا تو وہاں میرے دل کی کیفیت کیا ہوگی؟ وہاں سلطانہ کے ذاتی استعمال کی چیزیں ہوں گی۔ اس کے کپڑے، اس کے برتن، اس کے زیور... اور وہ سب کچھ جو وہ چھوڑ کر جا چکی ہے۔ سلطانہ کے قاتلوں کے ساتھ ساتھ کنڑ انتہا پسند ہاشم رازی کا چہرہ بھی میری نظروں میں گھومنے لگا۔ وہ بھی تو بالواسطہ سلطانہ کے قتل میں شریک رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگیں اور جسم میں لاوا سا بہنے لگا۔

رات کسی وقت میں جاگا تو میں نے دیکھا کہ دروازے کا چوکور خانہ کھلا ہوا ہے۔ خانے کی اکلوتی سلاخ کی دوسری جانب وہی پکی رنگت والا پہرے دار موجود ہے اور عمران سے باتیں کر رہا ہے۔ میں نے کروٹ بدلی اور پھر سو گیا۔

صبح میں نے دیکھا کہ انور خاں ہولے ہولے کراہ رہا ہے۔ اس کی چوٹوں میں شدید درد تھا۔ جب انور خاں جیسا فولادی بندہ کراہتا ہے تو اس کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ درد معمولی نہیں ہے۔ میں نے زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کچھ دیر بعد ایک انگریز گارڈ کا ٹماٹر جیسا چہرہ چوکور خلا میں نظر آیا۔ وہ نشے میں دھت تھا۔ شاید یہ اس فتح کا نشہ تھا جو ان کو ملی تھی یا مل رہی تھی۔ ''کیا تکلیف ہے؟'' وہ انگریزی میں بولا۔

''انور خاں کو بہت درد ہے۔''

''اس کا درد بڑی جلدی ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دم ختم۔ بس تھوڑی دیر انتظار کرو۔'' اس کے معنی خیز لہجے نے میرے ذہن میں اندیشوں کی بھرمار کر دی۔

کچھ اسی طرح کی دھمکی ان گارڈز نے اس وقت دی تھی جب زخمی ابراہیم کو گولی سے اڑانے کے لیے اس کوٹھری سے لے جایا گیا تھا۔

تو کیا اب انور خاں کی باری آنے والی ہے؟ میں نے بے حد کرب سے سوچا۔

اور اگر ایسا ہوا تو کیا ہم اب بھی تماشائی بنے دیکھتے رہیں گے؟ میں نے عمران کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ پتھر کی طرح سخت تھا۔ اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ آٹھ بجے کے قریب مسلح گارڈز آ گئے۔ میں سمجھا کہ وہ انور خاں کو لے جانے آئے ہیں لیکن انہوں نے پہلے بھرت کو باہر نکلنے کا حکم دیا۔ ان کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفلیں تھیں اور تیوروں سے پتا چلتا تھا کہ اگر ہم حکم عدولی کریں گے تو وہ ہمیں اندر ہی بھون سکتے ہیں یا اس بری طرح زخمی کر سکتے ہیں کہ ہم پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہی نہ رہیں۔ وہ لوگ بھرت کو لے کر ایک طرف چلے گئے۔ پھر ہم سب کو باری باری باہر نکالا گیا اور ہمارے ہاتھ بڑی مضبوطی کے ساتھ پشت پر رسیوں سے باندھ دیے گئے۔ ہمارے اردگرد درجنوں رائفلوں کا پہرا تھا۔ یہاں کسی بھی طرح کی مزاحمت خودکشی کے مترادف تھی۔ انور خاں کو سب سے آخر میں ایک اسٹریچر پر باہر لایا گیا۔ اس کے ہاتھ بھی مضبوطی سے پشت پر بندھے ہوئے تھے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ لوگ ہمارے ساتھ کیا کرنے جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں نفرت کے شعلے تھے اور تیور خطرناک۔ پتا نہیں کیوں اس وقت مجھے لگا کہ میں بارونداجیکی کی یہ تاریخی کوٹھڑی آخری بار دیکھ رہا ہوں۔

ہمیں برہنہ پا اور برہنہ سر چند ننگ راہداریوں سے گزارا گیا اور پھر ہم صحن میں آ گئے۔ ہماری آنکھیں روشنی میں چندھیا گئیں۔ آج ہم پورے چار دن بعد سورج کی روشنی دیکھ رہے تھے۔ جارج کی اس بدنام زمانہ جیل کے در و دیوار میں اس سے پہلے بھی ایک بار دیکھ چکا تھا جب مجھے سلطانہ کے ہمراہ پکڑ کر زرگاں لایا گیا تھا اور پھر میری خدمات جارج گورا کے حوالے کی گئی تھیں۔ لیکن آج جارج گورا تھا اور نہ سلطانہ۔

گارڈز کے نہایت سخت پہرے میں ہم جیل کے پھاٹک سے باہر آئے اور یہی وقت تھا جب ہمیں زرگاں کی اصل صورتِ حال کا پتا چلا۔ یہ سب کچھ تعجب خیز تھا۔ جیل کی بیرونی دیوار اور پھاٹک وغیرہ گولیوں سے چھلنی تھے۔ یقیناً یہ نشانیاں اس زبردست شب خون کی تھیں جو دو دن پہلے باغیوں کی طرف سے مارا گیا تھا اور جو بقول انور خاں ایک غدار کی وجہ سے ناکام ہوا تھا۔ ہم نے اپنے اردگرد درختوں پر کچھ لاشیں لٹکتی دیکھیں۔ ان لوگوں کو پھانسی دی گئی تھی۔ جوں جوں ہم آگے بڑھے، ہم نے زرگاں کے لرزہ خیز منظر دیکھے۔ ایک چوراہے میں کئی جلی ہوئی لاشیں ایک چھوٹے سے ڈھیر کی صورت میں پڑی تھیں۔ کچھ منہدم اور ادھ جلے مکان بھی دکھائی دے رہے تھے۔ درختوں اور مختلف پولوں سے لٹکتی ہوئی لاشیں جابجا دکھائی دیتی تھیں۔ کچھ کے جسم گولیوں سے چھلنی تھے، کچھ کے چہرے مسخ تھے۔ ان میں سے چند ایک کے سوا سب مسلمان دکھائی دیتے تھے۔

''لگتا ہے کہ بغاوت پوری طرح کچل دی گئی ہے۔''

میرے پہلو میں چلتے ہوئے عمران نے سرگوشی کی۔ ہم آخری قطار میں تھے۔ ہر قیدی کے عقب میں ایک مسلح گارڈ تھا جس نے اسے بازو سے پکڑ رکھا تھا۔

ہم جیل سے نکلنے والے قریباً چالیس قیدی تھے۔ تین قیدی اسٹریچرز پر تھے۔ ان میں انور خاں بھی شامل تھا۔ بھرت بار بار اپنے خشک لبوں پر زبان پھیر رہا تھا۔ اس نے بھانپ لیا تھا کہ کچھ اچھا ہونے نہیں جا رہا۔ میم کی عزت لوٹنے کے جرم میں وہ بے گناہ پکڑا گیا تھا مگر یہاں اس کی سننے والا کوئی نہیں تھا۔

جب ہمارا قافلہ ایک کشادہ سڑک پر مڑا تو بھرت نے ہمیں آگاہ کرتے ہوئے زیرلب کہا۔ ''ہم قاسمیہ کے علاقے میں جا رہے ہیں۔ یہاں مسلمان آبادی ہے بلکہ یہ زرگاں میں مسلمانوں کا گڑھ ہے۔''

اردگرد کے مکانوں کی کھڑکیوں اور دروازوں میں سے سہمے ہوئے چہرے جھانک رہے تھے۔ ہر طرف ہراس کی فضا تھی۔ ہم نے ایک چھوٹا سا محلہ دیکھا جو پورے کا پورا جلا ہوا تھا۔ یہاں نمائش کے لیے ایک سر بریدہ لاش چوراہے کے بیچوں بیچ پڑی تھی۔ جب ہم اس علاقے کی تنگ گلیوں میں داخل ہوئے تو ایک فوجی گاڑی ہمارے قافلے کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔ میں نے اور بھرت نے مڑ کر دیکھا۔ اس گاڑی میں منحوس تھوبڑے والا اینڈرسن موجود تھا۔ تاہم ایک شخص اینڈرسن سے بھی اہم اس گاڑی میں موجود تھا۔ وہ دراز قد سرجن اسٹیل تھا۔ اس کے چہرے پر خشونت برس رہی تھی۔ چند ہفتوں کے اندر اس نے اپنے سگے بھائی کے علاوہ اپنی بیوی بھی کھو دی تھی۔ اس کا لبوترا چہرہ دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کے اندر بدلے کی آگ بھڑک رہی ہے۔

بھرت کے پیچھے چلنے والے مقامی گارڈ نے اس کی گردن پر زوردار جھانپڑ رسید کیا اور حکم دیا کہ وہ صرف آگے دیکھے۔

ہم پا بجولاں چلتے رہے۔ چند منٹ بعد پیچھے آتی ہوئی گاڑی میں سے اینڈرسن کی کرخت آواز بلند ہوئی۔ وہ میگافون کے ذریعے ٹوٹی پھوٹی اردو میں بول رہا تھا۔

''یہ اسٹیٹ اور حکم جی کے مجرم ہیں۔ آج ان لوگوں کو تمہاری آنکھوں کے سامنے عبرت ناک پنش منٹ دیے جائیں گے۔ ہام توم کو دکھائیں گا کہ باغیوں کا انجام کیا ہوتا۔ دیکھو اور عبرت پکڑو۔''

اس نے یہ چند فقرے بار بار دہرائے۔ ایک چھوٹے چوراہے پر یہ قافلہ رک گیا۔ یہاں ایک مسجد نظر آ رہی تھی۔ اردگرد کی دیواروں پر انگریزوں اور حکم کے خلاف باغیانہ نعرے لکھے تھے جنہیں بعد ازاں مٹانے کی کوشش کی گئی تھی۔ یہاں آبادی گنجان تھی۔ اردگرد کے مکانوں کی چھتوں اور کھڑکیوں میں لاتعداد لوگ موجود تھے۔ اگر یہ سب لوگ اکٹھے ہو کر ایک دم ٹوٹ پڑتے تو ان دو ڈھائی سو فوجیوں کی تکا بوٹی کر ڈالتے لیکن عملی طور پر ایسا ہونا ممکن نہیں تھا۔ اینڈرسن نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''یہی جگہ ہے جہاں سے پانچ دن پہلے تم لوگوں نے اپنی ٹیشن شروع کیا۔ اسی جگہ سے وہ آگ بھڑکا جس نے اسٹیٹ کے پُرامن لوگوں کا بہت زیادہ نقصان کیا۔ سیکڑوں بے گناہ لوگوں کا مرڈر ہوا۔ ہاں، یہی وہ جگہ ہے۔''

اینڈرسن نے مسلح سپاہیوں کو حکم دیا۔ انہوں نے قیدیوں میں سے چند افراد چنے۔ رائفلوں کی سنگینوں کے ذریعے ان کے کپڑے چاک کر دیے گئے اور انہیں زمین پر اوندھا لٹا دیا گیا۔ یہ ایک تکلیف دہ منظر تھا۔ اینڈرسن چنگھاڑا۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں پُرامن شہری ڈاکٹر ولیم اور اس کی وائف کا کپڑا پھاڑا گیا اور ان کو مار مار کر بے ہوش کر دیا گیا۔ اگر تم لوگوں نے وہ سین دیکھا تھا تو آج یہ بھی دیکھو۔''

اوندھا لٹا ئے جانے والے چھ قیدیوں کو اس طرح بے بس کیا گیا کہ ان کے سر کے بال اور ٹخنے گارڈز نے اپنی گرفت میں لے لیے... پھر ان پر چمڑے کے وزنی جوتوں کی بارش کر دی گئی۔ وہ چلاّتے رہے، چلاّتے رہے۔ ان کی جلد سے خون رسنے لگا۔ ان میں سے تین نیم بے ہوش اور تین مکمل بے ہوش ہو گئے۔ مکمل بے ہوش ہو جانے والوں کو بھی اسٹریچرز پر ڈال لیا گیا اور انہیں بغیر کوئی طبی امداد دیے یہ قافلہ آگے روانہ ہو گیا۔

چھوٹی چھوٹی گلیوں میں سے نکل کر لوگ اس قافلے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ ان کی حیثیت صرف تماشائیوں کی تھی۔ مزاحمت تو دور کی بات ہے، وہ مسلح فوجیوں کے سائے سے بھی خوفزدہ تھے۔ ان میں زیادہ تر لڑکے بالے تھے۔

قیدیوں کو چپ لگ گئی تھی۔ ان کے چہرے زرد ہو گئے تھے۔ سب کو انجام دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک سرسری سی عدالتی کارروائی، تین چار منٹ کا رسمی مکالمہ اور پھر سزائے موت۔ مجھے لگا کہ میں کوئی ڈیڑھ سو سال پہلے 1857ء میں کھڑا ہوں۔ انگریزوں کے خلاف بغاوت کچل دی گئی ہے۔ بہادر شاہ ظفر کو قید میں ڈال دیا گیا ہے۔ لوگوں کو سرِعام پھانسیاں دی جا رہی ہیں۔ ان کے سر جدا کیے جا رہے ہیں۔

کمپنی کی حکومت نے ساڑھے تین سو سالہ مغلیہ دورِ حکومت کو ختم کر دیا ہے اور لوگوں پر ظلم کے پہاڑ ڈھا رہی ہے... ہاں، یہ سب کچھ ویسا ہی تو تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ یہاں کا برائے نام اقتدار ایک ہندو کے پاس تھا اور وہ ان گوروں کا کٹھ پتلی بنا ہوا تھا۔

میں نے سوچا۔ ''تو کیا آج ہماری زندگیوں کو فل اسٹاپ لگنے والا ہے؟'' میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے عمران کو دیکھا۔ اس کے سپاٹ چہرے سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔

آخر ہم ایک بڑے چوراہے میں پہنچے۔ یہ قاسمیہ چوک تھا۔ ہماری آمد سے پہلے ہی یہاں بہت سے افراد جمع تھے۔ ہماری آمد کے بعد اور بھی ہجوم ہو گیا۔ گھروں کی چھتوں اور گلیوں میں بھی لوگ نظر آ رہے تھے۔ ان کے چہرے بتا رہے تھے کہ جو کچھ یہاں ہونے جا رہا ہے، وہ انہیں خون کے آنسو رلا رہا ہے مگر وہ اسے روکنے کے لیے کچھ کر نہیں سکتے تھے۔ یہاں بھی درختوں پر کئی لاشیں لٹکی نظر آئیں۔ ابھی ان میں سے بُو اٹھنا شروع نہیں ہوئی تھی۔ غالباً ان بدنصیبوں کو کل رات کسی وقت پھانسی دی گئی تھی۔ یہ سب کے سب مسلمان تھے۔

یہاں ہمیں ایک قطار میں دس سولیاں گڑی نظر آئیں۔ ایک طرف بہت سی کرسیاں رکھی تھیں اور میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر صاف ستھرے کپڑے بچھے ہوئے تھے۔ یہاں درجنوں انگریز صاحبان پہلے سے موجود تھے۔ ان میں سے بیشتر شراب سے شغل کر رہے تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک لرزہ خیز تماشے کی ہوس تھی۔ اس جگہ چاروں طرف خاردار باڑ تھی۔

ہمیں ایک چبوترے پر کھڑا کر دیا گیا تھا۔ برہنہ کیے جانے والے چھ افراد میں سے تین تو اسٹریچرز پر تھے، باقی تین ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ ان کے جسموں پر کپڑے کی ایک دھجی نہیں تھی۔ سولیاں ہم سے فقط پندرہ بیس قدم کی دوری پر تھیں۔ دو ہٹے کٹے جلاّد نما افراد یہاں موجود تھے۔ ایذا رسانی کے بیشتر آلات بھی یہاں نظر آ رہے تھے۔ لکڑی کے دستے والے وزنی ہتھوڑے، چھوٹی ہتھوڑیاں، آہنی میخیں اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ۔ میری نگاہوں میں ایک بار پھر اسحاق کی لرزہ خیز موت کے مناظر گھوم گئے۔ ہزاروں افراد کے سامنے اس ''جاں بہ لب'' کو میخوں کے ذریعے سولی پر ٹھونکا گیا اور پھر اس کی ہڈیوں کا چُورا کر دیا گیا تھا۔

فوجی افسر منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا۔ ہم چالیس قیدیوں کی تین قطاروں میں سب سے آخری قطار میں تھے... لیکن بھرت کو اب پہلی قطار میں کھڑا کیا گیا تھا۔ قیدیوں والے چار اسٹریچرز بھی ایک طرف رکھے تھے۔ اسٹریچرز کی بیلٹس باندھ کر قیدیوں کو ہلنے جلنے سے روک دیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ انور خاں کی آنکھیں بند ہیں اور وہ منہ میں مسلسل کچھ پڑھ رہا ہے۔ منیارڈ ٹہلتا ہوا ہمارے پاس آیا اور منہ ٹیڑھا کر کے انگریزی میں بولا۔ ''مجھے خوشی ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ بہرحال، تمہارے لیے ایک خبر اچھی ہے اور ایک بُری۔''

''کیا کہنا چاہتے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''اچھی خبر یہ ہے کہ تم تیسری قطار میں ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ تمہیں ابھی سزا نہیں دی جا رہی۔ تمہاری سزا ملتوی ہو گئی ہے۔''

میرے سینے میں لہری دوڑ گئی۔ ''اور بُری خبر؟'' میں نے پوچھا۔

وہ سفاکی سے بولا۔ ''یہ سزا زیادہ دیر کے لیے ملتوی نہیں ہوئی۔ آدھے قیدیوں کو یہاں سزا دی جا رہی ہے۔ آدھے قیدیوں کو ڈیڑھ دو میل دور قاسمیہ کے دوسرے چوک میں دی جائے گی... چلو کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ تمہیں دو ڈھائی گھنٹے اور زندگی مل گئی ہے اور زندگی تو پھر زندگی ہی ہوتی ہے۔''

میں آزاد ہوتا تو شاید اس سفید سور پر پل پڑتا مگر میرے ہاتھ پشت پر بے انتہا سختی سے بندھے ہوئے تھے اور درجنوں رائفلیں ہماری طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

منیارڈ نے بڑی ادا سے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ''یہ اردگرد کا نظارہ تم کو کیسا لگ رہا ہے؟ دیکھو، یہ صرف دو ڈھائی سو سپاہی ہیں۔ انہوں نے اردگرد کے ہزاروں تماشائیوں کو ہپناٹائز کر رکھا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ اندر سے کھول رہے ہیں، ابل رہے ہیں مگر کچھ کر نہیں سکتے۔ یہ انسان نہیں بھیڑ بکریاں ہیں اور بھیڑ بکریاں بھی ایسی جو ہپناٹائز ہو چکی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تمہیں عزت مآب اسکیل صاحب کی بہادری کی داد دینی چاہیے۔ لوگ کہتے تھے کہ قاسمیہ چوک کے علاقے میں چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔ لیکن ہم یہاں موجود ہیں اور قاسمیہ کے ان باغی قیدیوں کو ان کے عزیز و اقارب کے سامنے ہی کتے کی موت مارنے والے ہیں۔ ہے نا بہادری؟'' منیارڈ نے ستائش طلب نظروں سے مجھے اور عمران کو دیکھا۔

”لیکن یہ نہتے لوگ ہیں۔“ عمران نے کہا۔

وہ ہنسا۔ ”اتنے بھی نہتے نہیں ہیں۔ کچھ نہ کچھ ضرور ہے ان کے پاس۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کے پاس توپیں اور راکٹ لانچر بھی ہوں تو یہ کچھ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ لڑائی ہتھیار سے نہیں یہاں سے ہوتی ہے... یہاں سے۔“ اس نے اپنے سینے کو بائیں طرف سے ٹھونکا۔

سگریٹ کا کش لے کر بولا۔ ”اسٹیل صاحب اور مسٹر اینڈرسن چاہتے تو یہاں بہت ساری نفری بھی لا سکتے تھے۔ یہاں کے ہر کالے کے سر پر ایک رائفل بردار کھڑا کر سکتے تھے لیکن وہ صرف دو کمپنیوں کے ساتھ یہاں آئے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈھائی سو سپاہی۔ اور تم ان ڈھائی سو سپاہیوں کی دہشت دیکھ رہے ہو۔ یہ اس سے آدھے بھی ہوتے تو نتیجہ یہی ہونا تھا۔ اب تو تمہیں یہ بات ماننی چاہیے کہ ایک برٹش سپاہی ایک سو کالے جنگجوؤں پر بھاری ہے...“

ملیارڈ صرف بڑ نہیں مار رہا تھا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ سیکڑوں تماشائی واقعی انسانوں کے بجائے بھیڑ بکریاں نظر آ رہے تھے۔ دور فاصلے پر چند ٹولیاں ضرور ایسی تھیں جو نعرے لگا رہی تھیں اور احتجاجی رویے کا اظہار کر رہی تھیں مگر باقی سب سکوت تھا۔

اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ ایک شاندار میز کے عقب میں مخملی کرسیوں پر بیٹھ چکے تھے۔ ہلکی سنہری دھوپ میں ان کے چہرے کچھ اور بھی سرخ دکھائی دیتے تھے۔ اینڈرسن اپنی جگہ سے اٹھ کر چبوترے پر آیا اور ایک بار پھر میگا فون کے ذریعے دہاڑا۔ ”...ہام دوستوں کے دوست اور دشمنوں کے دشمن ہیں۔ یہ تمہارے سامنے عبرت کا تصویر بنا وہ سب ڈرٹی لوگ کھڑا ہے جس نے اپنی اوقات سے بڑھ کر ظلم کیا۔ پچھلے پانچ دن تک ان لوگوں نے اس شہر کو جہنم بنائے رکھا۔ اب ان کا انجام توم لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھے گا۔ یہ سب کا سب اپنے کرائمز کو تسلیم کر چکا ہے۔ حکم جی کے قانون میں ان کے لیے کوئی رعایت ناہیں اور نہ ہی ہام دیں گا۔ اب کہاں ہیں وہ موٹی گردنوں والے سرکردہ لوگ جنہوں نے ان کو بھڑکایا۔ ان میں سے بہت سا بھاگ چکا اور بہت سا چوہوں کی طرح انڈر گراؤنڈ ہے۔ یہ بیویوں اور کنیزوں کے جھرمٹ میں رہنے والے، جھوٹے دغاباز، فریبی عیاش تم کو کچھ ناہیں دے سکتے۔ اسپرین کا ایک گولی، جنریٹر کا ایک پرزہ، رائفل کا ایک راؤنڈ... کچھ بھی ناہیں۔“

قوی ہیکل اینڈرسن کئی منٹ تک دہاڑتا رہا۔ آخر میں اس نے کہا۔ ”ہام ڈرنے والا ناہیں، لڑنے والا لوگ ہے۔ ہام کو اپنے بازو پر بھروسا ہے اور اسی لیے ہام یہاں موجود ہے۔ اگر کسی کو کسی بھی ٹائم اپنے دل کا ارمان نکالنا ہے تو ہام اس کے لیے تیار ہے۔“

اینڈرسن کی تقریر ختم ہوئی تو ہم پر یہ انکشاف ہوا کہ یہاں کوئی سرسری سماعت بھی نہیں ہوگی اور اگلے چند منٹ کے اندر کم از کم بیس قیدیوں کو مقامی طریقے کے مطابق سولی چڑھا دیا جائے گا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ انور خاں اور بھرت بھی ان بیس افراد میں شامل ہوں گے۔ ہم نے دیکھا کہ بھرت کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آ رہا تھا۔ آفیسر ملیارڈ اس کے قریب ہی موجود تھا۔ بھرت نے دو تین بار اس سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن گارڈز نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔ یقیناً وہ ان آخری لمحوں میں پھر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتا ہوگا۔ ان کو بتانا چاہتا ہوگا کہ وہ میم کرسٹی کو مارنے والوں میں نہیں بچانے والوں میں شامل تھا... مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اب صفائی دہائی کا مرحلہ گزر چکا ہے۔ کسی فریادی کی کسی فریاد پر اب کان نہیں دھرا جائے گا۔

اسی دوران میں میری نظر میڈم صفورا پر پڑی۔ وہ کرسیوں پر بیٹھے معزز مہمانوں کی آخری قطار میں نظر آ رہی تھی۔ اس کا چہرہ غم واندوہ کی تصویر تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر اتنی دور سے بھی مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کچھ دیر پہلے تک روتی رہی ہے۔ چند سیکنڈ کے لیے میری اور اس کی نگاہیں ملیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ عمران نے بھی اسے دیکھ لیا ہے۔ ایک دوسرے کو دیکھنے کے سوا ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ صفورا میں اتنی سکت نہیں ہوگی کہ وہ یہاں بیٹھ کر سفاکانہ طریقے سے سولیاں چڑھائے جانے کا منظر دیکھ سکے۔ یقیناً وہ صرف ہمیں دیکھنے کے لیے یہاں آئی تھی۔ خونی تماشا شروع ہونے سے پہلے ہی اسے یہاں سے چلے جانا تھا۔

عمران نے مجھے ٹہوکا دیتے ہوئے کہا۔ ”میڈم کو اپنانے کی حسرت دل میں ہی رہ گئی۔ آہ... اب اس کو بھی پتا نہیں چل سکے گا کہ میں اس پر کس طرح فدا تھا۔“

میں نے حیرت سے عمران کو دیکھا۔ سلطانہ کی موت کے بعد سے میری طرح اسے بھی چپ سی لگ گئی تھی۔ آج وہ کئی دنوں کے بعد تھوڑا سا چہکا تھا۔ ہم بے حد سنگین صورتِ حال کا سامنا کر رہے تھے۔ ایسی صورتِ حال میں وہ اپنے مخصوص انداز میں کیوں بولا تھا؟

میں نے بھی اپنی خاموشی توڑی۔ میں نے بھرّائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”عمران! کیا آج پھر ہم دیکھتے رہ جائیں گے؟ ہم اسحاق کو نہ بچا سکے، کیا انور خاں اور بھرت کے لیے بھی کچھ نہ کر سکیں گے؟“

”نہیں یار! اس دفعہ تو کچھ نہ کچھ ہو جائے گا۔“

”کیسے ہو جائے گا؟“

”یار! جب تم چاہو گے تو ہو جائے گا۔ تم کوئی ایویں شیویں چیز ہو؟ تم نے یہاں کے شکتی دیوتا جارج گورا کو ناکوں چنے چبوائے ہوئے ہیں۔ اکھاڑے میں اسے موت کے گھاٹ اتارا ہوا ہے۔ تم کوشش کرو گے تو سب کچھ ہو جائے گا۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم زور لگاؤ تو تمہارے ہاتھوں کو جکڑنے والی رسّی ٹوٹ جائے گی۔“

”کیا کہہ رہے ہو؟“ میں نے بیزاری سے کہا۔

”یار! میں نے کبھی خبروں کے علاوہ جھوٹ بولا ہے؟ میں وہی کہہ رہا ہوں جو ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

ہم دونوں پنجابی میں بات کر رہے تھے اور لہجہ بہت دھیما تھا۔ گارڈز کچھ فاصلے پر تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ ہماری بات نہیں سمجھ رہے ہوں گے۔ عمران کی اس بے وقت کی راگنی پر میرا دل بھر آیا۔ آنکھوں کے کنارے جل اٹھے۔

”عمران!“ میں نے احتجاجی لہجے میں کہا۔

وہ سنجیدہ ہو گیا اور بدلے ہوئے آہنگ میں بولا۔ ”یار! تمہارے ہاتھوں پر بندھی ہوئی رسّی اتنی مضبوط نہیں ہے کہ تم اسے توڑ نہ سکو۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ اسے کمزور کر دیا گیا ہے۔ تمہارے پیچھے پیچھے چلنے والا گارڈ اسے کمزور کرتا رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ریزر بلیڈ کا ایک ٹکڑا تھا۔ وہ اس ٹکڑے کو رسّی کے بلوں پر چلاتا رہا ہے۔ اب یہ رسّی سات آٹھ جگہ سے کمزور پڑ چکی ہے۔ ہمارے پیچھے دیوار ہے اس لیے ہمارے بندھے ہوئے ہاتھ کسی کو نظر نہیں آ رہے۔“

میں نے اپنے ہاتھ ہلا کر دیکھے۔ وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں... ابھی زور نہیں لگانا۔ ابھی زور لگانے کا وقت نہیں آیا۔“

میں نے سرگوشی کی۔ ”تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی... اگر... رسّی کمزور کی ہے تو کس نے کی ہے... اور کیوں؟“

”تمہیں بتایا تو ہے کہ تمہارے پیچھے چلنے والے گارڈ نے کی ہے۔ اور کیوں کی ہے، اس کا جواب بڑا مشکل ہے۔ اس پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے۔“ وہ عجیب کھوئے کھوئے سے انداز میں بولا۔ میں اس کا اطمینان اور ٹھہراؤ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ یہ اطمینان اور ٹھہراؤ میرے اندر ایک بے نام امید جگا رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”چلو تم طویل جواب نہ دو، مختصر دے دو۔“

ہم بڑے عام سے انداز میں بات کر رہے تھے۔ بات کرتے ہوئے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔ گارڈز نے ابھی تک ہمارا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔

عمران بدستور کھوئے کھوئے انداز میں بولا۔ ”کہتے ہیں نا کہ چیونٹی بھی اپنی طاقت کے مطابق اپنا دفاع کرتی ہے۔ کچھ لوگ چیونٹیوں ہی کی طرح حقیر اور بے حیثیت سمجھے جاتے ہیں۔ جب رنجیت پانڈے جیسے لوگ ان کی انا کے منہ پر تھپڑ مارتے ہیں تو وہ اندر سے بدل جاتے ہیں۔ وہ رہتے تو چیونٹی ہی ہیں لیکن یہ زہریلی چیونٹی ہوتی ہے۔ ہاتھی کو گرا دیتی ہے...“ عمران کا لب ولہجہ معنی خیز تھا۔

عمران کی بات نے میرے اندر ایک چھناکا سا کیا۔ دماغ میں روشنی سی بھر گئی۔ پانڈے اور تھپڑ والی بات سے مجھے چند روز پہلے کا ایک منظر یاد آ گیا... اور اس کے ساتھ ہی یہ یاد آ گیا کہ ہماری کوٹھڑی پر پہرا دینے والے گھبرے سانولے گارڈ کی آواز میں نے پہلے کہاں سنی تھی۔ وہ آواز مجھے یوں ہی جانی پہچانی نہیں لگی تھی۔ جب ہم اتھرا گاؤں میں کماد کے کھیت میں چھپے ہوئے تھے تو رات کی تاریکی میں رنجیت پانڈے اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک کمانڈو ایکشن کے لیے نکلا تھا۔ یہ لوگ سیوریج کی ایک پرانی پائپ لائن تک پہنچے تھے اور اسپتال میں گھسنے کے لیے اس پائپ لائن کے سرے پر سے مٹی ہٹائی تھی۔ پانڈے کی ہدایت پر اس کا ماتحت کدال چلا رہا تھا۔ کدال سیمنٹ کے پائپ سے ٹکرا گئی تھی اور آواز پیدا ہوئی تھی۔ پانڈے نے بھنا کر اس ماتحت کو تھپڑ رسید کیا تھا۔ تھپڑ کی آواز سناٹے میں دور تک گونجی تھی۔ پانڈے اور اس کے اس مزدور نما ماتحت کے درمیان جو مختصر مکالمہ ہوا تھا، اس میں یہ آواز میرے کانوں تک پہنچی تھی۔ یہ بھرّائی ہوئی سی آواز والا ماتحت اس وقت ایک دیہاتی کے حلیے میں تھا اور دھوتی کرتہ پہنے ہوئے تھا۔

ایک دم واقعات کی بہت سی کڑیاں مل گئیں۔ کوٹھڑی میں، میں نے دو تین بار اس سانولے ماتحت گارڈ کو عمران سے باتیں کرتے سنا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں کوئی کھچڑی پکی تھی۔ کوئی پلان بنا تھا۔ عمران نے دوبارہ تیز سرگوشی کی۔ ”میں ایک بار پھر کہہ رہا ہوں۔ ابھی زور نہیں لگانا۔ جب وقت آئے گا، میں بتا دوں گا۔“

دوسری طرف اجتماعی سولیوں کی تیاری آخری مراحل میں تھی۔ ورزشی جسم والے مقامی جلاد بالکل تیار تھے۔ ہزاروں کا مجمع مضطرب لیکن خاموش تھا۔

میرے جسم میں سوئیاں سی چبھنے لگیں۔ دھڑکن بڑھتی جارہی تھی۔ میں نے کہا۔ ''لیکن میرے پیچھے چلنے والا گارڈ تو کوئی اور تھا؟''

''وہ اس کا ساتھی ہے۔'' عمران نے مختصر جواب دیا۔

اب مجھے کچھ دیر پہلے کی وہ ساری صورتِ حال یاد آرہی تھی۔ جب ہم یہاں آرہے تھے، سب قیدیوں کے پیچھے ایک ایک گارڈ تھا اور ہر گارڈ نے اپنے قیدی کو باقاعدہ بازو سے پکڑا ہوا تھا۔ میرے والے گارڈ نے بھی میری کلائی تھامی ہوئی تھی۔ اس وقت مجھے کچھ اندازہ نہیں ہوا تھا کہ میرے ہاتھوں کی بندش کے ساتھ کچھ کیا جارہا ہے۔

''عمران! اگر کچھ کرنا ہے تو جلدی کریں۔ یوں نہ ہو کہ وقت پھر ہاتھ سے نکل جائے۔'' میں نے سرگوشی کی۔

''بس تھوڑا سا انتظار... تھوڑا سا... کسی نے یہاں آنا ہے۔''

''کس نے؟'' میں نے چونک کر پوچھا۔

''ٹھیک سے مجھے بھی پتا نہیں... لیکن وہ آئے گا ضرور۔''

''تم پھر پہیلیاں بجھوا رہے ہو۔ تمہیں سب پتا ہوگا۔''

''سب نہیں... ہاں تھوڑا بہت پتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ جب آئے گا تو سیدھا ان میز کرسیوں کی طرف جائے گا جہاں یہ گورے بیٹھے، انگور کی بیٹی سے کھیل رہے ہیں۔ ایک دم ہلچل مچ جائے گی... اور یہی وقت ہوگا تمہارے زور لگانے کا۔ تم اپنی رسّیاں توڑ دینا اور سیدھا سرجن اسٹیل کی طرف جانا۔''

''سرجن اسٹیل کی طرف؟ وہ تو وہاں بیٹھا ہے۔ ان آخری کرسیوں کی طرف۔''

''تب وہ وہاں نہیں ہوگا۔'' عمران نے کہا۔ ''وہ یہاں ہوگا، ہمارے سامنے۔ وہ ذلیل ان بیس بندوں کو اپنے ''دستِ مبارک'' سے سولی چڑھانا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی آنجہانی ماریا کی روح کو خوش کرنا چاہتا ہے۔''

ایک تنومند گارڈ ہمارے قریب آیا اور دانت پیس کر بولا۔ ''تم دونوں لگاتار باتیں کررہے ہو۔ چپ ہوجاؤ ورنہ پہلے تمہاری باری آجاوے گی۔''

میں اور عمران اس زہرناک وارننگ کے بعد خاموش ہوگئے۔ میڈم صفور اب اپنی جگہ سے اٹھ کر جاچکی تھی۔ ممکن تھا کہ وہ اب بھی کہیں پیچھے تماشائیوں میں موجود ہو۔ عمران کا کہا درست ثابت ہوا۔ دراز قد سرجن اسٹیل اپنی جگہ سے اٹھا اور گارڈز کے ساتھ چلتا ہوا چبوترے پر آگیا۔ سولیاں اب بالکل تیار تھیں۔ قطار میں کھڑے پہلے قیدی کا رنگ بالکل سفید ہوچکا تھا۔ یقیناً پہلی باری اسی کی تھی۔ اسٹریچرز پر لیٹے قیدیوں کو بھی چبوترے پر چڑھا دیا گیا۔ ان میں انور خاں بھی تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ ہمارے لیے اندازہ لگانا مشکل تھا کہ وہ بے ہوش ہے یا نہیں۔

اینڈرسن، منیارڈ اور دیگر معزز گورے اپنی اپنی کرسیوں پر موجود تھے۔ وہ اس سفاکی کا نظارہ کرنے کے لیے پوری طرح تیار و آمادہ تھے جو یہاں روا رکھی جانے والی تھی... پہلے قیدیوں کو سولیوں سے باندھا جانا تھا۔ پھر ان کی ہتھیلیوں اور ٹخنوں میں آہنی میخیں ٹھونکی جاتی تھیں۔ پھر آہنی ہتھوڑے کی ضربوں سے ان کے جسم کی اہم ہڈیاں ٹوٹتی تھیں۔ آخر میں رائفل کی گولی یا خنجر کے وار سے ان کا قصہ تمام ہونا تھا۔

...اور وہ کون تھا جسے آنا تھا؟ جس کے آنے کی امید عمران کو تھی... وہ کون ہوسکتا تھا؟ ڈاکٹر چوہان؟ کپتان اجے؟ چھوٹے سرکار کا کوئی جاں باز یا پھر اقبال جسے ہم فتح پور کے تہ خانے میں چھوڑ آئے تھے؟

...تین قیدیوں کو سولی سے باندھا جاچکا تھا۔ میری دھڑکن عروج پر پہنچ چکی تھی۔ ہونٹ خشک ہورہے تھے۔ میں نے بے حد اضطراب کے ساتھ عمران کی طرف دیکھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھوں آنکھوں میں مجھے انتظار کرنے کو کہا... دو تین منٹ مزید گزرے اور پھر وہی ہوا۔ آنے والا آگیا۔ وہ کون تھا؟ میں نے اسے کافی فاصلے سے دیکھا۔ اس نے اپنا چہرہ بھی ایک ڈھاٹے میں چھپایا ہوا تھا۔ میں نے اسے اس کے قد کاٹھ، اس کی جسامت اور اس کے بھاگنے کے انداز سے پہچانا۔ اور یہ وہ تھا جس کے بارے میں، میں نے بالکل نہیں سوچا تھا۔ میں اسے بھولا ہوا تھا... شاید میں نے لاشعوری طور پر بھی نہیں سوچا تھا کہ وہ یہاں نظر آسکتا ہے... وہ طلال تھا۔ سلطانہ کا پندرہ سولہ سالہ بھانجا... جو کسی رشتے سے اس کا بھتیجا بھی تھا... کم گو، کم آمیز۔ بڑی بڑی بھید بھری آنکھوں والا۔ سلطانہ اس کے لیے خالہ تھی، ماں تھی اور بہن بھی۔ وہ اس سے بے حد محبت رکھتا تھا۔ پچھلے چند دنوں میں حالات کچھ ایسے رہے تھے کہ میں نے طلال کے بارے میں سوچا ہی نہیں تھا اور نہ ہی یہ غور کیا تھا کہ جب فتح پور مندر کے تہ خانوں میں سلطانہ کی موت کی خبر پہنچے گی تو

اس کے اس راجپوت بھانجے پر کیا گزرے گی۔ اور اب اچانک وہ میری آنکھوں کے سامنے تھا۔

اس کی آمد کا منظر قابلِ دید تھا۔ وہ اور اس کی برادری کے قریباً دس پندرہ افراد اچانک ہجوم میں سے نکلے تھے اور اندھا دھند ان نشستوں کی طرف دوڑے جہاں گورے صاحبان مے نوشی میں مصروف تھے۔ طلال سب سے آگے تھا۔ مجھے اس کے ہاتھوں میں چھوٹی نال والی رائفل نظر آئی۔ وہ لگاتار فائر کرتا اور چلاّتا ہوا سلطانہ کے قاتلوں اینڈرسن اور منیارڈ وغیرہ کی طرف بڑھا۔ چند سیکنڈ کے لیے جیسے درجنوں گارڈز سکتہ زدہ ہوگئے۔ پھر انہیں ہوش آیا۔ انہوں نے رائفلیں سیدھی کیں۔ دھماکوں سے فضا کچھ اور بھی لرز اٹھی۔ طلال کے چار پانچ ساتھی رستے میں ہی گر گئے لیکن باقی خاردار باڑ تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ طلال کے پیچھے آنے والے شخص کے ہاتھ میں قریباً ڈیڑھ فٹ چوڑا اور دس بارہ فٹ لمبا تختہ تھا۔ اس نے یہ تختہ خاردار باڑ کے گول چھلوں کے اوپر پھینکا، پلک جھپکتے میں طلال اپنے تین چار ساتھیوں سمیت اس تختے پر چڑھا اور خاردار رکاوٹ پار کرگیا۔ میں نے اس کی گولی سے سیکنڈ آفیسر منیارڈ کو زخمی ہوتے اور میز پر اوندھے گرتے دیکھا۔

سولیوں کے قریب کھڑے درجنوں گارڈز اپنے ''وی آئی پیز'' کو بچانے کے لیے چبوترے سے اترے اور خاردار تاروں کی طرف بڑھے۔ یہی وقت تھا جب عمران نے مجھے کہا۔ ''توڑ دو۔''

اور میں نے پشت پر بندھے ہاتھوں کی بندش توڑ دی۔ رسّی کے کئی بل تڑاخے سے ٹوٹے اور وہ میرے ہاتھوں سے علیحدہ ہوگئی۔ میں پوری رفتار سے دراز قد سرجن اسٹیل کی طرف دوڑا۔ اس کا رخ بھی خاردار باڑ اور اس کے اندر موجود معززین کی طرف تھا۔ ایک گارڈ نے مجھ پر فائر کیا۔ گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی ہوئی نکل گئی۔ میں اپنے پورے زور سے اسٹیل پر جا پڑا۔ سلطانہ کی موت کے بعد جو آگ میرے اندر جمع ہوئی تھی، اسے ایک دم نکاسی کا راستہ ملا۔ وہ شعلہ جوالا بن گئی۔ آسمانی بجلی کا روپ دھار گئی۔ اسٹیل اور میں لڑھکتے ہوئے تین فٹ اونچے چبوترے سے نیچے گرے۔ تب تک اسٹیل کا چمکیلا پسٹل میرے قبضے میں آچکا تھا۔ میں نے پسٹل اس کی زرافے جیسی لمبی لیکن مضبوط گردن سے لگا دیا... اور اسے گھسیٹتا ہوا دیوار کے بالکل پاس لے گیا۔ کئی گارڈز نے رائفلیں میری طرف سیدھی کیں۔

''خبردار... گولی مار دوں گا۔ اڑا دوں گا اسے۔''

میں نے چلاّ کر کہا۔

گارڈز ایک لمحے کے لیے ٹھٹکے لیکن اسی دوران میں بائیں طرف سے ایک گارڈ نے گولی چلا دی۔ یہ گولی میرے سر کے بالوں کو چھو کر گزری۔ میں نے بھی اپنی دھمکی سچ کر دی۔ میں نے تپتے پھڑکتے، زور لگاتے اسٹیل کی گردن میں گولی ٹھونک دی... میرا دوسرا فائر اس کے نچلے جبڑے کو چیر کر یقیناً اس کے سر میں گھسا ہوگا۔ وہ ایک دم ڈھیلا پڑ گیا۔ میں اس کے جسم کو ڈھال کی طرح استعمال کر کے پیچھے ہٹا اور پھر جست لگا کر ایک فوجی جیپ کے عقب میں گرا۔ یہ جگہ جوابی فائرنگ کے لیے بہترین تھی۔

ہر طرف کہرام سا مچ گیا تھا۔ سلیقے سے رکھی ہوئی میزیں الٹ چکی تھیں۔ گورے بدحواسی میں چاروں طرف بھاگ رہے تھے۔ میں نے طلال کی ایک جھلک دیکھی۔ میرے سامنے اس نے زمین پر گرے ایک فربہ اندام انگریز کی توند میں تلوار گھونپی اور دستے تک اتار دی۔ پھر وہ نیچے جھک کر بھاگتا ہوا ایک طرف اوجھل ہوگیا۔

یہی وقت تھا جب صورتِ حال نے ایک بالکل غیر متوقع کروٹ لی۔ کچھ دیر پہلے تک یہ کروٹ کسی کے گمان میں بھی نہیں تھی۔ ڈیڑھ دو ہزار کا وہ مجمع جسے انگریزوں اور مسلح گارڈز نے اپنی دہشت سے ہپناٹائز کر دیا تھا... اس ''ٹرانس'' میں سے اچانک ہی نکل آیا۔ عمران کہتا تھا، جادو ایسے ہی ٹوٹا کرتے ہیں۔ زنجیریں ایسے ہی کسی اچانک واقعے کی حدت سے پگھل جاتی ہیں اور رکے ہوئے پانی ایسے ہی کسی ہلچل کے سبب بلند و بالا ڈیموں کو بہا کر لے جاتے ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ انگریزوں اور ان کے گارڈز کو تتر بتر دیکھ کر ایک دم مجمع حرکت میں آگیا۔ کچھ دیر پہلے تک جو لوگ بالکل غیر مسلح نظر آتے تھے، اب ان میں سے کئی ایک کے ہاتھوں میں لاٹھیاں، تلواریں اور ایسی ہی دیگر اشیا نظر آئیں۔ وہ نعرہ زنی کرتے ہوئے کسی سیلاب کی طرح آگے بڑھے۔ گارڈز نے رائفلوں کے منہ کھول دیے۔ دھماکے ہوئے، شعلے لپکے۔ لیکن ہجوم رکنے کے لیے نہیں بڑھا تھا۔ وہ منظر گواہی دے رہا تھا کہ یہاں شاید توپیں بھی نصب ہوتیں تو ان دیوانے لوگوں کو روک نہ سکتیں۔ تابڑ توڑ فائرنگ سے زخمی ہوکر بہت سے لوگ گرے لیکن وہ رکے نہیں۔ یہ بڑا کلاسیکل منظر تھا۔ ایک سیکنڈ کے لیے مجھے یوں لگا کہ میں پھر ڈیڑھ سو برس پیچھے چلا گیا ہوں اور آزادی کی جنگ کا ایک ٹکڑا دیکھ رہا ہوں۔ لوگ للکارتے ہوئے خاردار تار کی طرف دوڑتے چلے گئے۔ شاید ایسے ہی کسی موقع کے لیے یہ شعر کہا جاتا

ہے۔ کتنے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت...

اور پھر تصادم ہوگیا۔ زرگاں شہر کا قاسمیہ چوک میدانِ جنگ بن گیا۔ میں نے عمران کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ٹرپل ٹو رائفل تھی۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا، عمران کے ہاتھ چند سیکنڈ پہلے اسی ''سیاہ رنگت اور روشن دل'' والے غریب گارڈ نے کھولے تھے جس نے میرے ساتھ مہربانی کرائی تھی۔

عمران لپکتا ہوا چبوترے پر چڑھا اور اس اسٹریچر تک پہنچا جس پر انور خاں دراز تھا۔ میں بھی اوٹ سے نکل کر بھاگتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ ہم نے انور کے اسٹریچر کو اٹھایا اور فائرنگ کی زد سے دور ایک بڑی ٹرک نما گاڑی کی اوٹ میں لے گئے۔ باقی چار اسٹریچرز پر موجود افراد گولیوں سے چھلنی ہو چکے تھے۔ ہم نے چھٹے اسٹریچر کو بھی محفوظ اوٹ میں پہنچا دیا۔ طلال کے کچھ ساتھی چبوترے پر چڑھ آئے تھے اور انہوں نے ان تین قیدیوں کی رسیاں کاٹ دی تھیں جنہیں سولیوں سے باندھا جا چکا تھا۔ ان میں سے بھی ایک شخص راہی عدم ہوگیا تھا لیکن باقی دو سلامت تھے۔

میری نگاہیں صرف اور صرف سلطانہ کے قاتلوں کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اگر میں ان سے اپنی سلطانہ کا بدلہ نہ لے سکا تو اپنی ہی آگ میں جل کر بھسم ہو جاؤں گا۔ رنجیت پانڈے، منیارڈ اور اینڈرسن میں سے کوئی مجھے نظر نہیں آ رہا تھا لیکن وہ یہاں موجود تھے۔ مجھے پتا تھا، وہ موجود ہیں۔ میں نے ماؤزر نما پسٹل پر گرفت مضبوط کی اور خاردار تاروں کی طرف بڑھا۔ یہ ساری جگہ دو طرفہ فائرنگ کی زد میں تھی۔

عمران نے میرا ارادہ بھانپ کر مجھے روکا۔ ''کیا کر رہے ہو تابی؟''

''نہیں، مجھے جانے دو عمران... مجھے مر جانے دو یا مار دینے دو۔''

''حوصلہ کرو... سب کچھ ہوگا۔''

''اب نہیں ہوگا تو کب ہوگا؟'' میں نے خود کو عمران سے چھڑایا اور مختلف چیزوں کی آڑ لیتا ہوا خاردار تاروں کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ جب عمران نے دیکھا کہ میں رکوں گا نہیں تو وہ بھی میرے ساتھ ہو گیا۔ ہم دونوں دیوانہ وار ان پوزیشنوں میں گھس گئے جہاں سے انگریز اور مقامی گارڈز ہجوم پر اندھا دھند فائرنگ کر رہے تھے۔ ہم نے کم از کم چار گارڈز کو اپنے ہاتھوں سے گولی ماری۔ یہاں ہماری دست بدست لڑائی بھی ہوئی۔ عمران نے بے دریغ ایک گورے سپاہی کے سینے میں رائفل کی سنگین گھونپی اور میں نے ایک مقامی گارڈ کے پیٹ میں گولی مار کر اس کی رائفل چھین لی۔ اور تب ہمیں منیارڈ نظر آیا... اس کا ایک کندھا طلال کی گولی سے شدید زخمی ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے دوسرے ہاتھ میں میگافون تھاما ہوا تھا۔ شاید چند سیکنڈ پہلے تک وہ اپنے بچے کھچے گارڈز کو یہ ہدایات دے رہا تھا کہ گولیوں کی بارش کر دو۔ ان لوگوں کو چیونٹیوں کی طرح مسل دو۔ لیکن وہ بھول رہا تھا کہ ہر جگہ جلیانوالہ باغ نہیں ہوتی اور نہ ہر جگہ جنرل ڈائر کے ظلم کا سکہ چلتا ہے۔ میں نے عمران سے سنگین چڑھی رائفل لی اور اپنی رائفل اسے دے دی۔ یہی وقت تھا جب منیارڈ نے پلٹ کر ہمیں دیکھا۔ لیکن اب بہت دیر ہو چکی تھی۔ یہی شخص تھا جس نے سلطانہ پر گولیوں کی بوچھاڑ کرنے کے لیے گورے کمانڈوز کو آنکھ کا قاتل اشارہ کیا تھا۔ میں نے اس کی آنکھ کو ہی نشانہ بنایا۔ نیلی سنگین قوت کے ساتھ اس کی آنکھ سے ٹکرائی اور وہ سب کچھ تباہ کر گئی جو اس کی آنکھ کے پیچھے اور کھوپڑی کے اندر موجود تھا۔ شاید میں کچھ زور اور لگاتا تو سنگین کھوپڑی توڑ کر دوسری طرف سے باہر آ جاتی۔ منیارڈ کی دوسری آنکھ اور چہرے کے تاثرات بڑے بھیانک تھے۔

ایک انگریز رائفل مین نے قریبی گلی کے اندر سے عمران کو نشانہ بنایا۔ عمران کی بے مثال لک کہاں کام نہیں کرتی تھی۔ اس نے یہاں بھی کام کیا۔ گولی سیدھی عمران کو لگتی مگر راستے میں عمران کی رائفل آ گئی۔ گولی اس کے دستے سے ٹکرائی تھی۔ عمران نے مہارت سے جوابی فائر کر کے رائفل مین کو ڈھیر کر دیا۔

اب یہ وقت تتر بتر ہونے کا تھا۔ چبوترے کے اردگرد اور میز کرسیوں والے احاطے میں تیس چالیس لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے بیس پچیس تو ضرور گارڈز کی ہوں گی۔ ان بیس پچیس میں کئی انگریز بھی نظر آ رہے تھے۔ یقیناً وہ سب سے اہم لاشیں سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی تھیں۔ اب کسی بھی وقت راج بھون سے کمک یہاں پہنچ سکتی تھی۔ اگر کمک پہنچ جاتی تو راہِ فرار اختیار کرنے والے اور گلیوں میں روپوش ہونے والے سرکاری فوجی بھی واپس آ کر لڑائی میں شامل ہو جاتے۔ نہتے شہری کہاں تک مسلح فوجیوں کا مقابلہ کر سکتے تھے۔

''بھرت کہاں ہے؟'' میں نے عمران سے پوچھا۔

''ابھی تک مجھے بھی کہیں نظر نہیں آیا۔''

ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے واپس اس گاڑی تک

پہنچے جس کے عقب میں دونوں اسٹریچرز رکھے تھے۔ یہاں مسلح اور نیم مسلح شہریوں کا جمگھٹا تھا۔ ہم بھرت کے ساتھ ساتھ اس معرکے کے اصل ہیرو طلال کو بھی ڈھونڈ رہے تھے لیکن وہ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وہ زندہ بھی ہیں یا نہیں۔ شہری فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ انہوں نے سرجن اسٹیل کی لاش کو گھسیٹنے کی کوشش بھی کی مگر عمران کے اشارے پر میں نے انہیں منع کر دیا۔ جمع ہونے والے لوگ مجھے بے حد اہمیت دے رہے تھے۔ میں نے جارج، یہاں کے شکستی دیوتا کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اور یہی میری پہچان تھی۔ کچھ لوگ وہ ٹوٹی ہوئی رسّی دیکھ رہے تھے جسے توڑنے کے بعد میں اسٹیل پر حملہ آور ہوا تھا۔ وہ یہ رسّی ایک دوسرے کو دکھا رہے تھے اور تبصرے کر رہے تھے۔ ان میں سے شاید کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس رسّی کے ٹوٹنے میں مجھ سے زیادہ ایک ریزر بلیڈ کا کمال ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے میں مرکزِ نگاہ بن گیا۔ میرے گرد ہجوم بڑھتا چلا گیا۔ لوگوں نے میرے اور انور خاں کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ وہ میرے اور انور خاں کے حق میں فلک شگاف نعرے لگا رہے تھے۔ یہ نعرہ زنی بڑھتی چلی جا رہی تھی۔

عمران نے سرگوشی کے لہجے میں مجھ سے کہا۔ ''ان لوگوں سے کہو کہ وقت ضائع نہ کریں۔ بہت جلد سرکاری فوجی پوری طاقت سے یہاں ہلّا بولیں گے۔ لوگ اپنے دفاع اور بچاؤ کی تیاری کریں۔ گھروں اور محفوظ جگہوں پر مورچے بنائیں۔ خاص طور سے ان دو اہم راستوں کو روک لیں جو قاسمیہ میں داخل ہوتے ہیں... یقیناً ان میں کچھ لیڈر ٹائپ بندے بھی ہوں گے۔ ان کے ذریعے فوری بندوبست کریں۔''

میں نے کہا۔ ''یہ سب باتیں تم خود کیوں نہیں کہتے؟''

''نہیں یار! تمہاری بات کا اثر ہوگا۔ یہ لوگ تمہیں اہمیت دے رہے ہیں اور ٹھیک ہی دے رہے ہیں۔''

''لیکن...''

''لیکن شیکن کچھ نہیں۔ چلو شروع ہو جاؤ۔'' اس نے ایک بندے سے میگافون لے کر میری طرف بڑھایا۔ یہ وہی فون آلود میگافون تھا جو ابھی ہم نے منیارڈ کی لاش کے پاس سے اٹھایا تھا۔

میں نے کبھی تقریر کی تھی اور نہ اس طرح لوگوں کا سامنا کیا تھا۔ پھر بھی عمران کے کہنے پر میں چبوترے پر چڑھ گیا۔ دور تک پُرجوش لوگ نظر آ رہے تھے۔ خاردار تاروں کے اردگرد کالے اور گورے فوجیوں کی لاشیں پڑی تھیں۔ ان میں سے کچھ لاشوں پر چادریں ڈال دی گئی تھیں۔ قاسمیہ کے نوجوان، فوجیوں کی بکھری ہوئی رائفلیں اور ایمونیشن وغیرہ اکٹھا کر رہے تھے۔ میں نے میگافون ہونٹوں کے قریب کیا۔ یہی وقت تھا جب دو افراد مجمع چیرتے ہوئے آئے اور چبوترے پر آ کر مجھ سے لپٹ گئے۔ یہ ڈاکٹر چوہان اور عبدالرحیم تھے۔ چوہان کو میں نے بس اس کی آواز سے پہچانا۔ ان دونوں نے اپنے چہرے منڈاسوں میں چھپا رکھے تھے۔ کندھوں سے رائفلیں جھول رہی تھیں۔ چوہان نے مجھے زور سے بھینچتے ہوئے کہا۔ ''مجھے پتا تھا، میں تمہیں ایک دن ضرور زندہ دیکھوں گا۔ مجھے پتا تھا۔''

عبدالرحیم بھی میرے گلے لگ گیا۔ عبدالرحیم ان قیدیوں میں سے تھا جو اسحاق اور انور خاں وغیرہ کے ساتھ ہمارے ہمراہ نل پانی پہنچے تھے۔ عبدالرحیم زرگاں کے اسی محلے میں رہتا تھا جہاں سلطانہ کا بچپن اور لڑکپن گزرا تھا۔ ادھیڑ عمر عبدالرحیم ہچکیوں سے رونے لگا۔ ''سلطانہ بی بی چلی گئی۔ وہ ہم سب کو چھوڑ گئی۔ اس کی کوئی عمر تھی جانے کی۔''

عمران نے اسے بمشکل مجھ سے علیٰحدہ کیا۔ پھر میرے کان میں تیز سرگوشی کرتے ہوئے بولا۔ ''وقت کم ہے۔ جو کچھ کہا ہے جلدی سے اس کا اعلان کر دو۔''

میں نے میگافون اپنے سامنے کیا اور بلند آواز سے وہ الفاظ دہرانے شروع کر دیے جو عمران نے کہے تھے۔

لوگوں کا جوش و خروش عروج پر پہنچ گیا۔ وہ ہوائی فائرنگ کرنے لگے۔ تلواریں، لاٹھیاں اور کلہاڑیاں ہوا میں لہرانے لگیں۔ کچھ دیر پہلے تک ان لوگوں کو اسٹیل اور اینڈرسن وغیرہ مردہ سمجھ رہے تھے۔ ان لوگوں کے سامنے ہی ان کے پیاروں کو بدترین طریقے سے مار کر اپنی ہیبت میں اضافہ کرنا چاہتے تھے مگر ایک ''پُرجوش واقعے'' نے انہیں زندہ کر دیا تھا۔ ایک شخص نے فوجی جیپ کی چھت پر چڑھ کر حکم کے لیے مردہ باد کا نعرہ لگوایا۔ پھر مجھ سے مخاطب ہوا اور کڑک کر بولا۔ ''آپ فکر نہ کریں جی۔ ہم ان گوروں اور ان کے چمچوں کے لیے قاسمیہ کو قبرستان بنا دیویں گے۔ ان کو اپنی لاشیں اٹھانے کی ہمت بھی نا ہیں ہووے گی۔''

ایک اور شخص جیپ پر چڑھ گیا۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بھی انور خاں کا ایک قریبی ساتھی حسنات بھائی تھا۔ وہ دہاڑتی آواز میں بولا۔ ''تابش صاحب بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ یہاں اکٹھا ہونے کا فائدہ نا ہیں۔ اپنے گھروں میں جاؤ۔ عورتوں اور بچوں کو پیچھے پرانے قلعے میں بھیج دو۔ ہر گھر کو مورچا بنا لو۔ ہر گلی میں ان سفید سوروں کے لیے موت

کا نا کا لگا دو۔ اب ہم پیچھے نا ہیں ہٹ سکتے۔ اب ہمیں مرنا ہے یا مار دینا ہے۔''

عمران نے پھر مجھے بولنے کے لیے کہا۔ میں نے خون آلود میگافون اپنے سامنے کیا تو لوگ پھر ہمہ تن گوش ہو گئے۔ میں نے کہا۔ ''بھائیو! آج یہاں قاسمیہ چوک میں جو کچھ ہوا ہے، اس نے پورے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہلچل مچا دینی ہے۔ میں غائب کا علم نہیں جانتا اور نہ انور خاں جانتا ہے لیکن میں آپ سب کو وشواس دلاتا ہوں کہ اب ''نل پانی'' نے خاموش نہیں رہنا۔ اب وہاں سے سیلاب ضرور آئے گا اور یہ سیلاب ہمارے ساتھ مل کر ان گورے کالے حکمرانوں کو بہا کر لے جائے گا۔ راج بھون کی اینٹ سے اینٹ بجے گی۔ ہاں، اینٹ سے اینٹ بجے گی۔''

لوگوں کا جوش و خروش عجیب رنگ اختیار کر گیا۔ مجھے لگا کہ اگر میں اس وقت اس چبوترے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہوں کہ وہ میرے ساتھ چلیں اور راج بھون پر ہلّا بول دیں تو وہ فوراً تیار ہو جائیں گے۔ سب اندیشوں کو بالائے طاق رکھ دیں گے۔

زندگی میں پہلی بار مجھے اندازہ ہوا کہ عوام الناس کس طرح کسی کو اچانک بلند ترین درجے پر پہنچاتے ہیں اور پھر اس کے اشارے پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ لیکن میں جانتا تھا کہ ابھی لوگوں کو کسی انتہائی اقدام کی طرف لے جانے کا وقت نہیں آیا اور غالباً اسٹریچر پر لیٹے ہوئے انور خاں کی سوچ بھی یہی تھی۔ اس کی آنکھیں نیم وا تھیں، وہ سب کچھ دیکھ رہا تھا اور سن رہا تھا۔

عمران کے اسرار پر سانولی رنگت والا گارڈ امرناتھ بھی چبوترے پر آ گیا۔ عمران نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ''اس کو بھی چند لفظ بولنے کا موقع دو۔''

میں نے میگافون امرناتھ کو تھمایا۔ وہ چند لمحے تک ہچکچایا پھر جذباتی انداز میں بولا۔ ''ہمار کو جیادہ بولنا ناہیں آوت۔ اور نہ ہم نے جیادہ کچھ کہنا ہے۔ بس یہی کہنا ہے کہ ہم سب نے مل کر ان جالموں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ اب مرنا ہے یا مار دینا ہے۔''

اس کے ساتھ ہی اس نے جھک کر مجھے پرنام کیا۔ میگافون مجھے تھمایا اور اشک بار آنکھوں کے ساتھ نیچے چلا گیا۔

عمران کے اشارے پر میں نے لوگوں کو منتشر ہونے اور ہدایات پر عمل کرنے کا کہا... لوگ منتشر ہونے لگے۔

☆☆☆

سہ پہر ہونے والی تھی۔ ہم زرگاں کے پرانے قلعے میں تھے۔ یہ کافی قدیم عمارت تھی۔ اس کا ایک چوتھائی حصہ منہدم ہو چکا تھا۔ اسے چاروں طرف سے گنجان آبادی نے گھیرا ہوا تھا۔ یہ مسلمانوں کی آبادی تھی۔ یہ کھنڈر قلعہ اس راستے پر واقع تھا جو مشرقی سمت سے قاسمیہ میں داخل ہوتا تھا۔ چوہان، عبدالرحیم اور انور خاں بھی ہمارے ساتھ تھے۔ انور خاں کی حالت میں بہتری واقع ہوئی تھی۔ وہ اب دھیمے لہجے میں بات بھی کر رہا تھا۔ خوش قسمتی سے بھرت بھی بچ بچا کر یہاں پہنچ گیا تھا۔ اس کے ساتھ اس کی محبوبہ چمپا عرف چمپی اور اس کی ماتا بھی تھی۔ چمپی کا یہاں آنا اس کے لیے خطرناک تھا مگر بھرت تو اسے کنوئیں میں کودنے کو کہتا تو بھی وہ ایک سیکنڈ کی دیر نہ لگاتی۔ بہرحال دونوں ماں بیٹی اوڑھنیوں میں لپٹی بڑی سہمی ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔ قاسمیہ چوک میں لڑائی شروع ہوتے ہی بھرت نے چبوترے سے چھلانگ لگا دی تھی اور ایک قریبی گلی میں روپوش ہو گیا تھا۔ لوگوں نے پکڑ کر اس کے ہاتھ کھولے تھے اور اسے گوروں سے بچانے کے لیے کئی گھنٹے ایک بیکری میں چھپائے رکھا تھا۔

سرکاری فوج نے ابھی تک قاسمیہ پر کسی طرح کی کارروائی نہیں کی تھی۔ یقیناً انہیں پتا چل چکا تھا کہ وہاں زبردست مزاحمت کا ماحول پیدا ہو چکا ہے۔ ہر گھر نے ایک مورچے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ اب وہ بڑی احتیاط اور پوری طاقت کے ساتھ کارروائی کرنا چاہتے تھے۔ بس چند گھنٹوں کے اندر ہی میں بالکل غیر متوقع طور پر مزاحمت کاروں کا لیڈر بن گیا تھا۔ وہ میرے گرد پروانوں کی طرح جمع تھے۔ قاسمیہ چوک میں میرا جست لگا کر چبوترے سے اترنا اور پھر سرجن اسٹیل پر جھپٹنا ایک ایسا واقعہ تھا جو ہر کسی کی زبان پر تھا۔ میں نے اسٹیل کو اس کے اپنے ہی ماؤزر نما پسٹل سے قتل کیا تھا۔ یہ پسٹل ابھی تک میرے پاس تھا۔ لوگوں کے لیے یہ اسپیشل پسٹل بھی ''زیارت'' کی چیز بنا ہوا تھا۔ جارح کی عبرت ناک شکست کے بعد جو ''ہوا'' میرے سلسلے میں بندھی تھی، اب وہ اور زور پکڑ گئی تھی۔ میرا اپنے ہاتھوں کی بندش کو توڑنا بھی لوگوں کے لیے زبردست حیرت اور تحریک کا باعث تھا۔ جبکہ میرے خیال میں اس صورتِ حال کا اصل ہیرو عمران تھا یا پھر گارڈ امرناتھ کا وہ ساتھی جس نے میری بندش کو بڑی صفائی سے قابلِ شکست بنایا تھا۔

میرے بعد اگر لوگ کسی کو تھوڑا بہت کریڈٹ دے رہے تھے تو وہ راجپوت نوجوانوں کا وہ جتھا تھا جس نے

اچانک ہجوم میں سے نکل کر ہنگامے کا آغاز کیا۔ اس جتھے کے تقریباً چار نوجوان جاں بحق اور دو سخت زخمی ہوئے تھے۔ ان کو ڈاکٹر چوہان وغیرہ قلعے کے اندر ہی طبی امداد دے رہے تھے۔ جتھے کے باقی نوجوانوں کا کچھ پتا نہیں تھا۔ ہاں، اتنی تسلی ضرور ہوئی تھی کہ طلال مرنے والوں میں شامل نہیں۔

سرجن اسٹیل اور منیارڈ کی موت نے میرے اندر بھڑکتی آگ پر پانی کے کچھ چھینٹے تو ڈالے تھے مگر اس کی حدت میں خاص کمی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میں اپنے ہاتھوں اور بازوؤں میں ابھی تک سرجن اسٹیل کے خونچکاں جسم کا لمس محسوس کر رہا تھا۔

یہی شخص تھا جس نے اپنی سائنسی مہارت سے بھانڈیل اسٹیٹ کے سادہ لوح عوام کو بے وقوف بنانے کا ٹھیکا لے رکھا تھا۔ وہ اس سلسلے میں حکم کو کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتا تھا اور لوگ حکم کو بہت بڑا اوتار سمجھنے لگے تھے۔

عمران نے اپنے بالوں میں انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ ''جگر! آج تم نے سرجن صاحب کو ٹھنڈا کر کے اپنا بہت پرانا بدلہ چکا دیا ہے۔''

''کون سا بدلہ؟''

''الیکٹرانک چپ والا بدلہ۔ دراصل یہ چپ ہی تو تھی جس نے تمہیں برسوں اسٹیٹ کا قیدی بنائے رکھا ہے۔''

''لیکن حکم اور اینڈرسن ابھی زندہ ہیں عمران۔''

''یہ جوا کیشن سے بھرپور فلم شروع ہوئی ہے، اس میں ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ میں تمہیں گارنٹی دیتا ہوں کہ بہت سے لوگ مریں گے... لیکن...''

''لیکن کیا؟''

''لیکن یہ گارنٹی نہیں دیتا کہ ان فوت شدگان میں ہم شامل نہیں ہوں گے۔'' میں نے کہا۔ ''کم از کم میں تو شامل ہو ہی جاؤں تو اچھا ہے۔''

میری آنکھوں میں پھر سلطانہ کا غم جاگ اٹھا۔ آنکھوں کے کنارے جلنے لگے۔ عمران کچھ دیر مجھے دیکھتا رہا پھر اس نے مجھے گلے سے لگا لیا۔ میں کتنی ہی دیر تک اپنی ٹھوڑی اس کے کندھے پر ٹکائے آنکھیں بھگوتا رہا۔ اچانک ایک آواز نے ہمیں چونکایا۔ ''دیکھو تابش! کون آیا ہے؟'' یہ چوہان کی آواز تھی۔

میں نے سر اٹھا کر دیکھا اور حیران رہ گیا۔ میرے سامنے کھوسٹ بڑھیا کی پوتی بہو مالا اور پوتا ستیش کھڑے تھے۔ مالا کے ہاتھوں میں ایک نومولود بچہ تھا۔ وہ بہت کمزور اور خستہ حال نظر آتی تھی۔ مالا اور ستیش کو ہم نے آخری بار فتح پور کے مندر میں دیکھا تھا۔ ایک خونی ہنگامہ ہوا تھا۔ ستیش کے والد کے ہاتھ تیل کے کڑاہ میں جلے تھے اور پھر لوگوں نے اسے دوشی ٹھہرا کر قتل کر دیا تھا۔ مالا کی جان بھی بہ مشکل بچ پائی تھی۔ اس کے بعد سے مالا اور ستیش منظر سے یکسر اوجھل تھے۔

ستیش ایک نہایت کٹر اور انتہا پسند برہمن زادہ تھا لیکن جو اطلاعات ملی تھیں، ان سے پتا چلا تھا کہ وہ اب بہت حد تک بدل گیا ہے۔ اس کے بدلنے کی ایک وجہ تو یقیناً اس کی خوبرو اور روشن خیال پتنی مالا ہی تھی۔ دوسرے اس نے اپنے بزرگوں کا جو انتہائی دقیانوسی رویّہ دیکھا تھا، اس نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ستیش کا ایک بازو پلاستر میں جکڑا ہوا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ سنگین اور بگڑی ہوئی چوٹ اسی مندر والے ہنگامے کی یادگار ہے۔ وہ بیمار اور کمزور بھی دکھائی دیتا تھا۔ میں نے اور عمران نے ان دونوں کو خوش آمدید کہا۔ ان دونوں کو کچھ پتا نہیں تھا کہ ہمارا رویّہ ان کے ساتھ کیسا ہوگا۔ بہرحال، میرے دو چار فقروں نے ہی ان کے خدشات دور کر دیے۔ ایک دوسرے کا حال احوال پوچھا گیا۔ مالا اور ستیش ان تمام حالات سے آگاہ تھے جو پچھلے ڈھائی تین ماہ میں پیش آئے تھے۔ سامبر مقابلے میں جارج کی عبرت ناک شکست اور موت کی تفصیلات بھی انہیں معلوم تھیں۔

مالا نے اشک بار لہجے میں مجھے بتایا۔ ''ماتا جی ہماری جان کی دشمن ہو رہی ہیں، تابش بھیّا۔ آپ کو پتا ہی ہوگا، یہاں زرگاں میں ان کے بہت سے عقیدت مند پیدا ہو گئے ہیں۔ وہ ان کے اشارے پر ہر کام کرنے کو تیار ہو جاوت ہیں۔ ماتا جی نے چند خطرناک لوگن کو ہمارے پیچھے لگا رکھا ہے۔ ان لوگن کو حکم ہے کہ میں جہاں بھی ملوں، میری ہتھیا کر دی جاوے۔ میرے بچے اور ستیش کو پکڑ کر ان کے پاس لایا جاوے۔ ہم دو مہینوں سے جگہ جگہ چھپتے پھر رہے ہیں۔''

عمران نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ''بہت جلد آپ دونوں کو کہیں چھپنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ آپ دونوں یہاں قلعے میں آ گئے ہیں، یہ بڑا اچھا کیا ہے۔''

اس گفتگو میں مالا کے پتی ستیش نے بھی حصہ لیا۔ وہ اپنے سابقہ رویّے پر بڑا نادم تھا۔ اسے اس بات پر بھی افسوس تھا کہ اس نے استھان میں سلطانہ کو زندہ جلانے کی کوشش میں حصہ لیا اور بعد ازاں وہ گرو کی موت کا سبب بھی

بنا۔ وہ بالکل بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”مجھ کو وشواس نا ہیں ہوتا کہ دادی جی اس حد تک جا سکت ہیں۔ وہ میری پتنی اور میرے بچے کے جیون کی دشمن ہو رہی ہیں۔ ان کے ہرکارے ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔“

یہ واقعی کٹر پن کی انتہا تھی۔ وہ بڑھیا کہنہ عقیدوں کی پجارن تھی۔ اور وہ اکیلی نہیں تھی۔ پرانی نسل کے ایسے ہزاروں لوگ یہاں موجود تھے۔

اسی دوران میں انور خاں کے ساتھی حسنات احمد کے ایک مخبر نے اطلاع دی کہ حکم کے فوجی دستے بڑی تعداد میں قاسمیہ کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ ان کی کمان اینڈرسن صاحب خود کر رہے ہیں۔ وہ ایک بند فوجی جیپ میں سوار ہیں۔ اس جیپ کے علاوہ بھی درجنوں گاڑیاں اور گھوڑا گاڑیاں اس کارروائی میں شریک ہیں۔

مخبر فیروز احمد نے کہا۔ ”وہ لوگ اسپیکروں کے ذریعے بار بار اعلان کر رہے ہیں کہ علاقے کے لوگ اپنے گھر خالی کر کے پیچھے ہٹ جاویں ورنہ ان کو دشمن سمجھا جاوے گا اور اپنے انجام کے وہ خود ذمے دار ہوویں گے۔“

حسنات احمد نے مجھ سے کہا۔ ”اس وقت قاسمیہ کے لوگن اور زرگاں کے دوسرے مسلمانوں کو آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ان کے درمیان ہوویں گے تو ان کے حوصلے بلند ہو جاویں گے۔ وہ ایک دو دن تک تو ان حکم کے ٹھوڈوں کو قاسمیہ میں داخل ہی نہیں ہونے دیویں گے۔“

میں عمران سے تنہائی میں بات کرنا چاہ رہا تھا مگر تنہائی کہیں نہیں تھی۔ پورا قلعہ عورتوں اور بچوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں عمران کو لے کر ایک ڈیوڑھی میں آ گیا۔ مجھے اپنے دل دماغ پر بڑا بوجھ محسوس ہو رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! تم دیکھ رہے ہو، یہ لوگ مجھ پر ضرورت سے زیادہ بھروسا کر رہے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ میں جارج کو مار سکتا ہوں تو سب کچھ کر سکتا ہوں۔ لیکن تمہیں تو پتا ہے یہ سب کچھ میرے بس کا روگ نہیں۔“

”کیا تمہارے بس کا روگ نہیں؟“

”یار! انجان نہ بنو۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ میں اس طرح کی مار دھاڑ کر سکتا ہوں اور کروا سکتا ہوں۔ یہ لوگ مجھے کمانڈر وغیرہ بنانے کے چکر میں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ لڑیں اور میں ان کو لڑاؤں۔“

”تو یار! اس میں مشکل کیا ہے؟ میں ہوں نا تمہارے ساتھ... تم یہ سمجھو کہ سب کچھ میں نے ہی سنبھالا ہوا ہے، تم صرف آرڈرز جاری کر رہے ہو۔“

”مگر...“

”یار! کوئی مسئلہ نہیں۔ سب ہو جائے گا۔ اصل کام تو یہاں کے لوگوں کے جذبے اور حوصلے نے ہی کرنا ہے۔ بس ان کو تھوڑی سی راہنمائی کی ضرورت ہے۔ وہ زا ہنمائی ہم کریں گے۔“

”ہم نہیں، تم کرو گے۔“

”چلو، میں ہی کروں گا۔ کیا ہم انور خاں کا اتنا ساتھ بھی نہیں دے سکتے؟ اب یوں کرو کہ قلعے سے باہر نکلتے ہیں۔ جیپ پر علاقے کا ایک راؤنڈ لگاتے ہیں۔ میگا فون ساتھ لے لیتے ہیں۔ راستے میں دو چار جگہ رک کر لوگوں کو حوصلہ دیں گے... انہیں بتائیں گے کہ وہ جم کر اپنا دفاع کریں۔ کم از کم اتنی دیر تک ان گوروں اور کالوں کو روکیں جب تک نل پانی سے ”ایٹک“ نہیں آ جاتا۔“

”کیا تم سمجھتے ہو کہ نل پانی سے ایٹک آئے گا؟“

”ہم تو کچھ بھی نہیں سمجھتے تھے۔ سویرے قاسمیہ چوک میں ہزاروں کا مجمع تھا اور دوڑھائی سو مسلح سپاہیوں نے انہیں بھیڑ بکری بنایا ہوا تھا۔ مگر جب طلال اور اس کے ساتھیوں نے ہلا بولا اور تم نے سرجن اسٹیل کی گردن دبوچی تو دیکھتے ہی دیکھتے سارا منظر بدل گیا۔ یار! یہ منظر ایسے ہی بدلتے ہیں۔ میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ اب نل پانی چپ نہیں رہے گا۔ مراد شاہ اور چھوٹے سرکار دیکھ رہے ہیں کہ حکم مکمل طور پر ان گوروں کا کٹھ پتلی بن چکا ہے۔ وہ اب آئیں گے۔ ضرور آئیں گے۔ اب تک یہ لڑائی کھلتی رہی ہے مگر اب نہیں ٹلے گی۔“

ہم نے گوروں سے چھینی ہوئی دو جیپوں پر قاسمیہ کے اندر ایک چکر لگایا۔ حسنات اور آٹھ دس مسلح محافظ ہمارے ساتھ تھے۔ ہم اہم جگہوں پر تھوڑی تھوڑی دیر کے لیے رکے۔ عمران کے کہنے پر میں نے میگا فون کے ذریعے لوگوں کے جوش وجذبے کو ابھارا۔ ہر جگہ فلک شگاف نعروں سے فضا گونجی۔

ہم رات دس بجے کے قریب واپس آئے۔ اس کے کچھ ہی دیر بعد گوروں اور حکم کے دستوں کی طرف سے حملہ شروع ہو گیا۔ یہ حملہ دو طرف سے تھا۔ حملے کی جگہ قلعے سے خاصی دور تھی۔ پھر بھی تابڑ توڑ فائرنگ اور دستی بموں کے دھماکوں سے ہلچل مچ گئی... ہمیں معلوم تھا کہ سرکاری دستوں کے لیے تیزی سے آگے بڑھنا ناممکن ہو گا۔ دفاع کرنے والے گھروں میں مورچہ بند تھے اور سرکاری سپاہیوں کو کھلی

جگہ پر آگے بڑھنا تھا۔ حسنات اپنے دیگر اہم کمان داروں کے ساتھ دفاعی لائن پر موجود تھا۔ اس نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ کم از کم چوبیس گھنٹے تک سرکاری دستوں کو قاسمیہ کی گلیوں میں داخل نہیں ہونے دے گا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ”ہم دونوں میں سے کسی ایک کو لڑائی والی جگہ پر موجود ہونا چاہیے۔ اور میرا خیال ہے کہ میرا جانا مناسب ہے۔“

”تم نے ہر خطرے کا ٹھیکا لے رکھا ہے؟“

”مجھے پتا تھا کہ تم یہ فقرہ ضرور بولو گے۔ لیکن ایک طرف تم مجھے مکمل ذمے داریاں سونپ رہے ہو، دوسری طرف میرے اختیارات میں مداخلت بھی کر رہے ہو۔ میں جو کہہ رہا ہوں، ویسا ہی کرو۔ یہاں عورتیں، بچے اور بوڑھے ہیں۔ ان پر خوف طاری ہے۔ لیکن اگر یہ اب تک حوصلے کا مظاہرہ کر رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم ان کے درمیان ہو۔ تمہارا یہاں رہنا ضروری ہے۔ باقی جہاں تک لڑائی کی بات ہے، فی الحال میں نے لڑنا ہے اور نہ تم نے۔“

اس نے مجھے وہاں رہنے پر مجبور کیا اور خود چوہان، عبدالرحیم اور دیگر مسلح افراد کے ساتھ قلعے سے نکل گیا۔

پتا نہیں کیوں وہ مجھے قائل کر لیتا تھا۔ اور مجھے ہی کیا، وہ ہر کسی کو قائل کر لیتا تھا۔ اگر وہ قائل نہ کر سکا... تو شاید ایک لڑکی کو نہ کر سکا... شبو کو آمادہ نہ کر سکا کہ وہ اس کا ہاتھ تھام لے اور سارے بندھن توڑ کر اس کے ساتھ آزاد فضاؤں کا رخ کر لے۔ یا شاید اس نے اسے قائل کرنے کے لیے اپنا پورا زور لگایا ہی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کی اپنی خواہش اور اندر سے پیدا ہونے والی رضا کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اور وہ ایسا نہیں کر سکی تھی۔ بہرحال، اب یہ سب دور افتادہ ماضی کی باتیں تھیں۔

شدید لڑائی کی صورتِ حال قریباً ڈیڑھ گھنٹا رہی۔ پھر غیر متوقع طور پر ایک دم سکون ہو گیا۔ پندرہ بیس منٹ بعد عمران اور چوہان وغیرہ قلعے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حکم کے وفاداروں کا پہلا بڑا حملہ روک دیا گیا ہے۔ ہاں، جنوبی راستے سے وہ لوگ قریباً ایک فرلانگ اندر آ گئے ہیں اور انہوں نے دو محلوں پر کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ عمران کو کندھے پر معمولی زخم بھی آیا تھا۔ یہ کسی شاٹ گن کا چھرّا تھا جو اس کے کندھے سے چھوتا ہوا گزر گیا تھا۔

عمران، چوہان اور میرے درمیان لڑائی کی صورتِ حال کے بارے میں بات ہوئی... عمران نے کہا۔ ”ہمیں حقیقت سے نظر نہیں چرانی چاہیے۔ اور حقیقت یہی ہے کہ ہم اکیلے انگریزوں اور ان کے کٹھ پتلی حکم کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہاں، یہ ہے کہ ہم انہیں کچھ دیر تک روک سکتے ہیں۔ اگر اس دوران میں نل پانی حرکت میں آ جاتا ہے تو پھر راج بھون کی باقاعدہ فوج کے ساتھ زوردار مقابلے کا ماحول بن سکتا ہے۔“

قرائن سے پتا چلتا تھا کہ اب سویرے تک کوئی نیا حملہ نہیں ہو گا۔ اس دوران میں قاسمیہ کے اندر گھس آنے والے دستے اپنی پوزیشنیں بہتر بنائیں گے۔ اتفاقاً اس لڑائی میں دونوں فریقوں کا زیادہ جانی نقصان نہیں ہوا تھا۔ دونوں طرف سے صرف سات آٹھ افراد ہلاک اور دو درجن کے قریب زخمی ہوئے تھے۔ ان میں سے زیادہ تعداد حکم اور اینڈرسن کے فوجیوں کی تھی۔

چوہان، حسنات، بھرت اور عبدالرحیم وغیرہ کو نگرانی کا کام دے کر میں اور عمران تھوڑی دیر آرام کرنے کے لیے چلے گئے۔ کل کے ہنگامہ خیز دن کی ذمے داریاں پوری کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ہم تھوڑی دیر آرام کر لیتے۔

حسنات احمد نے قلعے کی دوسری منزل پر ایک محفوظ کمرا ہمارے لیے منتخب کیا تھا۔ یہاں ایک بڑا پلنگ تھا جس پر کمبل پڑے ہوئے تھے۔ کمرے میں انگیٹھی کی حرارت بھی موجود تھی۔ دور کہیں قلعے کی بیرونی دیوار کے پاس کسی کتے کی آواز بار بار سنائی دیتی تھی۔ میرے ذہن میں آیا کہ کہیں یہ وہی کتا تو نہیں لیکن پھر اس ”فضول“ خیال کو میں نے ذہن سے جھٹک دیا۔ ابھی ہمیں لیٹے ہوئے پانچ دس منٹ ہی ہوئے تھے کہ کمرے کے قدیم طرز کے منقش چوبی دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ عمران نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ دوسری طرف انور خاں کا ساتھی حسنات احمد تھا۔ مجھے شک گزرا کہ شاید انور خاں کی طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے لیکن یہ شک صحیح نہیں تھا۔ حسنات احمد سے کچھ دیر تک کھسر پھسر کرنے کے بعد عمران نے دروازہ بند کیا اور تیزی سے اندر آیا۔ اس نے بے تابی سے دائیں بائیں دیکھا جیسے چھپنے کے لیے کوئی جگہ ڈھونڈ رہا ہو۔ وہ واقعی جگہ ڈھونڈ رہا تھا لیکن اپنے چھپنے کے لیے نہیں، میرے چھپنے کے لیے... اس نے مجھے بازو سے پکڑا اور جلدی سے ایک قد آدم آبنوسی الماری کے پیچھے موجود خلا میں چھپا دیا۔ میں سرگوشیوں میں پوچھتا رہ گیا کہ کیا بات ہے مگر اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ یہ کوئی اہم معاملہ لگ رہا تھا۔ چند سیکنڈ بعد اس نے دوبارہ کمرے کا دروازہ کھولا اور کسی کو اندر لے آیا۔ یہ ایک لمبی گرم چادر میں لپٹی ہوئی جواں سال عورت تھی۔

دروازہ بند ہونے کے بعد اس نے چادر سر سے سرکائی تو میں دنگ رہ گیا۔ گیس لیمپ کی سفیدی مائل روشنی میں میرے سامنے گیتا بھی کھڑی تھی۔ وہی لڑکیوں کی ڈانس انسٹرکٹر، پکی عمر لیکن چست جسم والی ''چلتی پرزی۔'' اس کے ہونٹوں پر لالی تھی۔ چہرہ تمتما رہا تھا۔ اس کی آنکھیں دیکھ کر لگا کہ وہ ہلکے سے نشے میں ہے۔ اس نے عجیب دل ربا انداز سے عمران کو دیکھا۔ گرم چادر اس کے شانوں سے ڈھلک رہی تھی۔ جسمانی نشیب و فراز نمایاں تر ہو رہے تھے۔ عمران نے ذرا جھنجلاہٹ سے کچھ کہنا چاہا مگر اس نے اپنا ہاتھ عمران کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

''بیکار میں ناہیں آئی ہوں۔ بڑے کام کی خبر لائی ہوں۔ تمہارا من خوش ہو جاوے گا۔ تم کہو گے، مانگو گیتا آج کیا مانگتی ہو۔''

عمران نے کہا۔ ''گیتا! یہ ایسی باتوں کا وقت نہیں ہے۔ ہم جنگ کی حالت میں ہیں۔ تمہیں سنائی دے رہا ہوگا، اب بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی ہیں۔''

''مجھے کیا بتا رہے ہو۔ جتنا زرگاں کے بارے میں، میں جانتی ہوں کوئی اور ناہیں جان سکتا۔ زرگاں گیتا بھی سے ہے اور گیتا بھی زرگاں سے ہے۔'' اس نے عجیب بے باکی سے کہا اور عمران کو نیم باز آنکھوں سے دیکھتی ہوئی اس کے بالکل قریب چلی آئی۔

یہ زرگاں کے شبستانوں کی رازداں وہی تیز طرار عورت تھی جو اس سے پہلے زرگاں سے ہماری واپسی کے وقت، عمران کے ساتھ ایک رومانی سین کر چکی تھی۔ یہ رومانی سین ان کوششوں کا عوضانہ تھا جو اس نے سلطانہ کے زیور ڈھونڈنے کے حوالے سے کی تھیں۔

...لیکن آج وہ کچھ زیادہ ہی بے باک نظر آتی تھی۔ اس نے اپنی چادر تھوڑی سی اور سرکائی اور میں سناٹے میں رہ گیا۔ چادر کے نیچے اس نے دو حصوں پر مشتمل مختصر ترین لباس پہنا ہوا تھا۔ اس نے عمران کو کندھوں سے تھاما اور جذباتی انداز میں اس کا گال چوم لیا۔ عمران بھنا گیا۔ اسے ذرا دھکیل کر بولا۔ ''مجھے یقین نہیں آ رہا کہ تم میں شرم کی اتنی کمی ہو سکتی ہے۔''

وہ نشیلے انداز میں بولی۔ ''اپنوں سے شرم ناہیں ہوتی۔ شاید تم میری گستاخی پر ناراض ہو رہے ہو۔ لیکن اگر یہ گستاخی ہے بھی تو سوچو کہ کیوں ہے؟ کوئی تو ایسی بات ہووے گی جس کی وجہ سے تمہاری اس بندی کو اتنی جرأت ہو رہی ہے۔''

عمران نے غور سے اسے دیکھا اور تاڑ لیا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ اپنے لہجے کو ذرا نرم رکھ کر بولا۔ ''گیتا! مجھے پہیلیاں نہ بجھواؤ۔ بات بتاؤ۔''

''بات کی قیمت؟'' وہ صرف دو تین انچ کے فاصلے سے عمران کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔

''کیا قیمت؟''

وہ اس کے گلے لگ گئی۔ عمران نے جیکٹ اور قمیص اتاری ہوئی تھی۔ اس نے عجیب جذباتی انداز میں اس کے کندھے کی خونی خراش پر اپنے احمریں ہونٹ رکھ دیے۔ وہ کسی جونک کی طرح اس کے کندھے سے رسنے والا خون چوس رہی تھی۔ عمران نے اسے بالوں سے پکڑ کر پیچھے ہٹایا۔

''یہ کیا حرکت ہے گیتا؟''

''یہ پریم ہے عمران... اور پریم کی کئی قسمیں ہووت ہیں۔ کچھ پریم بلیدان دیتے ہیں، کچھ نہیں دیتے۔ ایسے پریموں میں ایک ہاتھ دیا جاتا ہے، دوسرے ہاتھ لیا جاتا ہے۔''

''تم کیا دینا چاہتی ہو؟''

''میں تمہیں بھانڈیل اسٹیٹ کی تقدیر بتانا چاہت ہوں۔ میں تمہیں ایک ایسی جانکاری دینا چاہت ہوں جو اس لڑائی کا نقشہ بدل دیوے گی۔''

''کیسی جانکاری؟''

وہ نشیلی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔ ''سب کچھ بتا دوں گی تو پھر مجھ بے چاری کے پاس کیا رہ جاوے گا۔ چلو تمہیں تھوڑا سا بتا دیوت ہوں۔ نل پانی سے آنے والی بڑی بی جسے اب لوگن ماتا جی کہنے لگے ہیں، اس سارے کھیل میں ترپ کے پتے جیسی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ اس بڑی بی نے اب سے تھوڑے سے پہلے قاسمیہ کے علاقے اور قلعے پر زوردار حملے کے لیے ایک شبھ گھڑی بھی نکالی ہے۔ یہی کارن ہے کہ ہندو فوجیوں کے مشورے سے گوروں نے ابھی لڑائی روک دی ہے۔ لیکن اس بڑی بی کے حوالے سے اگلی بات بہت زیادہ خاص ہے...''

''کیا؟'' عمران نے پوچھا۔

''قیمت؟'' گیتا بھی نے عمران کو خمار آلود نظروں سے دیکھ کر کہا۔

☆☆☆

خطروں کے دائروں میں سفر کرتے جانبازوں کی داستان کے بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

قاتل مسیحا

مختار آزاد

ضرورت اور خیال کا طلسم... ایک دفعہ اپنے سحر میں جکڑ لے تو اس سے نکلنا ناممکن ہو جاتا ہے... اس کی ضرورت نے بھی اسے ایک ایسی راہ سجھادی تھی، تکمیل کے بغیر رہائی اس کے بس کی بات نہ رہی...

اپنائیت اور حساسیت کے جذبات میں گندھی ایک دل گداز تحریر

وہ جھوٹا نہیں تھا لیکن حالات نے کلیٹ ڈوسکی کی پینسٹھویں سالگرہ سے کچھ پہلے ہی اسے اعلیٰ درجے کا جھوٹا بنا دیا تھا مگر وہ یہ جھوٹ کسی کو تکلیف پہنچانے یا تفریح کی غرض سے نہیں بولتا تھا۔ اس کے جھوٹ بولنے کا مقصد صرف اپنی بیمار بیوی کو تسلی دینا تھا۔

ہوا یہ تھا کہ ڈوسکی کی سادہ لوح بیوی لیرا گزشتہ دس برس پہلے ایک ٹریفک حادثے میں بُری طرح زخمی ہو گئی تھی جس کے بعد سے اس کا نچلا دھڑ بالکل مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔ کئی ماہ کے علاج کے بعد وہ گھر تو لوٹ آئی تھی لیکن اس حالت میں کہ بس بستر کی ہو کر رہ گئی تھی۔ ڈوسکی اپنی بیوی سے بہت محبت

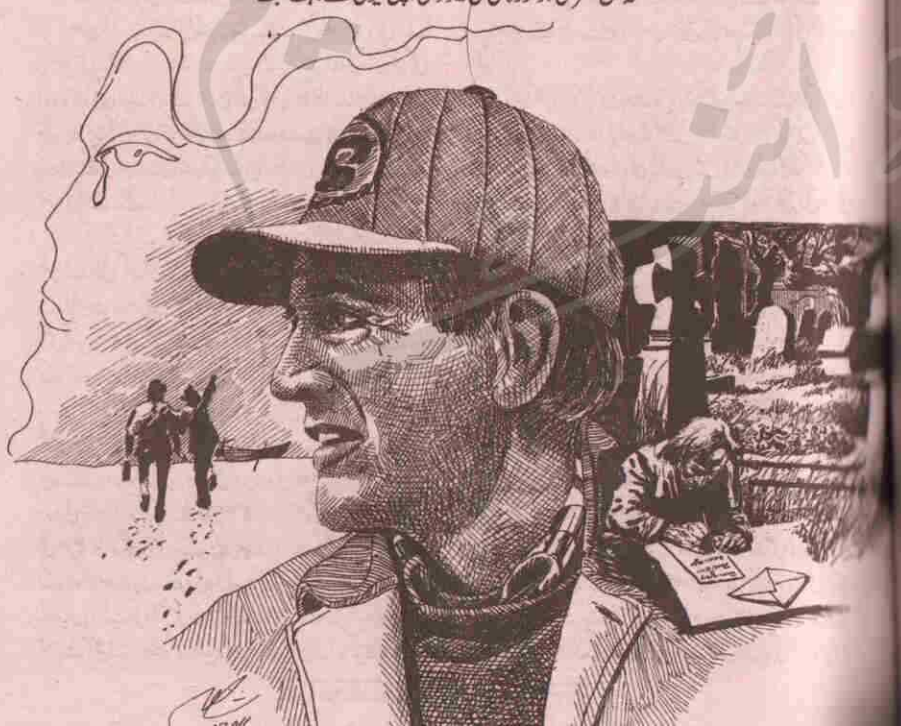

کرتا تھا۔ وہ ایک ریٹائرڈ سپروائزر تھا۔ اس کو ملنے والی ساری پنشن بیوی کے علاج پر خرچ ہو جاتی تھی لیکن اس کے باوجود وہ ہر وقت اُسے یقین دلانے کی کوشش کرتا تھا کہ وہ بہت جلد دوبارہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو جائے گی۔ حالانکہ ڈاکٹر کہہ چکے تھے کہ اب اس کی ساری زندگی بستر پر ہی گزرے گی مگر پھر بھی وہ ہر وقت اسے ٹھیک ہو جانے کی جھوٹی امیدیں دلاتا رہتا تھا۔

ڈوسکی غریب آدمی تھا۔ وہ فلوریڈا کے مضافاتی علاقے میں جھیل کے قریب واقع قصبے کے جس گھر میں رہتا تھا، وہ اس کے کاشت کار باپ نے تعمیر کروایا تھا۔ اب گھر کی حالت بھی بہت خستہ ہو چکی تھی۔ ایک تو اس کی پنشن بہت قلیل تھی، دوسرا یہ کہ آمدنی کا کوئی اور ذریعہ نہیں تھا۔ پھر لیرا کی بیماری..... اس کے پاس اتنے پیسے بچتے ہی نہیں تھے کہ گھر کی مرمت کروا سکے، اس کے باوجود وہ مستقل مزاجی سے زندگی بسر کر رہا تھا۔

لیرا سے شادی کو تیس برس ہونے والے تھے لیکن وہ اس کے لیے اب بھی محبوبہ کی حیثیت رکھتی تھی۔ مستقل بستر پر رہنے کی وجہ سے اس کی کمر پر پھوڑے ہو چکے تھے۔ یوں کئی اور امراض بھی اسے لاحق ہو چکے تھے۔

ان کے..... ایک بیٹی اور بیٹا تھے۔ بیٹی فلوریڈا کی ایک یونیورسٹی کے..... پروفیسر سے شادی کر چکی تھی اور بیٹا وہیں ایک آرٹ گیلری میں کام کرتا تھا۔ مالی لحاظ سے بیٹی اور بیٹا بھی اس قابل نہیں تھے کہ وہ اپنے ماں باپ کی مالی مدد کر سکتے، البتہ سال میں ایک دو بار وہ ان سے ملنے کے لیے ضرور آتے تھے۔

گزشتہ ایک ماہ سے وہ بہت زیادہ پریشان تھا۔ لیرا کی طبیعت کافی بگڑ چکی تھی۔ دس سال سے مستقل بستر پر رہنے کے باعث وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچا بن گئی تھی۔ ڈوسکی نے بھی تقریباً گھر سے نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے بیڈ کے کنارے کرسی ڈالے بیٹھا رہتا تھا۔ وہ درد کے مارے رات رات بھر کراہتی رہتی۔ اب اس میں اتنی طاقت بھی نہیں رہی تھی کہ بستر پر کروٹ بدل سکے یا تکیے کے سہارے بیٹھ سکے۔ اب تو ڈاکٹروں کی دی ہوئی دوائیں بھی اس کے درد کی شدت کو کم کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ بیوی کو پل پل مرتا ہوا دیکھنا اس کے لیے بہت اذیت ناک تھا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی اندرونی کیفیت کو چھپائے مسکراتا ہوا اسے تسلیاں دینے کی کوشش کرتا رہتا۔ اس کے لیے یہ سوچنا ہی نہایت تکلیف دہ تھا کہ جب لیرا نہیں ہوگی تو وہ کیسے زندہ رہ پائے گا۔ اولاد اپنی اپنی دنیا میں مگن تھی اور رہا ڈوسکی تو اس کی دنیا تو صرف لیرا تک ہی محدود تھی۔

وہ نومبر کی سرد دوپہر تھی۔ کمرے میں موسمِ سرما کی نرم نرم دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ لیرا کا بیڈ عین کھڑکی کے سامنے تھا۔ اس نے سینے تک کمبل اوڑھا ہوا تھا۔ دھوپ اس کی آنکھوں پر پڑ رہی تھی۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹی تھی۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ بیڈ کے ایک جانب کرسی پر ڈوسکی بیٹھا ہوا تھا جبکہ دوسری طرف لیرا کی ماں اور انکل خاموش بیٹھے اُسے تک رہے تھے۔ کمرے کا ماحول نہایت افسردہ تھا۔

''کیا میں مر رہی ہوں؟'' اس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی دقت سے دائیں جانب سر موڑتے ہوئے ڈوسکی سے استفسار یہ لہجے میں کہا۔

''نہیں میری جان! ایسا کچھ نہیں ہو رہا۔ میں نے تمہیں نئی دوا کھلائی ہے۔ تم بہت جلد ٹھیک ہو جاؤ گی۔'' اس کے لہجے سے محبت جھلک رہی تھی۔ اس نے بڑی مشکل سے اپنی پلکوں سے ڈھلکنے کے لیے بے قرار آنسوؤں کو روکتے ہوئے کہا۔

''تم یقین سے کہہ رہے ہو؟'' اس نے نقاہت سے اپنے سر کو تکیے پر سے تھوڑا اوپر اٹھاتے ہوئے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔

''ڈاکٹروں کو اس بات کا پورا یقین ہے۔'' یہ سن کر لیرا نے اپنا سر تکیے پر ٹکا دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ''تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ فضول کی باتوں میں ذہن کو الجھا کر خود کو ہلکان مت کرو۔'' اس کا لہجہ نہایت نرم تھا۔ آواز بھرائی ہوئی تھی مگر پھر بھی وہ بڑی ہمت سے اسے دلاسا دے رہا تھا۔

''او کے۔'' لیرا نے آہستہ سے کہا۔

''تم بہت جلد پوری طرح ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

ڈوسکی کی بات سُن کر لیرا نے ہلکا سا مسکرانے کی کوشش کی لیکن اس پر کمزوری غالب آ گئی۔ اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے جسم کی تمام قوت سلب ہو چکی ہو۔ پہلے تو اسے اپنے شوہر کی بات پر یقین آ جاتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ جان گئی تھی کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ اسے زندہ رہنے کے لیے جھوٹی تسلیاں دیتا ہے لیکن اس نے کبھی ایک بار بھی اس سے یہ نہیں کہا تھا کہ وہ جھوٹ کیوں بولنے لگا ہے اور وہ بھی اپنی بیوی سے۔ وہ جانتی تھی کہ ڈوسکی کا یہ معصوم جھوٹ اُس کی خوشی کے لیے ہی ہے مگر نہ جانے کیوں آج وہ یہ سمجھ رہی تھی کہ اب ڈوسکی کو مزید جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ وہ جان

چکی تھی کہ وہ مر رہی ہے۔ اب اس کی سانسیں کچھ ہی دیر کے لیے اس کے جسم کی مہمان ہیں۔

کمرے میں بدستور افسردہ ماحول چھایا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد اس کا درد بڑھنے لگا۔ درد بہت زیادہ تھا لیکن کمزوری اتنی زیادہ بڑھ چکی تھی کہ اس کے منہ سے کراہنے کی آواز بھی نہیں نکل پا رہی تھی۔ صرف اس کے ہونٹوں اور چہرے کے تاثرات سے ڈوسکی یہ اندازہ لگا رہا تھا کہ اس وقت وہ شدید کرب سے گزر رہی ہے۔

لیرا کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے جسم کی طنابیں کستی جا رہی ہیں۔ اس نے بڑی مشکل سے ایک بار اپنی آنکھیں کھول کر ڈوسکی کو دیکھنا چاہا لیکن اُس کا چہرہ اتنا دھندلا گیا تھا کہ اس نے اگلے ہی لمحے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اچانک اس کی سانسیں بے ترتیب ہونے لگیں۔ یہ دیکھ کر ڈوسکی سخت پریشان ہو گیا۔ وہ کرسی سے اٹھا اور اس کے بیڈ کی پٹی پر ٹک گیا۔ اس کا ہاتھ اُس کی نبض پر تھا۔ نبض بے ترتیب چل رہی تھی۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی سانسیں اکھڑنے لگیں۔ اس کے منہ سے سانس لینے کے بجائے خرخراہٹ جیسی آواز آنے لگی۔ اس سے پہلے کہ ڈوسکی کچھ کرتا، اس نے دو تین ہچکیاں لیں اور پھر ساکت ہو گئی۔ اس کا سر ڈھلک گیا۔ ڈوسکی نے ہاتھ بڑھا کر اس کی آنکھیں بند کیں۔ وہ سمجھ گیا کہ کچھ دیر پہلے لیرا سچ کہہ رہی تھی کہ میں مر رہی ہوں۔

ڈوسکی جب لیرا کی آنکھیں بند کر رہا تھا تو اُس کی ماں بھی سمجھ گئی کہ کیا حادثہ پیش آ چکا ہے۔ اسے بھی بیٹی کی موت کا یقین تھا لیکن ایک ماں کی حیثیت سے وہ اس کی زندگی کے آخری پل تک کسی ایسے معجزے کی منتظر تھی جس سے اسے زندگی مل جائے گی۔ لیکن لیرا ہی نہیں، اس کی امید بھی دم توڑ چکی تھی۔ وہ کافی دیر سے بیٹی کے سرہانے اپنے آنسو ضبط کیے بیٹھی تھی۔ ''ہائے میری بچی۔'' اُس نے زوردار چیخ ماری اور بے سدھ ہو کر کرسی پر گر پڑی۔

موت کے وقت اس کی عمر پچاس برس سے اوپر تھی۔ اس نے ڈوسکی کے ساتھ زندگی کے تیس سال بتائے تھے۔ اس کی بیماری کے بارے میں اس کی اولاد کو اچھی طرح علم تھا لیکن شاید وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ ان کی ماں آخری سانسیں لینے والی ہے۔ دو روز پہلے اس نے اپنی بیٹی اور بیٹے کو فون کر کے اُن کی ماں کی نازک حالت کے بارے میں بتا دیا تھا لیکن آنے پر کوئی تیار نہیں ہوا۔ سب کے پاس مصروفیت کا بہانہ تھا۔

عموماً ان کے بچے اگست میں ان سے ملنے آتے تھے لیکن اس بار اگست میں بھی اُن دونوں میں سے کوئی نہیں آیا تھا۔ اس بات کا لیرا کو بہت دکھ تھا۔ البتہ ڈوسکی نے اس کی بوڑھی ماں کو اطلاع کر دی تھی جو اپنے بھائی کے ساتھ فوراً چلی آئی تھی۔ جب لیرا نے آخری سانسیں لیں تو وہ دونوں اس کے سرہانے موجود تھے۔

ماں کو دیکھ کر لیرا بہت خوش ہوئی۔ شاید اس لیے کہ کوئی تو خونی رشتہ ہے جو اُس وقت اس کے پاس موجود ہے، جب وہ دنیا کو چھوڑ کر جانے والی ہے۔

لیرا کی ماں بدستور صدمے میں تھی۔ اسے ہوش آ گیا تھا۔ وہ دبے دبے لہجے میں رو رہی تھی۔ وہ لیرا کے ٹھنڈے پڑتے جسم کو بدستور چھو چھو کر دیکھ رہی تھی۔ ستر سالہ بوڑھی ماں، جسے یقین نہیں تھا کہ وہ اپنی کوکھ سے جنم لینے والی اولاد کو اپنی آنکھوں کے سامنے یوں دنیا چھوڑ کر جاتا ہوا دیکھ سکے گی۔

ڈوسکی اپنی بیوی کو بہت چاہتا تھا۔ اس نے پوری زندگی اسے ہر ممکن عیش و آرام مہیا کرنے کی کوشش کی تھی۔ اگرچہ اس کی موت کے وقت اُس کی مالی حالت بہت پتلی تھی، جیب اور بینک اکاؤنٹ، دونوں خالی تھے لیکن اس کے باوجود اس نے فیصلہ کیا کہ وہ اس کی تدفین نہایت شان سے کرے گا۔

لیرا کا انتقال سہ پہر کے وقت ہوا تھا۔ موت کے دو گھنٹے بعد میت قصبے کے اسپتال کے سرد خانے میں رکھوائی جا چکی تھی جہاں سے اُسے تجہیز و تکفین کرنے والا ادارہ لے جاتا۔ فی الحال اس نے ایک ہفتے بعد تدفین کا فیصلہ کیا تھا۔ ادارے کو تدفین کے لیے تیار کرنے کی غرض سے میت ایک دن پہلے چاہیے تھی۔ ڈوسکی کو یقین تھا کہ اس دوران میں وہ کسی نہ کسی طرح پیسے کا انتظام کر لے گا۔

ڈوسکی نے لیرا کی تدفین کے لیے جس طرح کا تابوت بنوانے اور میت کو تیار کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا، اس کے لیے پانچ ہزار ڈالرز درکار تھے۔ اس نے ادارے سے کہا تھا کہ وہ جس دن میت لائیں گے، اُسی دن وہ انہیں رقم ادا کر دے گا لیکن اب اس کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ آن کھڑا ہوا تھا کہ وہ پانچ ہزار ڈالرز کا انتظام کس طرح کر پائے گا؟

☆☆☆

البوم گارڈن وسیع و عریض سوئمنگ پول کے گرد گھوم پھر کر اس کا جائزہ لے رہا تھا۔ پانی کی سطح پر دو مردہ مینڈک اور کچھ مرے ہوئے حشرات الارض تیرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ گارڈن کی عمر ستر سال تھی۔ وہ بہت ہی موٹا آدمی تھا۔

گارٹن، ڈوسکی کا بہت پرانا دوست تھا۔ وہ دونوں ہاربر موبائل پارک کمپنی میں ملازمت کرتے تھے۔ ڈوسکی کی وجہ سے ہی ریٹائرمنٹ کے بعد گارٹن نے بھی اسی قصبے میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا۔ گارٹن، ڈوسکی کا واحد غم گسار ساتھی تھا۔

گارٹن نے شادی نہیں کی تھی اور نہ ہی اس دنیا میں اس کا کوئی اور رشتے دار تھا۔ وقت گزاری کے لیے اس نے ریٹائرڈ لوگوں کے لیے قائم کردہ قصبے کے کمیونٹی سینٹر میں ملازمت اختیار کرلی تھی۔ کمیونٹی سینٹر نے ایسے کئی کام شروع کررکھے تھے جس کی آمدنی سے نہ صرف سینٹر کے اخراجات پورے کیے جاتے بلکہ یہاں کام کرنے والے لوگوں کو اعزازیہ بھی ادا کیا جاتا تھا۔

کمیونٹی سینٹر میں ایک ریستوران واقع تھا جہاں تفریح کی غرض سے آنے والے لوگوں کے کھانے پینے کا معقول بندوبست تھا۔ سینٹر کے سامنے ایک وسیع وعریض جھیل پھیلی ہوئی تھی۔ موسم گرما میں اس جھیل پر آنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی تھی۔ عموماً ہر روز تیس چالیس افراد دوسرے شہروں سے جھیل کی سیاحت، مچھلی کے شکار اور کشتی رانی کا شوق پورا کرنے کے لیے یہاں آتے تھے۔ البتہ موسم سرما میں یہاں آنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی۔ گارٹن جھیل کی سیر کو آنے والے لوگوں کو کشتی میں سیر بھی کرواتا تھا۔ کرائے کی مد میں وصول کی گئی رقم کمیونٹی سینٹر کے اکاؤنٹ میں جاتی تھی۔

یہ نومبر کا شروع تھا اور سردی ہلکی تھی۔ صبح کے دس بج رہے تھے۔ لیرا کی موت کو تیسرا دن تھا۔ اس کی تدفین میں صرف چار دن باقی رہ گئے تھے مگر اب تک رقم کا انتظام نہیں ہو پایا تھا۔ ڈوسکی ہر طرف سے مایوس ہو چکا تھا۔ صبح سویرے اسے ایک امید کی کرن نظر آئی تھی۔ اس نے سوچا کیوں نہ کسی بیمہ کمپنی سے رابطہ کیا جائے کہ وہ کسی پالیسی کے تحت تدفین کے اخراجات ادا کردیں۔ یہی سوچ کر وہ گارٹن سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ جب وہ سینٹر کے سامنے پہنچا تو اس وقت وہ کمیونٹی سینٹر کے سوئمنگ پول کا جائزہ لے رہا تھا۔

''تم صبح صبح کیسے آدھمکے؟'' گارٹن نے اسے دیکھتے ہی کہا۔

''بتاتا ہوں۔'' ڈوسکی نے کہا۔ گارٹن آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ اس کے برابر پہنچا، ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہوگئی۔

''چلو اندر چلتے ہیں۔'' گارٹن نے کہا اور پھر وہ دونوں سینٹر کے ریستوران میں آگئے۔

''صبح سویرے تو آسمان بالکل صاف تھا۔'' ڈوسکی نے جیکٹ پر پڑنے والی بوندوں کو ہاتھ سے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''ہاں... میرے خیال میں بارش تیز ہوگی۔'' گارٹن نے اوپر آسمان کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ اچانک آسمان پر گہرے سیاہ بادل چھاگئے تھے اور تھوڑی دیر بعد ہی موسلا دھار بارش شروع ہو چکی تھی۔

''بارش تو بہت تیز ہوگئی.....'' ڈوسکی نے کہا۔ موسلا دھار بارش کا رخ برآمدے کی طرف تھا۔ بارش کے پانی سے برآمدہ بھی گیلا ہو رہا تھا۔

''لگتا ہے کہ بارش طوفان میں بدل جائے گی۔'' گارٹن نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے تو سردی لگنے لگی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈوسکی نے جیکٹ کی زپ بند کی اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑنے لگا۔ ''کافی منگواتے ہیں۔'' اس نے گارٹن سے کہا۔ یہ سن کر اس نے دو کپ کافی کا آرڈر دے دیا۔

''بتاؤ... پیسے کا کچھ انتظام ہوا؟'' گارٹن نے پوچھا۔

''ابھی تک تو کچھ نہیں ہوا۔'' اس کے چہرے پر بے بسی تھی۔

''بینک والے کیا کہتے ہیں؟''

''اکاؤنٹ میں مدت سے پھوٹی کوڑی نہیں ہے۔ رہی پنشن تو وہ پہلی تاریخ کو ہی نکال لیتا ہوں...''

''مگر اوور ڈرافٹ تو لیا جاسکتا ہے۔'' گارٹن نے قطع کلامی کی۔

''میں نے یہی کہا تھا لیکن منیجر نہیں مانا۔''

''تم اسے اپنی مشکل تو بتاتے۔''

''بتائی تھی مگر اس نے یہی کہا کہ ہم تدفین کے لیے نہ تو تمہیں قرض دے سکتے ہیں اور نہ ہی اوور ڈرافٹ۔ یہ بینک کی پالیسی میں شامل نہیں ہے۔'' یہ کہتے ہوئے ڈوسکی کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

''تو اب کیا ہوگا؟'' یہ بات سن کر گارٹن بھی پریشان ہوگیا۔ ''تدفین بھی سر پر آچکی ہے۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''کچھ سوچا، کیا کرنا ہے اب؟'' گارٹن نے پریشانی سے پوچھا۔

''وہ تدفین کے لیے بیمہ کمپنی...'' ڈوسکی نے اٹکتے ہوئے کہنا شروع کیا مگر پھر چپ ہوگیا۔

''کیا مطلب... ذرا کھل کر کہو۔'' گارٹن نے اسے

خاموش ہوتے دیکھا تو چونک کر کہا۔

''میں نے سوچا ہے... بیمہ کمپنی سے بات کرتے ہیں کہ وہ کسی پالیسی کے تحت ہمیں پانچ ہزار ڈالرز دے دیں، ہم قسط ادا کرتے رہیں گے۔''

''تمہارا دماغ تو خراب نہیں ہوگیا ہے؟ بیمہ کمپنی پالیسی بیچتی ہے، پریمیم لیتی ہے اور پھر حادثہ یا واقعہ ہوتا ہے تو رقم ملتی ہے۔'' گارٹن نے اسے سمجھانا شروع کیا۔ ''یہ کیسے ممکن ہے کہ پہلے وہ تمہیں پالیسی کے عوض پوری رقم ادا کردیں اور پھر قسطیں وصول کرتے پھریں۔ تم جو بات کررہے ہو وہ سیدھا سادہ قرض کا معاملہ ہے اور کوئی بیمہ کمپنی قرض نہیں دیتی ہے۔ اس مسئلے کے لیے تمہیں اپنے بچوں کی طرف ہی دیکھنا چاہیے۔'' گارٹن نے کہا۔

''تم میرے بچوں کو نہیں جانتے۔'' ڈوسکی نے افسوس سے کہا۔

''سب جانتا ہوں۔'' گارٹن نے کہنا شروع کیا۔ ''پچھلے سال فروری میں بھی تمہاری بیٹی سے ملا تھا۔ بڑی اچھی لڑکی ہے وہ۔ اس کی شادی تو پروفیسر سے ہوئی ہے نا..... ذرا بات تو کر کے دیکھو۔''

''ہاں..... مگر پروفیسر کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی کہ وہ تدفین کے اخراجات برداشت کرسکے۔''

''اور بیٹا.....''

''اس کی حالت تو اور بھی خستہ ہے۔ وہ یہاں اپنے آنے جانے کے اخراجات اٹھالے تو یہی بڑی بات ہوگی۔'' ڈوسکی نے کہنا شروع کیا۔ ''تدفین کا وقت جیسے جیسے قریب آرہا ہے، میری تو پریشانی بڑھتی جارہی ہے۔ اب اگر انشورنس کمپنی.....'' اس نے جان بوجھ کر اپنی بات پھر ادھوری چھوڑ دی اور خاموشی سے کھڑکی سے باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس کے چہرے پر پریشانی کے آثار تھے۔ موسلا دھار بارش کے باعث برآمدے میں بھی پانی نظر آرہا تھا، البتہ بارش تھم چکی تھی۔

ڈوسکی بوڑھا آدمی تھا۔ بیوی کی لاش سرد خانے میں تھی۔ تدفین کے وقت کا اعلان کیا جاچکا تھا مگر اب تک اس کے پاس اخراجات ادا کرنے کے لیے رقم نہیں تھی۔ اس کی بیٹی اور بیٹا بھی مالی لحاظ سے اتنے آسودہ حال نہیں تھے کہ وہ یہ خرچ ادا کرسکیں۔ خود گارٹن بھی بے چارہ پنشن پر گزر بسر کررہا تھا۔ ڈوسکی کا کوئی اور دوست، رشتے دار ایسا نہیں تھا جس سے وہ اتنی بڑی رقم قرض لے سکتا۔ اس کی مشکل کسی بھی طرح حل نہیں ہو پارہی تھی۔ اسے کوئی راہ نہیں سوجھ رہی تھی۔

''ایک حل ہے.....'' کافی دیر بعد گارٹن نے خاموشی توڑی۔

''کیا؟'' ڈوسکی کی آنکھوں میں چمک آگئی۔

''کیوں نا چرچ سے درخواست کی جائے کہ وہ.....''

''کبھی نہیں.....'' یہ سنتے ہی ڈوسکی کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ ''میرے جیتے جی ایسا نہیں ہوسکتا۔ وہ میری محبوبہ تھی اور میں اسے شان دار طریقے سے آخری سفر پر روانہ کروں گا۔'' اس کے لہجے میں عزم نظر آرہا تھا۔

''مگر رقم.....''

''میں انتظام کرلوں گا، چاہے مجھے کچھ بھی کیوں نہ کرنا پڑے.... مگر جو تم کہہ رہے ہو ایسا کبھی نہیں ہوگا۔'' اس نے گارٹن کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی کرلو گے؟'' گارٹن نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں.... لیرا کی خوشی کے لیے اُس کی زندگی میں سب کچھ کیا اور اب جبکہ یہ آخری بار ہے تو کیا میں یونہی ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں گا۔'' وہ نہایت سنجیدہ نظر آرہا تھا۔ ''ایک بات طے ہے۔ لیرا کی تدفین نہایت اہتمام سے ہوگی اور تابوت بھی نہایت خوبصورت اور قیمتی ہوگا۔''

''مگر پیسے.....'' گارٹن نے اسے خیالوں سے حقیقت کی دنیا میں واپس لانا چاہا۔

''وہ بھی آجائیں گے۔''

''کہاں سے آئیں گے؟ کیا بینک لوٹو گے؟''

''ضرورت پڑی تو یہ بھی کر گزروں گا۔'' اس نے گارٹن کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے کہا۔ ''تم تو میری ہمت جانتے ہی ہو۔''

''ہاں۔'' گارٹن نے آہستہ سے کہا۔ ''تم اب تک پہلے جیسے ہی ہو..... ضدی، ہٹ دھرم اور بنا سوچے سمجھے کر گزرنے والے۔ مجھے یاد ہے وہ واقعہ۔''

''کون سا واقعہ؟'' ڈوسکی نے چونکتے ہوئے کہا۔

''جب تم یہ حقیقت تسلیم کیے بنا کہ تمہیں تیرنا نہیں آتا، بچے کو ڈوبنے سے بچانے کے لیے پانی میں کود پڑے تھے۔''

''مگر بچے کو تو پھر بھی بچا لیا تھا نا۔'' وہ مسکرایا۔ ''ویسے چاہنے کے باوجود تیرنا تو آج تک مجھے نہیں آیا۔''

''خیر..... چھوڑو اس بات کو۔ بچے کو تم نے نہیں بچایا تھا۔''

''تو پھر کس نے بچایا تھا؟'' ڈوسکی نے اس کی بات

کاٹتے ہوئے کہا۔

''تم جو لائف جیکٹ پہنے ہوئے تھے، اُس نے تم دونوں کو بچایا تھا۔'' گارٹن نے مسکراتے ہوئے کہا۔

لیرا کی تدفین کے لیے اخراجات پر ہونے والی گفتگو نے ماحول پر نہایت سنجیدگی طاری کردی تھی لیکن گارٹن نے نہایت عقل مندی سے کام لیتے ہوئے ماحول پر چھایا ہوا تناؤ ختم کردیا۔ اس بات سے ڈوسکی کی توجہ بھی کچھ دیر کے لیے بٹ گئی۔ یوں اس پر طاری ذہنی دباؤ بھی کسی حد تک کم ہوگیا۔

''بارش رُک چکی ہے۔ کیا خیال ہے ایک، ایک کپ کافی اور پی لیں پھر چلتے ہیں؟'' گارٹن نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے۔'' ڈوسکی نے جواب دیا۔ ''ویسے کیا کام کرنا ہے اب ہمیں؟ چلو میرے گھر چلتے ہیں۔''

''ابھی نہیں، یہ سوئمنگ پول ہر حال میں آج ہی صاف کرنا ہے، منیجر کا حکم ہے۔ ویسے بھی کل کچھ خاص لوگ یہاں آرہے ہیں۔''

''کون لوگ ہیں؟'' ڈوسکی نے پوچھا۔

''فیڈرل ویلفیئر ڈپارٹمنٹ والے ہیں اور ان کے ساتھ کچھ این جی اوز کے لوگ ہوں گے۔'' گارٹن نے بے یقینی سے بتایا۔

کافی پینے کے بعد وہ دونوں اٹھے۔ ابھی وہ ریستوران سے نکلے ہی تھے کہ منیجر آتا ہوا دکھائی دیا۔ ''اے گارٹن ..... میں تمہاری طرف ہی آرہا تھا۔'' جیسے ہی اس کی نظر اُس پر پڑی، وہ چلّایا۔

''خیریت تو ہے مسٹر رابنسن؟'' گارٹن نے پوچھا۔ اتنی دیر میں وہ اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد بھی تھا۔ اس نے بیس بال کیپ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں جوگرز تھے۔ ٹی شرٹ کے اوپر سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہنی ہوئی تھی۔ اس کے کاندھے پر سیاہ تھیلا لٹک رہا تھا۔ حلیے سے وہ ایسا شخص نظر آرہا تھا جو مدتوں بعد مضمحل اعصاب کو سکون پہنچانے کے لیے اکیلا چھٹیاں گزارنے کے لیے گھر سے نکلا ہو۔ ویسے ڈوسکی کو وہ پہلی ہی نظر میں بیمار محسوس ہوا تھا۔

''یہ مسٹر ایڈورڈ ہیں۔ جھیل کی سیر کرنے کے لیے خاص طور پر یہاں آئے ہیں۔'' منیجر نے اپنے ساتھ آنے والے شخص کا تعارف گارٹن سے کرواتے ہوئے کہنا شروع کیا۔ ''بتا رہے تھے کہ وہ بہت پہلے اس جھیل پر آئے تھے اپنے والدین کے ساتھ۔ پچیس تیس برس بعد اب ایک بار پھر وہ اپنے بچپن کی یادیں تازہ کرنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ شام کو انہیں واپس جانا ہے۔ یہ چاہتے ہیں کہ کشتی پر ایک دو گھنٹے گھومتے ہوئے گزار دیں۔''

''بہت اچھا..... مگر اس سلسلے میں، میں ان کی کیا مدد کرسکتا ہوں؟'' گارٹن نے سوال کیا۔

''بوٹ مین چھٹی پر ہے۔ ویسے بھی یہ آف سیزن ہے۔ یہاں کوئی اور ایسا نہیں کہ جو بوٹ چلا سکے۔ بہتر ہے کہ تم انہیں سیر کرادو۔''

''وہ تو ٹھیک ہے مگر میں نے سوئمنگ پول اب تک صاف نہیں کیا ہے۔ مجھے تو اُس میں ہی سارا دن لگ جائے گا۔'' اس نے منیجر کو مخاطب کر کے کہا۔ یہ سن کر اس نے سر پکڑ لیا۔ وہ آدمی بھی پریشان نظر آنے لگا۔ اچانک منیجر کی نظر ڈوسکی پر پڑی۔

''آپ کو بھی تو بوٹ چلانا آتی ہے۔ پلیز! آپ ہی انہیں گھما لائیں۔'' منیجر نے اس کی طرف التجا بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یہ آپ کی مہربانی ہوگی۔'' منیجر کی بات سُن کر ڈوسکی سوچ میں پڑ گیا لیکن جب ایڈورڈ نے یہ کہا تو اس کا دل فوراً پسیج گیا۔

''چلیے .....'' اس نے ان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہے ڈوسکی ..... تم جاؤ۔ میں تو چلا سوئمنگ پول صاف کرنے۔'' یہ کہہ کر گارٹن مست ہاتھی کی طرح جھومتا ہوا چل دیا۔ ڈوسکی منیجر اور مہمان کے ساتھ ساتھ بوٹ کی طرف چل پڑا۔

آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ بارش کے بعد ہوا میں عجیب طرح کی مسحور کُن خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔ چھوٹے سے انجن والی کشتی پر ایڈورڈ اور ڈوسکی بیٹھے ہوئے تھے۔ کشتی کا انجن بند تھا اور وہ پانی پر ڈولتی ہوئی جارہی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جھیل میں تھوڑا آگے بڑھا تھا، تب ہی ایڈورڈ نے یہ کہہ کر انجن بند کروادیا تھا کہ کشتی چپوؤں کے ذریعے ہی چلائی جائے۔ انجن کی آواز نہ صرف کانوں کو بُری لگ رہی ہے بلکہ اس سے اُس کا ذہنی سکون بھی خراب ہورہا ہے۔ ڈوسکی نے اس کی بات مانتے ہوئے انجن بند کردیا۔ اب جھیل کے پانی پر یہ تنہا کشتی ڈول رہی تھی۔

جھیل کا خوب صورت ماحول ڈوسکی کے ذہن پر بہت اچھا اثر ڈال رہا تھا۔ بیوی کی موت اور تدفین کے مسائل کے باعث وہ کئی روز سے ذہنی طور پر سخت پریشان تھا لیکن اس وقت دل فریب موسم نے اس کی طبیعت پر خاصا خوش گوار اثر کیا تھا۔ قدرتی نظارے اور پانی سے ٹکراتی ہوا کی آواز اُسے

بہت بھلی لگ رہی تھی۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور ایڈورڈ پر نظر ڈالی۔ وہ نہایت انہماک سے پانی کو دیکھ رہا تھا۔ ''کیسا لگ رہا ہے یہ سب کچھ؟'' ڈوسکی نے چپو چلاتے ہوئے اشتیاق سے پوچھا۔

''بہت اچھا..... اس وقت مجھے وہ لمحے یاد آرہے ہیں جب میں پہلی بار اپنے والدین کے ساتھ یہاں چھٹیوں کے کچھ دن بتانے کے لیے آیا تھا۔'' اس کا لہجہ کھویا کھویا سا تھا۔ چہرے پر طمانیت اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ تھی جیسے کہ وہ اپنی نظروں کے سامنے کچھ ایسا دیکھ کر دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے جسے شاید وہ مدتوں بعد آج دیکھ پایا تھا۔

''لگتا ہے کہ بہت ہی خاص یادیں وابستہ ہیں اس جھیل سے۔'' ڈوسکی نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''کچھ ایسا ہی ہے۔'' اس نے چونک کر گہری سانس لی اور چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری بہت پرانی خواہش تھی کہ اس جھیل کی سطح پر کئی گھنٹے تنہا گزاروں، اپنی یادیں تازہ کروں اور بس.....'' یہ کہہ کر وہ رُکا اور کچھ دیر تک سوچتا رہا۔ پھر اس نے سر اٹھایا اور ڈوسکی کی طرف دیکھتے ہوئے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔ ''مگر بہت دیر کر دی یہاں آنے میں۔''

''دیر کیوں کی یہاں آنے میں؟'' ڈوسکی نے پوچھا۔

اس کے ساتھ بیٹھ کر وہ بھی کچھ دیر کے لیے اپنی ساری پریشانیاں اور لیرا کی موت کا دکھ بھلا چکا تھا۔ ''ہر بار یہ سوچ کر ٹالتا رہا کہ کرلوں گا، چلا جاؤں گا..... مگر جب پتا چلا کہ اب جانا ٹھہر گیا ہے تو بتانا تاخیر کیے چلا آیا۔''

''کسی اور ملک میں جا کر آباد ہونے والے ہو؟'' ڈوسکی نے استفسار یہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے۔

''ہاں.....'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''بہت دور ایک ملک ہے، وہاں جا کر رہنے والا ہوں۔'' اس نے مسکرا کر کہا لیکن اس کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

''کہاں ہے یہ ملک؟'' ڈوسکی جہاں دیدہ شخص تھا۔ اس کے لہجے میں پوشیدہ درد کو بھانپ گیا۔ اسی لیے اُس نے حیرت سے پوچھا۔

''تم کچھ دیر کے لیے چپو چلانا بند کردو۔'' اس نے سنی اَن سنی کرتے ہوئے نرم لہجے میں حکم دیا۔ ''بس..... یہاں کشتی روک لو۔ میں کچھ دیر کے لیے یہاں سکون سے رکنا چاہتا ہوں۔''

''او کے.....'' ڈوسکی نے چپو اٹھائے اور کشتی کے اندر رکھ لیے۔ یہ ایک چھوٹی سی کشتی تھی جس میں چار آدمیوں کے بیٹھنے کی گنجائش تھی۔ وہ چپو رکھ کر سکون سے بیٹھ گیا۔ ایڈورڈ اُس سے چند فٹ کی دوری پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ نہایت اشتیاق بھری نظروں سے آسمان کو تک رہا تھا۔ بارش کے بعد ایک بار پھر سورج نکل آیا تھا لیکن اس کے باوجود اب بھی نیلے نیلے آسمان پر کہیں کہیں ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ منظر نہایت دلکش تھا۔ ڈوسکی بھی ماحول سے لطف اندوز ہونے لگا۔

کافی دیر تک دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ گرمیوں کے موسم میں عموماً روزانہ جھیل پر خاصا رش رہتا تھا۔ اگر گرمیاں ہوتیں تو اس وقت جھیل پر درجنوں کشتیاں تیر رہی ہوتیں لیکن اس وقت وہاں دور دور تک کوئی کشتی نظر نہیں آرہی تھی۔ اچانک ایڈورڈ نے اپنی لائف جیکٹ اتار دی۔ اب وہ صرف ٹی شرٹ میں تھا۔ ''کیا ہوا..... کیوں اُتار دیا اسے؟'' ڈوسکی نے حیرت سے پوچھا۔

''اُلجھن ہو رہی تھی۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

یہ دیکھ کر ڈوسکی پریشان ہوگیا۔ جھیل انتظامیہ کے قواعد کے مطابق سیاح کو کشتی میں بیٹھے ہونے کی صورت میں لائف جیکٹ پہنے رکھنا لازمی تھا۔ اسے جیکٹ اتارتا دیکھ کر ڈوسکی تھوڑا سا ڈر گیا تھا، تبھی اس نے پوچھ لیا۔ ''تمہیں تیرنا تو آتا ہے نا؟''

''نہیں.....'' اس نے بڑے سکون سے جواب دیا اور تھوڑا سا جھک کر پانی میں اپنا ہاتھ ڈال کر چپو کی طرح چلانے لگا۔

''تمہیں تیرنا نہیں آتا تو اسے پہن لو ورنہ کوئی حادثہ پیش آگیا تو تم ڈوب کر مر بھی سکتے ہو۔'' اس کے لہجے میں تنبیہ تھی۔ ''مجھے بھی تیرنا نہیں آتا۔ اگر کچھ اُلٹا سیدھا ہوگیا تو دونوں مارے جائیں گے۔''

''مگر تم نے تو لائف جیکٹ پہنی ہوئی ہے۔'' اس نے ڈوسکی کی طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''مجھے ڈوب کر مرنے سے ڈر لگتا ہے۔''

''مگر مجھے موت سے ڈر نہیں لگتا۔'' اس نے ڈوسکی کے چہرے پر نظریں گڑاتے ہوئے کہا۔ ''ویسے بھی مجھے اب کسی قسم کی لائف جیکٹ مرنے سے نہیں بچا سکتی۔ البتہ تمہاری بات دوسری ہے۔ تم اسے پہنے رہو۔'' اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نظر آرہی تھی۔

''تم مجھے کچھ پریشان لگتے ہو؟'' ڈوسکی نے کہا۔

''ہوسکتا ہے کہ تم بھی پریشان ہو۔ کون سا ایسا شخص ہے جو پریشان نہیں۔'' اس نے خلا میں گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی زندگی بھر طرح طرح کی پریشانیوں میں گھرا رہا ہوں مگر

اب یہ سمجھ میں آیا کہ وہ سب کچھ فضول تھا۔''

''تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے کہ میں پریشان ہوں لیکن.....''

''لیکن تمہیں میری بات سمجھ نہیں آرہی۔'' یہ کہہ کر وہ ہنس دیا۔

''شاید نہیں.....'' ڈوسکی نے کہا۔ ''یہ بھی ہوسکتا ہے کہ تم نے غلط کہا ہو۔''

''چھوڑو یہ باتیں۔'' اس نے اپنا ہینڈ بیگ کھولتے ہوئے کہا۔ بیگ کے اندر سے اس نے سگریٹ کا پیکٹ اور لائٹر نکال کر باہر رکھا اور پھر بیگ کے اندر ہاتھ ڈال دیا۔ جب اس کا ہاتھ باہر آیا تو اس میں بٹوا دبا ہوا تھا۔ اس نے بٹوے کے اندر کچھ تلاش کرنا شروع کیا۔ ڈوسکی کی نظریں اس پر جمی ہوئی تھیں۔ اس نے کچھ دیر تک تو کوشش کی اور پھر بٹوے کی ہر چیز نکال کر باہر رکھنے لگا۔ ڈوسکی نے دیکھا کہ اس کے بٹوے میں ڈالرز بھرے ہوئے تھے۔ آخر اس کے چہرے پر پھر مسکراہٹ آگئی۔ اس نے بٹوے کی ایک جیب سے پلاسٹک میں لپٹی کوئی شے نکالی۔ یہ ایک بڑی گولی جتنی کوئی چیز تھی۔ اس کے بعد اس نے ایک ایک کر کے دوبارہ سب چیزیں بٹوے میں رکھیں اور اسے تھیلے میں ڈال کر واپس اپنے قدموں کے قریب رکھ دیا۔

ڈوسکی کن انکھیوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے حیرت تھی کہ رقم سے بھرا بٹوا اُس کی جیب میں تھا لیکن پھر بھی وہ زندگی سے بیزاری کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ اسے لگ رہا تھا کہ شاید اسے کوئی بہت بڑا دکھ پہنچا ہے۔

''پیو گے؟'' وہ ایڈورڈ کی بات سن کر چونکا اور اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ''پیو گے؟'' اس نے سگریٹ اس کی طرف کرتے ہوئے دوبارہ پوچھا۔

''میں تمہارا کون پوچھ رہا ہے؟ میں تو کہہ رہا ہوں چرس پیو گے؟''

''نہیں.....'' ڈوسکی نے نرم لہجے میں جواب دیا۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور پھر چرس سے بھرا سگریٹ تیار کرنے لگا۔ ڈوسکی نے نظریں دوسری طرف کیں اور لاتعلقی سے سامنے دیکھنے لگا۔

کچھ دیر بعد صاف ستھری فضا میں چرس کی ناخوش گوار بو پھیل گئی۔ وقفے وقفے سے ایڈورڈ کی کھانسی کی آواز بھی سنائی دیتی رہی۔ کئی منٹ گزر گئے، تب ایڈورڈ نے پکارا۔ ''تم نے کبھی چرس پی ہے؟'' اس کے بعد اسے کھانسی کا ایک زوردار ٹھکا لگا۔

''نہیں.....'' ڈوسکی نے سادگی سے جواب دیا۔

''میں نے بھی آج پہلی بار پی ہے؟''

''کیا؟'' ڈوسکی نے حیرت سے کہا۔ ''مطلب یہ کہ تم نے اس سے پہلے کبھی چرس نہیں پی؟''

''نہیں.....'' ایڈورڈ نے کہنا شروع کیا۔ ''بس..... ایک خواہش تھی، وہ بھی برسوں سے کہ کسی دن خوش گوار موسم میں تنہا بیٹھ کر، سکون سے اس کے چند کش لے کر دیکھوں تو سہی کہ آخر یہ کیا چیز ہے۔'' اس وقت بھی رہ رہ کر اسے کھانسی کے ٹھسکے اٹھ رہے تھے۔ اس نے تھیلا کھول کر پانی کی بوتل نکالی اور چند گھونٹ پانی پیا۔

''تم خوش نصیب ہو کہ آج کے دن تمہاری دو خواہشیں پوری ہوگئیں۔'' پانی پینے کے بعد اس کی کھانسی کے ٹھسکے رُک گئے، تب ڈوسکی نے کہا۔

''یہ آخری دو خواہشیں تھیں۔'' اس نے بظاہر مسکراتے ہوئے لیکن افسوس بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' وہ اس کی معنی خیز بات سن کر چونک گیا۔

''مطلب یہ کہ میں مرنے والا ہوں۔'' ایڈورڈ کے چہرے پر افسردہ کر دینے والی مسکراہٹ طاری تھی۔

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' ڈوسکی کھسک کر اس کے قریب آگیا۔

''وہی..... جو تم نے سنا ہے۔''

''تمہارے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے جو اس عمر میں مرنے کی بات کر رہے ہو؟ میرے خیال سے تو تم ابھی صرف پینتیس چالیس سال کے ہی ہوگے۔''

''ٹھیک پہچانا۔ میری عمر ابھی صرف اڑتیس سال ہے۔''

''تو پھر..... یہ تو تمہاری جوانی کے دن ہیں۔ کھاؤ پیو اور ہر غم ہنسی میں اڑا دو۔'' ڈوسکی نے اس کی دل جوئی کرتے ہوئے کہا۔ یہ سُن کر اس نے کوئی جواب نہیں دیا اور خالی خالی نگاہوں سے آسمان کو گھورنے لگا۔

اس کی حالت دیکھ کر ڈوسکی سمجھ گیا کہ اس وقت وہ کسی شدید جذباتی صدمے سے دوچار ہے۔ ممکن ہے کہ اس کی گرل فرینڈ نے اسے چھوڑ دیا ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اس کی بیوی بھاگ گئی ہو یا پھر اس نے طلاق لے لی ہو۔ ممکن ہے کہ اس کی نوکری ختم ہوگئی ہو۔ ہوسکتا ہے کہ اسے کاروبار میں بدترین خسارہ ہوا ہو جس کی وجہ سے وہ زندگی سے بیزار ہو کر ایسی باتیں کر رہا ہے۔ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ اس نے اپنے دل میں

سوچا۔ مجھے اس کی دل جوئی کرنا چاہیے۔ اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا۔ اس وقت جھیل کی سطح بالکل سنسان تھی۔ دور دور تک نہ تو کوئی کشتی تھی اور نہ ہی انسان..... اس کی باتیں سن کر وہ دل ہی دل میں ڈر بھی رہا تھا کہ کہیں یہ اجنبی خودکشی کی نیت سے تو یہاں نہیں آیا ہے جو ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس نے جھیل میں چھلانگ لگا دی تو وہ اسے بچا بھی نہیں پائے گا۔ اسے تو خود تیرنا نہیں آتا تھا۔

''یہ جیکٹ پہن لو۔'' اچانک ڈوسکی کے ذہن میں ایک جھماکا ہوا۔ اگر وہ پانی میں چھلانگ لگا دیتا تو اس کا بچنا محال تھا۔ وہ خود ہی اسے یہ بتا چکا تھا کہ اسے تیرنا نہیں آتا ہے۔ یہ خیال آتے ہی اس نے جیکٹ اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

''یہ لو، اسے پہن لو۔'' اس نے بڑی اپنائیت سے کہا۔

''رہنے دو۔ روح میں سرسراہٹ پیدا کرتی یہ ہوا مجھے اچھی لگ رہی ہے۔'' اس نے ہاتھ کے اشارے سے جیکٹ کو دور کرتے ہوئے کہا۔ ابھی اس نے یہ بات کہی تھی کہ اچانک ایک سرد ہوا کا جھونکا آیا۔ اس نے جھرجھری لے کر دونوں ہاتھ سینے پر باندھ لیے۔

''جیسے تمہاری مرضی۔'' ڈوسکی نے جیکٹ رکھتے ہوئے کہا۔

''ناراض کیوں ہو رہے ہو؟'' وہ ڈوسکی کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر بھانپ گیا کہ وہ اس کی بات پر کچھ خفا ہوا ہے۔ ''میں تو بس ذرا اس موسم سے لطف اندوز ہونے کے لیے اس کو نہیں پہننا چاہ رہا ہوں۔ ویسے بھی یہ پہن کر ایسا لگتا ہے جیسے انسان خطرات کے سمندر میں داخل تو ہونا چاہتا ہے لیکن اس بات کی ضمانت کے ساتھ کہ وہ ہر خطرے سے سو فیصد محفوظ رہے گا۔''

''لگتا ہے کہ تم بہت پڑھے لکھے ہو۔''

''یہ کوئی خاص بات نہیں ہے۔'' اس نے ہنس کر بات ٹال دی۔

''ایک گھنٹے سے میں تمہارے ساتھ ہوں مگر اب تک یہ سمجھ نہیں پایا کہ تمہاری شخصیت کس وجہ سے اس تناؤ کا شکار ہے؟'' آخر وہ اپنے دل کی بات زبان پر لے آیا۔ ''مجھے دیکھو..... میں بھی اس وقت ایک شدید نوعیت کے مسئلے سے دوچار ہوں لیکن پھر بھی تمہیں سیر کروانے کے لیے یہاں آ گیا ہوں۔ مُردہ خانے میں میری بیوی کی لاش پڑی ہے۔ اتوار کو اس کی تدفین ہے.....''

''یہ کوئی خاص بات نہیں..... میں اور تم بھی کسی دن یونہی مردہ خانے میں پڑے ہوئے دفنائے جانے کے منتظر ہوں گے۔''

''تم تو یہ بات یوں کہہ رہے ہو جیسے کسی کا مر جانا کوئی بات ہی نہیں ہے۔'' ڈوسکی نے فوراً جواب دیا۔

''تمہیں اگلے برس تک جینے کی امید ہے؟'' اچانک ایڈورڈ نے الٹا کھا سوال کر دیا۔ وہ سٹپٹا گیا۔

''امید تو ہے۔'' کافی دیر سوچنے کے بعد ڈوسکی نے جواب دیا۔

''یہی وجہ ہے کہ تم اپنی بیوی کی موت کا ذکر اس درد بھرے لہجے میں کر رہے ہو۔'' ایڈورڈ نے الجھے الجھے لہجے میں کہا۔ ''جب تمہیں اپنی موت کا وقت معلوم ہو جائے گا تو پھر تم کسی کی موت پر افسردہ نہیں ہو گے۔'' یہ کہہ کر وہ اس کے چہرے کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔

''اگر ناراض نہ ہو تو کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ تمہارے ساتھ ایسا کیا غلط ہوا ہے کہ تم زندگی سے اتنے بیزار دکھائی دے رہے ہو؟'' کافی دیر بعد ڈوسکی نے ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں اس سے سوال کیا۔

''میں مرنے والا ہوں.....'' اس نے یہ سنتے ہی اتنی جلدی کہا کہ ڈوسکی سمجھ بھی نہ پایا کہ وہ کیا کہہ گیا ہے۔

''اوہ میرے خدا..... نہیں تم.....''

''تم غلط سوچ رہے ہو میرے دوست۔'' اس نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ''میں نہ تو زندگی سے بیزار ہوں اور نہ ہی اپنے ہاتھوں اس کا خاتمہ کرنا چاہتا ہوں.....''

''تو پھر؟'' ڈوسکی نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

''مجھے خون کا کینسر ہے اور میں زیادہ سے زیادہ ہفتہ دس دن یا پھر شاید ایک مہینے کا مہمان ہوں اس دنیا میں۔''

''اوہ خدایا.....'' اس کی بات سنتے ہی ڈوسکی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آ بیٹھا اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا مگر منہ سے کچھ نہ بولا۔ اسے لیرا کے وہ آخری الفاظ یاد آ گئے جو مرنے سے کچھ دیر پہلے اس نے نہایت حسرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہے تھے..... ''کیا میں مر رہی ہوں؟''

ڈوسکی اس کو تسلی دینا چاہتا تھا لیکن وہ اس سے کیسے کہہ سکتا تھا کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ وہ ''ہونی'' کو جھوٹی تسلی دے کر کیسے ''انہونی'' کر سکتا تھا۔ وہ اس سے کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کے پاس الفاظ نہیں تھے۔ وہ بولنا چاہتا تھا لیکن اسے لگا جیسے اس کی گویائی کی طاقت سلب کی جا چکی ہو..... وہ دونوں بالکل خاموش تھے۔ ہوا چلنا بند ہو گئی تھی۔ پانی ساکت تھا اور ماحول یک لخت افسردہ ہو چکا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور ایڈورڈ کے سامنے بیٹھ گیا۔ پھر

اس نے اپنی ساری ہمت مجتمع کی اور دھیمے لہجے میں کہا۔ ''یہ سب کچھ کیسے ہوا؟''

''معلوم نہیں.....'' ایڈورڈ نے بھی آہستہ سے جواب دیا۔ کافی دیر تک دونوں خاموش رہے۔ آخر اس نے بتانا شروع کیا۔ ''میں نیویارک کے ایک بینک میں اعلیٰ عہدے پر کام کرتا ہوں۔ یہ کوئی دو ماہ پہلے کی بات ہو گی۔ مہینا بھر پہلے اچانک طبیعت مضمحل رہنے لگی۔ میں اکیلا رہتا ہوں۔ بیوی بچے نہیں ہیں۔ پہلے تو سمجھا کہ شاید کام کاج کی زیادتی اور کسی دوست کے نہ ہونے کی وجہ سے ڈپریشن کا شکار ہوا ہوں لیکن جب طبیعت میں مسلسل گراوٹ رہنے لگی تو ڈاکٹر کے پاس گیا۔ بہت سارے ٹیسٹ ہوئے۔ آخر انہوں نے یہ بتایا کہ مجھے خون کا کینسر ہو گیا ہے جو آخری اسٹیج پر ہے اور اب میں شاید کچھ ہی دنوں کا مہمان ہوں۔'' اس نے ایک سرد آہ بھری اور جھک کر پانی میں ہاتھ ڈال دیا۔ اسے چپو کی طرح چلانے لگا۔

''مجھے شدید افسوس ہوا یہ سن کر۔''

''مجھے بھی ہوا تھا یہ بات سن کر.....'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''مگر اب تو جانا ٹھہر گیا ہے پھر کس چیز کا افسوس۔''

''اب تم کہاں جاؤ گے؟''

''ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ میں اسپتال میں داخل ہو جاؤں تاکہ اپنی آخری سانسیں گن سکوں۔''

''کتنے دن باقی بچے ہیں؟'' ڈوسکی نے تاسف بھرے لہجے میں کہا۔

''ہفتہ، دس دن۔'' اس نے بدستور پانی میں ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ ''یہاں دوبارہ آنے کی بہت خواہش تھی۔ آج بہت خوش ہوں کہ یہ خواہش پوری ہو گئی۔ بس..... آج رات ہی نیویارک کے لیے نکل جاؤں گا۔ پرسوں صبح اسپتال میں داخل ہونا ہے۔'' وہ اپنی دھن میں کہے چلا جا رہا تھا۔ ''ڈاکٹر چاہتے ہیں کہ موت کے آخری لمحات میں ان کی دوائیں شاید میری تکلیف کو کچھ کم کر دیں گی ورنہ تو اسپتال کے بیڈ پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنا میرے نزدیک ویسا ہی ہے جیسے کسی کو موت کا انتظار کروانے کے لیے سزا سے کئی دن پہلے الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر، اسے اکیلا چھوڑ دیا جائے۔'' اسی لمحے اسے ایک بار پھر کھانسی کا ٹھکا لگا۔ اس نے پانی سے ہاتھ باہر نکالا۔ ڈوسکی نے آگے بڑھ کر اسے پانی کی بوتل پکڑا دی۔ اس نے دو گھونٹ پانی پیا اور ایک بار پھر کشتی کے کنارے سے اپنا اوپری دھڑ باہر کر کے جھکا اور پانی میں ہاتھ ڈال کر چپو کی طرح چلانے لگا۔

ڈوسکی خاموشی سے بیٹھا ہوا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ اسے ایڈورڈ سے شدید ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اتنی کم عمری میں ہی یہ موت کے منہ میں جا رہا ہے۔ بیڈ پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنے والی بات سن کر اسے ایک بار پھر لیرا یاد آ گئی۔ اس نے دس برس نہایت بے بسی کے عالم میں بستر پر لیٹ کر زندگی کی خواہش کے پردے میں موت کا انتظار کیا تھا۔ لیرا کا خیال آتے ہی اس کا دل صدمے سے پھٹنے لگا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔

کافی دیر بعد ڈوسکی نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ ایڈورڈ بدستور جھکا ہوا پانی سے کھیل رہا ہے۔ اس نے اسے متوجہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس نے ایک بار پھر آنکھیں موند لیں اور کچھ سوچنے لگا۔ کافی دیر تک اس کے دل و دماغ میں شدید کشمکش طاری رہی۔ اس کے دماغ میں رہ رہ کر ایڈورڈ کی باتیں گونج رہی تھیں اور لیرا کا خیال آ رہا تھا۔ آخر اس نے ہمت کر کے آنکھیں کھولیں۔ ایڈورڈ بدستور اپنے کھیل میں مگن تھا۔ اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ انہیں جھیل میں گھومتے ہوئے دو گھنٹے ہونے والے تھے۔ کشتی بیچ جھیل میں رکی ہوئی تھی۔ اس نے چپو اٹھائے۔ اچانک ''شراپ'' کی آواز گونجی۔ ایڈورڈ جھیل میں گر گیا تھا۔ ڈوسکی اپنی جگہ سے اٹھ کر اس طرف آیا جہاں ایڈورڈ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے پانی کی سطح پر دیکھا۔ ایک بلبلہ سطحِ آب پر نمودار ہوا اور پھر اگلے ہی لمحے غائب ہو گیا۔ کچھ دیر بعد دوبارہ اس کا سر پانی کی سطح پر نمودار ہوا۔ اس بار ڈوسکی نے اس کی طرف لائف جیکٹ اچھال دی لیکن یہ کوشش بے سود رہی۔ وہ ایک بار پھر پانی کے نیچے چلا گیا۔ ڈوسکی نے کشتی کا انجن اسٹارٹ کیا۔ جس جگہ وہ گرا تھا، وہاں دیکھا اور پھر آہستہ سے کہا۔ ''معاف کرنا دوست، ویسے بھی مجھے تیرنا نہیں آتا۔'' یہ کہہ کر اس نے کشتی کا رخ موڑا اور سینٹر کی طرف جانے لگا۔

تقریباً ایک گھنٹے کے بعد ایڈورڈ کی لاش جھیل سے نکالی جا چکی تھی۔ پولیس نے لاش کو مُردہ خانے منتقل کیا۔ ڈوسکی نے پولیس کو جو بیان دیا تھا، اس کے مطابق وہ جائے حادثہ پر لگ بھگ ڈیڑھ دو گھنٹے سے موجود تھے۔ اس نے پولیس کو یہ بھی بتایا کہ اس نے لائف جیکٹ اتار دی تھی اور اس کے اصرار کے باوجود اسے پہننے سے انکاری رہا۔ سینٹر کے منیجر نے بیان دیا کہ ڈوسکی یہاں اپنے دوست سے ملنے کے لیے آیا تھا اور میرے اصرار پر وہ مہمان کو سیر کروانے لے گیا۔

یہ سیدھا سادہ حادثہ تھا۔ کشتی میں اس کے ملنے والے بیگ سے پولیس کو بیس ہزار ڈالرز، اس کے شناختی کاغذات اور اسپتال کی رپورٹیں ملیں جن سے تصدیق ہوتی تھی کہ وہ

صرف چند دنوں کا مہمان تھا۔

دو دن تک تفتیش جاری رہی۔ پولیس نے نیویارک میں بھی متعدد رابطے کیے تاہم اس کے کسی وارث کا کوئی سراغ نہ مل سکا۔ بالآخر پولیس نے کیس کو اتفاقی حادثہ قرار دے کر تفتیش بند کی اور اس کے پاس سے ملنے والی رقم قصبے کے سینٹ ولیم چرچ کو دے کر، انہیں اس کی شان دار تدفین کی ذمے داری سونپی۔ تدفین اتوار کی سہ پہر کو ہونی تھی۔

☆☆☆

حادثے کو تیسرا دن تھا۔ لیرا کی تدفین کی تیاریوں کے باعث ڈوبکی بہت مصروف ہو چکا تھا۔ تدفین میں شرکت کے لیے اس کی بیٹی، داماد اور بیٹے سمیت کئی قریبی رشتے دار پہنچ چکے تھے۔ دوسری طرف میت کے لیے تابوت بنایا جا رہا تھا۔ ڈوبکی اپنی نگرانی میں تابوت تیار کروا رہا تھا۔ اس دوران میں ایک بار بھی نہ تو گارٹن اس سے ملنے آیا اور نہ ہی اس نے اُسے فون کیا۔

آخر تدفین کا دن آ پہنچا۔

اتوار کے دن صبح سویرے سے ہی اس کے گھر میں خاصی چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب میت کو گھر پر لایا گیا۔ جس نے بھی میت کو دیکھا، اس نے ڈوبکی کی تعریف کی کہ اس نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر خرچ کیا ہے۔

اتوار کے دن دوپہر کا وقت تھا، جب لیرا کی تدفین کے بعد قصبے کے باہر سے آنے والے تمام مہمان اور عزیز و اقارب گھر لوٹ آئے لیکن ڈوبکی کا کہیں پتا نہیں تھا۔ کوئی یہ بات نہیں جانتا تھا کہ وہ قبرستان سے سیدھا سینٹ ولیم چرچ چلا گیا تھا۔

ڈوبکی جب چرچ میں پہنچا تو وہاں گنتی کے ہی چند لوگ موجود تھے۔ پادری فادر آلمنڈ آخری رسومات ادا کروا رہا تھا۔ ڈوبکی کو دیکھتے ہی ان کے لبوں پر ہلکی سے مسکراہٹ آ گئی۔ دراصل اس نے فادر کو حادثے کی روداد بتا کر پہلے ہی درخواست کی تھی کہ وہ بطور وارث نہ صرف تدفین کے امور کی انجام دہی کی نگرانی کرے گا بلکہ اس کی تدفین بھی ایسے ہی انجام دے گا جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کی کر سکتا ہے۔ ویسے بھی مرنے والا اس کے بیٹے کی عمر کا ہی تھا۔

شام کے چار بجے تھے جب ڈوبکی گھر لوٹا۔ مہمان واپس جانا شروع ہو گئے تھے۔ آخر ایک ایک کر کے سب چلے گئے۔ شام تک گھر میں ڈوبکی، اس کا بیٹا، بیٹی، داماد اور گارٹن ہی رہ گئے تھے۔ گارٹن، اس گھر کے ایک فرد کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ڈوبکی اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا تھا۔ اس لیے ویسے بھی وہ اسے فی الحال تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔

ڈنر کے بعد ان پانچوں نے لیونگ روم میں بیٹھ کر کافی پی۔ اس دوران میں وہ سب لیرا کی باتیں کرتے رہے۔ رات کے ساڑھے آٹھ بج رہے تھے جب گارٹن نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ''رات کافی ہو گئی ہے۔ اب میں چلتا ہوں۔'' اس نے ڈوبکی کو مخاطب کر کے کہا۔

ڈوبکی، گارٹن کو چھوڑنے کے لیے باہر تک آیا۔ گیٹ پر پہنچ کر گارٹن رُکا۔ کچھ دیر تک وہ اسے سوالیہ نگاہوں سے تکتا رہا اور پھر اس سے بغل گیر ہو گیا۔ ''تم نے جیسا کہا، ویسا کر دکھایا۔ بڑی ہمت ہے تمہاری۔'' اس کی آواز رندھی ہوئی تھی۔ یہ سن کر وہ خاموش رہا۔ کچھ دیر تک گارٹن بدستور اس کے گلے سے لگا کھڑا رہا۔ آخر اس سے الگ ہوا اور ''گڈ بائے'' کہتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ ڈوبکی کی آنکھ سے دو آنسو ڈھلک گئے۔ اس نے آستین سے آنکھیں صاف کیں اور پھر مرے مرے قدموں سے چلتا ہوا گھر میں آ گیا۔

☆☆☆

ڈوبکی گھر میں تنہا رہ گیا تھا۔ تدفین کے بعد بیٹی، داماد اور بیٹا واپس جا چکے تھے۔ وہ کئی دن سے گارٹن سے بھی نہیں ملا تھا۔ وہ بھی اُس رات کے بعد سے گھر پر نہیں آیا تھا۔ دن کے گیارہ بج رہے تھے جب وہ گارٹن سے ملنے کے لیے کمیونٹی سینٹر پہنچا۔ وہ اس کی تلاش میں اِدھر اُدھر نظریں گھماتا ہوا ریستوران کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ وہ اسے برآمدے میں ..... کرسی پر آنکھیں موندے ہوئے نیم دراز نظر آ گیا۔

''اے موٹے.....'' ڈوبکی نے اسے دیکھتے ہی چلا کر کہا۔ یہ سنتے ہی اس نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھ سے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر بعد دونوں ریستوران کے اندر بیٹھے ہوئے کافی پی رہے تھے۔ گارٹن کچھ بجھا بجھا سا نظر آ رہا تھا لیکن ڈوبکی اس کی حالت کو نظر انداز کرتا رہا۔

''اور سناؤ..... اب کیا مصروفیات ہیں؟'' گارٹن نے کافی کا خالی مگ میز پر رکھتے ہوئے رسمی لہجے میں پوچھا۔

''لیرا کے بعد کیسی مصروفیت؟'' ڈوبکی ایک دم اداس نظر آنے لگا۔ ''گھر بالکل خالی ہو گیا ہے۔ میرا تو وقت ہی نہیں کٹتا۔ وہ ہوتی تھی تو وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چلتا تھا۔''

''تیس برس کی عادتیں، تین دن میں تو نہیں بدل سکتیں۔'' یہ سن کر گارٹن نے جواب دیا۔

''صحیح بات ہے۔'' اس نے کہا۔

''یہیں چلے آیا کرو، کم از کم کچھ مصروفیت تو رہے گی۔''

''ہاں..... ٹھیک کہتے ہو۔'' اس نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ''خیر، یہ بتاؤ کل صبح کیا کر رہے ہو؟''

''اب تک تو کچھ خاص بات نہیں ہے۔ کیوں سب خیریت تو ہے نا؟'' اس نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں..... کچھ خاص ہے یا یوں کہہ لو کہ مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے یا پڑ سکتی ہے۔''

''بتاؤ..... کیا بات ہے؟'' گارٹن نے اس کی مبہم بات سن کر پریشانی سے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''فی الحال تو کچھ نہیں بتا سکتا۔''

''تو تم کل صبح کا کیوں پوچھ رہے تھے؟'' گارٹن نے سوال کیا۔

''کل صبح تمہیں میرے گھر آنا ہوگا۔''

''آ جاؤں گا مگر بتاؤ تو سہی بات کیا ہے؟''

''یہ تو کل ہی پتا چلے گی۔'' ڈوبکی نے جواب دیا۔

''کیا نئی شادی کر رہے ہو جو اتنی رازداری برتی جا رہی ہے؟'' گارٹن نے مسکرا کر کہا۔

''تم بے تاب نہ ہو۔ کل بتا دوں گا۔ ویسے بھی میرا کون سا ایسا ہم راز ہے جو تمہیں نہیں، اُسے بتاؤں گا۔'' ڈوبکی نے مسکرا کر جواب دیا۔

''صبح کتنے بجے؟''

''جب ناشتا کر کے تیار ہو جاؤ تو گھر آ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ڈوبکی نے جواب دیا۔

''ہاں سنو.....'' ڈوبکی نے ایسے کہا جیسے اچانک اسے کوئی بات یاد آ گئی ہو۔ ''اگر میں گھر کے باہر نہ ملوں تو سیدھے بیڈ روم میں آ جانا۔ سو رہا ہوں تو جگا دینا۔''

''اتنی تاکید کیوں کر رہے ہو؟'' وہ یہ سن کر مسکرایا۔

''اس لیے کہ تم شریف آدمی ہو۔ صبح کے چار بجے ہی بستر سے نکل پڑتے ہو مگر میں ایسا نہیں ہوں۔'' ڈوبکی نے شرارت سے جواب دیا۔ ''ویسے بھی جلدی اٹھ کر کیا کروں گا؟''

''اور اگر موصوف بستر پر بھی نہ ملے تو کیا کروں؟ یہ بھی سمجھا دیں۔''

''پھر بیڈ کی سائڈ ٹیبل پر دیکھ لینا۔ تمہارے لیے پیغام لکھ کر چھوڑ جاؤں گا کہ تمہیں اب کیا کرنا ہوگا۔'' اس نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ ''فی الحال تو میں چلتا ہوں۔ ایک دو ضروری کام نمٹانے ہیں۔'' یہ کہہ کر ڈوبکی اٹھا اور اسے... گڈ بائے کہہ کر بازار کی طرف چل دیا۔

پھولوں کی دُکان سے اس نے دو شان دار گلدستے خریدے اور قبرستان چلا آیا۔ پہلے وہ ایڈورڈ کی قبر پر گیا۔ گلدستہ رکھا اور چند منٹ تک دوزانو ہو کر دعائیہ کلمات پڑھتا رہا۔ پھر وہ لیرا کی قبر پر گیا۔ قبر کے سرہانے گلدستہ رکھا اور قبر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ وہ کافی دیر تک اسی طرح بیٹھا رہا۔ اس وقت اس کے دماغ میں لیرا کے ساتھ گزاری ہوئی زندگی کا ایک ایک پل فلم کی طرح چلتا رہا۔ لگ بھگ ایک گھنٹے کے بعد وہ اٹھا اور گھر کی طرف چل دیا۔

☆☆☆

صبح کے سات بج رہے تھے جب گارٹن، ڈوبکی کے گھر میں داخل ہوا۔ وہ اِدھر اُدھر دیکھتا ہوا آگے بڑھتا رہا مگر وہ اسے نظر نہیں آیا۔

''اے ڈوبکی!'' اس نے گھر کے اندر پہنچ کر آواز دی مگر کوئی جواب نہ ملا۔ ''کم بخت سو رہا ہوگا اب تک۔'' وہ بڑبڑاتا ہوا اس کے بیڈ روم کی طرف بڑھا۔ سامنے بیڈ پر ڈوبکی کمبل اوڑھے سو رہا تھا۔ ''مجھے صبح صبح بلوا لیا اور خود میرے لیے کافی بنانے کے بجائے یہاں پڑا سو رہا ہے۔'' گارٹن نے بڑبڑاتے ہوئے اس کے چہرے پر سے کمبل اٹھایا مگر اگلے ہی لمحے اسے زوردار جھٹکا لگا۔ ایک پل کے لیے اسے کچھ سمجھ نہیں آیا۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا چند قدم پیچھے ہٹا اور کرسی پر ڈھے گیا۔ وہ گہری گہری سانسیں لے رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد جب اس کے اوسان ذرا بحال ہوئے تو وہ اٹھا اور ایک بار پھر ڈوبکی کے بستر کے قریب پہنچ کر کھڑا ہو گیا۔

ڈوبکی کا چہرہ نیلا ہو رہا تھا۔ اس کا منہ کھلا ہوا تھا۔ آنکھوں کی پتلیاں اوپر چڑھ چکی تھیں۔ اس کے کھلے منہ پر جھاگ کے نشان تھے۔ ''اوہ میرے خدا..... یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' گارٹن نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے گردن موڑ کر سائڈ ٹیبل پر دیکھا۔ وہاں ایک سفید لفافہ رکھا ہوا تھا۔ اس نے لفافہ اٹھایا اور اسے کھول کر دیکھا تو اس میں سو سو ڈالر کے بہت سارے نوٹ اور ایک خط رکھا ہوا تھا اس نے خط نکال کر لفافہ وہیں رکھا اور کرسی پر بیٹھ کر اسے پڑھنے لگا۔

''پیارے گارٹن.....

لیرا کے بعد میں جس شخص پر..... سب سے زیادہ بھروسا کرتا تھا، جس سے ہر بات شیئر کرتا تھا..... وہ صرف تم ہو۔ تمہارے سامنے میری پوری زندگی کھلی کتاب کے مانند ہے۔ میری زندگی کا کوئی راز تم سے چھپا ہوا نہیں۔ ویسے بھی میری

زندگی کا کوئی راز تھا ہی نہیں مگر پھر بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے جو تم سے پوشیدہ ہو، ماسوائے اس ایک بات کے۔ یہی وہ بات ہے جس کے لیے میں نے تمہیں آج صبح یہاں بلایا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ میں جیتے جی یہ بات تم سے نہیں کہہ پاؤں گا اور نہ ہی میں یہ بوجھ اپنے سینے پر ساتھ لے کر اس دنیا سے جانا چاہتا تھا، اس لیے میں یہاں تم سے وعدہ لیتا ہوں کہ سب کچھ جاننے کے بعد مجھے معاف کردو گے۔

تم جانتے ہو کہ جس دن میں کشتی لے کر جھیل پر گیا تھا، اُس دن میں تدفین پر آنے والے اخراجات کے بارے میں کتنا زیادہ پریشان تھا مگر پھر بھی تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ جو کچھ کیا یا جو کچھ ہوا، اس میں میری بُری نیت کا بہت زیادہ عمل دخل نہیں تھا۔

ایڈورڈ موت کے بالکل قریب تھا۔ جب اس نے مجھ سے نہایت بے بسی کے لہجے میں یہ کہا کہ اسے پرسوں اسپتال میں داخل ہو کر موت کا انتظار کرنا ہے تو یہ سن کر میں بہت افسردہ ہو گیا لیکن جب اس نے یہ کہا کہ اسپتال کے بیڈ پر لیٹ کر موت کا انتظار کرنا تو میرے لیے ویسا ہی ہے جیسا کہ کسی کو موت کا انتظار کروانے کے لیے سزا سے کئی دن پہلے، الیکٹرک چیئر پر بٹھا کر اکیلا چھوڑ دیا جائے..... تو یہ سن کر میں خود پر قابو نہ رکھ سکا۔ مجھے رہ رہ کر لیرا اور اس کی وہ تکالیف یاد آنے لگیں جو اس نے بستر پر پڑے پڑے برداشت کی تھیں۔ میں کافی دیر سوچتا رہا۔ وہ بہت خوش نظر آرہا تھا۔ آخر میں نے فیصلہ کیا کہ اس جیسے شخص کو بستر پر مرنے کے بجائے تکلیف اٹھائے بغیر، ہنستے مسکراتے ہوئے زندگی کو الوداع کہنا چاہیے۔ وہ پانی میں ہاتھ ڈال کر کھیل رہا تھا کہ میں نے پیچھے سے اس کے کاندھے پر چوٹ ماری۔ وہ توازن برقرار نہ رکھ سکا اور جھیل میں گر کر ڈوب گیا۔ اس کے ڈوبنے کے بعد میں نے لائف جیکٹ پانی پر پھینک دی اور پولیس کو جھوٹی کہانی سنائی کہ وہ خود گر گیا تھا۔

میں تمہیں ایک بار پھر یقین دلانا چاہتا ہوں کہ جو کچھ ہوا، اس کے پیچھے اصل جذبہ ہمدردی کا تھا لیکن ساتھ ہی میری ضرورت بھی پوری ہو گئی۔ میں نے کبھی کسی سے جھوٹ نہیں بولا، ماسوائے لیرا کے۔ اس جھوٹ کے پیچھے بھی ہمدردی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ میں ہمیشہ جھوٹ بول بول کر اسے صحت یابی کی امید دلاتا رہا اور وہ بے چاری آخری وقت تک میرے جھوٹ کو سچ سمجھتی رہی۔ میں ایڈورڈ سے بھی یہی کہنا چاہتا تھا کہ وہ ٹھیک ہو جائے گا لیکن نہیں کہا۔ میں اس جھوٹ سے تھک چکا ہوں۔ پولیس کے سامنے جھوٹ بولنا مجبوری تھی۔ البتہ اب میں ہر مجبوری سے آزاد ہو چکا ہوں۔

تم جانتے ہو کہ میں نے موت کا یہ دن کیوں چُنا؟ آج میری پینسٹھویں سالگرہ ہے۔ شادی کے بعد ہمیشہ رات بارہ بجتے ہی لیرا مجھے مبارک باد دیتی تھی۔ رات ٹھیک بارہ بجے میں نے زہر پی لیا۔ اب میں لیرا سے ملنے اور ہمیشہ اس کے پاس رہنے کے لیے جا رہا ہوں۔

ہاں، ایک اور بات..... میں نے ایڈورڈ کے بٹوے سے گیارہ ہزار ڈالرز بھی نکالے تھے۔ چھ ہزار ڈالر تدفین پر خرچ ہو گئے۔ باقی پانچ ہزار ڈالرز اس لفافے میں ہیں۔ اس میں سے میری تدفین پر جتنا کم خرچ ہو سکے، کرنا اور باقی اپنے آخری وقت کے لیے رکھ لینا۔

میں نے پولیس کے لیے بھی خودکشی کا ایک خط تیار کر لیا ہے۔ وہ خط میری جیب میں ہے لیکن اس میں وہ کچھ نہیں لکھا جو تمہیں بتا رہا ہوں۔ یہ باتیں اگر راز ہی رہیں تو اچھا ہوگا ورنہ اب میں جہاں جا رہا ہوں، وہاں اس راز کے افشا ہونے سے بھی کچھ فرق نہیں پڑے گا۔ مجھے امید ہے کہ تم سب کچھ سمجھ چکے ہو گے۔ درخواست نہیں کرتا لیکن اگر ہو سکے تو معاف کر دینا۔

تمہارا گناہ گار دوست.....''

گارٹن کی پلکیں بھیگ چکی تھیں۔ خط پڑھ کر وہ کچھ دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے اپنی جیب سے لائٹر نکالا اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر خط کو آگ لگا دی۔ کچھ دیر بعد جلے ہوئے خط کی راکھ ہوا میں اُڑ چکی تھی۔

گارٹن پلٹا۔ اس نے سائیڈ ٹیبل پر رکھا ہوا لفافہ اٹھا کر دراز میں رکھا اور فون اٹھا کر پولیس کو اطلاع دینے لگا۔

فون رکھنے کے بعد وہ پلٹا اور بیڈ کے سرہانے آ کر تھوڑا سا جھکا اور اپنا چہرہ ڈوگی کے چہرے کے نزدیک لا کر کہنے لگا۔ ''معاف کرنا دوست..... مجھے اس رقم کی ضرورت نہیں۔ البتہ تمہاری شان دار تدفین کا خرچ میں ادا کروں گا۔ آخر تم میرے واحد دوست تھے۔'' یہ کہتے ہوئے اس کی پلکیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ ''ویسے میں یہ سب کچھ سمجھ چکا تھا، اگر تم یہ بتائے بغیر مر جاتے تو شاید میں تمہیں معاف نہیں کرتا۔'' اس نے ڈوگی کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے ایسے کہا جیسے وہ اس کی بات سن رہا ہے۔ پھر اس نے لاش کے چہرے پر کمبل ڈالا اور پلٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اسے پولیس کے آنے کا انتظار تھا۔

شیطان کی موت

ثمر عباس

نیکی اور بدی کی قوتیں ازل سے انسان کی دشمن ہیں اور ابد تک اس کا پیچھا نہیں چھوڑیں گی... پُراسرار ماحول کی پروردہ مکروفریب کہانی جس کے کردار انسان اور انسانیت کے دشمن تھے...

اس شخص کا قصہ جس کی ذات انواہوں کی گہری دھند میں لپٹی ہوئی تھی

جب صبح کے چار بجے ڈپٹی شیرف بیری نے کشتی پر آ کر کیبن کا دروازہ کھٹکھٹایا تو میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت آپ کسی اچھی خبر کی توقع نہیں رکھ سکتے۔ میں نے فوراً ہی بستر سے چھلانگ لگائی اور لمحہ بھر میں باہر آ گیا۔ میری آنکھیں اندھیرے میں ہیری کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھیں کیونکہ اس وقت وہ یونیفارم میں نہیں تھا۔

''مائیک! تم ٹیلی فون کیوں نہیں اٹھا رہے؟'' اس نے اس طرح کہا جیسے اپنے آنے کی وجہ بیان کر رہا ہو۔ ''شیرف تم سے اسی وقت اسٹاک آئی لینڈ پر ملنا چاہتا ہے۔'' کی ویسٹ سے نکلتے وقت پل پار کرنے کے بعد یہ

پہلا جزیرہ ہے۔ اس کا کچھ حصہ شہر کی ملکیت ہے جبکہ بڑے حصے کا تعلق کاؤنٹی سے ہے۔

''مجھے؟'' میں نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔

''ہاں، اس نے مجھے گھر آکر جگایا اور کہا کہ تمہیں ساتھ لے کر پانچویں اسٹریٹ کے آخر میں واقع اولڈ مینشن میں پہنچ جاؤں۔ ابھی اور اسی وقت۔''

''کیوں؟'' میں نے اپنے سر پر ٹوپی جماتے ہوئے کہا۔

''یہ تو میں نہیں جانتا۔'' ہیری منہ بناتے ہوئے بولا۔ ''لیکن لگتا یہی ہے کہ کوئی فوری نوعیت کا معاملہ ہے۔''

کاؤنٹی شیرف باب پرل مین سے میرے رسمی تعلقات ہیں اس لیے اس وقت بلائے جانے پر مجھے تجسس ہو رہا تھا۔ میرا اب تک کا تجربہ یہی بتاتا ہے کہ قانون نافذ کرنے والے ادارے صحافیوں کو ہر معاملے سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن اس وقت تک تو معاملہ اس کے برعکس نظر آرہا تھا۔

''پھر بھی تمہیں کچھ نہ کچھ اندازہ تو ہوگا۔'' میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

''آج میری چھٹی ہے اس لیے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ وہ لوگ کس مسئلے پر کام کر رہے ہیں۔'' وہ اکتائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''تم میرے ساتھ چلو۔ ہوسکتا ہے کہ راستے میں ریڈیو پر کچھ تفصیل سننے کو مل جائے۔''

☆☆☆

''کیا تم اسے جانتے ہو؟'' شیرف پرل مین نے مجھ سے پوچھا۔ اس وقت ہم ایک خستہ حال مینشن کے لیونگ روم میں کھڑے ہوئے تھے۔

میں نے جھک کر اس لڑکی کے چہرے کو غور سے دیکھا لیکن وہ میرے لیے اجنبی تھی۔ میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

''اچھی طرح دیکھو۔'' شیرف نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اس کا تعلق بھی تمہارے قبیلے سے ہے۔''

میں اس کی بات سن کر چونک گیا۔ کیا وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس لڑکی کو میں نے قتل کیا ہے؟

''یہ ٹریسی کا کس ہے اور یہ بھی تمہاری طرح صحافت سے وابستہ تھی۔'' اس نے سرد لہجے میں کہا۔

☆☆☆

میرا اصلی نام لائم مرفی ہے لیکن کالج کے دنوں سے ہی مائیک مرفی کے نام سے پہچانا جاتا ہوں۔ پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں اور فلوریڈا کے قصبے ٹی ویسٹ میں اپنی کشتی پر رہتا ہوں۔ شیرف کا خیال تھا کہ صحافی ہونے کے ناتے میں اور ٹریسی ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے جبکہ ایسا نہیں تھا۔ ہم دونوں کے کام کی نوعیت مختلف تھی۔ وہ طویل قسم کے تحقیقاتی مضامین لکھا کرتی تھی جو اکثر کتابوں کی شکل میں شائع ہوا کرتے تھے جبکہ میں ہفت روزہ میگزین کے لیے فیچر لکھتا یا میامی نیوز سروس کے لیے رپورٹنگ کیا کرتا تھا۔ میرا زیادہ وقت اپنی کشتی پر ہی گزرتا تھا۔

''مجھے یہاں خون نظر نہیں آرہا؟'' میں نے تجسس سے پوچھا۔

''اسے کسی اور جگہ قتل کر کے یہاں لایا گیا ہے۔'' شیرف نے حقیقت بیان کرتے ہوئے کہا۔

''اگر تم سمجھ رہے ہو کہ کسی ویمپائر نے اس کا خون پی لیا ہے تو ایسا نہیں ہے۔ ممکن ہے کہ شاید کوئی اخبار سنسنی پھیلانے کے لیے اسے دوسرا رنگ دے دے۔''

میں نے دوبارہ لاش کی طرف دیکھا اور اس کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔ ''ٹریسی کے بال سنہرے تھے۔ میں اس سے کافی عرصے پہلے ایک ایوارڈ ڈنر میں ملا تھا۔ یہ وہ نہیں ہے۔''

شیرف بناوٹی ہنسی سے بولا۔ ''یہ وہی ہے۔ میں اس سے ایک مہینا پہلے میامی میں مل چکا ہوں اور اس کے سیاہ بال ہی تھے۔ ایف بی آئی نے تمام قصبات کے شیرف کو ایک تقریب میں مدعو کیا تھا اور یہ بھی وہاں مہمان کے طور پر موجود تھی۔''

''اسے مہمان کے طور پر کیوں بلایا گیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

شیرف مجھے دوسرے کمرے میں لے گیا کیونکہ وہاں دوسرے لوگوں کی آمد شروع ہو چکی تھی جو جائے واردات سے متعلق معلومات جمع کر رہے تھے۔

''وہ ہمیں چوروں کے ایک گروہ سے ہوشیار رہنے کے بارے میں بتا رہے تھے۔ ٹریسی نے ہی یہ کہانی سنائی تھی۔ اس نے اخبار میں شائع ہونے سے پہلے ہی ایف بی آئی کو اس گروہ کے بارے میں مطلع کر دیا تھا اور اس کے بعد وہ گروہ زیرِ زمین چلا گیا۔ ٹریسی کا خیال تھا کہ یہ گروہ فلوریڈا میں ایسی وارداتیں کر سکتا ہے۔''

یہ کمرا کسی زمانے میں لائبریری رہا ہوگا لیکن اب اس کی خالی الماریاں گرد سے اٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کمرے کا جائزہ لینے کے بعد اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''یہ گروہ کس نوعیت کی چیزیں چراتا ہے؟'' اس وقت مجھے

شدت سے اپنے بستر میں جانے کی خواہش ہو رہی تھی۔

''جسمانی اعضا؟'' اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔

''جسمانی اعضا۔'' میں نے چونکتے ہوئے کہا۔ یہ سنتے ہی میری نیند اڑ گئی تھی۔

''ہاں۔'' اس نے سختی سے کہا اور پھر پوری کہانی سنا دی۔

☆☆☆

نیویارک، میامی، لاس اینجلس اور دوسرے بڑے شہروں میں ایسے کلب وجود میں آچکے تھے جہاں ویمپائر کے ماننے والوں کا ہجوم اکٹھا ہوتا تھا اور یہ لوگ ان کہانیوں پر اندھا یقین رکھتے تھے جو ٹی وی پروگراموں اور فلموں کے ذریعے ان تک پہنچتی تھیں۔ ان کلبوں کی شہرت سینہ بہ سینہ لوگوں تک منتقل ہو رہی تھی اور انہیں اپنی پبلسٹی کے لیے کوئی سائن بورڈ لگانے یا اشتہار دینے کی ضرورت نہیں تھی۔

گزشتہ سال ان شہروں میں کئی ایسی لاشیں دریافت ہوئیں جن کے جسمانی اعضا مثلاً گردے، جگر، دل اور یہاں تک کہ آنکھیں بھی غائب تھیں اور یہ سب وہی لوگ تھے جو ان کلبوں میں جایا کرتے تھے۔ ٹریسی نے اس معاملے کی تحقیقات کی اور اس نے نیویارک میں ایسے کلبوں کا پتا چلا لیا جہاں ویمپائر کے پرستار درندوں جیسے معصومی دانت لگا کر ایک دوسرے کا خون پیا کرتے تھے۔ اس نے ویمپائر کے ایک ایسے ہی چیلے کا پتا لگا لیا۔ اس کہانی کے شائع ہوتے ہی نہ صرف وہ کلب بند ہو گیا بلکہ ویمپائر کا چیلا بھی غائب ہو گیا۔ اس پر ایک پندرہ روزہ اخبار نے ٹریسی کو ویمپائر کے قاتل کے خطاب سے نوازا۔

''اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟'' میں نے کمرا میں جھانکتے ہوئے کہا جہاں ٹریسی کے جسم کو چادر سے ڈھانپ دیا گیا تھا اور اب وہ میڈیکل ایگزامنر کا انتظار کر رہے تھے۔

''تم ایک صحافی ہو، ہر جگہ جا سکتے ہو اور ہر ایک سے بات کر سکتے ہو۔ تمہیں صرف یہ معلوم کرنا ہے کہ یہاں تو ایسا کوئی کلب موجود نہیں ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ ہمارے بچے اس وبا میں گرفتار ہو کر اپنے اعضا سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔''

☆☆☆

میں صرف ایک ایسے لڑکے کو جانتا تھا جس کا تعلق گوتھک نسل سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کسی زمانے میں شرقی جرمنی سے ہجرت کر کے امریکا آگئے تھے۔ میں نے ہمیشہ اسے سیاہ لباس میں دیکھا تھا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور ناک، کان چھدے ہوئے تھے لیکن پچھلے چند ماہ کے دوران میں اس میں کافی تبدیلی آگئی تھی۔ جب میں اس سے ملنے گیا تو وہ اپنی کشتی میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ میں نے اسے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔

''ایلیکس! کیا تم مجھے کچھ وقت دے سکتے ہو؟''

''کیوں نہیں۔ اوپر آجاؤ۔'' وہ کتاب بند کرتے ہوئے بولا۔

''تم اسکول جاتے ہو؟'' میں نے کتاب پر نظر ڈالتے ہوئے کہا، وہ کوئی درسی کتاب تھی۔

''سٹی کالج۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔

میں ایلیکس کے بارے میں تھوڑا بہت جانتا تھا۔ اس کی عمر بمشکل اکیس سال ہوگی۔ اس نے دو سال پہلے یہ کشتی خریدی تھی۔ وہ خاموش طبع اور اپنے آپ میں مگن رہنے والا نوجوان تھا۔ کبھی کبھی وہ ہماری پارٹیوں میں شریک ہوتا جن میں گھر کے بنے ہوئے کھانے اور سستی شراب رکھی جاتی۔ کبھی کبھار وہ ہمارے ساتھ کھانے پینے میں شامل ہو جاتا ورنہ کچھ دیر بیٹھ کر چلا جاتا۔

میں نے بات کو آگے بڑھانے کے لیے کہا۔ ''تم نے اپنے لیے کون سا مضمون منتخب کیا ہے؟''

''شاید بیالوجی۔''

میں جانتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے کیونکہ میں نے اس کے ہاتھ میں کوئی اور ہی کتاب دیکھی تھی۔

''اگر میں تمہیں سچ بتا دوں تو تم مجھ پر ہنسو گے نہیں اور نہ ہی کسی اور کو کچھ بتاؤ گے۔''

''بے فکر رہو۔ یہ بات ہم دونوں کے درمیان ہی رہے گی۔''

''پولیس سائنس۔'' وہ منہ ہی منہ میں بولا۔ ''میں نے پولیس اکیڈمی میں داخلہ لے لیا ہے اور جلد ہی پولیس والا بن جاؤں گا۔''

''واہ، یہ تو بڑی زبردست بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''یہاں کے لوگ مجھے پولیس کی وردی میں دیکھ کر حیران رہ جائیں گے اور شاید ڈر کے مارے مجھ سے بات بھی نہ کریں۔''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو تمہاری موجودگی میں زیادہ محفوظ تصور کریں۔'' میری بات سن کر وہ جواب میں مسکرا دیا۔

''کیا تم میری مدد کر سکتے ہو؟'' میں نے لمحہ بھر توقف

کے بعد قدرے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کس سلسلے میں؟'' وہ تھوڑا سا حیران ہوتے ہوئے بولا۔

''کیا اس قصبے میں کوئی گوتھ کلب ہے؟''

''تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس نے مشتبہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

میں نے اسے ٹریسی کا کس کے قتل کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس کا تعلق بھی اسی نوعیت کے کسی کلب سے جوڑا جا رہا ہے۔

''میں نے اس کی کچھ کہانیاں پڑھی ہیں۔ کیا تم اسے جانتے تھے؟''

''ہاں!'' میں نے جھوٹ بولا۔ ''میں جاننا چاہتا ہوں کہ اس کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا۔ تم مجھے بتاؤ کہ یہ کلب کہاں واقع ہے؟''

اس نے میرے لیے کافی بنائی اور بتایا کہ گزشتہ دو ماہ سے ایک پرانا چھوٹا جہاز کرسمس ٹری آئی لینڈ پر لنگر انداز ہے اور وہیں یہ لوگ جمع ہوتے ہیں۔

''نصف شب کے بعد ایک چھوٹی کشتی تمہیں وہاں لے جائے گی۔'' اس نے کہا۔ ''میں وہاں دو مرتبہ جا چکا ہوں لیکن جیسا کہ میں نے تمہیں بتایا کہ اب میرا رجحان کسی اور جانب ہے۔''

''کشتی والے کو یہ کیسے معلوم ہوتا ہے کہ کن لوگوں کو لے کر جانا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے غور سے دیکھا اور سر ہلاتے ہوئے بولا۔ ''وہ تمہیں ہرگز لے کر نہیں جائے گا جب تک اسے یقین نہ ہو جائے کہ تمہارا تعلق بھی اسی کلب سے ہے۔''

میں اس سے پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ دو مرتبہ وہاں کیسے چلا گیا لیکن مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ ہتھے سے نہ اکھڑ جائے اس لیے بات کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ وہ جہاز کس کی ملکیت ہے جہاں یہ سب لوگ جمع ہوتے ہیں؟''

''وہ عمر میں تم سے بڑا ہے جبکہ وہاں آنے والے سب لوگ نوجوان ہوتے ہیں۔ وہ شخص وہاں کیڑے کی طرح رینگتا رہتا ہے جیسے اسے یقین ہو کہ وہی ڈریکولا ہے۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' اب میں پوری طرح اس کی جانب متوجہ ہو گیا تھا۔

''اس کا رنگ مجھ سے بھی زیادہ سفید ہے۔ بڑے بڑے نکیلے دانت اور ہسپانوی لہجے میں بولتا ہے۔ گزشتہ بار میں ایک انگریز لڑکی کے ساتھ وہاں گیا تھا۔ اس شخص نے پارٹی کے دوران چند چکر لگائے اور پھر غائب ہو گیا۔''

''اس کی غیر موجودگی میں پارٹی کون چلاتا ہے؟''

''دو خوب صورت لڑکیاں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''اس کے علاوہ میں نے وہاں محافظوں کی موجودگی بھی محسوس کی تھی لیکن ان کے بارے میں یقین سے نہیں کہہ سکتا۔''

''میں وہاں ضرور جاؤں گا۔'' میں نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ''ممکن ہے اس کے لیے مجھے اپنے بالوں کا رنگ تبدیل کرنا پڑے۔''

''مجھے بتاؤ کہ تمہیں کس چیز کی تلاش ہے؟ میں آج رات ہی وہاں جاؤں گا۔''

میں نہیں چاہتا تھا کہ کوئی میرے معاملے میں ٹانگ اڑائے لیکن اس کی بات میں بھی وزن تھا۔ میں کسی طرح بھی اس پارٹی میں فٹ نہیں ہو سکتا تھا۔ میری وہاں موجودگی انہیں شک میں مبتلا کر سکتی تھی۔ وہ وہاں سے غائب ہو سکتے تھے یا ممکن ہے کہ ان کے پاس مجھ جیسے صحافیوں سے نمٹنے کا کوئی اور طریقہ ہو۔

☆☆☆

میں نے ڈیول اسٹریٹ کے اختتام پر واقع بندرگاہ کے حصے سے اس جہاز کا جائزہ لینے کی کوشش کی جس کے بارے میں ایلیکس نے بتایا تھا۔ میرے اندازے کے مطابق اس کی لمبائی ایک سو فٹ ہو گی۔ اس کا عرشہ بہت بڑا تھا جس کے ساتھ یقیناً ایک بڑا ہال ہو گا اور نیچے رہائشی کیبن اور انجن روم ہو گا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' میرے عقب سے ایک آواز آئی۔ مڑ کر دیکھا تو پاورے تھامس کھڑا تھا۔ وہ آئرلینڈ کا رہنے والا تھا اور اس کا تعلق ایک مشنری تنظیم سے تھا لیکن وہ کسی وجہ سے اپنے مشن کو چھوڑ کر یہاں آ گیا تھا۔ اس کی عمر ساٹھ کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ بے تحاشا سگریٹ پیتا اور ایک پرانی بائیسکل پر قصبے کا چکر لگاتا رہتا تھا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ فرشتے اسے آنے والے حالات کے بارے میں باخبر رکھتے ہیں۔

''پاورے تھامس۔'' میں نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہاں کیسے؟''

''میں جانتا تھا کہ تم یہیں ملو گے۔'' اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''تم کیا کرنے جا رہے ہو؟''

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے میرے ارادے کی بھنک کیسے پڑ گئی۔ میں نے انجان بنتے ہوئے کہا۔ ''کس بارے میں؟''

اس نے مسکراتے ہوئے جہاز کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''خوب صورت جہاز ہے۔''

''وہاں شیطان رہتا ہے۔'' اس نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ''جو لوگ کچھ کر سکتے ہیں، وہ اس معاملے کو دیکھ رہے ہیں۔''

''اب یہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''اور وقت تیزی سے نکلتا جا رہا ہے۔''

☆☆☆

اگلے روز صبح پانچ بجے میرے ٹیلی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ دوسری طرف سے ایلیکس بول رہا تھا۔

''آدھ گھنٹے کے اندر مجھ سے ڈریون میں ملو۔''

''ایلیکس! جانتے ہو، کیا وقت ہوا ہے؟'' میں نے نیم غنودگی کے عالم میں کہا۔

اس نے زوردار قہقہہ لگایا اور بولا۔ ''خون پینے والی بلاؤں کے خاتمے کا یہی وقت ہے۔ اپنے ساتھ کاغذ اور پنسل بھی لیتے آنا۔ تمہارے پاس صرف آدھ گھنٹا ہے۔''

میں نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا اور اپنی پرانی سفید جیپ میں سوار ہو کر ڈریون پہنچ گیا۔ صبح کا وقت ہونے کی وجہ سے مجھے پارکنگ میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ مجھے اندر داخل ہوتا دیکھ کر کیفے کا مالک رون مسکرایا۔ میں نے اس کے پاس سے گزرتے ہوئے اپنی من پسند کافی کا آرڈر دیا اور ایلیکس کی طرف بڑھ گیا۔ وہ پہلے سے ہی کافی کے گھونٹ لے رہا تھا۔

''شاید تمہیں میری بات پر یقین نہیں آیا۔'' وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم کاغذ اور پنسل ساتھ لائے ہو؟''

میں نے کاغذ کا رول اور دو پنسلیں میز پر رکھ دیں۔ ہم نے ناشتے کا آرڈر دیا اور ایلیکس نے کاغذ پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔ وہ کاغذ پر نظریں جماتے ہوئے بولا۔

''معاملات قابو سے باہر ہوتے جا رہے ہیں۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے کافی کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''میں نے تمہیں ان دو لڑکیوں کے بارے میں بتایا تھا۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا۔ ''وہ میرا خون پینا چاہ رہی ہیں۔ میں نے انہیں ایک سے زائد مرتبہ لڑکے اور لڑکیوں کی گردن اور بازوؤں سے خون پیتے ہوئے دیکھا ہے۔'' اس نے ایک کاغذ پر اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور دوسرے پر لکیریں کھینچنا شروع کر دیں۔

''وہ جہاز پر موجود ہر شخص سے یہی کہہ رہی تھیں کہ کیا وہ ماسٹر کے لیے خون کا عطیہ دینا چاہیں گے؟ وہ اس شخص کو ماسٹر کہتی ہیں۔''

''خون کا عطیہ!'' میں چونکتے ہوئے بولا۔ ''مگر کیسے؟''

''جس طرح اسپتالوں میں خون لیا جاتا ہے۔ وہ تمہارے بازو میں سوئی چبھوئیں گے اور ایک نلکی کے ذریعے خون تھیلی میں منتقل ہونا شروع ہو جائے گا۔''

''کیا ان کے پاس کوئی خون لینے والا بھی ہے؟''

''یقیناً ہو گا۔'' اس نے ناشتا شروع کرتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں خون دینے کے لیے کشتی کے نچلے حصے میں جانا ہو گا۔''

''وہاں ایسی کیا خاص بات ہے؟''

''مجھے نہیں معلوم کیونکہ میں نے خون نہیں دیا۔ حالانکہ وہ لڑکیاں بہت خوب صورت ہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''میں ہمیشہ انجکشن لگوانے سے پرہیز کرتا ہوں اور خاص طور پر ایسی سوئی کو تو بالکل برداشت نہیں کر سکتا جو ایک سے زائد بار استعمال ہو چکی ہو۔''

اس نے پہلا کاغذ میری طرف بڑھایا۔ اس پر اس نے جہاز کے گراؤنڈ فلور کا نقشہ بنایا تھا۔

''میں نے اندازے سے اس کی پیمائش لکھی ہے۔ ضروری نہیں کہ تم اس پر یقین کر لو۔'' یہ کہہ کر اس نے دوسرا کاغذ بھی میری طرف بڑھا دیا جس پر اس نام نہاد ماسٹر کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ وہ اپنے لمبے نکیلے دانتوں کے ساتھ بناوٹی انداز میں مسکرا رہا تھا۔ اس خاکے کو دیکھ کر میرے ذہن میں ڈریکولا کا نقشہ ابھرنے لگا۔

☆☆☆

میں شیرف پرل مین اور پولیس چیف رچرڈ ڈولی کے ہمراہ ایک دوسری کشتی سن سیٹ کے عرشے پر کھڑا ہوا تھا جہاں سے ہمیں کرسمس ٹری آئی لینڈ اور وہ جہاز صاف نظر آ رہا تھا۔ شیرف اور پولیس چیف کے پاس ایلیکس کے بنائے ہوئے خاکوں کی نقول بھی تھیں۔ وہ جہاز ساحل سے کافی فاصلے پر لنگر انداز تھا اور شہر کی پولیس یا شیرف کو اس تک پہنچنے کے لیے سمندری گشتی ٹیم یا کوسٹ گارڈ کی مدد لینا

پڑتی۔

انہیں جہاز پر چھاپا مارنے کے لیے وارنٹ کی ضرورت تھی جو کسی ثبوت کے بغیر نہیں مل سکتا تھا۔ البتہ یہ ہو سکتا تھا کہ پولیس نصف شب کے بعد وہاں جانے والوں کی نگرانی کرے۔ ان سے پوچھ گچھ کی صورت میں کسی مشتبہ فرد کی نشاندہی ہو سکتی تھی اور یہ بھی ممکن تھا کہ ان میں سے کسی کے خلاف منشیات کے استعمال یا کم عمری میں شراب نوشی کے جرم میں وارنٹ جاری کر دیا جائے۔

ہم نے اس امکان پر بھی گفتگو کی کہ کوسٹ گارڈ کے کیپٹن فنن سے جہاز کے بارے میں معلومات حاصل کی جائیں کہ کیا اسے سمندر میں جانے کا سرٹیفکیٹ ملا ہوا ہے؟ اور یہ کہ کیا اس کے حفاظتی آلات درست حالت میں ہیں؟ کوسٹ گارڈ کا عملہ چیکنگ کے بہانے اس جہاز پر جا سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی ہم نے دیگر امکانات پر غور کیا۔

شیرف نے میرا شکریہ ادا کیا اور وعدہ کیا کہ وہ مجھے اپنی تحقیقات سے باخبر رکھے گا۔ میں نے اس کے کہنے پر یقین نہیں کیا اور شاید اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔ شیرف کے مقابلے میں رچرڈ مجھے زیادہ اچھی طرح جانتا تھا۔ اس کے چہرے کے تناؤ سے میں نے اندازہ لگا لیا کہ وہ اس بارے میں خاصا متفکر ہے۔ کچھ یہی کیفیت میری بھی تھی۔ ایک صحافی ہونے کے ناتے میرے کچھ اصول تھے۔ اسٹوری تلاش کرو اور اسے پوری سچائی کے ساتھ سامنے لاؤ۔ اس اسٹوری کے حصول کے لیے مجھے قانون کی مدد درکار تھی اور نہ ہی ان کی پابندیاں میرا راستہ روک سکتی تھیں۔ اس کام کے لیے میں اکیلا ہی کافی تھا۔

ماسٹر کے ہسپانوی لہجے نے مجھے شک میں مبتلا کر دیا تھا چنانچہ میں اس کی اصلیت جاننے کے لیے کھوج میں لگ گیا۔ میں نے اخبارات کی فائلوں اور گوگل سے اس بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر میں نے اپنے ایک ذریعے کو آزمانے کا فیصلہ کیا جو اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ محض ایک ڈرنک کے عوض مجھے اپنی کہانیوں کے لیے مواد فراہم کر چکا تھا۔

☆☆☆

باب پیرس کی عمر پچاس سے تجاوز کر چکی تھی۔ وہ اسی شہر میں پلا بڑھا تھا۔ وہ ہمیشہ سے ہی غیر قانونی دھندوں میں مصروف رہا لیکن اپنا کام بڑی ہوشیاری سے کرتا تھا۔ اس لیے کبھی پولیس کی نظروں میں نہیں آیا۔ اسمگلروں اور کشتی کی دوڑ میں حصہ لینے والوں سے اس کے خصوصی تعلقات تھے۔

میں نے اسے ایک بار میں آنے کی دعوت دی اور اس کی خاطر تواضع کرنے کے بعد اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا۔

''مجھے ایک شخص کے بارے میں معلومات درکار ہیں اور میرے خیال میں تم یہ کام بہتر طور پر کر سکتے ہو۔''

باب نے مشتبہ انداز میں مجھے دیکھا اور مسکرا دیا۔ میں نے ایلیکس کی بنائی ہوئی تصویر اس کے سامنے رکھ دی جسے دیکھتے ہی وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''ڈریکولا۔''

''اس کے نکیلے دانتوں کو بھول جاؤ۔ یہ بتاؤ کہ اس چہرے کو پہچانتے ہو؟''

''دیکھنے میں تو آدمی کا بچہ ہی لگتا ہے۔'' وہ تصویر مجھے واپس کرتے ہوئے بولا۔ ''لیکن یہ ہے کون؟''

''یہی تو میں جاننا چاہتا ہوں۔''

''کیوں؟'' اس نے اپنے اطمینان کے لیے پوچھا کیونکہ وہ اتنی جلدی کسی پر بھروسا نہیں کرتا تھا۔

''اگر مجھے اس کا پس منظر معلوم ہو جائے تو ایک بہت اچھی اسٹوری بن سکتی ہے۔''

''میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں۔'' اس نے بیئر کا طویل گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ''یہاں ایک ایسا شخص بھی ہے جو کیوبا سے مہاجرین کو لے کر آتا ہے۔ تم اسے چھوٹے سے جہاز کا کپتان کہہ سکتے ہو۔ یہ سلسلہ اس وقت شروع ہوا جب اس کی گرل فرینڈ نے اپنے خاندان کو یہاں لانے کی فرمائش کی۔ پھر کسی اور نے معقول معاوضے کے عوض اپنے رشتے داروں کو یہاں لانے کے لیے کہا۔ اس کے بعد اسے پیسوں کا لالچ ہو گیا اور وہ پوری طرح اس کام میں ملوث ہو گیا۔''

میں سمجھ گیا کہ یہ اسی کی کہانی ہے جسے وہ اپنے انداز میں سنا رہا ہے لیکن میں نے دخل اندازی کرنا مناسب نہ سمجھا۔ وہ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''ایک روز کسی شخص نے اس سے رابطہ کیا اور اپنے کام کے لیے بھاری معاوضے کی پیشکش کی۔'' وہ معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تم سمجھ سکتے ہو کہ ایسی پیشکش کسی ناجائز کام کے لیے ہی کی جاتی ہے۔''

''ظاہر ہے۔'' میں نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا۔

''کپتان نے ایک اصول یہ بنا رکھا تھا کہ وہ صرف لوگوں کو لے کر آتا تھا اور ان کے ساتھ کوئی فالتو سامان نہیں ہوتا تھا لیکن زیادہ پیسوں کے لالچ میں آ کر وہ اپنا اصول

توڑنے پر تیار ہو گیا۔ اس شخص کی ہدایت کے مطابق وہ ایک مخصوص دن، ایک مخصوص بار میں کچھ لوگوں سے ملا جو کیوبا کی بندرگاہ میرینا ٹینگو پر واقع ہے اور انہیں اپنے ساتھ لے کر چند گھنٹوں بعد سمرلینڈ پہنچ گیا۔ تم جانتے ہو کہ کسی کیوبا کے باشندے کے لیے سوٹ کیس کے ساتھ اس بندرگاہ کی چیک پوسٹ سے گزرنا کتنا مشکل ہے؟''

''میرے خیال میں تو یہ ناممکن ہے۔'' میں نے کہا۔

''بہرحال، سمرلینڈ پہنچ کر ملاقات ایک اور شخص سے ہوئی جو ایک دین میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کپتان کو معاوضے کی بقیہ نصف رقم ادا کی اور اس طرح یہ مشن مکمل ہو گیا۔''

''اچھی کہانی ہے لیکن اس کا اس بندے سے کیا تعلق بنتا ہے؟'' میں نے تصویر والا کاغذ لہراتے ہوئے کہا۔

''کپتان نے اس کے بعد بھی اس شخص کے لیے چند اور چکر لگائے۔ پھر ایک روز کپتان سے کہا گیا کہ اسے اس بار صرف ایک آدمی کو لے کر آنا ہے اور اس کام کے عوض اسے پوری کشتی کے مسافروں کے کرائے کے برابر معاوضہ دیا جائے گا۔ کپتان یہ سن کر حیران رہ گیا کہ اتنے چھوٹے سے کام کے لیے اتنا بھاری معاوضہ کیوں دیا جا رہا ہے۔''

اس نے لمحہ بھر کے لیے توقف کیا اور میرے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاغذ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''اگر ڈریکولا کے چہرے پر لمبے دانتوں کے بجائے مونچھیں بنا دی جائیں تو یہ اس شخص سے ملتی جلتی تصویر کہلائے گی۔''

''یہ کتنی پرانی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''شاید دو سال یا اس سے بھی زیادہ۔''

''کپتان نے کبھی اس بارے میں سوچا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے؟''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''اب تم مجھ سے پوری کہانی سننا چاہ رہے ہو۔ کیوبن نہیں جانتے تھے کہ کپتان کو ہسپانوی زبان آتی ہے لہٰذا وہ اس کی موجودگی میں بھی آپس میں بے تکلفانہ گفتگو کرتے تھے۔ ان کی باتوں سے کپتان کو اندازہ لگانے میں یہ دشواری نہیں ہوئی کہ یہ لوگ اس شخص کے احسان مند تھے۔ وہ ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا تھا البتہ اس کے عوض وہ اسے اپنا ایک گردہ دینے پر تیار ہو جاتے تھے۔ اس کام کے لیے ڈاکٹر بھی کیوبا سے ہی آیا تھا۔''

''کپتان نے آخری بار کیوبا کا چکر کب لگایا تھا؟''

''ایک سال ہو گیا۔'' اس نے بیئر کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔

''کیا کپتان کو معلوم ہے کہ اس ڈاکٹر سے کیسے رابطہ کیا جا سکتا ہے؟''

''اس کا نام تو معلوم نہیں لیکن کپتان کی یادداشت بہت اچھی ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پہچان لے گا۔ گو کہ اس نے احتیاط کے طور پر وین کی نمبر پلیٹ بھی اتار دی ہے لیکن وہ ایک چھوٹے اسپتال کے نام پر رجسٹرڈ ہے۔''

''ان معلومات کے لیے میں تمہارا شکر گزار ہوں۔''

''صرف شکریہ سے کام نہیں چلے گا۔'' وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ ''کھانا کھلاؤ۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگی ہے۔''

کھانے کے دوران میں، میں نے باب سے اسپتال کا نام، پتا اور فون نمبر معلوم کر لیا۔ باقی معلومات گوگل سے حاصل کی جا سکتی تھیں۔ اتنا تو اندازہ ہو گیا کہ اس اسپتال کا تعلق کسی نہ کسی طرح اس کشتی سے تھا۔ اب مجھے اس کی تفصیلات جاننا تھیں۔

☆☆☆

مجھے یہ ساری معلومات رچرڈ یا شیرف پرل مین کو بتا دینی چاہیے تھیں لیکن میں نے ایسا نہیں کیا بلکہ خود ہی گوگل سے اسپتال کے اسٹاف کے بارے میں معلومات حاصل کر لیں۔

پادرے تھامس سے میری ملاقات ایک بار میں ہوئی جسے میں نے اپنے کام کے سلسلے میں بلایا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی بولا۔ ''مائیک! وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔''

''ہاں۔'' میں نے اسپتال کے میڈیکل اسٹاف کی فہرست والا کاغذ اس کے سامنے لہراتے ہوئے کہا۔ ''گو کہ ہمارے کام کی رفتار سست ہے لیکن تھوڑی بہت پیش رفت ہوئی ہے۔''

''کیا یہ ٹریسی کے کاغذات ہیں؟'' اس نے اشتیاق سے پوچھا۔

''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''میں ٹریسی کے کاغذات کس طرح حاصل کر سکتا تھا؟''

''میں نے سوچا کہ شاید تم اس کے گھر گئے ہو گے۔''

اس کے الفاظ سن کر میں چونک پڑا۔ ''کیا تم جانتے ہو کہ وہ کہاں رہتی تھی؟''

''ہاں۔'' اس نے اپنا سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔ ''وہ جب پہلی بار یہاں آئی تو میں نے اس سے رابطہ کیا

تھا۔"

کبھی کبھی وہ اسی طرح حیران کر دیتا تھا جس سے سامنے والا یقین کرنے پر مجبور ہو جاتا کہ واقعی اس کے قبضے میں جنات ہیں جو اسے پل پل کی خبریں دیتے رہتے ہیں۔ میں نے اس پر اپنی حیرانی ظاہر نہیں ہونے دی اور کہا۔

"کیا وہ پرانے شہر میں رہتی تھی؟"

"ہاں، قبرستان سے دو بلاک کے فاصلے پر اس کا کاٹیج ہے۔"

☆☆☆

دو کمروں پر مشتمل یہ کاٹیج انجیلا اسٹریٹ پر واقع تھا۔ مجھے اس کا تالا کھولنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ لیونگ روم کا فرنیچر بھی مکان کی طرح پرانا ہی تھا۔ دوسرے کمرے کو ٹریسی نے اپنا دفتر بنایا ہوا تھا۔ میز پر اس کا لیپ ٹاپ رکھا ہوا تھا۔ میں نے اس کا بٹن دبایا تو اسکرین پر ٹریسی کی تصویر نمودار ہو گئی۔

"ہم یہاں کس چیز کی تلاش میں آئے ہیں؟" تھامس نے دروازے میں کھڑے کھڑے پوچھا۔

میں کوئی جواب دینے کے بجائے ٹریسی کی میز پر بیٹھ گیا اور لیپ ٹاپ کا بٹن دبا کر مختلف فائلیں دیکھنے لگا لیکن مجھے مایوسی ہوئی کیونکہ وہ سب اس کی کتابوں سے متعلق تھیں۔

"ہمیں اس کی یو ایس بی تلاش کرنی چاہیے۔" میں نے میز کی دراز ٹٹولتے ہوئے کہا۔

"ممکن ہے کہ وہ اس کے پرس میں ہو۔" تھامس نے خدشہ ظاہر کیا۔

"میں نہیں جانتا لیکن اس نے اپنا مواد ایک دو جگہ ضرور محفوظ کیا ہوگا۔ ممکن ہے کہ احتیاط کے طور پر اس نے اسے کہیں چھپا دیا ہو۔"

ہم نے گھر کی ایک ایک چیز کھنگال ڈالی۔ یہاں تک کہ تھامس نے کچن میں رکھی ہوئی خالی بوتلیں، جار اور برتن بھی دیکھ ڈالے لیکن مطلوبہ شے کہیں نہیں ملی۔ پھر اچانک ہی تھامس نے بیڈ روم کے سرہانے رکھا ہوا لائٹر اٹھایا اور اس سے سگریٹ سلگانے کی کوشش کرنے لگا لیکن وہ کام نہیں کر رہا تھا۔

"شاید اس کی گیس ختم ہو گئی ہے۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے بولا اور ماچس سے سگریٹ سلگالی۔

میں نے اس کے ہاتھ سے لائٹر لے کر اسے کھولا۔ ایک چھوٹی سی یو ایس بی اس کے اندر رکھی ہوئی تھی۔ میں نے مسرت آمیز نعرہ لگایا۔ "مل گئی۔"

میں نے وہ یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگائی اور ٹریسی کی فائلوں کو دیکھنے لگا۔ ٹریسی نے تمام نوٹس بڑی تفصیل سے درج کیے تھے۔ ان میں تاریخ، معلومات کا ذریعہ اور کس مقصد کے لیے معلومات حاصل کی گئیں، سب کچھ موجود تھا۔ میں اس کے کام سے بہت متاثر ہوا۔ پھر مجھے اس اسپتال کے بارے میں بھی مواد مل گیا جو ٹریسی نے خفیہ طور پر حاصل کیا تھا۔ وہ جاننا چاہ رہی تھی کہ ماسٹر کی ڈور کون ہلا رہا ہے اور یہ کہ وہ ان جسمانی اعضا کا کیا کرتا ہے۔ اسے شبہ تھا کہ یہ کوئی حیوانی رسم ہے۔

"تھامس! تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے لیپ ٹاپ بند کیا اور یو ایس بی اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا۔

"وہ اس شیطان کے قریب پہنچ چکی تھی لیکن اس نے اسے مار ڈالا۔"

"یہ ایک فرد کا کام نہیں بلکہ پورا گروہ اس میں شامل ہے۔" میں اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔ "اور نہ ہی میں اسے وحشیانہ رسم سمجھتا ہوں۔ میرے خیال میں یہ کوئی گھناؤنا کاروبار ہے۔ یہ لوگ گردے بیچ کر پیسے کما رہے ہیں۔"

☆☆☆

اپنی کشتی پر واپس آ کر میں نے ایک بار پھر ٹریسی کی یو ایس بی لیپ ٹاپ میں لگائی اور اس میں سے اپنے مطلب کے کچھ پرنٹس نکال لیے اور عرشے پر جا کر انہیں پڑھنے لگا۔ ٹریسی نے جو کچھ لکھا تھا، اس میں اپنی معلومات کو جمع کیا تو میں کسی نتیجے پر پہنچنے کے قابل ہو گیا۔

پولیس کا کہنا تھا کہ کسی ثبوت کے بغیر وہ جہاز پر چھاپا نہیں مار سکتے۔ مجھے کسی وارنٹ یا تلاشی کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے تو صرف وہاں تک پہنچنے کے لیے راستہ چاہیے تھا تاکہ میں اپنے شک کو حقیقت کا رنگ دے سکوں۔

"تم اس وقت باہر کھڑے کیا کر رہے ہو؟" ایلیکس نے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے پوچھا۔

میں ان نوٹس کو پڑھتے وقت اپنے گرد و پیش سے غافل ہو گیا تھا اس لیے چونکتے ہوئے بولا۔ "کچھ نہیں، بس یونہی کچھ کاغذات دیکھ رہا تھا۔ تم اس وقت یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"میں شہر سے آ رہا ہوں۔" اس نے کہا۔ "کوئی خاص بات معلوم ہوئی؟"

"نہیں لیکن میں اس پر کام کر رہا ہوں۔"

"میری مدد کی ضرورت ہو تو بتاؤ۔"

یہ کہہ کر وہ کشتی پر آ گیا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں ماسٹر کے جہاز پر جانا چاہتا ہوں۔ کیا وہ اس کے لیے کوئی راستہ نکال سکتا ہے تاکہ میں کسی کی نظروں میں آئے بغیر جہاز کے نچلے حصے میں جا سکوں۔

"انجن روم کے برابر میں ہی ایک تہ خانہ ہے جہاں سامان رکھا جاتا ہے اس لیے وہاں جانے کے لیے انجن روم میں کوئی نہ کوئی راستہ ضرور ہوگا۔ یہ تہ خانہ اسٹور روم کے عقب میں ہے۔ میں نے وہاں کوئی تالا نہیں دیکھا لیکن ممکن ہے کہ وہ اندر سے بند رہتا ہو۔"

"وہاں روشنی کا کیا انتظام ہے؟"

"کمروں کی کھڑکیوں سے آنے والی روشنی ہی کافی ہے۔ تاہم لنگر کی جانب بھی ایک لائٹ لگی ہوئی ہے۔ شاید انہیں یقین ہے کہ باہر کا کوئی شخص اس کشتی پر نہیں آ سکتا۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" میں مسکراتے ہوئے بولا۔

☆☆☆

میرا منصوبہ بہت سادہ تھا البتہ اس کا مشکل حصہ وہ تھا جب میں عرشے پر پہنچ جاتا۔ ایلیکس میری مدد کرنے کے لیے بہت پُرجوش تھا لیکن میں نے اس کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ گو کہ کوئی مشکل پیش آنے کی صورت میں اس کی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ میں نے اپنے ایک دوست برٹ کو فون کر کے کہہ دیا کہ وہ مجھے جہاز تک پہنچانے کے لیے ایک چھوٹی کشتی لے کر آ جائے جبکہ ایلیکس نے اپنے لیے اسی کشتی کا انتخاب کیا جس کے ذریعے وہ پہلے بھی جہاز پر جا چکا تھا۔

رات ڈیڑھ بجے کے قریب برٹ نے مجھے اپنی کشتی کے ذریعے جہاز تک پہنچا دیا اور جونہی ایلیکس نے سب ٹھیک ہے کا سگنل دیا تو میں جہاز سے لٹکتی ہوئی رسی کی سیڑھی کے ذریعے عرشے پر پہنچ گیا۔ میں نے سر سے پاؤں تک سیاہ لباس پہن رکھا تھا۔ پیروں میں ٹینس شوز اور سر پر ٹوپی بھی لگا لی تھی۔ میرے پاس ایک خودکار ریوالور، چھوٹی ٹارچ اور انجن روم کا دروازہ کھولنے کے لیے ایک سلاخ بھی تھی۔

میں دبے پاؤں انجن روم کے دروازے کی جانب بڑھا۔ وہاں اتنی روشنی تھی کہ مجھے اپنا کام کرنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ دروازہ اندر سے بند تھا اور کمروں سے موسیقی کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے سلاخ کی مدد سے بہ آسانی تالا توڑ دیا۔ اس کے دو بولٹ زمین پر گر گئے جن کی آواز پیدا ہوئی۔ کوئی بھی اس جانب متوجہ ہو سکتا تھا۔ میں کچھ دیر دم سادھے کھڑا رہا اور جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ کسی نے یہ آواز نہیں سنی تو دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گیا۔ اب مجھے تاریک انجن روم میں راستہ تلاش کرنے کے لیے ٹارچ کی ضرورت تھی۔ وہاں سے ایک دروازہ جہاز کے ہال وے اور کمروں کی جانب کھلتا تھا۔ ہال وے کے دونوں جانب دو اور اس کے اختتام پر ایک دروازہ تھا۔ سیلون کو جانے والی سیڑھیوں کے پاس لوگوں کے باتیں کرنے کی اور موسیقی کی آوازیں آ رہی تھیں۔

مجھے ابھی تک یقین نہیں تھا کہ یہاں کیوں آیا ہوں لیکن میں جانتا تھا کہ ایک بار مجھے اپنا شکار مل گیا تو اسے پہچاننے میں دیر نہیں لگے گی۔ اور ایک بار میں نے ثبوت فراہم کر دیا تو تلاشی کے وارنٹ کے حصول میں بھی کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی، تاہم یہ معلوم نہیں تھا کہ مجھے کیا ثبوت چاہیے۔ میں اور ٹریسی دونوں ہی اس حوالے سے شک میں مبتلا تھے۔

میں نے انجن روم کے قریب ترین دروازے کو کھولنے کی کوشش کی۔ وہ ایک چھوٹا سا کمرا تھا جس میں دو برتھیں لگی ہوئی تھیں۔ پھر میں نے ہال کے اختتام پر واقع دروازہ کھولا۔ اندر گھپ اندھیرا تھا۔ میں نے ٹٹول کر دیوار پر نصب سوئچ تلاش کیا اور دوسرے ہی لمحے کمرا روشن ہو گیا۔

میرے سامنے وہ ثبوت موجود تھا جس کی پولیس کو ضرورت پڑ سکتی تھی۔

اس بڑے کمرے کے وسط میں بستر پر ایک نوجوان شخص کندھوں تک چادر اوڑھے بے ہوشی کے عالم میں لیٹا ہوا تھا۔ میں نے اپنا ریوالور نکال کر دروازہ بند کر دیا۔ کمرے کا بغور سے جائزہ لینے پر اندازہ ہوا کہ دو چھوٹے کمروں کو ملا کر اسپتال کی طرز پر ایک بنایا گیا ہے جس میں لوہے کی الماریاں، چھت میں لگے بلب، آئی وی اسٹینڈ اور مختلف ٹرے رکھی ہوئی تھیں۔ اس لڑکے کے بستر کے پاس دل کی دھڑکن دیکھنے کے لیے ایک مانیٹر لگا ہوا تھا اور اسٹینڈ پر لگی گلوکوز کی بوتل سے پتا چل رہا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ میں نے اس کی تسلی بخش حالت دیکھ کر وہ سوئی نکال دی جس کے ذریعے اسے گلوکوز دیا جا رہا تھا۔ وہ یونہی بے حس و حرکت پڑا رہا۔ اگر اس کے دل کی دھڑکن رک جاتی تو مانیٹر کا الارم بج اٹھتا اور اگر کوئی کہیں بیٹھا اس کی نگرانی کر رہا ہوتا تو معاملہ بگڑ سکتا تھا۔ میں نے وقتی طور پر اسے تنہا چھوڑ دیا اور وہاں سے ہٹ گیا۔ اس خیال کے آتے ہی میں پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے چھت اور دیواروں پر نظر دوڑائی لیکن مجھے وہاں کوئی کیمرا نظر نہیں آیا۔

میں نے دو تین بار اس کے چہرے کو تھپتھپایا لیکن اس

نے کوئی حرکت نہیں کی۔ اس کے سیاہ کپڑے سلیقے سے تہ کیے کرسی پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے جیبوں کی تلاشی لی لیکن کوئی بٹوا برآمد نہیں ہوا۔ صرف چند ڈالر اور تھوڑے سے سکے پڑے ہوئے تھے۔ میں نے چھت پر لگی لائٹ آف کر کے باتھ روم کی بتی جلا دی تاکہ دروازے سے روشنی باہر نہ جا سکے۔

میں نے رچرڈ کو فون کر کے سوتے سے جگا دیا۔ اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ میں کہاں ہوں اور میں نے کیا دیکھا ہے تو وہ ناراض ہونے لگا۔ اس کے ساتھ ہی اسے یہ فکر بھی تھی کہ وہ میری مدد کے لیے پولیس نہیں بھیج سکتا تھا۔ بہرحال، اس نے مجھے یقین دلایا کہ وہ فوراً ہی شیرف پرل مین اور کوسٹ گارڈ کے کیپٹن فنٹن کو فون کر رہا ہے، وہی اس سلسلے میں کچھ کر سکیں گے۔

میں نے کمرے کا دروازہ کھول کر راہداری کا جائزہ لیا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ واپس آ کر دوبارہ اس لڑکے کے گال تھپتھپائے لیکن اس نے ذرا سی بھی حرکت نہیں کی۔ میں اسے اٹھا کر اوپر نہیں لے جا سکتا تھا کیونکہ وہ خاصا وزنی تھا۔ البتہ اسے انجن روم میں ہی کسی جگہ چھپایا جا سکتا تھا تاکہ وہ ماسٹر اور اس کے چیلوں سے محفوظ رہے۔

میں نے انجن روم کے ساتھ بنے ہوئے کمرے کا دروازہ کھولا۔ اس میں ایک بستر، ٹی وی اور چھوٹا سا اسٹیریو موجود تھا۔ پھر میں نے اس لڑکے کے کپڑے اٹھائے اور اسے اپنے کندھے پر لاد کر اس کمرے میں پہنچا دیا اور خود عرشے پر چھپ کر کوسٹ گارڈ کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ پھر میں دوبارہ کمرے میں گیا اور وہاں کی لائٹ جلا دی۔

''تم کون ہو؟''

کمرے کے وسط میں بستر کے پاس ماسٹر کھڑا مجھے گھور رہا تھا۔ وہ دبلا پتلا، طویل قامت اور سیاہ لباس میں ملبوس تھا اور جب وہ بولا تو مجھے اس کے نکیلے دانت دکھائی دیے۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ یقین تھا۔

میں نے ریوالور نکال کر اسے اپنے نشانے پر لے لیا لیکن اس پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ بے ہوش لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے بچانے کے لیے یہاں آئے ہو؟''

''لڑکے سے دور رہو۔'' میں نے اس پر ریوالور تانتے ہوئے کہا۔

وہ دو قدم پیچھے ہٹا اور زہریلی مسکراہٹ چہرے پر لاتے ہوئے بولا۔ ''تم اسے کس طرح لے جا سکتے ہو۔ میرے آدمی تمہارا راستہ روکیں گے اور جہاز پر موجود دوسرے احمق بھی ان کا ساتھ دیں گے۔ تمہارا بچ نکلنا بہت مشکل ہے۔''

''ہم تینوں کوسٹ گارڈ کے آنے تک یہیں رکیں گے۔'' میں نے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ ''اس کے بعد میں تمہیں ان کے حوالے کر دوں گا۔''

''کیا وہ آ رہے ہیں؟''

''ہاں، میں نے انہیں بلانے کے لیے فون کر دیا ہے۔''

''یہ تو بہت برا ہوا۔'' وہ مجھے گھورتے ہوئے بولا۔ ''تم دونوں کے ساتھ اور بھی کئی لوگ مارے جائیں گے۔''

''میں تمہاری دھمکیوں سے ڈرنے والا نہیں ہوں۔ اپنی جگہ خاموش کھڑے رہو۔''

''میرے لوگ اس کمرے کی نگرانی کر رہے ہیں اور جانتے ہیں کہ ایسی صورتِ حال میں انہیں کیا کرنا ہے۔'' وہ عیاری سے مسکراتے ہوئے بولا۔ ''کیا تم سمجھتے ہو کہ مجھے مار ڈالو گے؟ اب مجھے اس جسم کی ضرورت نہیں۔ یہ میرا ساتھ نہیں دے سکتا۔'' وہ میری طرف بڑھتے ہوئے بولا۔ ''ذرا سونگھو۔''

''مجھے کچھ سونگھنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی جگہ پر کھڑے رہو۔ میں نے اسے وارننگ دی۔ ''ورنہ گولی مار دوں گا۔''

''مجھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تم سمیت بہت سے لوگ اس آگ میں جل کر مر جائیں گے۔''

وہ میری طرف آ رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے ایک فائر کیا لیکن وہ نہیں رکا۔

''تمہیں اپنا نشانہ بہتر بنانے کی ضرورت ہے۔'' اس نے اپنے نکیلے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

میں نے اس کے سینے میں دو گولیاں اتار دیں لیکن وہ مسکراتا رہا۔

''ہم بہت جلد ملیں گے۔'' اس کی آواز بہت صاف اور واضح تھی پھر وہ فرش پر گرا اور مر گیا۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے دروازہ کھولا کہ فائر کی آواز سن کر کہیں کوئی اس طرف تو نہیں آ رہا۔ مجھے کمروں سے لوگوں کے چلانے اور دھواں اٹھنے کی بو محسوس ہوئی۔ میں نے جلدی سے اس لڑکے کو اپنے کندھوں پر اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیوں کی جانب بڑھا۔ میرے ایک ہاتھ میں ریوالور تھا تاکہ اگر ماسٹر کے آدمی مجھے روکنے کی کوشش کریں تو ان کا مقابلہ کر سکوں۔ بہت سے لڑکے سیڑھیاں اتر کر نیچے آ رہے تھے۔ ایلیکس بھی ان میں شامل تھا۔

''انہوں نے ہمیں کمرے میں بند کر دیا تھا۔'' اس نے گھبرائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ تم نیچے ہو۔''

میں نے اسے بتایا کہ گوسٹ گارڈ والے پہنچنے ہی والے ہیں اور پوچھا کہ ماسٹر کے ساتھی کہاں ہیں۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' اس نے جواب دیا اور ان لڑکوں اور لڑکیوں کی طرف دیکھنے لگا جو ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے باہر نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔

میں نے ایک لڑکے کا بازو پکڑ کر پوچھا۔ ''کیا تم نے یہاں کوئی آگ بجھانے والا آلہ دیکھا ہے؟''

اس نے مجھے دھکا دیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ عرشے پر آگ کے شعلے اٹھتے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور کمرے میں دھواں داخل ہونے لگا تھا۔

''اسے لے جاؤ۔'' میں نے بے ہوش لڑکے کا بوجھ ایلیکس کے کندھوں پر منتقل کرتے ہوئے کہا۔ پھر میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا شیشہ توڑ دیا تاکہ لوگوں کو باہر نکلنے کا راستہ مل سکے۔

''فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔'' میں نے چلاتے ہوئے کہا۔

آگ کے شعلے تیزی سے عرشے پر پھیل رہے تھے۔ میں نے ایلیکس سے کہا۔ ''برٹ کی کشتی نیچے موجود ہو گی۔ تم اس لڑکے کو لے کر اس میں سوار ہو جاؤ۔''

''پھر تم کیا کرو گے؟''

''میری فکر چھوڑو۔ پہلے اسے بچاؤ۔''

ایلیکس نے کچھ تامل کیا۔ شاید وہ مجھے اس صورتِ حال میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہ رہا تھا لیکن میں اسے دھکیلتے ہوئے جہاز کے دائیں حصے کی جانب لے گیا جہاں نیچے جانے کے لیے سیڑھی موجود تھی۔ جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ ایلیکس اس لڑکے کو لے کر برٹ کی کشتی تک پہنچ چکا ہے تو میں واپس جہاز کے اندرونی حصے کی طرف آ گیا۔ سیلون میں دھواں بھر گیا تھا اور میرے کانوں میں ان لڑکوں اور لڑکیوں کی آوازیں آ رہی تھیں جو مدد کے لیے پکار رہے تھے لیکن دھوئیں کی دبیز چادر کی وجہ سے میں انہیں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ میری آنکھوں میں پانی بھر گیا اور سانس لینے میں دشواری ہونے لگی۔ میں رینگتا ہوا دھوئیں سے دور ہونے کی کوشش کرنے لگا۔

میرا پورا جسم جھلس گیا تھا اور کپڑے جگہ جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ اب میں عرشے کے اس کونے پر کھڑا ہوا تھا جو ابھی تک آگ سے محفوظ تھا۔ میرے چاروں طرف آگ کے شعلے

نظر آرہے تھے اور میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ جس طرح جہاز پر آیا تھا، اسی طرح واپس لوٹ جاؤں۔ میں عرشے کی ریلنگ پر چڑھا اور پانی میں چھلانگ لگادی۔

''تم نے آنے میں بہت دیر لگادی۔'' برٹ مجھے دیکھ کر چلایا۔ اس نے مجھے چھلانگ لگاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔ اس لیے کشتی کو میرے قریب لے آیا جو پہلے ہی خوف زدہ چیخوں سے بھری ہوئی تھی۔ اس دوران میں آگ بجھانے والی کشتی بھی پہنچ چکی تھی جبکہ دوسری کشتیاں زندہ رہ جانے والوں کو تلاش کررہی تھیں۔

☆☆☆

اس حادثے میں ماسٹر سمیت نو افراد مارے گئے جن میں سے چھ بچے جل کر اور دو ڈوب کر ہلاک ہوئے جبکہ ماسٹر کی موت میری گولی سے ہوئی تھی۔ اس واقعے کے چند روز بعد میں پولیس چیف رچرڈ اور پاورے تھامس کے ساتھ ساحل پر کھڑا جہاز کے جلے ہوئے ڈھانچے کو دیکھ رہا تھا۔

''یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ وہ کون تھا؟'' رچرڈ کا اشارہ ماسٹر کی جانب تھا۔ انگلیوں کے نشانات بھی نہیں مل سکے۔ البتہ ہم نے اس کے کمپیوٹر سے کچھ معلومات حاصل کی ہیں اور ایف بی آئی کے لوگ ایور گلیڈ کلینک کے عملے سے پوچھ گچھ کررہے ہیں؟''

''اس کے چیلوں اور ان دو لڑکیوں کے بارے میں کچھ معلوم ہوا؟'' میں نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ''کیا انہوں نے ہی وہاں سے فرار ہوتے ہوئے آگ لگائی تھی؟''

''اس بارے میں یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔'' رچرڈ نے کہا۔ ''ہمارا اندازہ یہی ہے کہ وہ آگ لگنے سے پہلے ہی جہاز سے جاچکے تھے کیونکہ تمام لاشوں کی شناخت ہوچکی ہے اور وہ سب نوجوان طالب علم تھے۔ اس لیے یہی سمجھا جاسکتا ہے کہ ماسٹر کے آدمیوں نے ہی فرار ہونے سے پہلے آگ لگائی ہوگی۔''

''کمپیوٹر سے کیا معلومات حاصل ہوئیں؟'' میں نے پوچھا۔

''ان میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم اس کے خلاف استعمال کرسکیں۔'' رچرڈ نے بے بسی سے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر وہ سب کیا ہورہا تھا؟'' میں نے دوبارہ سوال کیا۔

''وہ ان نوجوانوں کے خون کو جسمانی اعضا کا عطیہ دینے والوں کے لیے استعمال کرتا تھا اور یہ کوئی غیر قانونی کام نہیں ہے۔ آپ کسی کو بھی اپنا گردہ عطیہ کرسکتے ہیں۔''

''لیکن وہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کررہا تھا۔ لوگ اپنی مرضی سے گردے نہیں عطیہ کرتے تھے بلکہ وہ اس طرح ان سے غیر قانونی طور پر امریکا لانے کا معاوضہ لیتا تھا۔''

''مجھے تمہاری بات پر یقین ہے لیکن ہم اسے ثابت نہیں کرسکتے۔''

''اس لڑکے کے بارے میں کچھ معلوم ہوا جو مجھے وہاں ملا تھا؟''

''اسے کچھ یاد نہیں۔ بس اتنا جانتا ہے کہ ان لڑکیوں کے ساتھ اندر گیا تھا اور جب آنکھ کھلی تو اس نے اپنے آپ کو تمہاری کشتی میں پایا۔ بہرحال، اب وہ گھر جاچکا ہے۔''

کچھ لمحے خاموشی رہی پھر رچرڈ بولا۔ ''مائیک! تم نے بہت سی زندگیاں بچائی ہیں۔ اس کے لیے میں ذاتی طور پر تمہارا احسان مند ہوں۔''

''کیا میں اس کے کمپیوٹر سے حاصل ہونے والی معلومات دیکھ سکتا ہوں تاکہ ٹریسی کے کاغذات سے ان کا موازنہ کرسکوں؟''

''فی الحال کوسٹ گارڈ والے معاملے کی تحقیقات کررہے ہیں۔ شاید فٹن اور پرل مین تم سے بھی اس روز پیش آنے والے واقعات کے بارے میں پوچھ گچھ کریں کیونکہ تمہاری گولی سے ہی ماسٹر ہلاک ہوا تھا۔''

یہ کہہ کر اس نے میرا شانہ تھپتھپایا اور چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد پاورے تھامس میرے پاس آیا۔ وہ کچھ فکرمند نظر آرہا تھا جبکہ میرے خیال میں تو اسے خوش ہونا چاہیے تھا۔

''تم اتنے اداس کیوں ہو؟'' میں نے اس کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''اس شیطان نے کہا تھا کہ وہ تم سے جلد ہی ملے گا۔ یہی بات مجھے پریشان کررہی ہے۔''

''میں نے اسے مار دیا ہے۔ اب وہ کبھی نظر نہیں آئے گا۔''

''تم شیطان کو نہیں مار سکتے مائیک!'' وہ سنجیدگی سے بولا۔ ''وہ کسی اور شکل میں واپس آسکتا ہے۔ وہ کہہ چکا ہے کہ تم سے جلد ملے گا۔''

''اور تم نے اس پر یقین کرلیا؟ میں نہیں تو میری جگہ کوئی اور اس شیطان کا مقابلہ کرنے کے لیے موجود ہوگا۔ نیکی اور بدی کی جنگ ہمیشہ سے ہوتی آئی ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گی۔''

صبح بخیر

مریم کے حنان

بقائے زندگی کی جنگ ہر شخص کا بنیادی حق ہے ... اس شخص کو بھی یہی کٹھن صورتِ حال درپیش تھی... اپنے آپ کو اس دلدل سے نکالنے کے لیے اس نے ہر راہ سے گزر جانے کا حتمی فیصلہ کرلیا...

اس شخص کا ماجرا جس نے حصولِ مقصد کے لیے طویل انتظار کیا تھا

اس روز مجھے گھر جانے کی جلدی تھی کیونکہ آج روزی کی سال گرہ تھی اور ہم اسے منانے کے لیے باہر جارہے تھے۔ روزی میری بیوی ہے۔ میں اس سے محبت کرتا ہوں لیکن اس سے تھوڑا ڈرتا بھی ہوں۔ وہ غصے کی تیز ہے، خاص طور سے اگر میری طرف سے کوئی کوتاہی ہوجائے تو اس کا غصہ دیکھنے والا ہوتا ہے۔ ایک بار وہ ناراض ہوجائے تو بڑی مشکل سے مانتی ہے۔ اسے منانے میں بہت وقت اور رقم خرچ کرنا پڑتی ہے اس لیے میری کوشش ہوتی ہے کہ اسے خفا ہونے کا موقع نہ دوں۔

میرا تعلق میامی پولیس ڈیپارٹمنٹ کے ہومی سائڈ اسکواڈ سے ہے۔ صبح سے میں اور میرے ساتھی فارغ بیٹھے تھے۔ یعنی کسی طرف سے مرنے مارنے کی کوئی اطلاع نہیں آئی

تھی۔ بوش خوش تھا، اس نے لنچ کے دوران میں مجھ سے کہا۔
''شکر ہے کسی نے صبح صبح قتل ہونے کی کوشش نہیں کی۔''
میں نے اس سے اختلاف کیا۔ ''حالانکہ صبح کا وقت ہی ایسے کاموں کے لیے بہترین ہے، دیکھو ہم تازہ دم ڈیوٹی پر آتے ہیں اور اگر بھاگ دوڑ کرنی پڑ جائے تو کوئی مشکل نہیں ہوتی۔''
بوش نے مصنوعی جماہی لی۔ ''مجھے تو بہت ہوتی ہے اور میری خواہش ہے جس نے بھی غیر طبعی موت مرنا ہو وہ شام یا رات کو مرے۔''
نوجوان بوش میرا پارٹنر تھا۔ عمر میں مجھ سے دس سال کم تھا اور غیر شادی شدہ بھی تھا۔ اس لیے زندگی اس کے لیے بہت آسان تھی۔ مجھے شام کے وقت کام کرنا بہت کھلتا تھا۔ دوپہر کے بعد میں دعا مانگنے لگتا کہ اب کوئی کام نہ آئے۔ ورنہ شام غارت ہو جاتی تھی۔ دیر سے گھر جاتا تو روزی کا پھولا منہ دیکھنا پڑتا۔ ہماری ڈیوٹی شام چھ بجے ختم ہو جاتی اور اس کے بعد میری بلا سے کچھ بھی ہوتا رہے۔ چار بجے میں دعا مانگ رہا تھا کہ باقی وقت بھی خیریت سے گزر جائے مگر اس روز دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں کافی لینے کی نیت سے اٹھا تھا کہ لیفٹیننٹ کارل کی طرف سے بلاوا آ گیا۔ میرا دل دھڑک اٹھا۔ کوئی اطلاع آ گئی تھی ورنہ کارل مجھے طلب نہ کرتا۔ میں بوجھل قدموں سے اس کے دفتر پہنچا تو میرا ساتھی اور جوڑی دار بوش وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے دیکھتے ہی کارل نے کہا۔
''پال فوراً دو سو بیس نارتھ ویسٹ میامی پہنچ جاؤ۔''
''وہاں کیا ہوا ہے؟'' میں نے فکرمندی سے پوچھا جبکہ بوش سکون سے بیٹھا ماچس کی تیلی چبا رہا تھا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کیونکہ اسے شام میں کام کرنا اچھا لگتا تھا۔
''کسی فرائڈ کارک نے اطلاع دی ہے کہ اس کے بٹلر ایڈورڈ جیسن نے خودکشی کر لی ہے۔'' لیفٹیننٹ کارل بولا۔ ''وہاں جا کر حالات دیکھو اور مجھے رپورٹ کرو۔''
''نارتھ ویسٹ میامی۔'' میں نے اعتراض کیا۔ ''وہاں پہنچنے میں ایک گھنٹا لگ جائے گا اور تم چھ بجے اٹھ جاؤ گے۔''
''میں دفتر میں موجود ہوں گا۔'' کارل سرد لہجے میں بولا۔ ''اور کیا چھ تم یہیں بجا دو گے؟''
میں اور بوش باہر آئے اور..... کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ شام کے وقت میامی سے باہر جانے والی تمام سڑکوں پر رش بہت زیادہ ہو جاتا ہے۔ مجھے کئی جگہ ٹریفک سے گزرنے کے لیے پولیس سائرن کا سہارا لینا پڑا حالانکہ یہ کام مجھے سخت ناپسند ہے۔ بوش نے اندازہ لگایا۔ ''شاید آج تم روزی سے کوئی وعدہ کر کے آئے ہو۔''
''اس کی سال گرہ ہے اور ہمیں باہر جانا ہے۔'' میں نے کراہ کر کہا۔
''مجھے تم سے ہمدردی ہے۔'' بوش مسکرایا۔ ''ایسا کرو تم پہلے ہی روزی کو بتا دو، وہ تیار ہو گئی تو تمہیں زیادہ مشکل کا سامنا کرنا پڑے گا۔''
''ممکن ہے معاملہ سیدھا سا ہو۔'' میں نے امید سے کہا۔ ''بٹلر نے سچ مچ خودکشی کی ہو۔''
''اگر اس نے سچ مچ خودکشی کی ہے تب بھی ہم معاملے کو اتنی جلدی نہیں نمٹا سکتے۔'' بوش نے حقیقت پسندی سے کہا۔ ''اس لیے بہتر ہے تم اسے آگاہ کر دو۔''
میں نے سوچا اور نفی میں سر ہلایا۔ ''میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ دوسری صورت میں بھی روزی اتنی ہی ناراض ہو گی اس لیے پہلے سے مصیبت اپنے گلے میں ڈالنے کی کیا ضرورت ہے؟''
بوش نے شانے اچکائے۔ ''جیسے تمہاری مرضی۔''
ایک گھنٹے بعد ہم بیس نارتھ ویسٹ میامی پہنچ گئے۔ یہ ساحل کے کنارے ایک چھوٹی سی پہاڑی کے آخری سرے پر واقع عالی شان ولا تھا۔ یہاں سے سمندر اور دور پھیلے میامی شہر کا شاندار نظارہ کیا جا سکتا تھا۔ یقیناً اس ولا کی قیمت کئی ملین ڈالرز میں تھی۔ پولیس وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جب ہم کار سے اترے تو ایک پیٹرول آفیسر پاس آیا۔ اس نے تعارف کرایا۔
''میرا نام کارمیکن ہے سر۔''
''لاش تم نے دیکھی تھی؟'' میں نے پوچھا۔
''یس سر..... سب سے پہلے میں اور میرا ساتھی یہاں پہنچے تھے۔'' اس نے سر ہلایا۔
''اطلاع کس نے دی؟''
ولا کے مالک فرائڈ کارک نے اس واقعے کی اطلاع دی تھی۔ وہ ولا کے لان میں موجود تھا اور فکرمند نظر آ رہا تھا۔ میں اور بوش اس کے پاس پہنچے۔ تعارف کے بعد میں نے سوال کیا۔ ''تم نے لاش کب دیکھی؟''
''پولیس کو کال کرنے سے پانچ منٹ پہلے..... شاید تین بج کر پینتالیس منٹ پر۔'' اس نے جواب دیا۔ فرائڈ تقریباً پچاس برس کا صحت مند شخص تھا۔ اس کے گرے بال لمبے اور گدی سے نیچے آ رہے تھے اور چہرے مہرے سے دولت مندی کے آثار واضح تھے۔
''تم یہاں اکیلے رہتے ہو؟'' میں نے لان کا جائزہ لیا جو اس وقت اجڑا ہوا لگ رہا تھا۔ شاید اس کی باقاعدگی سے دیکھ

بھال نہیں کی جاتی تھی۔

"صرف میں اور ایڈورڈ رہتے ہیں....." اسس نے تصحیح کی۔ "دراصل میرے مالی حالات درست نہیں ہیں اس لیے میں اب زیادہ ملازم نہیں رکھ سکتا۔"

"کیا تم ایڈورڈ کو بھی فارغ کرنے کا سوچ رہے تھے؟" بوش نے پوچھا۔

وہ ہچکچایا لیکن پھر اثبات میں سر ہلایا۔ "سچی بات ہے میں ایسا ہی سوچ رہا تھا۔"

"کیا تمہاری سوچ کا ایڈورڈ کو علم تھا؟"

"نہیں لیکن اسے میرے حالات کا علم تھا۔" فرائڈ نے سرد آہ بھری۔ "اس ولا کی فروخت کی کارروائی جاری ہے۔"

لاش لیونگ روم میں تھی۔ اندر سے یہ ولا بہت عالی شان تھا۔ بہترین فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ بٹلر ایڈورڈ چمڑے کے کاؤچ پر نیم دراز تھا اور اس کے بائیں ہاتھ میں وہ پستول دبا ہوا تھا جس سے اس نے اپنی کنپٹی پر گولی مار کر خودکشی کی تھی۔ موت فوری واقع ہوئی تھی اس لیے زیادہ خون نہیں نکلا تھا اور یہ صاف ستھری موت تھی۔ ایڈورڈ کے جسم پر لمبا کوٹ تھا اور اس کے سر کے بال چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہ تقریباً فرائڈ کی عمر کا لیکن کسی قدر کمزور صحت کا مالک تھا اس لیے بٹلر کا مخصوص کوٹ اس کے جسم پر جھولتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے گال اندر دھنسے ہوئے تھے اور ہاتھ پاؤں متورم لگ رہے تھے۔ میں نے چھو کر دیکھا۔ ان میں ورم نہیں تھا، ان کی قدرتی ساخت ایسی تھی جیسا کہ زیادہ آرام کرنے والے افراد کی ہو جاتی ہے۔ اس کی توند بھی ہلکی سی نکلی ہوئی تھی حالانکہ اس کی باقی صحت اچھی نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا کہ وہ کام کے بجائے زیادہ تر آرام کرتا رہا ہو۔

طبی عملہ آ چکا تھا۔ ڈاکٹر لاش کا معائنہ کر رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "موت کتنی دیر پہلے واقع ہوئی ہے؟"

"اسے مرے ہوئے ڈیڑھ گھنٹے سے زیادہ نہیں ہوا ہے۔" ڈاکٹر نے کہا۔ "موت کی وجہ کنپٹی کا زخم ہے۔" اس نے ٹارچ کی روشنی میں سوراخ میں جھانکتے ہوئے کہا۔ "گولی نے دماغ کو شدید متاثر کیا ہے، موت فوری واقع ہوئی ہے۔"

میں نے بوش سے کہا کہ وہ کارروائی مکمل کر کے لاش کو وہاں سے اٹھوا دے اور خود باہر آیا۔ فرائڈ پریشانی کے عالم میں لان میں کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔ "پہلے ہی معاشی حالات خراب ہونے کی وجہ سے کوئی گاہک نہیں مل رہا ہے اور اب یہاں ایک موت بھی ہو گئی ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے تمہیں اس ولا کو بیچنے میں مشکل پیش آ رہی ہے؟" میں نے کہا۔

اس نے سر ہلایا۔ "اس کے اخراجات بہت زیادہ ہیں اور میں مالی لحاظ سے خاتمے کے قریب ہوں۔"

"اس کی وجہ؟" میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گیا۔

اس نے گہری سانس لی۔ "اسٹاک مارکیٹ میں میرے کئی ملین شیئرز تھے اور پچھلے دنوں کیا ہوا ہے، تمہیں اچھی طرح معلوم ہے۔"

"لیکن اب تو شیئرز کی قیمت بہتر ہو رہی ہے۔"

"مجھ پر بینکوں کا قرض بھی تھا، اس کی ادائیگی کے لیے میں نے اونے پونے شیئرز فروخت کر دیے اور اب میں خالی ہاتھ ہوں۔"

پورے ملک میں بلکہ دنیا میں رئیل اسٹیٹ بیٹھ گئی ہے اور خاص طور سے بڑی مالیت کے سودے نہ ہونے کے برابر رہ گئے ہیں۔ اس کا ولا نہیں بک رہا تھا تو اس میں تعجب کی بات نہیں تھی۔ لیکن میں اس کی دکھ بھری داستان سننے نہیں آیا تھا۔ یہاں ایک آدمی مرا تھا اور مجھے اس کی تفتیش کرنا تھی، میں نے اس سے کہا۔ "مجھے تمہارا بیان درکار ہے اس بارے میں تم جو جانتے ہو بتاؤ، کوئی بات چھپانے کی کوشش مت کرنا۔"

"مجھے چھپانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، یہ سیدھا سادہ خودکشی کا کیس ہے اور ایڈورڈ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں ہے۔"

اس کے بعد فرائڈ نے جو بیان دیا، اس کے مطابق اس کا بٹلر جب حسبِ معمول شام کی چائے لے کر نہیں آیا تو وہ خود اس کی تلاش میں نکلا اور اس نے ایڈورڈ کو لیونگ روم میں کاؤچ پر اسی حالت میں پایا تھا۔ پستول اس کے ہاتھ میں تھا اور وہ مر چکا تھا اس کے سر میں جس قسم کا زخم تھا اس کے بعد کسی کے زندہ ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس نے فوری طور پر پولیس کو کال کی اور اس کے نتیجے میں پندرہ منٹ میں ایک پیٹرول کار ولا میں آ چکی تھی۔ میں نے اس مختصر اور سادہ بیان کے بعد سوالات کا آغاز کیا۔

"تم نے گولی چلنے کی آواز سنی؟"

"نہیں میرا کمرا مکمل طور پر ساؤنڈ پروف ہے اور باہر سے کوئی آواز نہیں آتی ہے۔" اس نے نفی میں جواب دیا۔

"تب تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس نے خودکشی کر لی ہے؟"

"وہ مجھے شام کی چائے دینے نہیں آیا تھا تو میں اس کی تلاش میں نکلا اور اسے لیونگ روم میں اسی طرح مُردہ حالت میں پایا۔"

"ایڈورڈ کب سے تمہارے پاس ملازم ہے؟"

"اسے ملازم ہوئے کوئی بیس سال ہو گئے ہیں۔" اس

نے سوچ کر کہا۔ "میں صحیح سے تو اس کی ملازمت کے کاغذات دیکھ کر ہی بتا سکتا ہوں لیکن تقریباً بیس سال ہو گئے ہیں۔"

"بیس سال ایک طویل عرصہ ہے، اس کا مطلب ہے تم اس کی خدمات سے مطمئن تھے اور تب ہی تم نے اسے ملازم برقرار رکھا؟"

"سوفی صد۔" وہ زور دے کر بولا۔ "ایڈورڈ بہت اچھا اور تربیت یافتہ بٹلر تھا۔ میں اس کی خدمات سے پوری طرح مطمئن تھا اور میرا ارادہ تھا کہ اگر یہ ولا اچھی قیمت پر بک گیا تو میں اس کی ملازمت برقرار رکھوں گا۔"

"اس کے بیوی بچے ہیں؟"

فرائڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں، اس نے شادی نہیں کی اور نہ ہی میرے علم میں اس کا کوئی رشتے دار ہے کیونکہ نہ تو وہ کسی سے ملنے گیا اور نہ ہی کبھی کوئی اس سے ملنے آیا۔"

"کوئی دوست، جاننے والا؟"

"نہیں، میرے علم میں ایسا کوئی فرد نہیں ہے جسے میں ایڈورڈ کا دوست کہہ سکوں۔ وہ کسی سے بھی نہیں ملتا تھا۔"

"تنہائی پسند آدمی تھا؟"

"تم کہہ سکتے ہو، شاید وہ اپنی ذمے داریوں میں خوش رہتا تھا۔"

"ایک بٹلر کی حیثیت سے اس کی کیا ذمے داریاں تھیں؟"

"وہی جو ہوتی ہیں۔ وہ کھانا بنانے سے لے کر ولا کی اندرونی صفائی ستھرائی کا ذمے دار بھی تھا۔"

"وہ ڈرائیور بھی تھا؟"

"نہیں، میں خود ڈرائیونگ کرتا ہوں اور ایڈورڈ ڈرائیونگ نہیں کرتا تھا، اسے کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے وہ ڈرائیونگ سے گریز کرتا تھا۔ کم سے کم میں نے اسے ڈرائیونگ کرتے نہیں دیکھا۔"

مجھے تعجب ہوا کیونکہ ایک بٹلر کو ڈرائیونگ آنی چاہیے، یہ اس کی لازمی ذمے داریوں کا ایک حصہ ہوتا ہے۔ میں نے غور سے اسے دیکھا۔ "میں نے آج تک کسی بٹلر کے بارے میں نہیں سنا کہ اسے ڈرائیونگ نہیں آتی ہو۔"

"مجھے معلوم ہے لیکن میں نے کہا نا اس کے ساتھ کوئی نفسیاتی مسئلہ تھا جس کی وجہ سے اس نے ڈرائیونگ سیکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔" فرائڈ نے جواب دیا۔ "میں نے ایک دو بار ایڈورڈ سے اس بارے میں پوچھا تھا لیکن اس نے کوئی واضح جواب نہیں دیا اس لیے میں نے پھر پوچھنے سے گریز کیا۔ ویسے بھی مجھے ڈرائیور کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں نے اس بات پر زیادہ توجہ نہیں دی۔"

"ایڈورڈ کے کسی عورت سے تعلقات تھے؟"

"نہیں، میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ کیونکہ نہ تو کبھی کوئی عورت اس سے ملنے آئی اور نہ ہی وہ میرے علم میں لا کر کسی سے ملنے گیا۔"

"اسے مالی مسئلہ تھا، کوئی ایسی لت جس کی وجہ سے وہ مالی پریشانی کا شکار ہو گیا ہو؟"

"تمہارا مطلب ہے کہ اسے جوئے یا شراب کی لت تھی تو میرے علم میں ایسی کوئی بات بھی نہیں ہے۔" فرائڈ نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے تنخواہ ماہانہ دیتا آیا ہوں اور مجھے نہیں یاد کہ اس نے کبھی مجھ سے پیشگی تنخواہ کا مطالبہ کیا ہو، اس کا مطلب ہے اس کی مالی حالت ٹھیک تھی۔"

"تنخواہ کیسے دیتے تھے، اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ ہے؟"

فرائڈ نے اس بار بھی نفی میں سر ہلایا۔ "میں اسے ہمیشہ کیش تنخواہ دیتا تھا۔"

"تم نے بتایا وہ تنہائی پسند تھا تو کیا اس میں خودکشی کا رجحان تھا؟ اس نے اس سے پہلے بھی خودکشی کی کوشش کی یا تمہارے سامنے کبھی اس پر بات کی؟"

"نہیں۔"

"آج تم نے اس کے رویے میں کوئی تبدیلی دیکھی؟"

"معمولی سی ..... وہ صبح ناشتے کے وقت مجھے پریشان لگ رہا تھا۔ پھر میں نے اسے نہیں دیکھا۔ میں دوپہر میں کھانا نہیں کھاتا ہوں۔ البتہ شام کی چائے لازمی پیتا ہوں اور وہ مجھے ٹھیک ساڑھے تین بجے چائے لا کر دیتا ہے۔"

"جب وہ نہیں آیا تو تم اس کی تلاش میں نکلے یعنی صبح سے تم نے اسے دوسری بار دیکھا؟"

"یہ درست ہے، آج کے دن میں نے اسے صرف دو بار دیکھا۔"

"صبح سے اس وقت تک تم کیا کرتے رہے؟"

"میں اخبارات دیکھتا رہا اور پھر کچھ دیر آرام کیا تھا، کوئی خاص مصروفیت نہیں تھی۔ دو بجے میں نہانے گیا اور اس کے بعد بھی میں نے آرام ہی کیا۔"

فرائڈ نے جس قسم کا بیان دیا، وہ ہومی سائڈ والوں کی زبان میں ڈیڈ اینڈ کہلاتا ہے یعنی وہ جگہ جس پر آ کر تمام راستے بند ہو جائیں۔ فرائڈ کے بیان میں کوئی اہم بات نہیں تھی جس سے بٹلر کی موت پر روشنی پڑتی۔ فرائڈ کے بیان سے ایسا لگ رہا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے ایڈورڈ کا دل دنیا سے اچاٹ ہو گیا اور اس

نے لیونگ روم میں آکر کاؤچ پر لیٹ کر اپنے سر میں گولی مار لی۔ میں نے پوچھا۔ ''اس نے جس پستول سے خود کو شوٹ کیا، وہ کس کا ہے؟''

''میرا ہے لیکن یہ عام طور سے ایڈورڈ کی تحویل میں رہتا ہے کیونکہ اس ولا کی حفاظت کی ذمے داری بھی اس پر تھی۔''

''ایڈورڈ پستول کہاں رکھتا تھا؟''

''میری اسٹڈی میں میز کی دراز میں ..... یہ دراز مقفل رہتی ہے لیکن اس کی دو چابیاں ہیں ان میں سے ایک ایڈورڈ کے پاس ہوتی ہے۔''

میں نے محسوس کیا کہ یہ واقعی خودکشی کا کیس تھا۔ پانچ بج کر پینتالیس منٹ ہو چکے تھے۔ اگر میں فون پر لیفٹیننٹ کارل کو بتا دیتا کہ یہ خودکشی کا کیس ہے تو اس کے ساتھ میری جان بھی چھوٹ جاتی اور میں ذرا تاخیر سے سہی لیکن گھر پہنچ جاتا اور روزی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ وہ سمجھتی میں ٹریفک جام کی وجہ سے تاخیر سے آیا ہوں۔ اس دوران میں اندر سے بوش آیا۔

''ڈاکٹر نے لاش دیکھ لی ہے اب تم چاہو تو ایک نظر اسے دیکھ سکتے ہو۔''

''اوکے تم ذرا مسٹر کارک سے گپ شپ کرو، میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔'' میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

کیونکہ ڈاکٹر اور فارنسک والوں نے اپنا کام مکمل کر لیا تھا اور لاش کی تصویریں بھی لی جا چکی تھیں اس لیے اسے الٹنے پلٹنے میں کوئی حرج نہیں تھا میں نے سب سے پہلے اس کے لباس کی تلاشی لی۔ کوٹ کی جیب سے ایک بٹوا نکلا اور اس میں سوائے چند سو ڈالرز کے کچھ نہیں تھا۔ نہ ڈرائیونگ لائسنس اور نہ سوشل سیکیورٹی کارڈ اور نہ ہی کوئی کریڈٹ یا ڈیبٹ کارڈ۔ ایک جیب سے چابیوں کا ایک بڑا گچھا برآمد ہوا جو یقیناً اس ولا کی تھیں اور بٹلر کی حیثیت سے ان کو سنبھالنا ایڈورڈ کی ذمے داری تھی۔ اس کے جسم پر مزید کوئی نشان نہیں تھا اور اس نے جو گولی چلائی تھی وہ بھی سر کے اندر ہی تھی۔ میں زخم کا معائنہ کر رہا تھا کہ مجھے لگا جیسے اس نے حال ہی میں بال ترشوائے ہوں، یہ چھوٹے اور سر سے چپکے ہوئے بال تھے۔ اس کا ماتھا بال اڑنے سے فراخ ہو گیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ کے ناخنوں کا معائنہ کیا لیکن وہ بھی صاف ستھرے اور نفاست سے ترشے ہوئے تھے۔ میں نے فارنسک انچارج سارجنٹ بینسن سے کہا۔ ''اس کے خون کا ٹیسٹ کرا کے مجھے جلد از جلد رپورٹ دو۔''

''کل صبح تک مل جائے گی۔'' اس نے بے نیازی سے کہا اور اپنے عملے سمیت رخصت ہو گیا۔ طبی عملہ بھی لاش لے کر رخصت ہو گیا۔ اب وہاں میں اور بوش تھے یا پٹرول آفیسر کارمیگن اور اس کا ساتھی ..... میں لان میں آیا اور فرائڈ سے کہا۔

''میں ایڈورڈ کی رہائش گاہ دیکھنا چاہتا ہوں۔''

وہ مجھے اور بوش کو ولا کے عقبی حصے میں لایا۔ یہاں دو کمرے ایڈورڈ کے لیے مخصوص تھے۔ ان میں ایک اس کا بیڈروم تھا اور دوسرا لیونگ روم .... مجھے خیال آیا کہ جب اسے ذاتی لیونگ روم میسر تھا تو اس نے ولا کے لیونگ روم میں خودکشی کیوں کی؟ لیونگ روم تھوڑے لیکن بیش قیمت فرنیچر سے سجا ہوا تھا۔ البتہ بیڈروم میں ایک معمولی سا بیڈ اور ایک الماری کے سوا کچھ نہیں تھا۔ میں نے بوش کو بیڈ کی تلاشی لینے کو کہا اور خود الماری کی طرف بڑھا۔ یہ تین پٹوں والی الماری تھی اور اس کے سارے دروازے لاک تھے۔ میں نے ایڈورڈ کے پاس سے ملنے والی چابیاں نکالیں اور انہیں الماری کے لاک میں آزمانے لگا لیکن ان میں سے کوئی چابی اس میں نہیں لگی۔

''اس کی چابیاں کہاں ہیں؟'' میں نے فرائڈ کی طرف دیکھا۔

''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' اس نے پریشان ہو کر کہا۔ ''یہ ایڈورڈ کا کمرا ہے اور وہی چابیاں کہیں رکھ سکتا ہے۔''

میں نے لاش کی مکمل تلاشی لی تھی۔ پھر اس کمرے کو بھی کھنگال ڈالا اور لیونگ روم کو بھی دیکھ لیا لیکن الماری کی چابیاں کہیں نہیں تھیں۔ بوش نے خیال ظاہر کیا۔ ''ممکن ہے ایڈورڈ نے ولا میں کہیں رکھ دی ہوں۔''

''ہمیں اسٹڈی میں دیکھنا چاہیے۔'' میں نے ایک خیال کے تحت کہا اور ہم فرائڈ کی راہنمائی میں اسٹڈی میں آئے۔ یہ خاصی بڑی اور آراستہ اسٹڈی تھی۔ چاروں طرف الماریوں میں کتابیں سجی تھیں۔ میں نے دیکھا کہ میز کی ایک دراز سے چابیوں کا ایک گچھا جھول رہا ہے۔ دراز کی چابی لگی تھی اور باقی چابیاں مجھے ایڈورڈ کی الماری کی لگ رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں ربر کے باریک دستانے تھے اس لیے میں نے بلا جھجک چابیاں نکال لیں۔ دراز کے علاوہ اس میں ایک جیسی ساخت کی تین چابیاں تھیں۔ اس کے ساتھ ایک کی ہولڈر تھا جس کی پشت کے سرے پر مرسیڈیز کا مونوگرام بنا ہوا تھا۔

''کیا یہی ایڈورڈ کی چابیاں ہیں؟''

فرائڈ نے شانے ہلائے۔ ''شاید..... میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں نے کبھی اس کی چابیوں کو دیکھا نہیں ہے۔''

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔'' میں نے کہا اور ہم واپس ایڈورڈ کے کمرے میں آئے اور جب .... الماری پر چابیاں

آزمائیں تو اس کے تالے کھل گئے۔ ایک خانے میں اس کے کپڑے رکھے تھے، میں نے تمام کپڑے ایک ایک کر کے نیچے گرا دیے۔ اس خانے میں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ دوسرے خانے میں کپڑوں کے ساتھ کچھ دستاویزات بھی ملی تھیں، یہ ایڈورڈ کے سرٹیفکیٹس تھے۔ اس نے ایک اچھے ادارے سے بٹلر کا کورس کیا ہوا تھا اور یہ کورس ڈپلوما کے برابر تھا۔ وہ آج سے بیس سال پہلے فرائڈ کی ملازمت میں آیا تھا اور اس سے پہلے اس نے صرف تین سال ایک خاتون مارتھا رچل کے پاس ملازمت کی تھی۔ مارتھا نے اسے سرٹیفکیٹ بھی دیا تھا۔ لیکن اس خانے میں نہ تو اس کا سوشل سیکیورٹی کارڈ تھا اور نہ ہی مزید کوئی اور دستاویز تھی۔ وہ بڑی خاموش اور تقریباً روپوشی کی زندگی گزار رہا تھا۔ فرائڈ اسے تنخواہ نقد دیتا تھا اور ظاہر ہے وہ اس پر ٹیکس بھی ادا نہیں کرتا ہوگا۔ سوشل سیکیورٹی نہ ہونے کا ایک مطلب یہ بھی تھا۔ الماری سے نقد رقم بھی نہیں ملی تھی۔ میں نے فرائڈ سے پوچھا۔

''تم تنخواہ اسے نقد کیوں دیتے تھے؟''

''اس کے اصرار پر۔'' فرائڈ نے توقع کے مطابق جواب دیا۔ ''اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں تھا۔''

''اس کا مطلب ہے وہ ٹیکس چوری کرتا تھا؟''

فرائڈ پریشان نظر آنے لگا۔ ''دیکھو وہ میرا ملازم تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ میں اس کے ہر فعل کا ذمے دار ہوں۔''

''ہم تمہیں ذمے دار ٹھہرا بھی نہیں رہے ہیں۔'' بوش نے اسے تسلی دی۔ اسی اثنا میں میرے موبائل فون کی گھنٹی بجی۔ یہ روزی تھی۔ میں لیونگ روم میں آ گیا اور کال ریسیو کی تو روزی نے کاٹ دار لہجے میں کہا۔

''پائی تم کہاں ہو؟''

''ہنی میں دفتر سے نکلنے والا تھا کہ.....''

''کوئی کیس آ گیا۔'' اس کا لہجہ مزید سرد ہو گیا۔ ''ابھی تم کہاں ہو؟''

''نارتھ ویسٹ میامی۔'' میں نے کمزور لہجے میں کہا۔

''چھ بج کر پانچ منٹ ہو رہے ہیں..... اگر تم ابھی وہاں سے نکلو تو سات بجے سے پہلے گھر نہیں آ سکتے اور جہاں ہمیں جانا ہے وہ جگہ بھی پون گھنٹے کی ڈرائیو پر ہے۔ یقیناً تم ابھی وہاں سے فوراً نہیں نکل سکو گے۔''

''ہنی مجبوری ہے.....'' میں نے کہنا چاہا۔

''سوائے بیوی کے ساری دنیا تمہاری مجبوری ہے۔'' اس نے کہا اور فون بند کر دیا۔ میں نے گہری سانس لی اور ایڈورڈ

کو دل ہی دل میں کوسا جس نے خودکشی کے لیے یہ وقت منتخب کیا تھا اگر وہ دو گھنٹے کی تاخیر سے خودکشی کرتا تو میں اس مشکل میں نہ پڑتا۔ مجھے معلوم تھا روزی کا موڈ کئی دن تک خراب رہے گا۔ میں ایڈورڈ کے بیڈ روم میں واپس آیا اور فرائڈ سے کہا۔ ''یہ حصہ اور تمہارے ولا کا لیونگ روم فی الحال سیل ہوگا اور اس حصے میں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوگی۔''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے جان چھوٹنے پر گویا سکھ کا سانس لیا۔

مجھے الماری کے تیسرے پٹ کا خیال آیا اور میں نے اسے کھولا۔ اس حصے میں دو عدد درازیں اور کچھ خانے تھے لیکن ان میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ کوئی تصویر اور نہ ہی کوئی کاغذ، پرفیوم کی ایک عدد شیشی تھی جس میں زرد سیال ہلکورے لے رہا تھا۔ اس حصے کی تلاشی لیتے ہوئے میں دل ہی دل میں حساب لگا رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر اگر میں ہائی وے کا راستہ پکڑوں تو چالیس منٹ میں گھر پہنچ سکتا تھا اور اس کے بعد دس منٹ میں روزی کو منا کر ہم باہر جا سکتے تھے۔ دس منٹ کی مشکل ہوتی اس کے بعد مجھے کئی دن کا سکون مل جاتا۔ میں نے الماری کے پٹ دوبارہ سے لاک کیے اور فرائڈ سے کہا۔

''کل میں تمہارا تفصیلی بیان لوں گا۔''

''میں تمہیں ملوں گا۔'' اس نے کہا۔ میں اور بوش باہر آئے میں نے آفیسر کاریگن سے کہا۔

''ایڈورڈ کا رہائشی حصہ اور وقوعہ والی جگہ سیل کر دو اور اپنی رپورٹ ہومی سائڈ کو روانہ کر دینا۔''

''یس سر۔'' اس نے کہا اور ہم باہر آ گئے۔ بوش سوچ میں گم تھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''ہم نے کیس کچھ زیادہ جلدی نہیں بھگتا دیا؟'' اس نے کہا۔

میں لیفٹیننٹ کارل کو رپورٹ کرنے جا رہا تھا لیکن بوش کی بات سن کر میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ ''کیا مطلب..... کیا تم نے کوئی خاص بات محسوس کی ہے؟''

''نہیں کیس تو خودکشی کا ہی لگ رہا ہے لیکن تم نے محسوس نہیں کیا کہ یہ کچھ زیادہ ہی صاف شفاف کیس ہے.... کہیں شک کا کوئی دھبا نہیں ہے؟''

''سچی بات ہے میرے ذہن پر روزی سوار ہے اور میں اس بارے میں زیادہ سوچنا نہیں چاہتا۔'' میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ''میری ایک بات یاد رکھو کہ کام اہم ہوتا ہے لیکن ازدواجی معاملات اس سے زیادہ اہم ہوتے ہیں۔''

بوش مسکرانے لگا، وہ ابھی نوجوان تھا اور جوشیلا بھی تھا لیکن ہماری اچھی انڈر اسٹینڈنگ تھی۔ ''تمہارا مطلب ہے کہ کام کہیں بھاگا نہیں جا رہا ہے لیکن وقت نکل گیا تو بیوی کو منانا مشکل ہو جائے گا۔''

میں ہنسا۔ ''اب تم سمجھ گئے ہو۔''

میں نے بوش کو راستے میں ایک جگہ اتارا اور پھر ہر ممکن تیزی سے ڈرائیو کرتا ہوا گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مجھے امید تھی کہ روزی ابھی تک تیار ہو گی اور اس نے لباس نہیں بدلا ہو گا۔ میرا اندازہ درست نکلا، وہ مکمل تیاری اور غضب کی حالت میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسے منانے میں مجھے دس منٹ لگے اور اس کے بعد ہم سالگرہ منانے کے لیے روانہ ہو گئے اور رات جب واپس آئے تو روزی کا موڈ بہت خوش گوار تھا۔ اپنی تگ و دو کا مجھے بہت اچھا صلہ ملا تھا۔

صبح میں دفتر پہنچا تو ایڈورڈ کی پوسٹ مارٹم اور لیب کی رپورٹ آ گئی تھی۔ پوسٹ مارٹم کی رپورٹ میں سوائے اس کے اور کوئی خاص بات نہیں تھی کہ ایڈورڈ کی موت تین بج کر تیس منٹ سے تین بج کر چالیس منٹ کے درمیان ہوئی تھی۔ گویا جس وقت فرائڈ نے لاش دریافت کی ایڈورڈ نے اس سے کچھ دیر ہی پہلے خود کو شوٹ کیا تھا۔ لیب کی رپورٹ البتہ کام کی تھی۔ ایڈورڈ کے خون میں الکوحل کی بہت زیادہ مقدار پائی گئی تھی جس وقت اس نے خودکشی کی وہ نشے میں تھا۔ میں کیس کی کڑیاں آپس میں جوڑنے لگا۔ ابھی تک بوش نہیں آیا تھا۔ اس کا ڈیوٹی پر آمد کا وقت صبح دس بجے ہوتا تھا۔ کاریگن کی رپورٹ بھی آ گئی تھی لیکن اس میں کوئی بھی خاص بات نہیں تھی اور بہ ظاہر یہ خودکشی کا کیس لگ رہا تھا۔ میں نے اپنے پاس موجود ایڈورڈ کی الماری کی چابیاں دفتر میں آتے ہی نشانات اتارنے کے لیے لیب بھیج دی تھیں۔ بوش کے آنے تک مجھے اس کا نتیجہ مل گیا۔ پھر میں نے اب تک حاصل شدہ معلومات کا تجزیہ کیا اور اس کے بعد میں نے بوش کو کال کی۔

''پارکنگ میں آ جاؤ۔''

''کیوں؟'' اس نے اعتراض کیا۔ ''ابھی تو میں دفتر آیا ہوں۔''

''میں تم سے کئی بار کہہ چکا ہوں کہ کام کرنے کا بہترین وقت صبح کا ہوتا ہے اور ہم فرائڈ کے پاس چل رہے ہیں۔''

میں پارکنگ میں پہنچا تو بوش وہاں کھڑا جماہیاں لے رہا تھا، اس نے رات یقیناً کہیں مصروف گزاری تھی اور اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔ ہم فرائڈ کے ولا کی طرف روانہ ہوئے۔

میں نے ایک پولیس کار کو وہاں پہنچنے کی ہدایت کی تو بوش چونکا۔ ''لگتا ہے کوئی خاص بات ہے؟''

''خاص بات تو ہے۔'' میں نے نارتھ ویسٹ کی طرف جانے والی سڑک پر مڑتے ہوئے کہا۔

''کیا یہ خودکشی نہیں ہے اور فرائڈ نے اپنے بٹلر کو قتل کیا ہے؟''

''تمہارا کیا خیال ہے؟'' میں نے اس سے سوال کر لیا۔

''میں نے کہا نا کہ معاملہ کچھ زیادہ ہی صاف لگ رہا ہے لیکن کل تم نے میری بات پر دھیان نہیں دیا تھا۔'' اس نے شکوہ کیا۔

''شام کا وقت کام کے لیے یقیناً اچھا نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔

''لیکن زیادہ تر قاتل پکڑے بھی اسی وجہ سے جاتے ہیں کیونکہ اس وقت کیے جانے والے قتل اپنے پیچھے کوئی نہ کوئی سقم چھوڑ جاتے ہیں جو قاتل کی طرف اشارہ کرتے ہیں، اس کے... برعکس صبح کے وقت کیے جانے والے قتل بہت کم پولیس کی گرفت میں آتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔ حالانکہ کل شام وہ بہت پُرجوش ہو رہا تھا اور میرا اس کے برعکس حال تھا۔ جیسا کہ اس وقت میں چاق و چوبند تھا اور وہ بیزار تھا۔ ''اب اس کیس کے بارے میں بتاؤ۔''

''اس میں کئی ایسی چیزیں ہیں جو مشکوک ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک تو ایڈورڈ کے پاس سے کوئی شناختی چیز نہیں نکلی ہے۔''

''یہ کوئی مشکوک بات نہیں ہے۔ بہت سارے لوگ ڈرائیونگ نہیں کرتے..... اس لیے وہ ڈرائیونگ لائسنس بھی نہیں بنواتے ہیں اور اسے سوشل سیکیورٹی گارڈ بنوانے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ ٹیکس ادا نہیں کرنا چاہتا تھا اور اس لیے اسے پنشن بھی نہیں ملتی۔''

''دوسرے اس نے اپنی ذاتی چابیوں میں اس دراز کی چابی کیوں لگا رکھی تھی جس میں فرائڈ کا پستول رکھا ہوا تھا؟''

''یہ بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ کئی بار اسے ولا کی چابیاں کہیں رکھنا پڑتی ہوں گی لیکن محافظ کی حیثیت سے پستول ہمہ وقت اس کی تحویل میں ہونا چاہیے اس لیے اس نے دراز کی چابی اپنی ذاتی چابیوں کے ساتھ لگا لی۔''

''اس کے پاس ولا میں ذاتی جگہ موجود تھی اور آدمی خودکشی جیسا کام ہمیشہ اپنے ماحول میں کرنا پسند کرتا ہے لیکن وہ ولا کے ایک لیونگ روم میں مُردہ پایا گیا۔''

''میرے خیال میں تو مرنے والے آدمی کو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا..... کہ وہ کہاں مر رہا ہے۔''

''ایک اہم بات اور ہے جسے کل ہم نے نظر انداز کر دیا تھا۔ لیکن یہ بات میں وہیں پہنچ کر بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

بوش مسکرایا۔ ''یعنی روایتی جاسوس کی طرح سسپنس پھیلاؤ گے۔''

ہم جلدی فرائڈ کے ولا پر پہنچ گئے وہاں پولیس کار پہلے سے باہر موجود تھی۔ میں نے اس میں موجود پولیس والوں سے کہا۔ ''جیسے ہی تمہیں ریڈیو پر اشارہ ملے، اندر آ جانا۔''

''ٹھیک ہے۔'' ایک پولیس افسر نے کہا۔

ہم اندر آئے۔ کال بیل کا بٹن دبانے پر فرائڈ خود آیا... ہمیں دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''مسٹر کارک، ہم تمہارا بیان لینے آئے ہیں۔''

''اندر آ جاؤ۔'' اس نے کہا اور ہمیں پاس کی نشست گاہ میں لے آیا۔ یہاں شاندار قسم کے وکٹورین اسٹائل کے صوفے تھے۔ میں نے بیٹھتے ہی سوالات کا آغاز کر دیا۔

''مسٹر کارک! تمہارے خیال میں ایڈورڈ نے اپنے رہائشی حصے میں خودکشی کرنے کے بجائے اس کام کے لیے ولا کے ایک لیونگ روم میں یہ کام کیوں کیا؟'' میرے اچانک سوال پر وہ گڑبڑا گیا۔

''وہ..... میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''اس کے پاس کوئی شناختی چیز موجود نہیں ہے، تم نے کیسے یقین کر لیا کہ وہی ایڈورڈ ہے۔''

''وہ ایڈورڈ کیوں نہیں ہو سکتا؟'' اس نے الٹا سوال کیا۔

''اس کے پاس اس کے سرٹیفکیٹس تھے۔''

''لیکن اس کے پاس کوئی شناختی چیز نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی اس پر توجہ نہیں دی۔'' فرائڈ نے بے پروائی سے کہا۔ ''مجھے اس پر اعتماد تھا اور اس نے بھی میرے اعتماد کو ٹھیس نہیں پہنچائی۔''

''تمہاری اسٹڈی کی دراز کی چابی اس نے اپنے ذاتی چابیوں کے گچھے میں لگا رکھی تھی، کیوں؟''

''اس بارے میں، میں کیا کہہ سکتا ہوں؟''

''کیا یہ بات تمہارے علم میں تھی؟''

''نہیں۔'' اس نے مختصر جواب دیا۔

''تم اسے تنخواہ ہمیشہ نقد دیتے تھے؟''

''ہاں میں نے کل بھی بتایا تھا، اس کا کوئی بینک اکاؤنٹ نہیں ہے۔'' فرائڈ کا لہجہ ذرا تیز ہو گیا۔

''ٹھیک ہے، تم اسے تنخواہ نقد دیتے تھے۔ اس نے بیس سال تمہارے پاس کام کیا ہے اور یقیناً تم اسے اچھی تنخواہ دیتے ہو گے۔ کم سے کم پچاس ہزار سالانہ دیتے ہو گے؟''

''اٹھاون ہزار ڈالرز سالانہ۔'' فرائڈ نے مرے ہوئے انداز میں کہا۔ ''بٹلر عام طور سے اس سے زیادہ ہی لیتے ہیں۔''

''اٹھاون ہزار ڈالرز سالانہ اچھی خاصی رقم ہے اور اس کا کوئی خاص خرچ بھی نہیں ہو گا؟''

''ہاں، رہائش اور اس کے بلز میری ذمے داری تھے۔ کھانا بھی میرے اخراجات میں شامل تھا۔''

''تم نے بتایا کہ اسے جوئے، شراب یا عورت کا شوق نہیں تھا، اس لحاظ سے اس کے پاس کئی لاکھ ڈالرز کی جمع پونجی ہونی چاہیے۔ لیکن کیا وجہ ہے کہ اس کے پاس سے نہ تو کوئی رقم نکلی اور نہ ہی کوئی ایسی چیز جس سے پتا چلے کہ اس نے کہیں سرمایہ کاری کر رکھی ہے؟''

فرائڈ ایک لمحے کے لیے ششدر رہ گیا پھر اس نے سنبھل کر کہا۔ ''میں اس بارے میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ میں اس کے معاملات میں دخل نہیں دیتا تھا۔''

''تم نے بتایا کہ تم نے کبھی اس کی چابیاں نہیں دیکھیں اور تمہیں نہیں معلوم تھا کہ اسٹڈی کی دراز والی چابی اس کی ذاتی چابیوں کے گچھے میں تھی؟''

''درست ہے۔'' اس نے بیزاری سے کہا۔

''اس کا مطلب ہے ان چابیوں پر صرف ایڈورڈ کی انگلیوں کے نشانات ہونے چاہئیں؟''

میرے اس سوال پر فرائڈ کا رنگ سفید ہو گیا اور اس نے اچانک اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن بوش تیار تھا اس نے اسے نشست گاہ کے دروازے پر پہنچنے سے پہلے جکڑ لیا اور پھر اس کے ہاتھ میں ہتھکڑی ڈال دی۔ یہ کام کر کے اس نے باہر موجود پولیس والوں کو طلب کیا اور مجھ سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ اس نے اپنے بٹلر کو قتل کیا ہے تاکہ اس کی جمع پونجی ہتھیا سکے۔''

''مسٹر کارک کو یہ گھٹیا کام کرنے کی ضرورت نہیں تھی کیونکہ وہ اس ملین ڈالرز ولا کا مالک تھا۔''

بوش نے میرے الفاظ پر غور کیا۔ ''کیا.... مطلب؟..... یہ ابھی بھی ہے۔''

''افسوس کہ تم اب بھی نہیں سمجھے۔'' میں نے سر ہلایا۔

''برخوردار! یہ خود بٹلر ہے اور اس نے اپنے مالک کو قتل کیا ہے۔ کیوں مسٹر ایڈورڈ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟''

لیکن وہ جواب دینے کے بجائے اپنے ہونٹ کاٹتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ہمارے تمام سوالوں کا جواب خاموشی سے دیا۔ البتہ اس شام تک اس نے پولیس اسٹیشن میں اپنے جرم کا اقرار کر لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ بیس سال سے فرائڈ کے پاس ملازم تھا لیکن اس نے اس کی خدمات کی پروا کیے بغیر اسے ملازمت سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کساد بازاری میں اسے دوسری ملازمت کہاں ملتی۔ پھر اسے فرائڈ کے رویّے کا بھی دکھ تھا اس نے اسے قتل کر کے اس کی جگہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اتنے عرصے اس کے ساتھ رہ کر وہ اس کے سارے معمولات سے واقف ہو گیا تھا۔ اس نے فرائڈ کے سائن کی مشق کر لی تھی۔ اس کے ڈیبٹ کارڈ اور انٹرنیٹ بینکنگ کے پاس ورڈ جان گیا تھا۔ فرائڈ اس ولا کو بیچ رہا تھا۔ وہ سارا کام خود سامنے آئے بغیر کر رہا تھا اس لیے ایڈورڈ کے لیے اس کی جگہ سنبھال کر ولا فروخت کر دینا اور رقم لے کر کہیں اور چلے جانا آسان تھا۔

فرائڈ کا کوئی قریبی رشتے دار نہیں تھا اور نہ ہی اس کا کوئی ایسا دوست تھا جو اس سے ملنے آتا۔ اس لیے ایڈورڈ نے اسے راہ سے ہٹانے کا سوچ لیا۔ اس نے پہلے فرائڈ کو تیز شراب دی اور جب وہ نشے میں دھت ہو گیا تو اس نے اس کے بال تراش کر بٹلر کی طرح چھوٹے کر دیے اور اس دوران میں وہ خود اپنے بال بڑھا چکا تھا۔ بال تراشنے کے بعد اسے صاف کر کے اور اپنا لباس پہنا کے ایڈورڈ نے اسے لیونگ روم کے کاؤچ پر ڈالا اور پستول اس کے ہاتھ میں پھنسا کر اس کی کن پٹی پر گولی مار دی۔

اس سے چند غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو اس نے اپنی جمع پونجی اپنی الماری سے غائب کر دی کہ وہ پولیس کی تحویل میں نہ جائے دوسرے اس نے اسٹڈی کی دراز کی چابی اپنے ذاتی گچھے میں لگا دی جو اصول کے خلاف تھی اور پھر اپنے کاغذات بھی غائب کر دیے جن پر اس کی تصویر ہو سکتی تھی۔ اس نے ڈرائیونگ کے بارے میں جھوٹ بولا کہ اس کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں ہے اور اس کے چابیوں کے گچھے میں بھی مرسیڈیز کا لوگو لگا ہوا تھا۔ اسے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ممکن ہے وہ شام کے بجائے صبح کے وقت یہ کام کرتا تو اس سے اتنی غلطیاں نہ ہوتیں اور وہ صاف بچ نکلتا۔ دو ہفتے بعد اسے ایک جیوری نے فرسٹ ڈگری مرڈر قرار دے دیا تھا۔

قسط 30

اسما قادری

ہمارے سماج میں قانون کتابوں میں لکھا ہوا ہے جب اس کی باگ ڈور ہاتھ سماج کے روایتی نظام تک پہنچتی ہے تو اس کے معنی ہی بدل کے رہ جاتے ہیں..... مختلف طبقات میں تقسیم اس نظام قانون کے بھی کئی رخ ہیں ، بالا تر طبقے کی خوشنودی ہی قانون کی اصل تعریف و تشریح ٹھہرتی ہے..... یہ تشریح کتابوں میں نہیں، روایتوں میں تحریر ہوتی ہے..... ایسی روایتیں جس میں قانون سب کے لیے ایک جیسا نہیں بلکہ سمندر اور جال کا سا ہے جہاں طاقتور مچھلی جال کو توڑ کر اور کمزور مچھلی بچ کر نکل جاتی ہے ۔ پھنستا وہی ہے جو درمیانے طبقے سے ہو۔ محبت نہ تو روایتوں کو مانتی ہے..... نہ طبقوں میں تقسیم معاشرے کا تجزیہ کر کے محبوب کا انتخاب کرتی ہے، یہ تو بس ہوجاتی ہے۔ دل طبقوں کی پروا کرتا ہے اور نہ ہی طاقت اس کا راستہ روک سکتی ہے البتہ اسے آزمائشوں سے ضرور گزرنا پڑتا ہے ۔ زندگی کی بساط اور وقت کے دھارے سب قسمت کی باتیں اور مقدر کی چالیں ہیں..... کبھی بازی پلٹ بھی جاتی ہے ۔ بیتا وقت لوٹ تو نہیں سکتا مگر مقدر ساتھ دے جاتا ہے..... اس وقت تک پلوں کے نیچے سے بہت سا پانی گزر چکا ہوتا ہے..... جرم ،افسرشاہی ،جاگیرداری اور پیار کے محور کے گرد گھومتا آزمائشوں کا ایک ایسا ہی لامتناہی سلسلہ

تقدیر کی فسوں گری، قسمت کی چالبازی یا مقدر کا کھیل..... بنے اور بگڑ جانے والوں کی کہانی

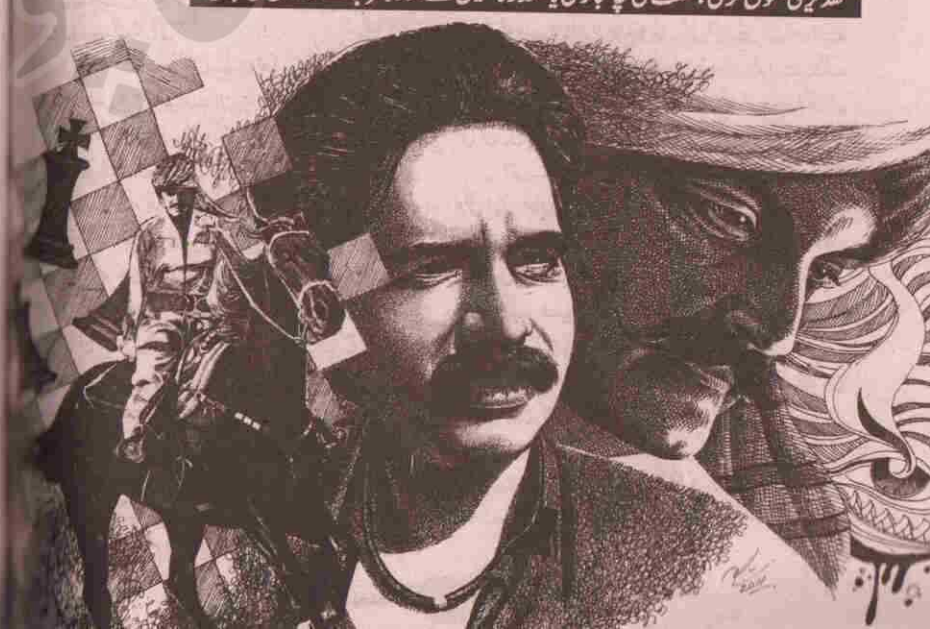

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

بارسوخ خاندان سے تعلق رکھنے والا شہریار عادل ایک پرجوش جوان ہے جس کی بطور اسسٹنٹ کمشنر پہلی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ اس کے زیرنگیں ضلع کے سب سے بڑے گاؤں پیر آباد کا چودھری افتخار عالم شاہ ایک روایتی جاگیردار ہے جو شہریار کو اپنے ڈھب پر چلانے میں کامیاب نہیں ہوتا ہے اور دونوں کے درمیان مخاصمت کا آغاز ہوجاتا ہے۔ پیر آباد کا رہائشی ماسٹر آفتاب جو عرصے سے گاؤں کے پرائمری اسکول کی ترقی کا خواہش مند ہوتا ہے، شہریار کا سہارا پاکر کھل کر اپنے مشن پر کام کرنے لگتا ہے۔ چودھری کی نفاست پسند بیٹی کشور، آفتاب کو دیکھتی ہے تو اس کی محبت میں مبتلا ہوجاتی ہے۔ آفتاب اور کشور خفیہ نکاح کر لیتے ہیں۔ ماہ بانو کا تعلق بھی پیر آباد سے ہے۔ چودھری افتخار جب ماہ بانو کو دیکھتا ہے تو اس پر اس کا دل آجاتا ہے اور وہ ماہ بانو کی عزت پامال کرنے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ چودھری کے چنگل سے نکل کر بھاگ جانے میں کامیاب ہوجاتی ہے۔ شہریار اپنے ڈرائیور مشابرم خان کے مشورے پر ماہ بانو کو کاندے منتقل کردیتا ہے۔ کچھ لوگ ماہ بانو کو اغوا کرلیتے ہیں۔ گورا جس کا نام ڈیوڈ ہے، اصل میں موساد کا ایجنٹ ہے۔ وہ چودھری کو ماہ بانو کا لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیتا ہے۔ ادھر کشور آفتاب کے کہنے پر حویلی چھوڑ دیتی ہے۔ ماہ بانو عمران نامی لڑکے کے ساتھ دشمنوں کی قید سے بھاگ نکلتی ہے۔ چودھری، ماسٹر آفتاب کو اغوا کرا لیتا ہے۔ ماہ بانو برف زار میں بھٹکتے بھٹکتے بے ہوش ہوجاتی ہے اور اس دوران اسے ایک مہربان شخص مل جاتا ہے جو کلا مخبر ہوتا ہے، وہ اسے اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ شہریار ماسٹر آفتاب کو چھڑانے کے لیے جکو کا سہارا لیتا ہے اور جکو آفتاب کو چودھری کے چنگل سے نکال لاتا ہے۔ ماہ بانو آرمی کسٹڈی میں پہنچ جاتی ہے۔ شہریار ماہ بانو کو چھڑا کر کراچی منتقل کردیتا ہے۔ ادھر چودھری کے کارندے بابر کو مار کر آفتاب اور کشور کا پتا لگا لیتے ہیں لیکن وہ وہاں سے نکل چکے ہوتے ہیں۔ مہاگرو (ورما) کے لوگ ورما کو اسپتال سے نکال لے جاتے ہیں۔ لیاقت رانا پر قاتلانہ حملے کی خبر سن کر شہریار پریشان ہوجاتا ہے اور انہیں دیکھنے کے لیے لاہور جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ راستے میں ڈاکٹر ماریا کی طبیعت کی خرابی کے باعث انہیں ایک چھوٹے سے ہوٹل میں مختصر قیام کرنا پڑتا ہے اور اس قیام کے دوران وہ ماریا کے قریب ہوجاتا ہے۔ ماہ بانو ایک بار پھر چودھری کے ہتھے چڑھ جاتی ہے۔ شہریار ماریا سے شادی کرلیتا ہے۔ اشرف شاہ ماہ بانو کو چودھری کی قید سے نکال کر ڈاکوؤں کے پاس پہنچا دیتا ہے۔ وہاں موجود ڈاکو اسلم ماہ بانو کو پسند کرنے لگتا ہے۔ آفتاب شہریار کو فون کرکے اسے را کے ایجنٹ کی اسلام آباد میں موجودگی کا بتاتا ہے۔ غلام محمد نامی ایجنٹ پکڑا جاتا ہے۔ شہریار، مشابرم خان اور فورس کی مدد سے اس پر قابو پاتا ہے۔ آفتاب اور کشور میرپورخاص آجاتے ہیں۔ شہریار جکو کو فون کرکے چودھری کی مرمت کرانا چاہتا ہے۔ عبدالمنان شہریار کو بتاتا ہے کہ ماہ بانو ڈاکوؤں کے پاس ہے۔ شہریار، مختار مراد کو ٹیلی فون کرکے جنگل میں آپریشن پر زور دیتا ہے۔ آفتاب کے ہاں ایک لڑکی کی پیدائش ہوتی ہے۔ ماہ بانو کو اسلم کے ذریعے شہریار کی شادی کی اطلاع ملتی ہے تو وہ صدمے سے بے ہوش ہوجاتی ہے۔ ماہ بانو اسلم کو شادی کی آفر کرتی ہے مگر ساتھ میں شرط رکھتی ہے کہ وہ ڈاکوؤں کا ساتھ چھوڑے اور عزت کی زندگی گزارے، تب وہ اس سے شادی کرے گی۔ چودھری چراغ پا ہوجاتا ہے اور آفتاب اور کشور کا سراغ لگانے کا حکم دیتا ہے۔ وہ چھوٹی چودھرائن ناہید کو حویلی کی ذمے داریاں دے دیتا ہے جبکہ بڑی چودھرائن کو تہ خانے میں قید کروا دیتا ہے۔ ادھر اسلم اور ماہ بانو ڈاکوؤں کی پناہ گاہ سے بھاگنے کا پروگرام بنا رہے ہوتے ہیں، للی زبردستی ان کے ساتھ شامل ہوجاتی ہے۔ چودھری کے گرگے آفتاب کو ڈھونڈنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں اور اسپتال پر دھاوا بول دیتے ہیں تاہم آفتاب اور کشور وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہوجاتے ہیں مگر اس افراتفری میں ان کی نوزائیدہ بچی وہیں رہ جاتی ہے۔ چودھری کے آدمی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ وہ بچی کو لے کر نکل رہے ہوتے ہیں کہ راستے میں ہتھیار بردار افراد انہیں دبوچ لیتے ہیں اور بچی کو ان سے لے لیتے ہیں۔ ادھر ماہ بانو، اسلم اور للی ڈیرے سے بھاگ نکلتے ہیں۔ پولیس ڈیرے پر آپریشن کرکے تمام ڈاکوؤں کو گرفتار کرلیتی ہے تاہم ماہ بانو کی بازیابی ممکن نہیں ہوتی اور دو ڈاکو اسلم اور جبرو بھی ہاتھ نہیں آتے۔ ادھر آفتاب شبانہ کو فون کرکے اپنی بچی کے بارے میں دریافت کرتا ہے اور موجودہ صورت حال کا سن کر اسے افسوس ہوتا ہے۔ جکو کی زبانی شہریار کو پتا چلتا ہے کہ آفتاب پر چودھری کے گرگے دھاوا بول دیتے ہیں تاہم جکو کے آدمی ان کی تمام کوششیں ناکام بنا کر آفتاب کی بچی کو اپنے قبضے میں لے لیتے ہیں۔ شہریار اس خبر پر خوش ہوتا ہے۔ ادھر ڈیوڈ پیسوں کا لالچ دے کر چودھری کو اس کے جوتے کے کارخانے میں ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب قائم کرنے پر آمادہ کرلیتا ہے۔ اسلم، ماہ بانو اور للی سفر کے دوران ایک جگہ رکتے ہیں۔ وہاں جبرو پہنچ جاتا ہے اور اسلم اور جبرو کے درمیان خونی تصادم ہوتا ہے۔ للی اس تصادم میں جبرو کی گولی کا شکار بنتی ہے۔ جبرو، اسلم کے چاقو کا شکار ہوکر اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ ادھر شبانہ آفتاب کی مدد کرنے کے چکر میں پولیس کے ہاتھوں دھرلی جاتی ہے اور اپنی آبرو کھو بیٹھتی ہے۔ وہ لوگ آفتاب کا فون نمبر پتا کرکے اس کی قیام گاہ کا پتا لگا لیتے ہیں اور چودھری سے پیسوں کے عوض اس کا پتا بتادیتے ہیں۔ آفتاب کو شہریار کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اس کی بچی خیریت سے ہے۔ ماہ بانو اور اسلم پہاڑی سلسلے میں آرام کی غرض سے رک جاتے ہیں۔ رات میں ماہ بانو کسی جانور کو دیکھ کر ڈر جاتی ہے اور ڈھلوان سے لڑھکتی جاتی ہے۔ تاہم لڑھکتے ہوئے اس کے ہاتھ میں جھاڑی آجاتی ہے اور وہ فی الحال کھائی میں گرنے سے بچ جاتی ہے۔ اسلم کسی نہ کسی طرح ماہ بانو کو بچا کر اوپر لے آتا ہے۔ وہاں ان کی ملاقات شفقت راؤ نامی شخص سے ہوتی ہے۔ وہ انہیں اپنے بہنوئی کا پتا سمجھا دیتا ہے اور ان کے لیے پناہ کا بندوبست کردیتا ہے۔ ادھر چودھری افتخار لندن پہنچتا ہے اور ہیروئن کی تیاری کے لیے لیب کے قیام والے معاملات طے کرلیتا ہے۔ ماہ بانو اور اسلم، شفقت راؤ کے بتائے ہوئے گاؤں تک پہنچ جاتے ہیں۔ وہ ماہ بانو کو تھوڑا دور ایک مقام پر چھوڑ کر اس کے بہنوئی کے پاس پہنچتا ہے اور اسے شفقت کا حوالہ دے کر اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ لوگ ماہ بانو کو لینے کے لیے اس مقام پر پہنچتے ہیں تو ماہ بانو کا نام ونشان نہیں ہوتا۔ تاہم ماہ بانو ایک چٹان کے پیچھے اسے سوتے ہوئے مل جاتی ہے۔ وہ لوگ حامد راؤ کے گھر آجاتے ہیں۔ ادھر شہریار شہزادی نامی عورت سے مردہ بچے کی ہڈیاں وصول کرنے والے شخص سے تفتیش کرتا ہے اور کافی کچھ اگلوانے میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ مراد شاہ کو ماں کے انتقال کی خبر ملتی ہے تو وہ چودھری سے اس بارے میں استفسار کرتا ہے مگر چودھری بڑی چالاکی سے اسے سمجھانے میں کامیاب ہوجاتا ہے اور اپنے آپ کو دکھی ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلم اور ماہ بانو ایک ہی کمرے میں رات گزارتے ہیں۔ صبح ان کی روانگی کا پروگرام ہوتا ہے تاہم اسلم کو ماہ بانو کی موجودگی میں کچھ بے چینی سی محسوس ہوتی ہے تو وہ رات کو اٹھ کر چھت پر چلا جاتا ہے۔ وہ باؤنڈری وال سے ہاتھ ٹکائے کھڑا ہوتا ہے کہ اچانک اسے کچھ انسانی سائے نظر آتے ہیں جو حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کررہے تھے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

اسے لگا کہ اس کی بصارت اسے دھوکا دے رہی ہے۔ وہ جس قسم کے حالات سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا، اس میں اس قسم کا فریب نظر ناممکنات میں سے بھی نہیں تھا۔ زندگی کی بقا کے لیے دشمنوں سے بھاگتا شخص تو اپنے سائے سے بھی بھڑکنے لگتا ہے اور ہر ہر آہٹ پر چونک جاتا کہ جانے دشمن کس طرف سے وار کرنے آ کھڑا ہوا ہے۔ چنانچہ حامد راؤ کے مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کرتے وہ سائے بھی اسے اگر اپنا بصری دھوکا لگ رہے تھے تو کچھ غلط نہیں تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اردگرد دیکھتا خود کو یہ یقین دلانے کی کوشش کرنے لگا کہ جو وہ محسوس کررہا ہے وہ درست نہیں ہے لیکن سایوں کی بڑھتی تعداد نے اسے یہ تسلیم کرنے پر مجبور کردیا کہ جو کچھ اسے دکھائی دے رہا ہے، وہی حقیقت ہے اور وہ کسی قسم کے اشتباہ نظر کا شکار نہیں ہوا ہے۔ اس یقین کے بعد اسے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جانے وہ کون لوگ تھے اور ان کے عزائم کیا تھے؟ اگر وہ حامد راؤ سے کسی دشمنی کے باعث اسے یا اس کے اہلِ خانہ کو نشانہ بنانا چاہتے تھے تو تب بھی وہ خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ حامد راؤ اس کا محسن تھا۔ اس شخص نے اسے اور ماہ بانو کو اپنی چھت کے نیچے پناہ دی تھی۔ وہ خود کو اس کے نمک کا مقروض سمجھتا تھا، چنانچہ یہ تو کسی طور ممکن ہی نہیں تھا کہ اپنے محسن کو مشکل حالات میں تنہا چھوڑ دے۔

چار دیواری سے دور ہٹ کر وہ تیزی سے واپس پلٹا اور سیڑھیاں اترتا چلا گیا۔ کوئی بھی قدم اٹھانے سے قبل حامد راؤ اور مقصود کو آگاہ کرنا اور ان سے مشورہ لینا ضروری تھا۔ سیڑھیاں اتر کر نیچے پہنچنے کے بعد اس کے قدم ٹھٹک سے گئے۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ حامد راؤ اور مقصود کی خواب گاہیں کون سی ہیں اور ایک ایسے گھر میں جہاں کی خواتین نے اس کے سامنے آنے سے مکمل طور پر گریز کیا تھا، وہ آزادانہ حرکت نہیں کرسکتا تھا۔ اس مسئلے پر ایک لمحہ سوچنے کے بعد اس نے اپنے اور ماہ بانو کے لیے مخصوص کی گئی خواب گاہ کا رخ کیا۔ ماہ بانو اب بھی اپنے سابقہ انداز میں سو رہی تھی لیکن اب اس کی اندرونی کیفیات بدل چکی تھیں۔ سر پر منڈلاتے خطرے کے بادلوں نے ساری لطیف حیات کو سلب کرکے بقا کی جدوجہد کرنے پر مجبور کردیا تھا چنانچہ ماہ بانو کے ہوش ربا وجود نے اس کے اندر کوئی ہلچل پیدا نہیں کی اور اس نے بیڈ کے قریب پہنچ کر ماہ بانو کا بازو پکڑ کر اسے جھنجوڑ ڈالا۔ اس طرح جگائے جانے پر وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اور خوف زدہ نظروں سے اسلم کے چہرے کو دیکھنے لگی جہاں عجیب سا ہیجان نظر آرہا تھا۔

''کک... کیا ہوا؟'' وہ بہ مشکل ہی اس سے یہ سوال کرسکی۔

''کچھ لوگ اس مکان کو گھیرے میں لینے کی کوشش کررہے ہیں۔ تم جاکر حامد راؤ اور مقصود کو جگا دو۔'' اس نے خوفناک لہجے میں اسے اطلاع دینے کے ساتھ ہدایت بھی دی۔

''کون لوگ...؟ کون ہیں وہ لوگ؟'' وہ قدرتی طور پر سراسیمہ ہوگئی۔

''مجھے نہیں معلوم؟ نہ ہی میں اس وقت ان سوالوں کا جواب دے سکتا ہوں۔ بس تم سے جو کہا ہے اس پر عمل کرو۔ میں واپس چھت پر جاکر حالات کا جائزہ لیتا ہوں۔'' اس نے جھنجلاہٹ بھرے لہجے میں جواب دیا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا۔ ماہ بانو بھی اب پوری طرح نیند کے خمار سے باہر نکل آئی تھی چنانچہ اپنا دوپٹا سنبھالتی ہوئی گھر کے اندرونی حصے کی طرف دوڑی۔ اس کا رخ انیلا اور مقصود کے کمرے کی طرف تھا کیونکہ دن کے وقت اس نے کچھ دیر اسی کمرے میں آرام کیا تھا، اس لیے اچھی طرح جانتی تھی کہ یہ خواب گاہ ان دونوں کے زیرِ تصرف ہے۔ خواب گاہ کے دروازے پر پہنچ کر اس نے زوردار دستک دی۔ اندر سے فوراً ہی ردِعمل ظاہر ہوا۔

''کون؟'' نیند کے خمار میں ڈوبی یہ آواز انیلا کی تھی۔

''میں ماہ بانو ہوں انیلا۔ ذرا مقصود بھائی کو جلدی سے باہر بھیج دو۔'' اس نے وقت ضائع کیے بغیر اپنی آمد کا مقصد بتایا۔ جواب میں اندر سے کچھ آہٹیں سنائی دیں اور ایک منٹ سے بھی کم وقفے میں دروازہ کھول دیا گیا اور مقصود کا چہرہ نظر آیا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں نیند کی سرخی تھی۔ یقینی طور پر وہ گہری نیند سے جاگا تھا۔ مقصود کے پیچھے ہی حیران پریشان سی انیلا کھڑی تھی۔

''مجھے اسلم نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ کچھ لوگ آپ کے گھر کو گھیرنے کی کوشش کررہے ہیں۔'' دونوں میاں بیوی کے کوئی سوال کرنے سے قبل ہی اس نے انہیں اطلاع دی جسے سن کر مقصود کے چہرے پر سراسیمگی کے تاثرات پھیل گئے۔

''اسلم خود کہاں ہے؟'' اس نے بوکھلائے ہوئے

انداز میں پوچھا۔

''اوپر چھت پر۔'' اس نے مختصراً بتایا۔

''میں بھی وہیں جاتا ہوں۔ تم ابا جی کو جگا کر انہیں بھی وہیں بھیج دو۔'' مقصود نے انیلا کی طرف دیکھ کر کہا اور عجلت میں چھت پر جانے والے راستے کی طرف دوڑ گیا۔

انیلا اس کی ہدایت پر عمل کرنے کے لیے آگے بڑھ گئی۔ اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں آج کل حامد راؤ نے اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ جب سے انیلا کی ماں یعنی شفقت راؤ کی بیوی یہاں رہ رہی تھی، اس کی خواب گاہ اس کے اور اس کی اپنی بیوی کے زیر استعمال تھی۔ ذہنی ابتری کا شکار انیلا کی ماں کو اتنا ہوش نہیں تھا کہ خود اپنا خیال رکھ سکے یا اپنے معمول کے کام انجام دے سکے، اس لیے حامد راؤ نے اپنی بیوی کو مستقل طور پر اس کے ساتھ منتقل کر دیا تھا۔ ان کی آپس کی رشتے داریاں اور قربتیں اتنی گہری تھیں کہ اس کی بیوی کو یہ ذمے داری بری نہیں لگی تھی اور وہ بڑی محبت اور خلوص سے اپنی نند کا خیال رکھ رہی تھی۔

''کیا بات ہے انیلا پتر۔ تو کچھ پریشان لگ رہی ہے۔ تیری ماں کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟'' انیلا کو رات کے اس پہر اپنے دروازے پر دیکھ کر حامد راؤ نے پریشانی سے پوچھا۔

''اماں ٹھیک ہیں ماموں جان لیکن ایک دوسری گڑبڑ ہے۔ کچھ لوگ ہمارے گھر کو گھیرے میں لے رہے ہیں۔ ماہ بانو کا شوہر اور مقصود اوپر چھت پر سے جائزہ لینے گئے ہیں اور آپ کو بھی وہیں بلایا ہے۔'' اس نے تیز تیز بولتے ہوئے ایک ہی سانس میں اطلاع دی جسے سن کر حامد راؤ کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ البتہ وہ زبان سے کچھ بھی کہے بغیر وہاں سے چل پڑا۔ گھبرائی ہوئی انیلا بھی واپس پلٹ گئی۔ آج کل جو کچھ ہو رہا تھا، انوکھا ہی ہو رہا تھا۔ صداقت کی موت کے بعد ان کی زندگیوں میں کچھ بھی نارمل نہیں رہا تھا۔ نوجوان بھائی کی موت کے بعد اس نے ماں کے پاگل پن کا صدمہ ہی کس طرح سہا تھا، یہ وہ خود ہی جانتی تھی۔ ان مشکل حالات سے نمٹتے اچانک ہی اسلم اور ماہ بانو سے ملاقات ہوگئی اور ان کی آمد کے ساتھ ہی ایک اور تکلیف دہ انکشاف ہوا کہ پیر سائیں کے ٹھکانے کو آگ لگانے میں اس کے اپنے باپ کا ہاتھ تھا۔ یہ خبر آج ہی چند گھنٹے قبل مقصود نے سونے سے پہلے اسے سنائی تھی اور اب وہ آدھی رات کو اس اطلاع کے ساتھ جگائی گئی تھی کہ ان کے گھر کو کچھ لوگ گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ گھر جس کی چار دیواری میں وہ خود کو محفوظ و مامون سمجھتی آئی تھی، اچانک ہی غیر محفوظ ہو گیا تھا تو اس کا گھبرانا بجا تھا۔ گھبراہٹ اور سراسیمگی کی اس کیفیت میں گھری وہ اپنے کمرے کے سامنے پہنچی تو ماہ بانو اب بھی وہیں کھڑی تھی۔

''میں تمہارا ہی انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اپنی رائفل چاہیے۔'' انیلا کی شکل دیکھتے ہی اس نے مطالبہ کیا۔ اس گھر میں داخل ہوتے وقت وہ رائفل کو بڑی سی چادر میں چھپا کر لائی تھی لیکن یہ ممکن نہیں تھا کہ اتنے بڑے ہتھیار کو گھر کے مالکان سے پوشیدہ رکھا جا سکتا۔ اس نے یہ بہانہ بناتے ہوئے کہ لمبے سفر میں اپنی حفاظت اور جانوروں کے شکار کے لیے یہ رائفل ساتھ رکھی گئی ہے، رائفل انانتا انیلا کے پاس رکھوا دی تھی۔ موجودہ حالات واضح نہیں تھے لیکن رات کے اندھیرے میں چوری چھپے ہونے والے محاصرے نے اس کے دل میں یہ خدشہ ضرور پیدا کر دیا تھا کہ یہاں محاذ آرائی کی ضرورت پیش آ سکتی ہے چنانچہ دستیاب ہتھیاروں کا تیار رکھنا مناسب تھا۔

''کیا یہاں لڑائی جھگڑا ہونے والا ہے؟'' اس کے مطالبے پر انیلا نے سہمے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''ارے نہیں، بس میں احتیاطاً ہی تم سے رائفل مانگ رہی ہوں۔'' انیلا کی اتری ہوئی صورت دیکھ کر اسے ہمت نہیں ہو سکی کہ اسے اپنے خدشات سے آگاہ کرے چنانچہ نظر چراتے ہوئے اسے جھوٹی تسلی دینے کی کوشش کی ورنہ خود اس کے اپنے اندر جانے کون کون سے اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ وہ مسلسل محاصرین کے بارے میں سوچ رہی تھی کہ وہ کون ہو سکتے ہیں۔ ایک امکان تو یہی تھا کہ وہ ان کے میزبان حامد راؤ کے کوئی دشمن رہے ہوں جبکہ دوسرا امکان اس سے زیادہ خوف ناک تھا۔ اسے خدشہ تھا کہ اسلم کی ڈاکو والی حیثیت ان کے لیے مصیبت نہ بن گئی ہو۔ وہ ایک ایسا مفرور ڈاکو تھا جو صرف پولیس ہی سے نہیں بلکہ اپنے ساتھیوں سے بھی بھاگا ہوا تھا اور ان میں سے کوئی بھی ایک اس کی تلاش میں یہاں پہنچ سکتا تھا۔ پولیس سے تو خیر مقابلے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا لیکن اگر آنے والے اسلم کے پرانے ساتھی تھے تو پھر ان سے مقابلہ کرنا ضروری ہو جاتا۔ ان لوگوں سے زیر ہو جانے کا نتیجہ ہلاکت یا اسلم کی گروہ میں واپسی کی صورت میں ہی نکل سکتا تھا اور یہ دونوں ہی صورتیں ناقابلِ قبول تھیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ ایسا کچھ نہیں ہونے دے گی اور اپنے حوصلے کی آخری حد تک مقابلہ کرے گی۔

''یہ لو۔'' اپنے خیالوں میں گم اسے خبر بھی نہیں ہو سکی کہ انیلا کب وہاں سے گئی اور رائفل لے آئی۔ اس کے مخاطب

کرنے پر وہ چونکی اور رائفل دونوں ہاتھوں سے تھام لی۔ ٹھنڈے لوہے کے لمس نے اس کے اندر عجیب سی آگ بھر دی۔ اس وقت وہ مار دو یا مر جاؤ والی کیفیت میں مبتلا تھی۔ زندگی میں درآنے والے فرار..... نے اسے تھکا کر رکھ دیا تھا۔ مصائب تھے کہ کسی طور ختم ہونے کا نام نہیں لیتے تھے۔ ایک امتحان ختم نہیں ہوتا تھا کہ دوسرا سامنے آ کھڑا ہوتا تھا۔ اب بھی جبکہ وہ ایک بہت بڑا سمجھوتا کرنے کے بعد اسلم کے ساتھ سکھ کی زندگی گزارنے کا خواب دیکھنے لگی تھی، ایک اور مصیبت سامنے آ کھڑی ہوئی تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس مشکل کا ڈٹ کر مقابلہ کرے گی۔ اس عزم کے بعد اپنے اندر ایک نیا جوش و ولولہ سا محسوس کرتی وہ کسی سپاہی کی شان سے چل پڑی۔ اندھیرے کے باوجود اس نے چھت پر جانے والی سیڑھیاں بڑے اعتماد سے طے کیں اور کھلی چھت پر پہنچ کر تاروں کی چھاؤں میں نظر آنے والے تینوں سایوں کا جائزہ لینے لگی۔ اگرچہ اسلم اس وقت مقصود کے کپڑوں میں ملبوس ہونے کی وجہ سے ان دونوں باپ بیٹے کی طرح شلوار قمیص ہی پہنا ہوا تھا پھر بھی اسے اسلم کو پہچاننے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ وہ سیدھی اس کی طرف بڑھتی گئی۔

''کچھ معلوم ہوا کہ کون لوگ گھر کو گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں؟'' اسلم کے قریب پہنچ کر اس نے سرگوشی میں استفسار کیا۔

''یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ روشنی نہ ہونے کے برابر ہے اس لیے کسی کی شکل دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ البتہ ہم لوگ یہ اندازہ لگانے میں کامیاب ہو گئے ہیں کہ وہ تعداد میں بیس بائیس کے قریب ہیں اور حامد راؤ کے مطابق اپنے لباس اور چال ڈھال سے اسی گاؤں کے رہائشی لگتے ہیں۔ ہم نے فی الحال ان میں سے کسی کو چھیڑنے کی کوشش نہیں کی ہے اور خاموشی سے یہ دیکھتے رہے ہیں کہ وہ کس کس پوزیشن پر موجود ہیں۔'' اس نے ماہ بانو کے قدموں کی موہوم سی چاپ محسوس کر لی تھی اس لیے قریب پہنچ کر اس کے استفسار کرنے پر بنا چونکے اسے جواب دینے لگا۔

''گاؤں کے رہائشی....'' اس کا جواب سن کر ماہ بانو نے ایک پُرخیال ہنکارا بھرا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ وہ ہمارے دشمن نہیں ہیں۔''

''وہ ہمارے دشمن ہیں۔'' اسلم نے پُرزور لہجے میں اس کی تردید کی۔ ''میں اپنے محسن کے دشمن کو بھی اپنا ہی دشمن سمجھتا ہوں۔''

''تمہیں سمجھنا بھی چاہیے۔ میں نے جو بات کہی تھی اس کا مقصد خود کو صورتِ حال سے الگ رکھنا نہیں تھا۔ میں بس اس بات پر اطمینان کا اظہار کر رہی تھی کہ ہمیں گھیرے میں لینے والوں کا تعلق پولیس یا ڈکیتوں سے نہیں ہے۔'' اس نے اپنی صفائی پیش کی۔ اس سے قبل کہ اسلم جواب میں کچھ کہتا، نیچے دروازے پر زوردار دستک ابھری۔ دستک اتنی زوردار تھی جیسے دستک دینے والا سوتے ہوؤں کے بجائے مردوں کو جگانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''اوپر سے جواب مت دینا۔ نیچے جا کر معلوم کرو کہ کون ہے؟ انہیں معلوم نہیں چلنا چاہیے کہ ہم ان کی نقل و حرکت سے پہلے ہی واقف ہو چکے ہیں۔'' اسلم نے مقصود کے بازو پر ہاتھ رکھ کر اسے سرگوشی میں ہدایات دیں جنہیں سن کر وہ تابع داری سے سر ہلاتا ہوا سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ دوسری طرف حامد راؤ کسی زخمی شیر کی طرح چھت پر ٹہل لگا رہا تھا۔

''میں ان میں سے کسی کو چھوڑوں گا نہیں۔ یہ جو بھی لوگ ہیں، انہوں نے حامد راؤ کے گھر کی طرف نظر ڈال کر بہت بڑی غلطی کی ہے۔'' ایک دیوار کی منڈیر پر لگی جالیوں میں سے اطراف کا جائزہ لینے کے بعد دوسری دیوار کی طرف جاتے ہوئے وہ بڑبڑایا۔ اس کا مخاطب کوئی نہیں تھا لیکن اسلم اور ماہ بانو دونوں ہی نے اس کے الفاظ سنے تھے۔ اسلم کے لیے حامد راؤ کا وہ روپ حیرت انگیز تھا۔ اس گھر میں قدم رکھنے کے بعد اس نے ہر لمحے اسے بہت نرم خو اور صلح جو انسان پایا تھا جسے اپنے دوست، کزن اور بہنوئی شفقت راؤ سے تمام تر محبت کے باوجود اس کے اقدام سے اختلاف تھا۔ جو سمجھتا تھا کہ شفقت راؤ کو انتقام کی اندھی راہ پر چلتے ہوئے براہِ راست ٹھکانے پر آگ لگانے کے بجائے انصاف کے لیے قانون سے رجوع کرنا چاہیے تھا۔ اب وہی قانون پسند حامد راؤ غیظ و غضب میں مبتلا تھا۔

''میں گاؤں والوں کا نمائندہ بن کر آیا ہوں۔ گاؤں والوں کا مطالبہ ہے کہ شفقت راؤ کی بیوی اور بیٹی کو ان کے حوالے کیا جائے تاکہ ہم ان سے شفقت راؤ کے جرم کا حساب لے سکیں۔'' نیچے مقصود دروازے پر پہنچ چکا تھا اور یقیناً اس نے آنے والے سے اس کی آمد کے بارے میں استفسار کیا تھا جس کے جواب میں انہیں یہ مطالبہ سننے کو مل رہا تھا۔

''یہ کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم اپنے ہوش میں تو ہو۔'' مقصود نے یقینی طور پر دروازہ کھولنے کی حماقت نہیں کی تھی لیکن وہ باہر موجود شخص کے مطالبے پر اتنی بری طرح چراغ پا ہوا تھا کہ اس کی بلند غصیلی آواز انہوں نے اوپر چھت تک سنی تھی۔ باہر کھلے میں موجود شخص کی آواز تو چھت پر سنائی دینا

کچھ بڑی بات نہیں تھی لیکن گھر کے دروازے کے اندر موجود مقصود کی آواز سنائی دینا اس کے غصے کا گراف بلند ترین ہونے کی نشانی تھی۔

''ہوش میں تو ہم اب آئے ہیں۔ ہمیں ملوم ہی نہیں تھا کہ ہم خانقاہ کو آگ لگانے والے جس خبیث شیطان کو ڈھونڈتے پھر رہے ہیں، وہ اپنے ہی گاؤں کا اتنا عزت دار آدمی نکلے گا۔ شفقت راؤ نے جو جرم کیا ہے، اسے ہم کسی صورت ماف (معاف) نہیں کر سکتے۔ اسے تو خیر ہم بعد میں ڈھونڈ کر سخت سزا دیں گے ہی لیکن پہلے اس کی دھی اور گھر والی کو ہمارے حوالے کرو۔ جب ہم اس کے گھر کی عورتوں کو گنجا کر کے سرعام ان کے سروں پر جوتے برسائیں گے تو شفقت راؤ کی ساری عزت داری مٹی میں مل جائے گی۔ اسے ملوم ہو جائے گا کہ جس پنڈ کے لوگوں نے اسے عزت دے رکھی تھی، ان کے ساتھ دھوکا کرنے کا کیا نتیجہ...'' باہر موجود شخص شاید کوئی پُرجوش سی تقریر کرنے کے موڈ میں تھا لیکن فضا میں گونجنے والی فائر کی آواز نے اسے اس کا جملہ مکمل نہیں کرنے دیا۔ یہ حامد راؤ تھا جو اوپر آنے سے پہلے اپنا بڑے بور کا ریوالور ساتھ لے کر چڑھا تھا۔

''اپنی زبان بند رکھ کتے۔ اب اگر تو نے اپنی ناپاک زبان سے اس گھر کی عورتوں کا ذکر کیا تو اگلی گولی تیرے بھیجے میں لگے گی۔'' حامد راؤ کی آواز میں قہر برس رہا تھا۔

''تسی اس ماملے سے الگ رہو حامد راؤ صاحب! ہمیں ملوم ہے کہ شفقت نے جو کچھ کیا، تسی اس میں شامل نہیں تھے۔ ہم آپ کو ہور آپ کے گھر والوں کو کچھ نہیں کہیں گے۔ ہماری دشمنی شفقت ہور اس کے گھر والوں سے ہے۔ ہور انہیں ہم کسی صورت میں ماف نہیں کریں گے۔ آپ کے لیے بہتر ہے کہ آپ خاموشی سے ایک طرف ہو جاؤ ورنہ خاحٹاہ (خوامخواہ) زد میں آ جاؤ گے۔'' وہ کوئی بہت ہی منہ پھٹ اور بدتمیز آدمی تھا جو نہایت اجڈ لہجے میں حامد راؤ سے کہہ رہا تھا۔

''تم بالکل الو کے پٹھے ہو جسے یہ بھی نہیں معلوم کہ جن عورتوں کا مطالبہ کر رہے ہو، وہ صرف شفقت ہی کی نہیں میرے گھر کی بھی عزت ہیں۔ اپنی بہن اور بہو کو میں کیسے بے عزتی کے لیے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔ اور اگر ان سے میرا رشتہ نہ ہوتا تب بھی میں اپنے دوست کی عزت تمہارے حوالے نہیں کر سکتا تھا۔ اگر شفقت نے کوئی جرم کیا ہے تو جا کر اسے تلاش کرو اور سزا دو لیکن اس طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھنا ورنہ اپنی آنکھیں کھو بیٹھو گے۔'' بوڑھا شیر پوری قوت کے ساتھ گرج رہا تھا۔

''تہاڈی مرضی راؤ صاحب! اب ہم سے کوئی شکوہ نہ کرنا۔'' اسی اجڈ آدمی نے جواب دیا لیکن پھر فوراً ہی فضا میں اس کی زوردار چیخ گونجی۔ حامد راؤ نے اسے مزید کوئی موقع دیے بغیر اس کی گستاخی کا مزہ چکھا دیا تھا۔ یقینی طور پر وہ بڑھ چڑھ کر بولنے والا اس وقت خاک و خون میں لوٹ رہا تھا۔ ان میں سے کسی کے پاس بھی حامد راؤ کے شکار کی حالت دیکھنے کی مہلت نہیں رہی تھی۔ پہلا فائر ہوتے ہی دوسری طرف سے گولیوں کی برسات کر دی گئی تھی۔ وہ تعداد میں کئی تھے اور متفرق اسلحے سے لیس تھے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں انہیں صرف ایک برتری حاصل تھی کہ وہ چار دیواری میں محفوظ ہونے کے علاوہ حملہ آوروں کی پوزیشنز سے اچھی طرح واقف تھے۔ اپنی دانست میں تو وہ بے خبری میں ان پر شب خون مارنے آئے تھے لیکن محض اتفاقاً اسلم کے چھت پر پہنچ جانے کی وجہ سے ان کی سازش قبل از وقت بے نقاب ہو گئی اور ان لوگوں کو مقابلے کے لیے ذہنی طور پر تیار ہونے کی مہلت مل گئی۔

فائرنگ شروع ہونے کے بعد مقصود بھی اوپر چھت پر ہی چلا آیا تھا۔ دروازے کی طرف سے دونوں باپ بیٹے کو اطمینان تھا کہ وہ اتنا مضبوط ہے کہ اسے توڑ کر گھر میں گھسنا ممکن نہیں ہوگا۔ پھر وہ لوگ کسی کو دروازے کے قریب پھٹکنے کی مہلت دیتے تو کوئی دروازہ توڑنے کی کوشش کرتا بھی۔ تعداد میں کم ہونے کے باوجود ان کی طرف سے بہت نپے تلے فائر کیے جا رہے تھے جس کا ثبوت وہ چیخیں اور کراہیں تھیں جو باہر سے وقتاً فوقتاً سنائی دے رہی تھیں۔ فائرنگ کا سلسلہ شروع ہونے سے پہلے اسلم نے اپنا مسٹل ماہ بانو کے حوالے کر کے اس سے رائفل لے لی تھی۔ اس کی آزمودہ رائفل اس وقت سب سے زیادہ قہر اُگل رہی تھی۔ وہ چن چن کر کمین گاہوں میں چھپے دشمنوں کو نشانہ بنا رہا تھا۔ اچھا خاصا نقصان اٹھانے کے بعد محاصرہ کرنے والوں کو اندازہ ہو سکا کہ ان کی کمین گاہیں پوشیدہ نہیں ہیں اور انہیں تاک تاک کر نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ وہ بوکھلاہٹ میں اپنی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش کرنے لگے اور اس کوشش میں مزید ایکسپوز ہو گئے۔ ان لوگوں نے حملہ آوروں کی اس بوکھلاہٹ سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا لیکن بہرحال وہ تعداد میں زیادہ تھے اور انہیں اندازہ ہو رہا تھا کہ جن بیس پچیس کو وہ دیکھ سکے تھے، ان کے علاوہ بھی مزید کمک پہنچ چکی تھی چنانچہ کئی کو نشانہ بنا لینے کے باوجود ان کا پلّہ بھاری نہیں ہو سکا تھا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا تھا کہ وہ قلیل تعداد اور محدود اسلحے کے باوجود بہترین دفاع کر رہے تھے۔

''ہم بہت زیادہ دیر تک ان لوگوں کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ ہمیں اپنی جانیں بچانے کے لیے یہاں سے بھاگنا پڑے گا۔ کیا تمہارے پاس ایسی کوئی ترکیب ہے جس کی مدد سے ہم یہاں سے نکل سکیں؟'' اسلم کو مسلح مقابلوں کا تجربہ تھا اس لیے وہ اس مقابلے میں اپنی پوزیشن کا اندازہ کر سکتا تھا۔ مقابلے پر موجود لوگوں کی بڑھتی ہوئی تعداد نے اسے تشویش میں مبتلا کیا تو وہ کھسکتا ہوا مقصود کے قریب پہنچ گیا اور اس خیال سے اس سے پوچھا کہ گھر کا مالک وکیل ہونے کی وجہ سے وہ یہاں سے فرار کا راستہ جانتا ہوگا۔

''مکان کی پچھلی دیوار سے ملا ہوا ہمارا گودام ہے۔ وہاں ایک سوزوکی پک اپ بھی موجود ہے۔ مکان اور گودام کے درمیان دروازہ بھی ہے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہم یہاں کا محاذ چھوڑ کر وہاں تک کیسے پہنچ سکتے ہیں۔ یہاں فائرنگ رکے گی تو وہ لوگ گھر پر چڑھ دوڑیں گے؟'' مقصود نے چڑھے ہوئے سانس کے ساتھ اس کے سوال کا جواب دیا جو بڑا حوصلہ بخش تھا۔

''ہم یہ محاذ ایک ساتھ نہیں چھوڑیں گے بلکہ ایک ایک کر کے یہاں سے جائیں گے۔'' اسلم نے پہلے ایک فائر داغا پھر اس کی بات کا جواب دیا۔

''ایسا کرو کہ پہلے تم نیچے جاؤ اور گھر کی خواتین کو لے کر گودام میں پہنچو۔ وہاں پہنچ کر گاڑی میں بیٹھنے میں تمہیں کتنی دیر لگے گی؟'' اسے ہدایت دینے کے ساتھ ساتھ اس نے سوال بھی کیا۔

''زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔'' اس نے جواب دیا۔

''اوکے تو پھر جاؤ اور اپنا ہتھیار بھی میرے حوالے کر دو۔ پانچ منٹ بعد میں ماہ بانو کو بھیجوں گا۔ البتہ جانے سے پہلے ہمیں گودام کے دروازے کی لوکیشن بتا دو تاکہ ہم بھٹکیں نہیں۔'' اس کی عقابی نظریں مسلسل باہر کا جائزہ لے رہی تھیں پھر بھی وہ مقصود کی طرف متوجہ تھا۔

''اگر میں پہلے اباجی کو نیچے بھیج دوں تو...؟'' مقصود تذبذب کا شکار تھا۔

''میں نے سوچ سمجھ کر تمہارا نام لیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم گودام میں پہنچتے ہی اپنی پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر دو اور بالکل ریڈی رہو کہ جیسے ہی ہم میں سے آخری فرد بھی وہاں پہنچتا ہے، فوراً گاڑی باہر نکال لو۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں راؤ صاحب کے لیے ڈرائیونگ کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ وہ اس وقت تشیش میں ہونے کی وجہ سے بے شک بہت پُرجوش نظر آ رہے ہیں لیکن کسی بھی لمحے ان کی ہمت جواب دے سکتی ہے۔'' اس نے مقصود کو دلیل دی تو وہ اس کی ہدایات پر عمل کرنے پر مجبور ہو گیا۔ مقصود کے بعد ماہ بانو کی باری تھی جس نے بنا کسی حیل وحجت کے پانچ منٹ بعد نیچے کا رخ کر لیا۔ راستہ تو انہیں مقصود بتا ہی چکا تھا۔ ماہ بانو کی روانگی کے بعد اس نے حامد راؤ سے نیچے جانے کو کہا۔ اس دوران وہ چھت پر ادھر ادھر گھوم کر مختلف سمتوں سے فائر کر چکا تھا۔ فائرنگ کرتے ہوئے اس نے اس بات کا خیال رکھا تھا کہ اپنے اور مقصود دونوں کے ہتھیار باری باری استعمال کرے تاکہ اگر حملہ آوروں میں کوئی اسلحے کا ماہر ہو تو اسے چھت پر موجود نفری میں کمی کا احساس نہ ہو۔ فائر وہ پہلے ہی سنبھل کر محدود تعداد میں کر رہے تھے اس لیے فائرنگ کے تسلسل میں کمی کا احساس کرنا مشکل تھا۔ ان کی نپی تلی فائرنگ نے حملہ آوروں کو ٹھیک ٹھاک نقصان پہنچایا تھا لیکن اب وہ بھی سنبھل چکے تھے اور نئی پوزیشنز لے لی تھیں اس لیے کوئی نقصان نہیں اٹھا رہے تھے۔

''میں آخر میں جاؤں گا، تم پہلے جاؤ۔'' اس کی طرف سے نیچے جانے کی ہدایت سن کر حامد راؤ نے جواب دیا۔ یقیناً وہ اپنی روایات اور وضع داری نبھانے کے لیے مہمان کے تحفظ کو مقدم رکھ رہا تھا۔

''یہ وقت بحث کا نہیں ہے راؤ صاحب! آپ دیکھ سکتے ہیں کہ مجھے اسلحہ استعمال کرنے میں آپ سے زیادہ مہارت حاصل ہے۔ آپ نہ تو میری طرح بیک وقت دو ہتھیار استعمال کر سکتے ہیں اور نہ ہی میری جتنی پھرتی کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ آپ میری فکر کیے بغیر آرام سے نیچے جائیں اور گاڑی میں بیٹھیں۔ میں انشاء اللہ دو تین منٹ میں آپ تک پہنچ جاؤں گا۔'' اس نے بنا کسی لگی لپٹی کے صورتِ حال حامد راؤ کے سامنے رکھ دی جس سے وہ یقیناً انکار نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ سر جھکا کر نیچے کا رخ کر لیا۔ اب چھت پر صرف اکیلا اسلم موجود تھا جو دوڑ کر کبھی ایک دیوار کے عقب سے فائر کرتا تھا، کبھی دوسری۔ اس کی یہ ترکیب کارگر تھی اور حملہ آور ہر طرف سے فائر آتا دیکھ کر گھر کے زیادہ نزدیک آنے کی ہمت نہیں کر پا رہے تھے۔ آخر تیسرے منٹ پر اس نے بھی چھت چھوڑ دی اور تیزی سے سیڑھیاں عبور کر کے گودام کی طرف جانے والے راستے پر دوڑ پڑا۔ تیسرا منٹ ختم ہونے سے پہلے وہ گودام میں موجود تھا جہاں مقصود نے پک اپ کا انجن اسٹارٹ کر رکھا تھا اور وہ لوگ اندر بیٹھے اسی کی راہ دیکھ رہے تھے۔

”میں گودام کا دروازہ کھولتا ہوں، تم گاڑی نکالتے چلے جاؤ۔ میں چلتی گاڑی میں ہی سوار ہو جاؤں گا۔“ اس نے مقصود کی طرف دیکھتے ہوئے اسے ہدایت دی اور پھر حامد راؤ کی طرف متوجہ ہوا۔

”آپ ہتھیار تیار رکھیے گا راؤ صاحب! اگر دروازے کے باہر کوئی موجود ہوا تو آپ کو ہی اس سے نمٹنا پڑے گا۔“ اس نے اپنی رائفل پک اپ کے فرش پر پھینک دی لیکن پسٹل ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دیکھا جاتا تو اس وقت اس کی جان سب سے زیادہ خطرے میں تھی لیکن وہ غیر معمولی جرأت مندی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ شاید ایسا اس لیے تھا کہ آج وہ کسی کو لوٹنے کے بجائے ایک بے گناہ خاندان کی حفاظت کے خیال سے میدانِ کارزار میں اترا تھا۔ حامد راؤ نے ستے ہوئے چہرے کے ساتھ سر ہلا کر اس کی ہدایات پر عمل پیرا ہونے کا اشارہ دیا تو وہ گودام کے بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ یہ دروازہ بھی کافی بھاری اور مضبوط تھا اور خاصی آواز کے ساتھ کھلا تھا لیکن امید کی جا سکتی تھی کہ باہر بپا فائرنگ کے شور میں یہ آواز سنائی نہیں دی گئی ہوگی۔

اس کے دروازہ کھولتے ہی مقصود تیزی سے پک اپ لے کر باہر نکلا۔ وہ بے مثال پھرتی کا مظاہرہ کرتا ہوا پچھلے حصے سے لٹک گیا۔ آگے حامد راؤ مقصود کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ پک اپ کے باہر نکلتے ہی بدترین خدشات سچ ہو کر سامنے آ گئے۔ اس طرف بھی حملہ آور موجود تھے چنانچہ گاڑی کے باہر نکلتے ہی ان پر فائر کیا گیا۔ اس فائر کا حامد راؤ نے فوراً جواب دیا۔ دوسری طرف اسلم بھی پیچھے نہ رہا اور بے پناہ مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے صرف ایک ہاتھ کی مدد سے لٹکے لٹکے دوسرے ہاتھ سے جوابی فائر داغ دیا۔ اس موقع پر مقصود کی کارکردگی بھی لائقِ تحسین تھی۔ اس نے کسی بھی قسم کی گھبراہٹ کا مظاہرہ کیے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی اور گاڑی کو وہاں سے نکالتا چلا گیا۔ خوش قسمتی سے اس جانب ایک دو سے زیادہ افراد موجود نہیں تھے اس لیے انہیں وہاں سے نکلنے میں بہت زیادہ مشکل پیش نہ آئی اور سوزوکی اپنے مسافروں کو لیے رات کے اندھیرے میں آگے بڑھتی چلی گئی۔

☆☆☆

حویلی میں صف ماتم بچھی تھی۔ صنوبر اور تاجور اپنی ماں کی موت کے غم میں پچھاڑیں کھا رہی تھیں۔ کشور کی ماں چودھرائن ایک جانب ساکت سی بیٹھی تھی۔ اصولاً اسے آج اپنی سوکن اور حویلی میں سب سے بڑی حریف کی موت پر آسودہ ہونا چاہیے تھا لیکن وہ سکتہ زدہ تھی اور اس قابل بھی نہیں رہی تھی کہ چودھری کی واحد زندہ بیوی کی حیثیت سے سارے کاموں کی نگرانی کر سکے۔ اپنی اس بے نیازی پر اسے بعد میں چودھری کے عتاب کا نشانہ بھی بننا پڑ سکتا تھا، اس کے باوجود اس میں حوصلہ نہیں تھا کہ اپنی جگہ سے اٹھ کر کچھ کر سکے۔ وہ تو زبانی احکامات جاری کرنے سے بھی معذور تھی اور ایسا شاید اس لیے تھا کہ آج اس کے سامنے وڈی چودھرائن کا تابوت میں بند بے جان جسم رکھا ہوا تھا۔ وہ وڈی چودھرائن جس کے حکم کا سکہ پوری حویلی پر چلتا تھا، آج بے بسی کی تصویر بنی لوگوں کے کندھوں پر اپنی آخری آرام گاہ تک پہنچائے جانے کی منتظر تھی۔

چودھرائن ناہید نے حویلی میں وڈی چودھرائن کے اقتدار کا سورج پوری طرح جگمگاتا اور پھر ڈوبتا ہوا دیکھا تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ حویلی کی کوئی عورت وڈی چودھرائن کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی تھی یہاں تک کہ وہ خود چودھری کی بیوی ہونے کے باوجود اپنی سوکن کے برابر حقوق کی حق دار نہیں تھی۔ لیکن پھر اس نے یہ بھی دیکھا تھا کہ وڈی چودھرائن، چودھری کے زیرِ عتاب آئی تو کس بری طرح رگڑی گئی۔ وڈی چودھرائن کے حویلی کے تہ خانے میں قید کیے جانے کا واقعہ خود اس کے اپنے علم میں بھی تھا لیکن اس سے آگے وہ وہی کہانیاں سنتی رہی تھی جو چودھری حویلی میں پھیلا رہا تھا۔ اسے ان میں سے کسی ایک کہانی پر بھی یقین نہیں تھا لیکن یہ بھی نہیں سمجھتی تھی کہ وہ اس حد تک پہنچ جائے گا کہ وڈی چودھرائن کی جان ہی لے لے گا۔ وہ وڈی چودھرائن کے قتل کی ایک طرح سے واقعاتی گواہ تھی لیکن لب کشائی کی ہمت نہیں رکھتی تھی اور مہر بہ لب بیٹھی اس بڑے سے ہال میں ہوتی گریہ وزاری سن رہی تھی۔ تاجور اور صنوبر کے علاوہ بھی وہاں رونے والی عورتوں کی بڑی تعداد موجود تھی۔ ان میں سے کچھ رشتے دار عورتیں تھیں اور بہت سی گاؤں کی وہ بے حیثیت و عسرت زدہ عورتیں جنہوں نے وڈی چودھرائن کی زندگی میں جانے اس کی کتنی جھڑکیاں سنی تھیں اور اس کے بے رحمانہ فیصلوں کا شکار ہوئی تھیں۔ ان مظلوم عورتوں کو اس کی موت پر مغموم ہونے کی کوئی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ پھر بھی رو رہی تھیں کہ صدیوں سے غلامی کی زنجیروں میں جکڑا ذہن یہی جانتا تھا کہ انہیں اپنے آقاؤں کی موت پر غم کا اظہار کرنا ہے، پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ انہیں معلوم تھا کہ اس اہم موقع پر جبکہ حویلی کی جملہ خواتین غم سے نڈھال نظر آ رہی ہیں، کچھ نادیدہ نگاہیں ان پر نگراں ہوں گی اور بعد میں کسی وقت وہ صرف اس وجہ سے بھی معتوب قرار دی جا سکیں گی کہ انہوں نے وڈی چودھرائن کی موت پر آنسو نہیں بہائے تھے۔ چنانچہ وہ اپنی قلبی کیفیات کی پروا کیے بغیر پوری شدومد سے اظہارِ غم میں مصروف تھیں۔ گاؤں کی ان نادار عورتوں کو مستقل طور پر ہال میں رکنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ ٹولیوں کی صورت میں وہاں آتی تھیں اور تھوڑی دیر آہ و بکا کرنے کے بعد باہر روانہ کر دی جاتی تھیں۔

اس ماتمی فضا کا رنگ اس وقت اور بھی گہرا ہو گیا جب مراد شاہ اور اس کی بیوی اپنی بیٹی سمیت وہاں پہنچے۔ بہنیں، بھائی اور بھاوج کو سامنے پا کر ان سے لپٹ گئیں اور دھاڑیں مارنے لگیں۔ وہ دونوں خود بھی غم زدہ تھے لیکن پھر بھی روتی بلکتی بہنوں کو سنبھالنے لگے۔ دور دیس سے آنے والے بھائی کو اپنا اتنا قرض تو ادا کرنا ہی تھا۔ کہنے کو تو اس حویلی میں ایک بھائی بھاوج اور بھی تھے لیکن ذہنی معذور بہزاد شاہ کی بساط ہی کیا تھی کہ بہنیں اس سے اپنا غم بانٹتیں۔ رہی اس کی نام نہاد بیوی فریدہ تو اسے بھی حویلی میں کوئی قابلِ ذکر مقام حاصل نہیں تھا۔ وہ اچھوتوں کی طرح حویلی کی بالائی منزل تک محدود رکھی جاتی تھی اور بظاہر بہزاد شاہ کی بیوی ہوتے ہوئے چودھری کے ہاتھوں کھلونا بنی رہی تھی۔ اس وقت فریدہ بھی اس وسیع و عریض ہال میں موجود تھی لیکن اس کے چہرے پر غم کا نام و نشان بھی نہیں تھا۔ جس عورت نے اسے اس کی کوکھ میں موجود بچے سمیت ہلاک کرنے کی سازش کی تھی، اس کی موت پر اسے مصنوعی دکھ کا اظہار کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ یہاں بیٹھ کر بھی وہ اپنے بچے میں مگن تھی اور چودھرائن کی گریہ وزاری کرتی اولاد سے قطعی بے نیاز تھی۔ اس نے ان میں سے کسی سے اظہارِ تعزیت نہیں کیا تھا۔ تاجور اور صنوبر نے اس کی اس بے نیازی کو بخوبی محسوس کیا تھا اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھا کر رہ گئی تھیں۔ فی الوقت اسے کچھ کہنا مناسب نہیں تھا۔ نہ ہی وہ اسے یہاں سے اٹھا سکتی تھیں، البتہ یہ بات خوب محسوس کر رہی تھیں کہ فریدہ درحقیقت وڈی چودھرائن کی میت میں شرکت کے لیے نہیں بلکہ خود کو حویلی کی بہو باور کروانے کے لیے وہاں موجود ہے اور افسوس کے لیے آنے والی ہر قابلِ ذکر عورت سے خاص طور پر یوں بڑھ چڑھ کر مل رہی ہے جیسے وہ حویلی میں بڑا خاص مقام رکھتی ہو۔

دل ہی دل میں دونوں بہنیں فریدہ سے بعد میں نمٹنے کا عزم باندھ کر موجودہ صورتِ حال کو نبھا رہی تھیں۔ دیکھنے والی ہر آنکھ نے دیکھا تھا کہ ماں کی موت بیٹیوں کے لیے کتنے غم کا سبب بنی ہے۔ اللہ اللہ کر کے آخر میت اٹھنے کا وقت آیا۔ چودھرائن کا تابوت اپنی آخری آرام گاہ کے لیے روانہ کیا گیا تو گویا کہرام سا مچ گیا۔ غم زدہ تاجور اور صنوبر ایسی بے حال ہوئیں کہ انہیں سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تاجور تو شدتِ غم سے بے ہوش ہی ہو گئی۔ عورتوں نے بڑی تدبیریں کر کے اسے ہوش دلایا پھر کسی کے مشورے پر انہیں آرام کے لیے الگ کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس موقع پر شاہدہ نے رشتے دار خواتین سے درخواست کی کہ انہیں کچھ دیر کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو دونوں بہنوں کو آرام کا موقع مل جائے گا۔ اپنی بھاوج پر اس لمحے دونوں بہنوں کو بڑا پیار آیا۔ وہ خود بھی دل سے تنہائی کی متمنی تھیں کہ رو رو کر سر درد سے پھٹا جا رہا تھا اور اب دل شدت سے آرام کا خواہاں تھا۔ مراد شاہ کی بیوی شاہدہ انہیں بند کمرے میں چھوڑ کر باہر نکلی تو دونوں نے سکون کا سانس لیا۔

”توبہ ہے ربا۔ رو رو کر حلق خشک ہو گیا۔ ذرا فریج میں سے جھانک کر دیکھ کہ کوئی جوس وغیرہ پڑا ہو تو مجھے دے۔ اتنی دیر کی محنت سے جان آدھی ہو کر رہ گئی ہے۔“ تاجور نے فوراً ہی نرم گرم بستر پر دراز ہوتے ہوئے چھوٹی بہن سے فرمائش کی جسے سن کر اس نے منہ تو بنایا لیکن انکار نہیں کر سکی اور روم ریفریجریٹر کھول کر اس میں جھانکا۔ اندر ایپل جوس کا ڈبا رکھا ہوا تھا۔ اس نے ایک گلاس بھر کر بہن کو دیا اور دوسرا خود لے کر بیٹھ گئی۔

”تو نے جنازہ اٹھتے وقت اباجی کی شکل دیکھی تھی؟ ایسی روتی صورت بنائی ہوئی تھی جیسے وہ خود ہی سب سے زیادہ غم زدہ ہوں۔“ جوس کا ایک بڑا سا گھونٹ حلق سے نیچے اتار کر تاجور نے صنوبر سے دریافت کیا۔

”تم تو اس وقت بے ہوش ہو گئی تھیں تمہیں کیسے معلوم؟“ صنوبر نے حیرت سے پوچھا۔

”اباجی کی صورت دیکھ کر ہی تو مجھے بے ہوش ہونے کا خیال آیا تھا۔ میں نے سوچا کہ جب اباجی جیسا آدمی اماں کی موت پر ایسی غم ناک شکل بنا کر بیٹھا ہے تو میں تو خیر دھی ہوں۔ میرے صرف رونے دھونے سے کام نہیں بنے گا اس لیے بے ہوش ہو گئی۔“ تاجور نے مزے سے بتایا۔

”ہیں... تو تو اداکاری کر رہی تھی؟“ صنوبر کی آنکھیں پھٹ سی گئیں۔

”تو اباجی بھی تو اداکاری کر رہے تھے، ورنہ سچ بتا کہ ایسے آدمی کو جو بیوی پر دو دو سوکنیں لایا ہو اور آئے دن بازاری عورتوں کے ساتھ راتیں گزارتا ہو، بھلا بیوی کی موت کا کیا غم ہوگا۔ وہ تو ان کو موقع نہیں مل سکا ورنہ وہ ماہ بانو کو بھی

اماں کی سوکن بنا کر چھوڑتے۔'' تاجور نے بے رحمی سے جواب دیا۔

''سوتو ہے۔'' صنوبر فوراً ہی قائل ہوگئی۔ ''ابا جی کو کبھی بھی اماں سے محبت نہیں رہی۔ اگر اماں کا میکا مضبوط نہ ہوتا تو جانے ابا جی ہور کون کون سے گل کھلاتے۔ کسر تو خیر انہوں نے اب بھی کوئی نہیں چھوڑی تھی۔ بس اتنا تھا کہ اماں کا حویلی میں راج تھا اور ان کے ہوتے کسی سوکن میں اتنا دم نہیں تھا کہ ان کے مقابلے پر کھڑی ہوسکتی۔ ہماری ایسی دبنگ اماں کیسے چٹ پٹ ہوگئی، ذرا خبر نہیں ہوسکی۔ مجھے تو اس معاملے میں کوئی گڑبڑ ہی لگتی ہے۔'' صنوبر نے دھیمی آواز میں اپنے شبہات کا اظہار کیا۔

''گڑبڑ تو خیر ہے۔ ابا جی، اماں سے ناراض تھے۔ یہ اطلاع تو پکی ہے، یہ اطلاع دینے والی کو ساری تفصیلات معلوم نہیں ہیں۔ اماں کب بیمار ہوئیں، اس کو یہ بھی خبر نہیں۔ نہ ہی اس نے انہیں علاج کے لیے حویلی سے باہر جاتے دیکھا۔ اس کا یہی کہنا ہے کہ سارے نوکر چاکر حیران ہیں کہ وڈی چودھرائن کو ایسی کون سی بیماری ہوگئی تھی کہ انہیں کانوں کان خبر بھی نہیں ہوئی اور انہیں علاج کے لیے حویلی سے روانہ کر دیا گیا۔'' تاجور نے اس کے شبہات کی تصدیق کرتے ہوئے بتایا۔ وہ دونوں ہی بہنیں اپنے گھر کی تھیں لیکن حویلی میں ان کا جاسوسی کا کچا پکا سا نیٹ ورک موجود تھا۔ حویلی کی بعض ملازماؤں کے ذریعے انہیں یہاں کے حالات کی خبر ملتی رہتی تھی۔ چودھرائن کے علاج کے لیے بیرونِ ملک مقیم ہونے کا سن کر انہوں نے بہت کوشش کی کہ اصل صورتِ حال سامنے آجائے لیکن وہ کوئی قابلِ ذکر یا ٹھوس معلومات حاصل کرنے میں ناکام رہیں۔

''مجھے تو لگتا ہے کہ ابا جی کی ناراضی کا فریدہ والے معاملے سے تعلق ہے۔ وہ جب اسپتال میں داخل تھی، تب اس کا بھرا حویلی بھی آیا تھا۔ اس کے واپس جانے کے بعد ہی ملازموں نے ابا جی کو غصے میں دیکھا تھا۔ ہور فیر اچانک اماں حویلی سے غائب ہوگئی۔'' صنوبر کا دماغ بہتر کام کر رہا تھا اس لیے اس نے حالات کا بہت واضح نہ صحیح لیکن ٹھیک ٹھاک تجزیہ کر ڈالا۔

''تیری گل دل کو لگتی ہے۔ میرا تو دل ہول رہا ہے۔ اگر ابا جی کو اس گل کی بھنک پڑی ہے کہ اماں نے جان بوجھ کر فریدہ کو سیڑھیوں سے گروایا تھا تو فیر ہور بھی بہت کچھ ہلوم ہوگیا ہوگا۔ یوں سمجھ لے کہ اب اماں کے ساتھ ساتھ ہم لوگوں کی بھی خیر نہیں ہے۔''

''ایسے ہول بھی نہ دلاوڈی آپا۔'' صنوبر بہن کی بات سن کر تھرائی۔

''ہول تو خود میرے اٹھ رہے ہیں۔ چلو اماں کی تو کوئی گل نہیں۔ اس نے تو دنیا میں سب دیکھ لیا تھا، خوب جی بھر کر حویلی پر راج بھی کیا تھا ہور اولادوں کی اولادیں تک دیکھ لی تھیں۔ ہمارے تو ابھی اپنے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تیرے کاکے نے تو ابھی دودھ پینا بھی نہیں چھوڑا۔ ذرا سوچ ایسی بھری جوانی میں دنیا چھوڑنی پڑی تو کتنا دل دکھے گا۔'' وہ اپنی متوقع موت کے خیال سے اتنی رنجیدہ ہوگئی تھی کہ گلاس میں موجود سیب کے جوس کا آخری گھونٹ پینا بھی بھول گئی تھی۔ سنجیدگی اور رنجیدگی کی اس ملی جلی کیفیت میں دونوں بہنوں کے چہرے خاصے مضحکہ خیز لگ رہے تھے لیکن انہیں ہوش نہیں تھا۔ البتہ اوپر کہیں وڈی چودھرائن کی روح تڑپ تڑپ کر بے حال تھی کہ جس اولاد کی خاطر اس نے سازشوں کے جال بنے، اپنی راج دھانی سے محروم ہوئی اور اذیت ناک موت کو گلے لگایا، وہ اولاد خود غرضی کی اس انتہا پر پہنچی ہوئی تھی کہ ماں کے مرنے کا سرے سے کوئی غم نہیں تھا۔ جتنے آنسو بہائے گئے تھے دنیا دکھاوے کے لیے بہائے گئے تھے اور اب اپنی فکر دامن گیر تھی۔

☆☆☆

کاغذ پر قلم چلاتے چلاتے اس نے نظر اٹھا کر وال کلاک کی طرف دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق اب تک مشابرم خان کو واپس آجانا چاہیے تھا۔ مشابرم خان اس کے حکم پر کالے میاں سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں ٹاہلی والا کی صورت حال معلوم کرنے کے لیے گیا ہوا تھا۔ ٹاہلی والا کے پیر سائیں کا جو مشکوک کردار سامنے آیا تھا، اس نے شہریار کے دل میں تجسس پیدا کر دیا تھا۔ اسے شک تھا کہ پیر سائیں بھی کہیں شاہنواز اور مولوی غلام محمد جیسے لوگوں میں سے نہ ہو جو مذہبی شخصیت کا مقدس لبادہ اوڑھ کر سیدھے سادے معصوم لوگوں کے ذہنوں کو تباہ کرنے کے مشن پر مامور تھے۔ اپنے اس شک اور تجسس کی وجہ سے اس نے مشابرم خان کو ٹاہلی والا روانہ کر دیا تھا کہ وہ وہاں کے حالات کا جائزہ لے کر خاموشی سے واپس آجائے۔ مشابرم خان ایک عام زائر کی طرح وہاں گیا تھا اس لیے اس نے ذاتی گاڑی کے بجائے بس سے سفر کیا تھا۔ اسے پیر سائیں کی خانقاہ پہنچ کر صرف اتنا کرنا تھا کہ خود کو مصیبت میں مبتلا ایسا شخص ظاہر کرکے جو پیر سائیں کی شہرت سن کر حاجت روائی کے لیے وہاں آیا ہو، کچھ دیر خانقاہ میں رکنے کا انتظام

کرلے۔ اپنے قیام کے اس مختصر عرصے میں اسے زبان بند رکھ کر صرف آنکھیں اور کان کھلے رکھنے تھے۔ اگر وہ یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جاتا کہ خانقاہ کی آڑ میں کوئی غیر قانونی کام کیا جارہا ہے تو پھر شہریار اپنا آئندہ کا لائحہ عمل طے کرتا۔ یہ تو طے تھا کہ وہ اپنے علم میں آجانے والے ایسے کسی فرد کو جو ملک و قوم کا دشمن ہو، ڈھیل دینے کے لیے قطعی تیار نہیں تھا۔ پیری فقیری کی آڑ میں چھوٹی موٹی جعلسازیاں کرنے والوں کو طرح دے جانا اور بات تھی لیکن ملک دشمن عناصر کی بیخ کنی نہ کرنا یا ان سے صرفِ نظر کر جانا اس کی دانست میں ایک ایسا جرم تھا کہ جس کے بعد وہ خود اپنے آپ سے نظر ملانے کے قابل نہ ہو پاتا، چنانچہ ذرا سا شبہ ہونے پر ٹاہلی والا کے پیر سائیں کی بو پر لگ گیا تھا۔

پیر سائیں کے معاملے میں اسے آئندہ فیصلے مشابرم خان کی رپورٹ پر کرنے تھے اور اسے لگتا تھا کہ وہ اپنے ساتھ بہت سی سنسنی خیز خبریں لے کر آنے والا ہے۔ صبح سویرے موبائل فون پر ہونے والی گفتگو میں اس نے ہیجان زدہ لہجے میں صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ بہ خیریت ہے اور جلد واپس لوٹ کر اسے بہت سی حیرت انگیز باتیں بتائے گا۔ اپنے گرد و پیش سے مطمئن نہ ہونے کی وجہ سے اس نے تفصیلی گفتگو کرنے سے معذرت کرلی تھی، چنانچہ اب وہ شدت سے مشابرم خان کے واپس لوٹنے کا منتظر تھا۔ سوئے اتفاق اس وقت عبدالمنان بھی دفتر میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ اس کے ساتھ صورتِ حال پر تبادلۂ خیال کر کے کوئی نتیجہ اخذ کرنے کی کوشش کرتا۔ عبدالمنان کو اس نے خود چودھری افتخار کی بیوی کے جنازے میں شرکت کے لیے پیر آباد بھیجا ہوا تھا۔ چودھری سے اس کی نفرت اپنی جگہ لیکن بہرحال وہ اس علاقے کا سب سے زیادہ بااثر شخص تھا چنانچہ اس کے ساتھ ہونے والے کسی ایسے کو مکمل طور پر نظر انداز کر دینا مناسب نہیں تھا۔ وہ خود شاید اتنی مصلحت پسندی سے کام نہ بھی لیتا لیکن عبدالمنان نے صبح اس سے اچھی خاصی بحث کر کے اس معاملے میں قائل کرنے کی کوشش کی تھی اور وہ صرف اس حد تک قائل ہو سکا تھا کہ عبدالمنان اس کے نمائندے کی حیثیت سے اظہارِ افسوس کے لیے پیر آباد چلا جائے۔ اس کام کے لیے اس نے خاص طور پر اس کا انتخاب اس لیے بھی کیا تھا کہ بے شک وہ خود تو کبھی نہ کبھی تبادلہ ہو کر یہاں سے کسی دوسرے ضلع میں چلا جاتا لیکن عبدالمنان کو تو بہرحال یہیں رہنا اور کام کرنا تھا اس لیے اس کا یہاں کسی سے مکمل بگاڑ مناسب نہیں تھا۔

انہی سوچوں میں غلطاں اس نے اپنی توجہ دوبارہ کام کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔ ابھی اس کے قلم نے کاغذ پر مزید کسی نئے لفظ کا اضافہ بھی نہیں کیا تھا کہ انٹر کام بج اٹھا۔ اس نے ریسیور اٹھایا تو دوسری طرف سے مشابرم خان کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ اسے فوری طور پر اندر بھیج دینے کی ہدایت کرنے کے بعد وہ فائل بند کر کے کرسی پر سیدھا ہو بیٹھا۔ مشابرم خان کے آنے کی اطلاع ملی تو طبیعت بالکل ہی اچاٹ ہوگئی چنانچہ اس نے اسے ایک طرف رکھ دیا۔ مشابرم خان کو اس کے کمرے تک پہنچنے میں ڈیڑھ دو منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دے کر اجازت ملنے کے بعد وہ اندر آیا تو شہریار نے اس کی آنکھوں کی سرخی دیکھ کر ہی اندازہ کرلیا کہ وہ رات بھر جاگتا رہا ہے۔ یعنی گزشتہ شب جو اس نے ٹاہلی والا میں گزاری تھی، کافی سنسنی خیز رہی تھی اور مشابرم خان کسی ایسے کام میں مصروف رہا تھا کہ اسے ذرا دیر بھی سونے کا موقع نہیں ملا تھا ورنہ وہ ایسا مضبوط آدمی تھا کہ اگر ایک ڈیڑھ گھنٹے کی نیند بھی لے لیتا تو تازہ دم ہوتا۔ اب بھی صرف اس کے چہرے پر رت جگے کے آثار تھے ورنہ اپنی حرکات و سکنات سے وہ پوری طرح چاق و چوبند نظر آرہا تھا۔

''لگتا ہے خاصی گرما گرم خبریں لے کر آئے ہو۔'' اس نے سلام کا جواب دینے کے ساتھ ہی اسے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے معنی خیز لہجے میں تبصرہ کیا۔

''بالکل سر! گرما گرم خبریں ہیں اور آپ کے اندازے سے بھی زیادہ حیرت ناک۔'' مشابرم خان کے جواب نے اس کے تجسس کو مزید بھڑکا دیا۔

''تو پھر شروع ہو جاؤ اور بلاکم و کاست سب بتا ڈالو۔''

''انکشافات کا سلسلہ ٹاہلی والا میں قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا اور کچھ سوالوں کے جواب بھی مل گئے تھے۔ ٹاہلی والا پنڈ میں ٹاہلی کے بہت سے درخت ہیں جن کی وجہ سے اس پنڈ کو یہ نام دیا گیا ہے۔ آبادی کے اعتبار سے وہ گاؤں پیر آباد سے چھوٹا ہے۔ کالے میاں کے پیر سائیں کی خانقاہ پنڈ میں داخل ہونے کے تھوڑی دیر بعد ہی سامنے آگئی تھی لیکن میں اس خانقاہ کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا اور شک ہوا کہ کسی غلط جگہ پہنچ گیا ہوں۔ حالانکہ میں ٹھیک انہی نشانیوں کے مطابق وہاں تک پہنچا تھا جو کالے میاں نے مجھے بتائی تھیں۔'' مشابرم خان نے بڑے ڈرامائی انداز میں تفصیلات کا آغاز کیا۔

''غیر ضروری سنسنی پھیلانے کے بجائے ٹو دی پوائنٹ بات کرو۔'' مشابرم خان کے طرزِ بیان پر الجھن محسوس کرتے

ہوئے اس نے فوراً ہی اسے ٹوکا۔

''معافی چاہتا ہوں صاب۔'' وہ فوراً ہی سنبھل گیا اور مزید تفصیلات بتانے لگا۔

''کالے میاں نے مجھے خانقاہ کا جو پتا سمجھایا تھا، وہاں خانقاہ کی جگہ ایک جلی ہوئی عمارت کا ڈھانچا موجود تھا۔ میں نے وہاں موجود افراد میں سے ایک سے اس کے بارے میں دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ چند روز قبل کسی نے رات کی تاریکی میں پیٹرول چھڑک کر اسے میں آگ لگا دی تھی جس کی وجہ سے عمارت کے ساتھ ساتھ وہاں موجود ایک پیڑوں سے معذور زائر بھی جل کر خاک ہو گیا۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ معذور شخص بالا ہو گا۔'' انتظار کی کوشش کرنے کے باوجود وہ خود کو رائے زنی سے نہیں روک سکا جس پر شہریار نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور خاموشی اختیار رکھی۔ مشابرم خان اپنی سناتا رہا۔ ''حادثے کا سن کر میں نے اس شخص کے سامنے گہرے دکھ کا اظہار کیا اور بتایا کہ میں بہت دور سے صرف پیر سائیں کی شہرت سن کر اپنے مسئلے کے حل کے لیے یہاں آیا ہوں۔ میں نے خود کو اتنا غریب آدمی ظاہر کیا جس کے پاس کرائے کی رقم کے علاوہ مزید کسی خرچ کے لیے رقم موجود نہ ہو۔ میری اداکاری نے اس شخص پر بڑا اثر کیا اور اس نے مجھے بتایا کہ بے شک خانقاہ جل گئی ہے لیکن پیر سائیں اور ان کے تمام مرید محفوظ ہیں۔ وہ خود بھی پیر سائیں کا مرید تھا جو خانقاہ کی ازسرِنو تعمیر کے لیے جائزہ لینے آنے والی ایک ٹیم کے ساتھ وہاں تک آیا تھا۔ اس نے مجھ سے رہائش اور پیر سائیں سے ملاقات کا وعدہ کیا اور اپنے ساتھ ایک ایسے گھر میں لے گیا جو اپنی تعمیر کی وجہ سے پنڈ کے چند گنے چنے گھروں میں سے ایک تھا اور جسے دیکھتے ہی یہ اندازہ ہو رہا تھا کہ گھر کے مالکان خاصے صاحبِ حیثیت لوگوں میں سے ہیں۔ معلوم ہوا کہ وہ گھر شریف نامی ایک آدمی کی ملکیت ہے جس نے خانقاہ کی بربادی کے بعد پیر صاحب اور ان کے مریدوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ مجھے بھی اس گھر کے ایک چھوٹے سے کمرے میں جگہ مل گئی۔ مجھے لے جانے والے آدمی نے کھانا پینا بھی فراہم کر دیا لیکن پیر سائیں سے فوری ملاقات کروانے سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ فی الحال پیر سائیں کسی بہت اہم معاملے میں الجھے ہوئے ہیں اس لیے اگلے دن ہی میری ان سے ملاقات ہو سکے گی۔ اس کا جواب سن کر میں افسردگی کا اظہار کرتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا اور یوں ظاہر کیا کہ جیسے شدید تھکن کی وجہ سے مجھے نیند آرہی ہے۔ میرا میزبان میری حالت دیکھ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی میں بستر سے اتر گیا اور دروازے کی جھری سے جھانک کر باہر کا جائزہ لینے لگا۔ میں جب وہاں پہنچا تھا تو بھی کافی ہلچل سی محسوس کی تھی لیکن صرف اس لیے نظر انداز کر دیا تھا کہ مریدوں کی بھیڑ بھاڑ کی وجہ سے وہ ہلچل کوئی ایسی انوکھی بات نہیں تھی لیکن دوبارہ چھپ کر جائزہ لینے پر مجھے اندازہ ہوا کہ وہاں کچھ غیر معمولی حالات ہیں۔ احاطے میں موجود لوگوں میں سے اکثر کے ہاتھوں میں ہتھیار نظر آرہے تھے اور چہروں پر ایسا جوش تھا جیسے وہ کسی مہم کے لیے روانہ ہو رہے ہوں۔ میں سن گن لینے کے لیے کمرے سے باہر نکل گیا لیکن باہر نکلتے ہی ایک آدمی نے مجھے سختی سے ٹوک کر واپس اندر جانے کا حکم دیا۔ میں نے حاجت کا بہانہ بنا کر تھوڑی دیر کی مہلت حاصل کرلی لیکن مسلح افراد کو دیکھنے کے سوا کچھ اور معلوم نہیں کر سکا۔ مجھے کمرے میں واپس جانے کا حکم دینے والا سائے کی طرح مسلسل میرے ساتھ ساتھ تھا اس لیے مجھے شرافت کا مظاہرہ کرتے ہوئے واپس کمرے میں جانا پڑا۔ کچھ دیر بعد میں نے دروازہ چیک کیا تو معلوم ہوا کہ اسے باہر سے کنڈی لگا کر بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی عملی طور پر میں وہاں قید ہو چکا تھا اور آپ کے لیے کارآمد معلومات حاصل کرنے سے قاصر تھا۔ بے بسی کی اس کیفیت میں بھی میں نے اپنے کان کھلے رکھے اور جھری سے باہر کا جائزہ لینے کی کوشش کرتا رہا۔ رات گئے مجھے گاڑیاں اسٹارٹ ہونے کی آواز آئی اور آہستہ آہستہ وہاں موجود لوگوں کی آوازیں بھی معدوم ہوتی چلی گئیں۔ بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں موجود تمام افراد اچانک ہی کہیں روانہ ہو گئے ہوں اور گھر میں چند ایک افراد کے علاوہ کوئی باقی نہ ہو۔ مجھے خیال آیا کہ دروازہ بجا کر کسی کو بلاؤں اور اس سے اس وقت روانگی کے بارے میں پوچھوں لیکن پھر میں نے انجان بنا رہنا ہی مناسب سمجھا۔ مسلح افراد کی روانگی کو مشکل سے آدھا گھنٹا ہی گزرا تھا کہ پنڈ کی فضا دھماکوں کی آواز سے گونج اٹھی۔ ایسا لگتا تھا کہ کسی مسلح گروپ نے اچانک ہی پنڈ پر حملہ کر دیا ہو۔ کافی دیر تک فائرنگ کا سلسلہ جاری رہا پھر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد مکان میں دوبارہ ہلچل شروع ہو گئی۔ آوازوں سے معلوم ہو رہا تھا کہ مہم پر جانے والے واپس آگئے ہیں اور اپنے ساتھ مردوں اور زخمیوں کو بھی لے کر لوٹے ہیں۔ بہت دیر تک مکان میں چیخ و پکار، بھاگ دوڑ اور ایک دوسرے کو ہدایات دینے کی آوازیں سنائی دیتی رہیں۔ میں کمرے میں قید بے بس سا اصل معاملے کی سن گن لینے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن پھر صبح کے قریب مجھے نیند آہی گئی۔ تقریباً چھ گھنٹے سوا گھنٹے کی نیند لینے کے بعد میری آنکھ کھلی تو میں نے خود کو وہاں تک پہنچانے والے کو اپنے کمرے میں پایا۔ وہ مجھے نیند سے جگانے اور ناشتے کا پوچھنے آیا تھا۔

میں ضروریات سے فارغ ہو کر ناشتا کرنے بیٹھا تو اس سے رات ہونے والی ہلچل اور فائرنگ کا ذکر چھیڑ دیا۔ وہ بھرا بیٹھا تھا اور اس کی سرخ آنکھوں کو دیکھ کر پتا چل رہا تھا کہ رات بھر اس نے ایک لمحے کے لیے بھی پلک نہیں جھپکی۔ میرے سوال کرتے ہی اس نے بتایا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص کے بارے میں علم ہو گیا ہے۔ وہ پنڈ کا ہی ایک معزز آدمی تھا جو کئی روز سے غائب تھا لیکن کسی نے اس بات کو اس لیے نوٹ نہیں کیا تھا کہ وہ شخص اپنے کاروبار کے سلسلے میں عموماً پنڈ سے غائب ہی رہتا تھا۔ شفقت راؤ نامی اس شخص کے بارے میں انہیں اس طرح معلوم ہوا تھا کہ شریف صاحب نے شفقت راؤ کے کزن اور سمدھی حامد راؤ کے گھر آنے والے ایک مشکوک جوڑے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے وہاں گھریلو کام کرنے والی ایک عورت کی ڈیوٹی لگا دی تھی کہ وہ ٹوہ لے کر بتائے کہ بالکل اچانک مہمان بن کر وہاں آنے والے وہ لوگ کون تھے؟ عورت نے ان کی توقع سے بڑھ کر معلومات حاصل کر ڈالیں۔ حامد راؤ اور اس کے مہمانوں کی گفتگو سن کر اسے معلوم ہوا کہ خانقاہ کو آگ لگانے والا شخص شفقت راؤ تھا۔ یہ اطلاع پا کر پیر سائیں کے مرید چراغ پا ہو گئے اور انہوں نے حامد راؤ کے گھر دھاوا بولنے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ بے شک حامد راؤ بے قصور ہے لیکن اس کے گھر میں مقیم شفقت کی بیوی اور بیٹی کو نشانۂ عبرت بنا کر شفقت سے انتقام کا سلسلہ شروع کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے رات کی تاریکی میں بہت منظم طریقے سے حامد راؤ کے گھر کا محاصرہ کیا اور اس کے سامنے اپنا مطالبہ پیش کیا لیکن حامد راؤ نے اس مطالبے کو ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ عورتیں صرف شفقت کی بیوی اور بیٹی ہی نہیں، حامد راؤ کی بہن اور بہو بھی تھیں۔ اس انکار کے بعد نوبت گولیاں چلنے تک جا پہنچی۔ پیر سائیں کے مریدوں کو اندازہ نہیں تھا کہ ان کی فائرنگ کا اتنے منظم طریقے سے جواب دیا جائے گا۔ انہیں بالکل یوں محسوس ہوا کہ مقابل ان کی کمین گاہوں سے بخوبی واقف تھے اور تاک تاک کر انہیں نشانہ بنا رہے تھے۔ میرے میزبان کے مطابق ان کے تین آدمی ہلاک اور کئی شدید زخمی ہوئے پھر بھی کچھ ہاتھ نہ آیا اور حامد راؤ اپنے اہلِ خانہ اور مہمانوں سمیت پنڈ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ میرے میزبان کا خیال تھا کہ حامد راؤ کے اس فرار کو کامیاب بنانے میں اس کے مہمانوں نے کلیدی کردار ادا کیا ہو گا ورنہ حامد راؤ اور اس کا بیٹا اتنے تیز لوگ نہیں ہیں کہ اتنے منظم طریقے سے مقابلہ کر پاتے۔ اس نے ملازمہ کے ذریعے معلوم ہونے والے مہمانوں کے نام بھی مجھے بتائے تھے جنہیں سن کر میں ششدر رہ گیا۔

روانی سے تفصیلات سناتا ہوا مشابرم خان اس مقام پر آ کر چپ ہو گیا۔ شہریار کو محسوس ہوا کہ وہ کوئی بڑا انکشاف کرنے والا ہے۔ ویسے بھی ٹاہلی والا سے موبائل فون پر اس نے اسے یہی پیغام دیا تھا کہ واپسی میں وہ اپنے ساتھ بہت سے سوالوں کے جوابات اور کچھ انکشافات لے کر آئے گا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا۔ اس کی سنائی گئی تفصیلات میں کئی اہم باتیں معلوم ہوئی تھیں۔ ان تفصیلات کو سن کر اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ خانقاہ میں جل کر مر جانے والا شخص بالا ہو گا۔ عرصے تک چودھری کے ظلم کا ساتھ دینے والا بالا جو ہاتھ پیروں سے سلامت رہا تو اپنے ہی جیسے لوگوں کی زندگیاں دوبھر کرتا رہا، زندگی کے آخری دنوں میں عبرت کا نشان بن کر رہ گیا تھا۔ اس بے ضمیر آدمی کی موت بھی بڑی بھیانک ہوئی تھی۔ یقیناً بے بسی کے عالم میں آگ کا ایندھن بنتے ہوئے اس نے وہ ساری چیخیں، آہیں اور سسکیاں سنی ہوں گی جن کا سبب اس کی ذات بنی تھی۔ شاید وہ ان دردناک لمحات میں اللہ کے آگے معافی کے لیے گڑگڑایا بھی ہو لیکن شہریار کو پورا یقین تھا کہ اس کی کوئی دعا اور التجا قبول نہیں کی گئی ہو گی اور مظلوموں کی بددعائیں بدروحوں کی طرح اس سے چمٹ کر رہ گئی ہوں گی۔

مشابرم خان کی سنائی گئی تفصیلات سے اسے یہ بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ پیر سائیں کے بگڑے جانے والے مرید کالے میاں کی کوئی کال اس کے ساتھیوں کی طرف سے کیوں وصول نہیں کی جا رہی تھی۔ خانقاہ میں آگ لگنے کے بعد وہ سب یقیناً افراتفری میں اپنی جانیں بچا کر وہاں سے نکل بھاگے ہوں گے۔ اتنے نازک لمحات میں ان میں سے کسی کو اپنے موبائل فونز کا خیال بھی نہیں رہا ہو گا اور نتیجتاً آگ نے انہیں چاٹ کر ناکارہ کر دیا ہو گا۔ ان تفصیلات میں ابھی یہ وضاحت ہونا باقی تھی کہ شفقت راؤ کون تھا اور اس نے خانقاہ کو آگ کیوں لگائی تھی؟ اگر مشابرم خان اپنی گفتگو کا آخری جملہ ادا نہ کرتا تو وہ یقیناً اس سے پہلا سوال اس سلسلے میں کرتا لیکن جس انداز میں اس نے اپنے آخری فقرے ادا کیے تھے، شہریار کو اپنے پورے وجود میں عجیب سی سنسنی دوڑتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اتنی بری طرح مضطرب ہو گیا تھا کہ زبان سوال کرنے سے بھی معذور ہو گئی اور یہ کام اس نے اپنی آنکھوں سے لیا تھا۔ مشابرم خان نے بھی اس کے صبر کا زیادہ امتحان نہیں لیا اور دھیمی آواز میں بتانے لگا۔

''ان دونوں کے نام ماہ بانو اور اسلم بتائے گئے ہیں۔

تھوڑا بہت حلیہ وغیرہ بھی جو میں معلوم کرنے میں کامیاب ہوا ہوں، اس سے بھی یہ تصدیق ہو رہی ہے کہ یہ وہی ماہ بانو اور اسلم ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔'' بالآخر مشابرم خان نے دھماکا کر ہی دیا جس نے شہریار کو اندر سے ہلا کر رکھ دیا۔ ماہ بانو کی تلاش میں اس نے کیا کچھ نہیں کیا تھا۔ ڈاکوؤں کی سرکوبی کے نام پر جنگل میں کیا جانے والا آپریشن بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی لیکن اپنی ساری بھاگ دوڑ کے نتیجے میں بھی وہ ماہ بانو کی گرد تک کو بھی نہیں پا سکا اور اب ایک غیر متعلقہ قصے میں اس کا نام اس طرح سامنے آیا تھا کہ وہ ڈاکو اسلم کی ساتھی کی حیثیت سے ٹاہلی والا میں پائی گئی تھی اور اب وہاں بھی موجود نہیں تھی۔ وہاں سے بھی وہ کسی نامعلوم سمت میں روانہ ہو چکی تھی۔

''کیا اسلم نے اسے یرغمالی بنا رکھا تھا؟'' اس کا ذہن ماہ بانو کو کسی ڈاکو کا ساتھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے اس نے یہ سوال کیا۔

''کچھ کہنا مشکل ہے۔ جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان کے مطابق وہ دونوں میاں بیوی کی حیثیت سے حامد راؤ کے گھر میں موجود تھے۔'' مشابرم خان کی آواز کچھ اور بھی دھیمی ہو گئی۔ یہ بات بتاتے ہوئے اس نے شہریار کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کیا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے اس کے ساتھ تھا۔ ماہ بانو کے اس تک پہنچنے سے لے کر بار بار غائب اور بازیافت ہونے کا ہر واقعہ اس کے علم میں تھا۔ اس نے دیکھا تھا کہ شہریار کس طرح اس لڑکی کے تحفظ کے لیے بے چین اور فکرمند رہتا تھا۔ کافی دنوں تک ماہ بانو بلتستان میں اس کے اپنے گھر میں روپوش رہی تھی۔ شہریار کی وفاداری اور اس لڑکی کی ہمدردی میں وہ اپنے بھائی اکرم خان کو گنوا بیٹھا تھا اور صدمے سے کومے میں چلی جانے والی اس کی ماں آج بھی اسلام آباد کے ایک اسپتال میں زندگی اور موت کے درمیان لٹکی ہوئی تھی۔ شہریار اپنے جذبات کے اظہار سے لاکھ گریزاں سہی، پر عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ مشابرم خان کو بھی کسی حد تک اس کی قلبی کیفیات کا اندازہ تھا اس لیے وہ اس موضوع پر بات کرتے ہوئے بہت محتاط تھا۔ شہریار کا ملازم ہونے کے ناتے اس سے وفاداری تو اپنی جگہ تھی ہی، وہ بہ حیثیت انسان بھی اسے بے پناہ پسند کرنے کی وجہ سے اس سے محبت کرتا تھا اس لیے اس کے جذبات کو ٹھیس لگنے سے خائف بھی تھا۔

''ہو سکتا ہے اسلم نے ماہ بانو کو یرغمال بنا رکھا ہو اور وہ وہی کچھ کرنے پر مجبور ہو جو اسلم اس سے کہتا ہو۔'' خاصے توقف کے بعد شہریار نے کہا۔

''شاید یہی بات ہو۔'' مشابرم خان نے اس سے اختلاف کرنا مناسب نہیں سمجھا ورنہ اسے ٹاہلی والا سے جو خبریں ملی تھیں، ان میں ایسی کوئی بات شامل نہیں تھی جس سے یہ اشارہ ملتا ہو کہ ماہ بانو کی حیثیت کسی یرغمالی کی سی ہو اور وہ مجبوراً اسلم کے ساتھ موجود ہو۔ اسے مبینہ طور پر اسلم کی ساتھی بتایا گیا تھا۔

''خیر جو بھی بات ہو گی، کبھی نہ کبھی سامنے آ جائے گی۔ فی الحال تم ٹاہلی والا پر توجہ دو اور دو چار دن بعد دوبارہ وہاں چکر لگا کر مزید سن گن لینے کی کوشش کرو۔ یہ پیر سائیں مجھے بڑا گڑبڑ آدمی معلوم ہوتا ہے۔ اللہ والوں کے مریدیوں کسی کی ماں بہن کی بے عزتی کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ہی کسی کے گھر پر مسلح جتھے کی صورت میں حملہ کرتے ہیں۔ یہ تو کچھ مجرمانہ ذہنیت کی عکاسی ہو رہی ہے۔ تم دوبارہ وہاں جاؤ تو خاص طور پر یہ معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ شفقت راؤ نامی شخص نے خانقاہ میں آگ کیوں لگوائی۔ وہ گاؤں کا باشندہ تھا اور بے شک پیر سائیں کا معتقد نہ رہا ہو لیکن اس بات سے تو واقف ہو گا کہ گاؤں میں پیر سائیں کے کتنے عقیدت مند موجود ہیں اور اس کی حرکت کے ردِعمل میں کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ کسی معزز آدمی کے اتنی خطرناک حرکت کرنے کا محرک معمولی نہیں ہوتا۔ شفقت راؤ کی حرکت کے پیچھے بھی کوئی بڑی وجہ رہی ہو گی۔ تمہیں پوری کوشش کر کے وہ وجہ معلوم کرنی ہو گی تاکہ پیر سائیں کا کردار واضح ہو سکے۔'' ماہ بانو سے متعلق ملنے والی خبر نے اسے خاصا شدید ذہنی جھٹکا لگایا تھا پھر بھی حالات کا بالکل درست تجزیہ کرتے ہوئے وہ مشابرم خان کو ہدایات دے رہا تھا۔

''ٹھیک ہے صاحب! میں اس گتھی کو سلجھانے میں اپنی پوری جان لڑا دوں گا۔'' حسبِ معمول مشابرم خان میدانِ عمل میں اترنے کے لیے دل و جان سے راضی تھا۔

''گڈ! مجھے تم سے یہی امید تھی۔'' شہریار نے اسے سراہا اور پھر کھلی فائل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مشابرم خان ملاقات ختم ہونے کا اشارہ پا کر باہر نکل گیا۔ اس کے چلے جانے کے بعد شہریار نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح فائل کی طرف توجہ مرکوز کر سکے لیکن ذہن منتشر ہی رہا۔ ماہ بانو کا اسلم ڈاکو کے ساتھ اس کی بیوی کی حیثیت سے پایا جانا اتنا غیر اہم واقعہ نہیں تھا جسے وہ آسانی سے نظر انداز کر سکتا۔ اسے تھوڑی ہی دیر میں اپنی کیفیت کا ادراک ہو گیا اور وہ فائل بند کر کے اٹھ کھڑا ہوا۔ اتنی منتشر ذہنی کیفیت میں یہاں بیٹھنے سے بہتر

تھا کہ وہ گھر واپس چلا جائے۔ فیصلہ کر کے وہ سیٹ سے اٹھا تو واپس گھر پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ بیڈ روم میں داخل ہوتے ہی اس کا ماریا سے سامنا ہو گیا۔

''خیریت، آج اتنی جلدی کیسے واپس آ گئے؟'' اسے بے وقت گھر میں موجود پا کر اس نے سوال کیا اور پھر تیزی سے آگے بڑھ کر کوٹ اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگی۔ اس چھوٹے سے کام کو انجام دینے میں اس کا انداز اتنا دل ربا تھا کہ وہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکا اور دل کو لگنے والی تازہ چوٹ کے باوجود اس سے بے مروتی برتنے کے بجائے آہستہ سے بولا۔ ''طبیعت کچھ بوجھل سی تھی۔ سر میں درد سا محسوس ہو رہا تھا اس لیے میں نے سوچا کہ گھر چل کر کچھ دیر آرام کر لوں۔''

''تھینک گاڈ کہ آپ کو اپنے بارے میں اس طرح سوچنے کا خیال آیا ورنہ مجھے تو لگتا ہے کہ آرام کا لفظ آپ کی ڈکشنری میں ہے ہی نہیں اور آپ نے کام کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا ہے۔'' بیویوں والے مخصوص لب و لہجے میں خفگی کا اظہار کرتے ہوئے ماریا نے اس کی ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کر کے اسے گردن سے نکالا اور پھر اس کا بازو تھام کر بیڈ کی طرف لے گئی۔ اس سارے عمل میں وہ اس کے اتنے قریب رہی تھی کہ وہ بہ خوبی اس کے بدن سے اٹھتی دھیمی سی باڈی اسپرے کی خوشبو کو محسوس کر رہا تھا۔ دھیمی سی اس خوشبو میں کچھ ایسا جادو تھا کہ وہ مسحور سا ہونے لگا اور حسبِ معمول فوری طور پر لباس تبدیل کر کے فریش ہونے..... کے بجائے چپ چاپ ماریا کے اشاروں پر عمل کرنے لگا۔ بیڈ کے قریب پہنچتے پر ماریا نے اس کے دونوں شانے تھام کر اسے کنارے پر بٹھا دیا اور خود نیچے اس کے قدموں میں بیٹھ کر اس کے جوتے اتارنے لگی۔

''ارے یہ کیا کر رہی ہو؟'' اس نے تیزی سے اپنا پیر پیچھے کرتے ہوئے اسے ٹوکا۔ وہ ماریا سے یوں بھی اکثر شرمندہ رہتا تھا کہ اس کے تمام تر خلوص کے باوجود اسے وہ توجہ اور محبت نہیں دے پاتا جس کی وہ بطور بیوی حق دار تھی، اس پر سے اس کی اتنی خدمت گزاری نے تو اسے شرمندہ ہی کر کے رکھ دیا۔ اس کی شوہر پرستی کو دیکھ کر تو قطعی طور پر اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ وہ ایک کوالیفائڈ ڈاکٹر ہے جو خود بھی معاشرے میں ایک ممتاز مقام رکھتی ہے۔ شہریار جس کلاس سے تعلق رکھتا تھا، وہاں تو عورتیں عموماً ہاتھ پیر ہلانے کی عادی ہی نہیں ہوتی تھیں اور خود کچھ نہ ہونے کے باوجود اپنے باپ، بھائی یا شوہر کے عہدے کے زعم میں مبتلا خود کو اتنا اعلیٰ سمجھنے لگتی تھیں کہ معمولی سے معمولی کام کرنا بھی انہیں اپنی توہین محسوس ہوتا تھا کجا کہ شوہر کے پیروں سے جوتے اتارنے کا کام۔

''میں وہی کر رہی ہوں جس سے میرے دل کو خوشی ملتی ہے۔ آپ مجھے روک کر میری خوشی سے محروم نہ کریں۔'' اس نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ آگے بڑھائے، اس بار شہریار نے خود کو بے بس سا پایا۔ جوتے اتارنے کے بعد ماریا اپنی نرم و ملائم انگلیوں سے آہستہ آہستہ اس کے پیروں کو سہلانے لگی۔ اس کی متحرک انگلیوں کی ہر ہر جنبش میں اتنی مشاقی تھی کہ شہریار نے اپنے پورے وجود میں سرور کی لہریں سی دوڑتی ہوئی محسوس کیں۔ اپنے کام کو جاری رکھتے ہوئے ماریا نے آہستہ سے اپنا سر اس کے گھٹنوں پر ٹکا لیا اور مخمور سے لہجے میں بولی۔ ''مجھے معلوم ہے کہ آپ نے حالات کے جبر کے تحت مجھے اپنایا ہے لیکن اس کے باوجود میرا اور آپ کا رشتہ اٹل ہے۔ میں ہمیشہ کوشش کرتی ہوں کہ ذہن سے ہر ناخوشگوار یاد کو کھرچ کر حال میں جی سکوں۔ میں نے آپ کے اور اپنے رشتے کو دل و جان سے قبول کر لیا ہے اور بیوی کی حیثیت سے اپنے سارے حقوق و فرائض ادا کرنے کی خواہش مند ہوں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آپ بہت مصروف رہتے ہیں اور کسی عام آدمی کی طرح اپنی بیوی کو زیادہ وقت اور توجہ نہیں دے سکتے لیکن مجھے اتنا تو حق دیا کریں نا کہ قسمت سے جو تھوڑا بہت وقت مجھے مل جائے اس میں، میں اپنے اور آپ کے رشتے کو محسوس کر سکوں۔'' اس کے بے حد نرمی سے کیے شکوے نے جہاں شہریار کو شرمندہ کیا، وہیں دل میں ایک ٹیس سی بھی اٹھی۔ اسے آج تک وہ رات نہیں بھولی تھی جب وہ ماریا کے ساتھ لاہور کی طرف عازمِ سفر تھا اور اچانک ہی ماریا کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے انہیں ایک تھرڈ کلاس سے ہوٹل میں رکنا پڑا تھا۔ اس ہوٹل کے کمرے میں اس کے ساتھ رات گزارتے ہوئے جانے اسے کیا ہوا تھا کہ عمر بھر کا زعمِ پارسائی جاتا رہا اور وہ ہر حد پھلانگ کر اپنی ہی نظروں میں مجرم ٹھہرا۔ اس جرم کی تلافی کے لیے اس نے ماریا سے شادی کر ڈالی لیکن ابھی تک وہ اپنے اور اس کے رشتے کو اس طرح سے قبول نہیں کر سکا تھا کہ ماریا کے ساتھ گرم جوشی سے پیش آتا۔ اس کی کامار یا اکثر اس سے شکوہ کرتی تھی اور وہ خود کو شرمندہ محسوس کرتا تھا۔ اس وقت بھی ایسا ہی ہوا اور وہ اپنے گھٹنوں پر ٹکے ماریا کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے نرمی سے بولا۔

''تم اتنی دل برداشتہ نہ ہوا کرو۔ میں مزاجاً ہی تھوڑا روکھا آدمی ہوں اور تم سے بطور خاص بے نیازی سے پیش نہیں آتا، نہ ہی تمہارے کسی حق سے انکاری ہوں۔ تم میری

بیوی ہو نہ تو اس بات کو جھٹلایا جا سکتا ہے اور نہ ہی یہ ممکن ہے کہ تمہارے ہوتے کسی دوسری عورت کو یہ مقام حاصل ہو سکے۔ تمہیں مجھ پر کم از کم اتنا اعتماد ضرور کرنا چاہیے کہ جتنا بھی کم سہی مگر میں صرف تمہیں میسر ہوں اور تمہارے حقوق میں کوئی اور حصے دار نہیں ہے۔''

''میں نے کبھی آپ کے کردار پر شک کیا بھی نہیں لیکن بس کبھی کبھی یہ احساس کہ آپ نے مجبوراً مجھے اپنی زندگی میں شامل کیا ہے، اتنی شدت اختیار کر لیتا ہے کہ میں آپ کے ہر رویے کو اسی کے تناظر میں دیکھنے لگتی ہوں اور دکھی ہو جاتی ہوں۔'' اس نے اپنا سر کچھ اس انداز سے شہریار کے گھٹنوں پر ٹکا رکھا تھا کہ وہ اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن آواز کے بوجھل پن سے ظاہر تھا کہ وہ رو رہی ہے۔

''بلاوجہ خود کو اتنا ٹینس کرنا حماقت ہے۔ حد سے بڑھی ہوئی حساسیت بھی انسان کا جینا دشوار کر دیتی ہے۔ چلو شاباش اٹھو اور مجھے کوئی پین کلر دو تاکہ میں اپنے سر درد سے نجات حاصل کر سکوں۔'' اس نے ماریا کو دونوں شانوں سے تھام کر سیدھا کیا تو کچھ دیر کے لیے نظریں اس کے چہرے پر جمی ہی رہ گئیں۔ نم ناک پلکوں کے ساتھ آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈوروں اور ناک کی سرخ پڑتی نوک نے اس کے حسن کو نیا ہی روپ دے دیا تھا۔ شہریار نے اپنا دل اس کے لیے گداز ہوتا محسوس کیا۔ وہ جیسے بھی سہی، اس کی بیوی تھی لیکن بدقسمتی سے وہ اسے خوش رکھنے میں ناکام تھا۔

''جسٹ آ منٹ۔ میں ابھی آپ کو کوئی اچھی سی میڈیسن دیتی ہوں۔'' اس کی قلبی کیفیت سے انجان ماریا بولتی ہوئی اس کے قدموں سے اٹھی اور پھرتی سے ایک دراز میں سے ٹیبلٹ نکال کر پانی کے گلاس سمیت اس کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ شہریار نے اس کی ہتھیلی پر دھری ٹیبلٹ اٹھا کر منہ میں رکھی اور پانی کے ساتھ نگل گیا۔

''اب آپ لیٹ جائیں۔'' ماریا نے پیار سے اسے ہدایت دی۔

''پہلے میں چینج کر لوں ورنہ مجھے قطعی نیند نہیں آئے گی۔'' شہریار نے کہا تو اس بار اس نے اس سے کوئی تعرض نہیں کیا اور خود بیڈ کے کنارے پر ٹنک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔ تھوڑی ہی دیر میں شہریار ڈھیلے ڈھالے آرام دہ کپڑوں میں ملبوس واپس آ گیا۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جنہیں مردانہ وجاہت کا شاہکار قرار دیا جاتا ہے اور جو کچھ بھی پہن لیں، ان پر سج جاتا ہے۔ اگر وہ تھوڑی دیر پہلے فارمل ڈریسنگ میں بے حد وجیہہ لگ رہا تھا تو اس وقت بھی اس کی وجاہت میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ اپنی تمام تر وجاہت کے ساتھ وہ مضبوط قدموں سے چلتا ہوا بیڈ کی طرف بڑھا تو ماریا کو اس کا ہر قدم اپنے دل پر پڑتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی قلبی حالت سے بے خبر وہ مگن سا آ کر بستر پر دراز ہو گیا اور ماریا بے ساختہ ہی اس کے قریب سرک آئی۔ قریب بیٹھ کر اس نے شہریار کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا اور اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔ کچھ دوا کا اثر تھا اور کچھ ماریا کی مشاق انگلیوں کی حرکت کہ اس نے اپنے سر کا بوجھل پن کم ہوتا محسوس کیا۔ ماریا کی انگلیاں مہارت سے اس کے سر میں حرکت کرتی رہیں اور پھر ان انگلیوں نے بہت آہستگی سے آگے کا سفر شروع کر دیا۔ کنپٹیوں سے رخسار، ٹھوڑی اور گردن کا سفر طے کرتی اس کی متحرک انگلیاں بہت آہستگی سے سینے تک پہنچ گئیں اور وہاں موجود گھنے بالوں میں الجھنے لگیں۔ انگلیوں کی اس جادو اثر حرکت کے ساتھ ساتھ اس کے شاداب بدن سے اٹھتی دھیمی دھیمی مہک نے بھی آہستہ آہستہ شہریار کو اپنی گرفت میں لینا شروع کر دیا۔ ویسے بھی وہ زخم خوردہ تھا اور عورت کے فراق میں زخم خوردہ مرد کے لیے عورت سے بڑھ کر کوئی مرہم نہیں ہوتا۔ وہ کبھی وقتی طور پر سہی، بہلتا جا رہا تھا اور بہلنے کے لیے بہکنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ شراب نہیں پیتا تھا کہ اس کے نشے میں بہک جانے کا انتظام کرتا لیکن ماریا اس وقت اس کے لیے نشے سے بھری چھلکتی بوتل ہی بنی ہوئی تھی جو بڑی فراخ دلی سے اسے فیض یاب کر رہی تھی۔ مے حسن سے فیض یاب ہوتا اس وقت وہ بڑا مسرور تھا لیکن جانے دل کے ایک گوشے میں کیسی کسک تھی جو کسی صورت پیچھا چھوڑتی ہی نہیں تھی۔ بہکنے اور بہلنے کے عمل سے گزرتے ہوئے بھی وہ اس کسک کو محسوس کر سکتا تھا۔

☆☆☆

''رب کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں حفاظت سے یہاں تک پہنچا دیا پر آگے کچھ سوچا ہے راؤ صاحب! آگے ہم کیا کریں گے؟'' اس وقت وہ لوگ شہر میں موجود حامد راؤ کے دو کمروں کے فلیٹ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہ فلیٹ دورانِ تعلیم مقصود کے زیرِ استعمال رہا تھا۔ اب بھی اس کا یا حامد راؤ کا کسی کام سے شہر آنا ہوتا تو وہ وہیں قیام کرتے تھے چنانچہ رات کے اندھیرے میں جب وہ لوگ ٹاہلی والا سے اپنی جانیں بچا کر فرار ہوئے تو سیدھے یہیں کا رخ کیا۔ دو کمروں کا وہ فلیٹ اتنا چھوٹا تھا کہ خواتین کا مکمل پردہ کرنا ممکن نہیں رہا تھا اس لیے حامد راؤ کی بیوی اس وقت اسلم کی موجودگی میں ہی اس سے بات کر رہی تھی۔ ویسے ان بے چاری خواتین کا

پردہ تو اسی وقت ٹوٹ گیا تھا جب وہ ٹاہلی والا سے افراتفری میں فرار ہو رہے تھے۔ وہ لمحات اتنے کٹھن تھے کہ کسی کو کچھ ہوش ہی نہیں رہا تھا... تو پھر بے چاری خوف زدہ خواتین پردے کا کیا خاک خیال رکھ پاتیں۔

''ہم کیا اور ہماری بساط کیا؟ جس رب نے جان بچانے کا احسان کیا ہے، وہ آگے کے معاملات بھی خود ہی سنوار دے گا۔'' حامد راؤ نے اپنی بیوی کو تسلی دی اور پھر مقصود کی طرف متوجہ ہو گیا۔

''مقصود پتر! تھوڑی دیر میں باہر جا کر کھانے پینے کا سامان لے آنا۔ یہاں تو کچھ ہو گا نہیں اور تمہیں معلوم ہے کہ تمہاری پھپی بھوک کی کتنی کچی ہے۔ نیند سے جاگے گی تو کھانے کے لیے شور مچا دے گی۔'' حامد راؤ نے اپنی جیب سے رقم نکال کر مقصود کے حوالے کی۔ یہ تھوڑی سی رقم اتفاق سے ہی اس کی جیب میں پڑی رہ گئی تھی ورنہ وہ لوگ جتنی افراتفری میں وہاں سے نکلے تھے، کسی کو کچھ بھی ساتھ لینا یاد نہیں رہا تھا۔ اسے اندازہ تھا کہ مقصود کی جیبیں بھی خالی ہوں گی اس لیے اسے رقم تھمائی تھی اور مقصود نے بنا حجت کے اجس طرح وہ رقم تھام لی تھی اس سے اس کے اندازے کی تصدیق بھی ہو گئی تھی۔ بہرحال، یہ کوئی تشویش ناک بات نہیں تھی۔ مقصود کسی وقت جا کر شفقت راؤ کے منیجر سے مل لیتا تو یہ مسئلہ منٹوں میں حل ہو جاتا۔ وہ شفقت راؤ کا داماد تھا اور اپنے داماد کو اس نے اتنی حیثیت تو دے رکھی تھی کہ اس کے مطالبے پر منیجر بے چون وچرا مطلوبہ رقم اس کے حوالے کر دیتا۔

''اگر رقم کا کوئی مسئلہ ہے تو میں بھی تھوڑی بہت رقم آپ کو دے سکتا ہوں۔'' اسلم کی گہری نظروں نے بھی فوراً مقصود کی خالی جیب کا اندازہ لگا لیا تھا اس لیے اس نے پیشکش کی۔ حامد راؤ کے گھر سے افراتفری میں فرار ہونے کے باوجود وہ بالکل بے سروسامانی کا شکار اس لیے نہیں تھا کہ ڈیرے سے روانہ ہوتے وقت ہی اس نے اپنے پاس موجود جمع پونجی ایک چرمی تھیلے میں رکھ کر اسے لباس کے نیچے جسم سے باندھ لیا تھا اور وہ چرمی تھیلا مستقل اس کے ساتھ ساتھ ہی تھا۔ تھیلے میں خاصی معقول رقم موجود تھی۔ اگر اس نے ماہ بانو کی حفاظت کے لیے اسے صرف اپنے لیے مخصوص کرنے کا مطالبہ کر کے سردار کو منہ مانگی رقم کی پیشکش نہ کی ہوتی تو اس وقت وہ اتنی بڑی رقم کا مالک ہوتا کہ شہر کے کسی بھی حصے میں گھر خرید کر وہاں ماہ بانو کے ساتھ اپنی نئی زندگی کا آغاز کر سکتا تھا۔ بہرحال، اب بھی وہ اس لائق تو تھا ہی کہ وقتی طور پر گزارہ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی اور اس نے اپنے محسن حامد راؤ کو بہت کھلے دل سے رقم کی پیشکش کی تھی۔

''نہیں صاحب زادے! رقم کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ کچھ رقم موجود ہے اور مزید بھی ضرورت کے مطابق منگوائی جا سکتی ہے۔ البتہ تمہاری پُرخلوص پیشکش کے لیے میں دل سے تمہارا شکر گزار ہوں۔'' حامد راؤ نے بڑے سجاؤ سے اسے جواب دیا اور پھر اپنی بیوی کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اس سے بولے۔

''بھلی لوک! میرا خیال ہے کہ تم دونوں بھی تھوڑی دیر جا کر آرام کر لو۔ ناشتے پانی کا مقصود بازار سے انتظام کر دے گا اس لیے اس طرف سے بے فکر رہنا۔''

''چنگی گل ہے راؤ صاحب!'' حامد راؤ کی سیدھی سادی فرماں بردار بیوی نے اس کا اشارہ پا کر اٹھنے میں ذرا دیر نہ لگائی۔ ماہ بانو کو بھی اس کی پیروی کرنی پڑی۔ انیلا اور اس کی ماں تو پہلے ہی دوسرے کمرے میں تھیں چنانچہ ان دونوں کے جاتے ہی کمرے میں صرف مردانہ نفری ہی رہ گئی۔ اس پل اسلم نے محسوس کیا کہ حامد راؤ اسے کچھ جانچتی ہوئی نظروں سے گھور رہا ہے۔ وہ اس کی نظروں سے بے چینی سی محسوس کرنے لگا۔ یوں لگتا تھا کہ حامد راؤ اس سے کوئی خاص بات کرنے والا ہے لیکن جب کئی منٹ گزر جانے کے بعد بھی وہ زبان سے کچھ نہ بولا تو اسلم کی بے چینی الفاظ کا روپ دھار گئی۔

''کیا بات ہے راؤ صاحب! آپ میری طرف ایسی نظروں سے کیوں دیکھ رہے ہیں؟ کہیں مجھ سے آپ کی شان میں کوئی گستاخی تو نہیں ہو گئی؟'' اس نے کچھ گھبراہٹ کے عالم میں سوال کیا۔

''تم کون ہو؟'' حامد راؤ نے اس کی بات کا جواب دینے کے بجائے نہایت سنجیدگی سے پوچھا۔

''مم... میں۔ میں آپ کو اپنے بارے میں بتا تو چکا ہوں۔'' اس نے گڑبڑا کر جواب دیا۔

''لیکن مجھے شک ہے کہ تم نے مجھے اپنے بارے میں سچ نہیں بتایا ہے۔'' وہ بڑے نپے تلے انداز میں بولے۔

''لیکن کیوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟'' اس نے پست آواز میں احتجاج کیا۔

''دیکھو برخوردار! بات یہ ہے کہ بے شک میں ایک چھوٹے سے پنڈ کا رہنے والا عام سا آدمی ہوں لیکن بہرحال میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔ میں نے زندگی کو تم سے کہیں زیادہ برتا ہے اس لیے میرا تجربہ بھی وسیع ہے۔ اور میرا تجربہ کہتا ہے کہ تم نے اپنے بارے میں ہمیں سب کچھ نہیں بتایا ہے۔ تمہاری اصلیت اب تک پردے میں ہے۔''

''میں پھر پوچھوں گا کہ آپ کس بنیاد پر ایسا کہہ رہے ہیں؟'' اندر ہی اندر لرزنے کے باوجود اس نے اپنا لہجہ ذرا مضبوط کر کے سوال اٹھایا۔

''ٹاہلی والا میں گزرنے والے آخری لمحات کی بنیاد پر۔ ہتھیار میرے اور مقصود کے پاس بھی تھے لیکن تم جس منظم انداز میں ہتھیار استعمال کر رہے تھے، اس سے صاف ظاہر تھا کہ تمہیں ان کھلونوں سے کھیلنے کا وسیع تجربہ ہے۔ پھر تم جس بے خوفی اور بے جگری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں وہاں سے نکال لائے، وہ کسی عام شخص کے بس کی بات نہیں۔ ایسی مہارت دو ہی طرح کے لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اول قانون کے محافظ، دوئم قانون کے دشمن۔ اب تم بتاؤ کہ تمہارا تعلق کس گروہ سے ہے؟'' انہوں نے نپا تلا سا تجزیہ اس کے سامنے رکھا تو وہ کتنی ہی دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ ہو سکا پھر نظریں جھکا کر دھیمی آواز میں پوچھا۔

''آپ کا کیا اندازہ ہے؟ آپ مجھے کس گروہ کا آدمی سمجھتے ہیں؟'' اس بار حامد راؤ کے لیے فوری طور پر جواب دینا ممکن نہیں رہا اور وہ ذرا سے توقف سے گلا کھنکھارتے ہوئے بولے۔

''اگر سچ پوچھو تو عقل اور تجربہ دونوں یہی کہتے ہیں کہ جو راہِ راست پر ہوتے ہیں اور قانون کے دائرے میں رہ کر کام کرتے ہیں، انہیں دوسروں سے اپنی پہچان چھپانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی۔ وہ بہت فخر سے اپنی پہچان ظاہر کر سکتے ہیں لیکن دوسری طرف میں تمہاری روشن پیشانی اور سلجھی ہوئی طبیعت کو دیکھتا ہوں تو دل تمہیں غلط ماننے پر راضی نہیں ہوتا۔ حالانکہ تم جن حالات میں مجھ تک پہنچے ہو وہ خاصے مشکوک تھے۔'' حامد راؤ کا جواب سن کر وہ دھیرے سے مسکرا دیا۔ انہوں نے اس کے بارے میں جو تجزیہ پیش کیا تھا، وہ بالکل درست تھا۔ وہ اس کے بارے میں بالکل جائز تذبذب کا شکار تھے۔ قسمت کی ستم ظریفی نے اسے ڈاکوؤں کے گروہ میں شامل کر دیا تھا جہاں سے اس نے ہتھیاروں کا استعمال اور لڑنے بھڑنے کا ہنر سیکھا لیکن تھا تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد جس نے پڑھ لکھ کر ملک کی خدمت کرنے کا خواب آنکھوں میں سجا رکھا تھا۔ حالات کی زد میں آ کر اس کا یہ خواب اتنی بری طرح بکھرا کہ وہ خود بکھر کر رہ گیا اور پیشانی پر ڈاکو ہونے کا داغ سجا بیٹھا۔

''اگر تم مناسب نہیں سمجھتے یا ہمیں اپنے بارے میں نہیں بتانا چاہتے تو مت بتاؤ لیکن جھوٹ بولنے سے گریز ہی کرنا۔ تم جو بھی ہو، ہم نے تمہیں دل میں جگہ دی ہے اور اگر کبھی زندگی میں کسی مقام پر تمہارے جھوٹے ہونے کا علم ہوا تو بہت

دکھ ہوگا۔'' حامد راؤ نے یہ الفاظ کہہ کر اسے بالکل ہی بے بس کر دیا۔ اپنے ساتھ اتنا خلوص برتنے والے شخص سے کوئی جھوٹ بولنے کا سوچ کر وہ پہلے ہی تذبذب کا شکار تھا اور اب تو ذرا بھی گنجائش نہیں رہی تھی چنانچہ اپنی داستانِ حیات اختصار سے سناتا گیا۔ اس نے ماہ بانو کے ڈیرے پر پہنچائے جانے سے متعلق بھی سب کچھ بتا ڈالا اور اس کے لیے اپنی پسندیدگی بھی ظاہر کر دی البتہ اس مقام پر اس نے حامد راؤ سے ایک جھوٹ بولنا ضروری سمجھا اور وہ یہ کہ اس کی اور ماہ بانو کی ڈیرے پر شادی کر دی گئی تھی۔ یہ جھوٹ اس نے صرف اس لیے بولا تھا کہ ماہ بانو کی عزت پر کوئی حرف نہ آئے اور ان دونوں کے تعلق کے بارے میں کوئی غلط قیاس نہ کیا جا سکے۔

حامد راؤ نے اس کی داستان کا ایک ایک حرف پوری توجہ اور سنجیدگی کے ساتھ سنا اور کہیں ان کے چہرے پر ایسا کوئی تاثر نہیں ابھرا جس سے اسے گمان ہوتا کہ وہ اس کی سچائی پر شک کر رہے ہیں۔ البتہ مقصود کی آنکھوں میں ایک جہانِ حیرت بھرا ہوا تھا۔ یقینی طور پر اس کے لیے اسلم کی داستان بہت دلچسپ اور حیرت ناک ثابت ہوئی تھی۔

''تمہاری داستان بہت دل گداز ہے اسلم! ہمارے معاشرتی رسوم و رواج کی بدصورتی اور لوگوں کی بے حسی نے نہ جانے تم جیسے کتنے نوجوانوں کو برباد کیا ہے۔ تمہاری بہن کے سسرالیوں نے تمہاری حیثیت سے زیادہ جہیز مانگ کر جس کم ظرفی اور لالچ کا مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے برائی کس حد تک پھیلی، شاید خود انہیں بھی اندازہ نہ ہو۔ ایک طرف اگر تم اور تمہارا گھرانا برباد ہوا تو دوسری طرف وہ لوگ خود کون سا سکھ میں رہے۔ جوان بیٹے کے قتل نے ان کی کمر بھی تو توڑ ڈالی ہوگی اور پھر ان متاثرین کا تو کوئی شمار ہی نہیں ہے جو تمہارے ڈاکو بننے کے بعد تمہارے ہاتھوں لٹے ہوں گے۔ لٹنے والوں کی بھی اپنی اپنی داستانیں ہوں گی۔ کہیں کسی کی بیٹی کی شادی کے لیے رکھا ہوا اسباب لٹ گیا ہوگا تو کہیں کسی بیمار کے علاج کے لیے رکھی رقم۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم نے کبھی ایسی کسی رقم پر ہاتھ ڈال دیا ہو جو کسی بے سہارا جوڑے نے اپنے بڑھاپے کے لیے سنبھال کر رکھی ہو یا پھر کسی نوجوان کو اعلیٰ تعلیم کے لیے بھیجنے کے واسطے مختص ہو... اور اس کے خواب بھی تمہاری طرح بکھر گئے ہوں۔'' حامد راؤ کے الفاظ نے اسے گہری شرمندگی سے دوچار کر دیا۔ غصے اور انتقام کی آگ میں جلتے کبھی اس نے اس انداز سے تو سوچا ہی نہیں تھا۔ اپنی نظر میں تو وہ اب تک اس معاشرے سے انتقام لیتا رہا تھا جس نے اسے برباد کیا تھا لیکن اب ذرا مختلف زاویے سے دیکھ رہا تھا تو اپنا کردار مظلوم سے بڑھ کر ظالم کا نظر آ رہا تھا۔ اگر کسی نے اس پر ظلم ڈھایا تھا تو وہ بھی تو کسی سے پیچھے نہیں رہا تھا۔ خود کو برباد کرنے والے افراد کو تو وہ آسانی سے انگلیوں پر شمار کر سکتا تھا لیکن جو اس کے ہاتھوں برباد ہوئے تھے، ان کا اس کے پاس کوئی شمار کب تھا۔ ندامت کے شدید احساس سے اس کا سر جھکتا ہی چلا گیا۔

''میں نے یہ سب تمہیں شرمندہ کرنے کے لیے نہیں کہا ہے۔'' حامد راؤ اس کی کیفیت فوراً ہی بھانپ گئے۔ ''میں یہ سب اس لیے کہہ رہا ہوں کہ مجھے تمہاری داستان سن کر دلی رنج ہوا ہے اور میں پوری شدت سے اس بات پر کڑھ رہا ہوں کہ محض کسی کے لالچ کی وجہ سے کتنی بربادی ہوئی۔ تم تو خود حالات کا شکار ایک ستم رسیدہ نوجوان ہو۔ میں تم پر طنز کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا اور اب تو تم برائی کی اس دلدل سے نکل ہی آئے ہو۔ یہ تمہاری خوش قسمتی ہے کہ ایک برے ٹھکانے پر ہونے کے باوجود اللہ نے تم تک ایک ایسی عورت کو پہنچا دیا جو تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں اس جہنم سے نکال لائی ورنہ عورت کے لالچ اور طمع کی بھی بڑی داستانیں بکھری ہوئی ہیں۔ ماہ بانو بیٹی قابلِ تعریف ہے کہ اس نے اپنے لیے ایک مشکل لیکن سیدھی راہ کا انتخاب کیا ورنہ اگر وہ لالچ میں مبتلا ہو جاتی تو ہو سکتا تھا کہ تم اس کی خاطر پہلے سے بھی بڑی بڑی وارداتیں کرنے پر مجبور ہو جاتے۔'' حامد راؤ بہت سمجھاؤ سے اسے احساسِ شرمندگی سے نکالنے لگا۔

''شکریہ راؤ صاحب! میں نے اپنے بارے میں آپ کو اتنی تلخ سچائی سے شاید اسی لیے آگاہ بھی کر دیا کہ آپ مجھے صاحبِ دل آدمی محسوس ہوئے تھے، ورنہ کوئی عام آدمی تو میرے ڈاکو ہونے کا سن کر ہی بدک جاتا۔'' اس نے رقت آمیز لہجے میں حامد راؤ کا شکریہ ادا کیا۔

''یہ بتاؤ کہ اب تمہارا کیا پروگرام ہے؟ اگر تم چاہو تو ہم تمہیں اپنے کاروبار میں شامل کر سکتے ہیں۔ ہمارے زراعت اور باغبانی سے متعلق کاروبار سے تو شاید تمہیں اتنی دلچسپی نہ ہو لیکن شفقت کے دفتر میں تمہارے مطلب کا کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آئے گا۔ میں تمہیں وہاں کھپا دوں گا تاکہ تم اپنی بیوی کے ساتھ باعزت زندگی گزار سکو۔'' انہوں نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ کیے بغیر اس سے اس کا پروگرام جاننا چاہا اور ساتھ ہی ایک پیشکش بھی کر دی۔

''میں آپ کا بہت ممنون ہوں راؤ صاحب کہ آپ نے مجھے اس قابل سمجھا۔ میں آپ کی اس پیشکش کو یاد رکھوں گا لیکن فی الحال مجھے اپنی ماں سے ملنے گاؤں جانا ہے۔ میری

خطاؤں کی وجہ سے وہ آج تک مجھ سے ناراض ہے۔ میں اسے منانے کی کوشش میں بھی کامیاب نہیں ہو سکا لیکن اب مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے ناراض نہیں رہ سکے گی۔ ماہ بانو اسے منا لے گی۔'' اسلم کی آنکھوں میں ایک اُمید سی تھی۔

''ٹھیک ہے۔ میں تمہارا انتظار کروں گا۔ میری دعائیں تمہارے ساتھ رہیں گی۔'' حامد راؤ نے جواب دیا تو اسلم کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔ آج جانے کتنے برسوں بعد کسی کے لبوں سے اس نے اپنے لیے دعا سنی تھی۔ ماں کی ناراضی کے بعد تو وہ اس نعمت سے بھی محروم ہو گیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ماں اب بھی اس کے لیے دعائیں کرتی ہو لیکن وہ خود ان دعاؤں کو اپنے کانوں سے سن کر حاصل ہونے والی خوشی سے محروم ہو گیا تھا۔ شاید ماہ بانو کا اس کی زندگی میں چلے آنا اس کی ماں کی دعاؤں کا ہی ثمر ہو ورنہ جرم کی راہ پر قدم رکھنے کے بعد تو اسے اپنا ایسا کوئی عمل یاد نہیں تھا جس کے صلے میں وہ اتنی بڑی نعمت کا حق دار ٹھہرتا۔

''کیا سوچنے لگے اسلم بھائی؟'' اس کی خاموشی کو محسوس کر کے اب تک گفتگو میں دخل نہ دینے والے مقصود نے آہستہ سے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''کچھ نہیں، بس اپنی خوش قسمتی کے بارے میں سوچ رہا تھا کہ اللہ نے اتنے برے حالات میں بھی اتنے اچھے لوگوں سے ملوا کر کتنا بڑا احسان کیا ہے۔'' اس نے دھیرے سے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''انسان اپنی نیت صاف رکھے تو اللہ خود ہی منزل آسان کر دیتا ہے۔ آپ نے برائی چھوڑنے کا سوچا تو دیکھیں اللہ نے بھی آپ کا ہاتھ تھام لیا۔ بس اب ہمیں انتظار رہے گا کہ آپ کب واپس آ کر ہمیں جوائن کرتے ہیں۔'' مقصود کے چہرے پر بھی بڑی بے ریا اور مخلص مسکراہٹ تھی۔

''اللہ کو منظور ہوا تو میں جلد تمہارے درمیان دوبارہ پہنچ جاؤں گا لیکن یہ تو بتاؤ کہ تم نے خود اپنے بارے میں کیا سوچا ہے۔ ہم لوگ جس انداز سے گاؤں سے نکلے ہیں، اس کے بعد تو کچھ بھی نہیں کہا جا سکتا۔ پیر سائیں کے معتقدین رات کے اندھیرے میں تمہارے گھر کو گھیر سکتے ہیں تو ان سے کچھ بعید نہیں کہ وہ اور کیا کچھ کر گزریں۔ پہلے تو وہ پھر بھی شفقت راؤ صاحب سے نالاں تھے اور ان کی فیملی کو نقصان پہنچانا چاہتے تھے لیکن اب تو تم لوگ بھی زیرِ عتاب ہو گے۔ ہماری طرف سے چلائی گئی گولیوں نے جانے ان کے کتنے آدمیوں کو زخمی یا ہلاک کیا ہوگا۔ انتقاماً وہ لوگ تمہارے گھر اور زمینوں کو بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ پیر سائیں کی حقیقت کچھ بھی ہو لیکن یہ طے ہے کہ گاؤں میں اس شخص کے بہت سے عقیدت مند موجود ہیں۔ اس کی سب سے بڑی مثال تمہاری گھریلو ملازمہ ہے۔ پہلے میں فوری طور پر اس عورت کا کردار سمجھ نہیں سکا تھا لیکن بعد کے حالات سے ثابت ہو گیا کہ اس عورت نے ہم لوگوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لی تھی اس لیے بیماری کا بہانہ کر کے چھٹی لے کر چلی گئی۔ اس کی زبان سے یہ جان کر کہ خانقاہ کو آگ لگانے میں شفقت راؤ ملوث تھا، پیر سائیں کے معتقدین مشتعل ہو گئے ہوں گے اسی لیے انہوں نے رات کی تاریکی میں تمہارے گھر پر حملہ کر دیا۔ اگر انہیں اس حملے کا بھرپور جواب نہ ملتا تو وہ اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب بھی ہو سکتے تھے۔ وہ تو اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب محفوظ رہے لیکن بات پھر وہیں آ جاتی ہے کہ اب ٹاہلی والا میں حالات تمہارے لیے بہت مخدوش ہوں گے۔ ایسے حالات میں تم کیا کرو گے اور کس طرح اپنا کام جاری رکھو گے؟ میرا جہاں تک خیال ہے، اب تک تو وہ قانون کو بھی تمہارے خلاف متحرک کر چکے ہوں گے۔ ویسے بھی تم لوگوں نے ہی مجھے بتایا تھا کہ علاقے کا تھانے دار خود پیر سائیں کا معتقد ہے۔'' اس نے راؤ خاندان کو درپیش خطرات ان لوگوں کے سامنے رکھ دیے۔

''ان سب باتوں کا تو ہمیں بھی اندازہ ہے۔'' مقصود کے بجائے حامد راؤ نے گلا کھنکھارتے ہوئے جواب دیا۔

''وقتی طور پر تو میں نے سوچ لیا ہے کہ اپنے بیان میں ہم یہ مؤقف اختیار کریں گے کہ رات کتنے مسلح افراد کو اپنے گھر کو گھیرے میں لیے دیکھ کر ہمیں یہ گمان گزرا تھا کہ ڈاکوؤں نے حملہ کر دیا ہے چنانچہ ہم نے بھی جوابی کارروائی کر ڈالی اور بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر نکلنے میں کامیاب ہوئے۔ رہی مشتعل افراد کے ہماری املاک کو نقصان پہنچانے کی بات تو اس معاملے کو میں اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ میں نصیب پر یقین رکھنے والا آدمی ہوں اور میرا ایمان ہے کہ جو شے میری ہے، وہ ہر حال میں مجھے ملنی ہے اور جو اللہ مجھے نہیں دینا چاہتا، وہ میں اپنا پورا زور لگا کر بھی حاصل نہیں کر سکتا۔''

''آپ کی سوچ بہت اچھی ہے۔ میں دعا کروں گا کہ جب میں اپنی ماں سے مل کر واپس آؤں تو حالات اس نہج پر ہوں کہ میں آپ لوگوں کے ساتھ کام کر سکوں۔ آپ کے ہاں ملازمت کرنے کو میں اپنی خوش نصیبی سمجھوں گا۔'' وہ حامد راؤ سے بے حد متاثر ہو چکا تھا چنانچہ پورے دل سے بولا۔ آگے

کیا ہونے والا ہے، یہ فیصلہ تو بہر حال اس تقدیر سے ہی ہونا تھا جس کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا البتہ اللہ کو ماننے والے اپنے حصے کی جدوجہد کرنے کے بعد اس پر شکر اور صبر سے کام لیتے ہیں کہ اسی میں حقیقی کامیابی کا راز پوشیدہ ہے۔

☆☆☆

مشابرم خان ایک بار پھر ٹاہلی والا میں تھا۔ شہریار نے اسے پیر سائیں کے متعلق مزید تفتیش کرنے کی ذمے داری سونپی تھی چنانچہ اس نے تاخیر مناسب نہیں سمجھی اور دوبارہ وہاں چلا آیا۔ پہلے اس کا ارادہ تھا کہ پیر سائیں سے ملاقات کا بہانہ کر کے ایک بار پھر اس کے اس مرید سے ملنے پہنچ جائے گا جس نے پہلی بار ٹاہلی والا آنے پر اس کی میزبانی کی تھی لیکن پھر خود ہی اپنا ارادہ بدل ڈالا۔ پچھلی بار ہی اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ اس کا میزبان پیر سائیں کا اندھا معتقد ہے۔ اس شخص سے اسے پیر سائیں کے متعلق جو بھی معلومات حاصل ہوتیں، وہ اتنی قابلِ اعتماد اس لیے نہیں ہو سکتی تھیں کہ عقیدت مندانہ بیانی سے زیادہ اپنے اعتقاد سے کام لیتا چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ کسی ایسے شخص کو تلاش کرنے کی کوشش کرے گا جو اسے درست معلومات فراہم کر سکے۔ اس چکر میں وہ ٹاہلی والا میں ادھر ادھر گھومتا پھر رہا تھا۔ خانقاہ کے سامنے سے گزرتے ہوئے اس نے دیکھ لیا تھا کہ وہاں تعمیرِ نو کا کام بڑی سرعت سے جاری ہے لیکن اس نے وہاں رکنا مناسب نہیں سمجھا اور بغیر رکے سیدھا آگے بڑھتا چلا گیا۔

ٹاہلی والا بھی دیگر دیہاتوں کی طرح ایک عام سا پنڈ تھا جہاں کچے اور نیم پختہ مکانوں کی اکثریت تھی۔ پختہ مکان بس چند ہی تھے جو یقیناً پنڈ کے صاحبِ ثروت لوگوں کی ملکیت تھے۔ ان میں سے ایک مکان چودھری شریف کا بھی تھا جہاں اس نے پچھلی بار قیام کیا تھا اور جہاں پیر سائیں نے بھی آج کل اپنا ٹھکانا بنا رکھا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر اس طرف کا رخ نہیں کیا کہ مبادا مکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کسی ایسے شخص سے ٹکراؤ ہو جائے جو اس کا صورت آشنا ہو اور پچھلی بار اس کے وہاں قیام سے آگاہی رکھتا ہو۔ چودھری شریف کے مکان کی طرف جانے والے راستوں سے مختلف سمت میں چلتا ہوا وہ ایک مقام پر پہنچ کر ٹھٹک گیا۔ وہ ایک پختہ مکان تھا جسے بری طرح آتش زنی کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ مکان کی حالت دیکھ کر ہی اس بات کا اندازہ ہو رہا تھا کہ وہاں باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ آگ لگائی گئی تھی۔ مکان کی تعمیر میں استعمال ہونے والی لکڑی کا سرے سے نام و نشان ہی نہیں رہا تھا اور وہاں بغیر کھڑکیوں دروازوں کا بس ایک ڈھانچا سا کھڑا رہ گیا تھا۔ عمارت کے اتنے برے انجام کو دیکھ کر اس بات کا تو تصور ہی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ روزمرہ استعمال ہونے والے ساز و سامان میں سے کوئی شے سلامت رہی ہو۔ اگر اتفاق سے کچھ باقی بھی رہا ہو گا تو کسی بھی موقع پرست کے ہاتھ لگ گیا ہو گا۔ اسے مکان کی حالت دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی کہ مکان حامد راؤ نامی اس شخص کی ملکیت ہے جو خانقاہ کو آگ لگانے والے شخص شفقت راؤ کا کزن اور سمدھی ہونے کے ناتے معتوب ٹھہرا تھا۔ اسی مکان میں بانو اور اسلم کی موجودگی کی بھی اطلاع ملی تھی۔ اب وہ دونوں اپنے میزبانوں سمیت جانے کہاں تھے لیکن اسے اس تباہ شدہ مکان کو دیکھ کر دلی افسوس ہو رہا تھا۔

حالات و واقعات بے شک مختلف تھے لیکن اس گھر کو دیکھ کر اسے اپنے گھر کا اجڑنا یاد آ گیا تھا۔ کئی مہینوں بعد سہی مگر وہ کبھی کبھی اپنے اس چھوٹے سے گھر جایا کرتا تھا جہاں اس کی ماں اور چھوٹا بھائی اکرم خان رہتے تھے۔ اکرم خان اس کی خاطر ماہ بانو کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتے ہوئے اپنی جان سے چلا گیا جبکہ ماں کو جوان بیٹے کی موت کا صدمہ ڈھا گیا۔ وہ آج بھی نیم مردہ حالت میں اسلام آباد کے ایک اسپتال میں داخل تھی اور وہ دل میں ان لوگوں کے لیے انتقام کی آگ لیے پھر رہا تھا جن کی وجہ سے اس کا گھر برباد ہوا تھا۔ اب ٹاہلی والا میں ایک بار پھر اس نے ایسی صورتِ حال دیکھی تھی کہ ایک نام نہاد پیر کے عقیدت مندوں نے اپنے ہی پنڈ کے رہائشی ایک عزت دار گھرانے کو بے گھر کر کے فرار ہونے پر مجبور کر دیا۔

حامد راؤ کے جلے ہوئے گھر کے سامنے سے وہ بڑی بجھی بجھی کیفیت میں آگے بڑھا اور بے خیالی میں آگے بڑھتا ہی چلا گیا۔ چلتے چلتے وہ مکانوں کی حدود سے نکل کر کھلے علاقے میں پہنچ گیا۔ یہاں دور دور تک کھیت پھیلے ہوئے تھے۔ ان ہرے بھرے کھیتوں میں ہی اس نے کافی بڑے قطعہ اراضی کو اسی حال میں دیکھا جس حال میں وہ ابھی حامد راؤ کا گھر دیکھ کر آ رہا تھا۔ دوسرے کھیتوں کی طرح یقیناً یہاں بھی کھڑی فصلیں موجود ہوں گی لیکن اب تو بس راکھ کا ڈھیر ہی رہ گیا تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ صدمے میں مبتلا ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ زمین کے سینے کو چیر کر اس میں سے ننھی کونپل نکلنے اور پھر اس کونپل کے پنپنے تک کے مراحل اتنی آسانی سے طے نہیں ہوتے۔ کسان اپنا خون پسینا ایک کرتا ہے تب کہیں جا کر زمین وہ رزق دیتی ہے جو انسانوں کے پیٹ کا دوزخ بھر سکے۔ فصل کے تیار ہونے تک اپنے دن

رات ایک کر دینے والا کسان اپنے بہت سے خواب اور امیدیں بھی ساتھ ساتھ ہی پروان چڑھاتا ہے۔ اگر حامد راؤ کا گھر تباہ ہوا تھا تو یہ صرف اس کا ذاتی نقصان تھا۔ صاحبِ حیثیت آدمی اس طرح کے نقصانات کو بعد میں کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیتا ہے لیکن کھڑی فصلیں جلائے جانے کا مطلب تھا کہ وہ غریب مزارع بھی متاثر ہوئے ہوں گے جن کی روزی روٹی ان کھیتوں سے وابستہ ہوگی۔ اسے اندازہ تھا کہ حامد راؤ اپنے خاندان کے ساتھ جہاں کہیں بھی ہوگا، کم از کم فاقہ کشی پر مجبور نہیں ہوگا لیکن اس کے کھیتوں پر کام کرنے والے کسانوں کے گھر تو جلد یا بدیر یہی نوبت آنے والی تھی... اور یہ تو ممکن ہی نہیں تھا کہ پیر سائیں کی عقیدت کا دم بھرنے والے وہ مشتعل افراد جنہوں نے یہ کارنامہ انجام دیا تھا، اپنے عمل کی تلافی کرتے ہوئے ان غریبوں کی کفالت کا ذمہ اٹھاتے۔

اس صورتِ حال پر اس کا دل بے حد بوجھل ہو گیا اور اس بوجھل دل کے ساتھ وہ واپس پلٹنے ہی لگا تھا کہ نظر ایک بوڑھے پر پڑی۔ پھٹی ہوئی بنیان اور میلی دھوتی پہنے وہ بوڑھا دونوں ہاتھ سر پر رکھے جلے ہوئے کھیت کے درمیان اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے سے اس کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اس کے باوجود وہ اس کے چہرے پر لکھی حسرت و یاس کی تحریر پڑھ سکتا تھا۔ اس کے قدم بے ساختہ ہی اس بوڑھے کی طرف اٹھ گئے۔ بوڑھا اس کی آمد سے بے خبر جلے ہوئے کھیت کے منظر میں اس طرح گم تھا کہ اسے ارد گرد کا کوئی ہوش ہی نہیں تھا۔ البتہ قریب جانے پر مشابرم خان کو وہ آنسو بھی نظر آ گئے تھے جو بوڑھے کی میل زدہ آنکھوں سے نکل کر بہتے ہوئے اس کی کھچڑی داڑھی میں گم ہوتے جا رہے تھے۔ الجھے ہوئے بالوں والی وہ داڑھی گواہ تھی کہ اس بے چارے نے اپنے شب و روز پسینا بہاتے ہوئے اتنی مصروفیت میں گزارے تھے کہ اسے اپنے وجود کی صفائی ستھرائی کی بھی مہلت نہ مل پاتی ہوگی۔ وہ بنا کوئی سوال کیے بھی بوڑھے کا کھیت سے تعلق سمجھ رہا تھا چنانچہ دل میں اس کے لیے گہری ہمدردی محسوس کرتے ہوئے اپنا دایاں ہاتھ اس کے شانے پر رکھ کر آہستہ سے دبایا۔ بوڑھے کے وجود میں پہلی بار جنبش پیدا ہوئی اور اس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا البتہ لب اب بھی خاموش ہی تھے۔

''السلام علیکم بابا!'' مشابرم خان نے خود ہی گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ بوڑھے کی آواز تو نہ سن سکا البتہ اس نے سر کی جنبش سے سلام کا جواب دے دیا۔

''آپ کون ہو بابا اور اس جلے ہوئے کھیت میں کیوں بیٹھے ہو؟'' مشابرم خان نے ہمت نہ ہاری اور خود بھی بوڑھے کے سامنے پنجوں کے بل بیٹھ گیا۔

''جانے کیوں بیٹھا ہوں؟'' بوڑھے کے لب کھوئے کھوئے انداز میں متحرک ہوئے۔ ''سب بولتے ہیں کہ نور بخش! اب ادھر کچھ نہیں رہا۔ تو ادھر کیوں آتا ہے؟ پر میرا تو سب کچھ ادھر ہی تھا۔ لیکن ادھر نہ آؤں تو سمجھ نہیں آتا کہ کدھر جاؤں۔''

''کیا یہ کھیت تمہارے تھے بابا؟'' اس نے بوڑھے نور بخش کو کریدنے کے لیے اس سے سوال کیا۔

''میرے نہیں تھے پر میرے ہی تھے۔ میں نے کسی باپ کی طرح اس کے ایک ایک بوٹے کو پروان چڑھایا تھا۔ ادھر سے مجھے اپنی روزی ملتی تھی۔ یہ فصل کٹ کر منڈی میں بکتی تو مالک مجھے میری دھی کے ویاہ کے لیے روپے دیتا۔ مالک نے مجھ سے وعدہ کیا تھا ہور وہ وعدے کا بڑا پکا سچا آدمی ہے، پر ظالموں نے تو مالک کو اس کے کنبے کے ساتھ یہاں سے بھگا ڈالا۔ اب میں کس کے سامنے جا کر ہاتھ پھیلاؤں کہ مجھے میری دھی کے ویاہ کے لیے روپے دو... ہور باقی چھ ہور جانیں جو گھر میں بیٹھی ہیں، ان کے پیٹ بھرنے کا بندوبست کرو۔ کوئی سننے والا ہے ہی نہیں بس اس لیے یہاں سینہ کوٹنے کے لیے آ جاتا ہوں۔ اس جلے ہوئے کھیت کو دیکھ کر مجھے ایسا لگتا ہے کہ جیسے میرے سامنے میرے جوان بیٹے کا لاشہ پڑا ہو۔'' نور بخش اور بھی زیادہ شدت سے رونے لگا۔ دبلے پتلے نور بخش کا جسم ہچکیوں کے زور سے بری طرح ہل رہا تھا۔ قریب سے اسے دیکھتے مشابرم خان کو اندازہ ہو رہا تھا کہ درحقیقت وہ اتنا بوڑھا نہیں ہے جتنا دور سے دکھائی دے رہا تھا۔ یقیناً غم والم کی شدت نے اس کے حلیے پر وہ بداثرات مرتب کیے تھے جن کی وجہ سے وہ بہت زیادہ عمر رسیدہ محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہارے مالک کے کھیت کیوں جلائے گئے؟ کیا وہ کوئی برا آدمی تھا اور اس کی کسی سے دشمنی تھی؟'' وہ ایسے رخ سے سوالات کر رہا تھا کہ بوڑھا خود ہی حقیقت اگلتا جائے۔ اس کی یہ حکمتِ عملی کامیاب رہی اور وہ بلبلا کر بولا۔

''نہ تو میرا مالک برا آدمی تھا ہور نہ ہی اس کی کسی سے دشمنی تھی۔ وہ بے چارہ تو بس رشتے داری ہور دوستی یاری کے چکر میں زد میں آ گیا۔ جو کچھ کیا تھا، اس کے سمدھی نے کیا تھا لیکن پاگل لوگ اس وچارے کے گھر پر چڑھ دوڑے ہور اب الٹی

سیدھی کہانیاں بنا کر اسے بھی مجرم ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''ارے کہیں تم حامد راؤ کی توبات نہیں کر رہے؟'' مشابرم خان نے چونکنے کی اداکاری کی۔ ''میں نے سنا ہے کہ حامد راؤ کے چچازاد بھائی اور سمدھی شفقت راؤ نے خانقاہ میں آگ لگا دی تھی اور حامد راؤ نے اس کے گھر کی عورتوں کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی تھی اس لیے گاؤں والوں نے غصے میں اس کے گھر پر حملہ کر دیا۔''

''عورتوں کو پناہ دی تھی تو کوئی جرم تو نہیں کیا تھا۔ وہ عورتیں اس کی بھی عزت تھیں۔ اگر کسی کو شفقت راؤ سے شکایت تھی تو جا کر اسے پکڑتا، بے گناہوں کے پیچھے سب ہاتھ دھو کر کیوں پڑ گئے؟ ہور سچ پوچھو تو مجھے یقین بھی نہیں ہے کہ شفقت راؤ پر لگا الزام سچا ہے۔ وہ خود وڈا پنگا آدمی ہے۔ دو برس پہلے میرا پتر بیمار پڑ گیا تھا تو اس نے اپنے خرچ پر شہر سے اس کا علاج کروایا تھا۔ وہ نیک آدمی وچارہ تو خود بڑا دکھی تھا۔ جوان پتر کی موت نے اس کا حال تباہ کر دیا تھا۔ ملوم نہیں صدمے سے اس کا دماغ الٹ گیا تھا یا کچھ ہور ہی چکر تھا؟ تھوڑی اڑتی پڑتی میرے کانوں میں ایسی گل پڑی تو ہے جس کو سن کر لگتا ہے کہ خانقاہ میں کچھ گڑبڑ ہے۔'' نور بخش روانی میں بولنا شروع ہوا تو بولتا ہی چلا گیا۔ شاید غم و غصے کی شدت نے اس کو اتنی بری طرح متاثر کر رکھا تھا کہ وہ مشابرم خان کے اجنبی ہونے کے باوجود بھی تسلسل سے اس کے سامنے دل کی بھڑاس نکالتا جا رہا تھا۔

''کیا چکر تھا خانقاہ میں؟'' نور بخش سے ہونے والی گفتگو اتنے اہم موڑ پر آ گئی تھی کہ اسے اپنے آپ پر قابو رکھنا آسان نہیں رہا اور وہ یکدم ہی بے تابی سے پوچھ بیٹھا۔

''اوئے تم کون ہو اور مجھ سے یہ سب کچھ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کی بداحتیاطی نے آخر گڑبڑ کر ہی دی اور بڑی آسانی سے سب کچھ بتاتا نور بخش چونک کر اس سے پوچھنے لگا۔

''مم... میں تمہارا ہمدرد ہوں۔'' مشابرم خان سٹپٹا گیا۔

''ہمدرد...؟ کدھر سے آئے ہو؟'' بوڑھا پوری طرح بدکا ہوا تھا۔

''میری بات آرام سے سنو نور بخش بابا! میں حامد راؤ صاحب کے ہمدردوں میں سے ہوں اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ اصل میں یہاں کیا ہوا تھا۔ ہمیں خود بھی یہی شک ہے کہ خانقاہ میں کوئی غلط کام ہو رہا تھا جس کی وجہ سے شفقت راؤ نے وہاں آگ لگا دی ورنہ اس کے بارے میں ہمارے پاس بھی یہی رپورٹ ہے کہ وہ بڑا اچھا آدمی ہے۔'' مشابرم خان نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا اور نور بخش کے شانوں پر اپنے دونوں ہاتھوں کا دباؤ ڈال کر بہت طریقے سے رام کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

''تم پولیس والے تو نہیں ہو...؟'' بوڑھے نے اسے گھورا پھر دونوں ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ''ہمیں ماپھی (معافی) دے دو صاحب! ہم بہت گریب (غریب) آدمی ہیں۔ پہلے ہی ہمارا بہت کچھ برباد ہو چکا ہے۔ اب پولیس کو گواہی اور بیان دینے کے چکر میں پڑیں گے تو بالکل ہی برباد ہو جائیں گے۔ جو پاگل لوگ ہمارے مالک جیسے بڑے آدمی کا یہ حال کر سکتے ہیں کہ اس کا مکان اور کھیت جلا دیں، وہ ہماری تو بوٹی بوٹی کر دیں گے۔ مالک تو یہاں سے نکل کر کہیں نہ کہیں پھر بھی آرام سے رہ ہی لے گا، پر ہم اس پنڈ سے نکل کر کدھر جائیں گے؟ ہمیں تو مرنے کے لیے بھی یہاں کے سوا کہیں زمین نہیں ملے گی۔'' وہ کافی خوف زدہ لگ رہا تھا۔

''تم اس بات کی فکر نہ کرو کہ تمہیں کہیں گواہی یا بیان کے لیے بلایا جائے گا۔ تم مجھے جو کچھ بتاؤ گے، وہ بس میرے اور تمہارے درمیان رہے گا۔ میں کسی کو بھی یہ نہیں بتاؤں گا کہ تم نے مجھے کچھ بتایا تھا۔'' مشابرم خان اسے یقین دہانی کروانے لگا لیکن اس کے لب خاموش ہی رہے اور وہ ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ اپنے شانوں سے ہٹا کر کھڑا ہونے کی کوشش کرنے لگا لیکن مشابرم خان نے اسے اس کی کوشش میں کامیاب نہیں ہونے دیا اور مضبوطی سے اس کا بازو تھام لیا۔

''ہمیں ماپھی دے دو صاحب، ہور ادھر سے جانے دو۔'' وہ گڑگڑایا۔

''نہیں۔'' مشابرم خان سختی سے بولا۔ ''تمہیں مجھے سچ بتانا ہوگا۔ اگر تم نے مجھے سچ نہیں بتایا تو جو ظلم ابھی ہوا ہے وہ بار بار ہوگا۔ تم اتنے خودغرض نہ بنو کہ صرف اپنی گردن بچانے کے لیے ظالموں کے بارے میں زبان بند کر کے رکھ لو۔ پھر جب میں تمہیں اس بات کی ضمانت دے رہا ہوں کہ تمہارا نام سامنے نہیں آئے گا تو تمہیں ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' نور بخش کے بازو پر اس کی گرفت اتنی سخت تھی کہ انگلیاں اس کی ہڈیوں میں گھسی جا رہی تھیں۔ نور بخش بے بس سا ہو کر دوبارہ وہاں بیٹھ گیا۔

''مجھے زیادہ کچھ ملوم نہیں ہے۔ بس میرے وڈے پتر نے اناپ شناپ کچھ تھوڑا سا بتایا تھا۔ اب کون جانے کے

بچے نے صحیح بھی کہا تھا یا نہیں۔" وہ گویا اب بھی تذبذب کا شکار تھا۔

"تمہیں جو اور جتنا معلوم ہے مجھے بتا دو۔ باقی سچ جھوٹ معلوم کرنا میرا اپنا کام ہے۔" مشابرم خان نے اپنے لہجے کی سختی برقرار رکھی۔ نور بخش اسے پولیس کا آدمی سمجھ رہا تھا تو اس نے اس کے اندازے کی تردید کرنے کی کوشش نہیں کی تھی بلکہ کچھ پولیس والوں جیسا ہی انداز اختیار کر کے اس کے حلق سے سچ اگلوانے کی کوشش میں تھا۔

"میرے پتر ہور شفقت راؤ کے پتر صداقت میں تھوڑی دوستی تھی۔ شروع میں دونوں ادھر ہی اسکول میں پڑھتے تھے، بعد میں شفقت راؤ نے صداقت کو پڑھنے کے لیے شہر بھجوا دیا تو دونوں کا ملنا جلنا کم ہو گیا، پر صداقت وڈا بیبا بچہ تھا۔ جب بھی چھٹیوں میں پنڈ آتا تھا تو میرے پتر سے ضرور ملتا تھا۔ مجھ سے بھی دعا سلام ضرور کرتا تھا لیکن آخری بار وہ پنڈ آیا تو کسی سے ملا جلا ہی نہیں۔ فیر سنا کہ اس پر کسی آسیب کا سایہ ہو گیا ہے اور خانقاہ میں پیر سائیں اس کا علاج کر رہے ہیں۔ یہ بھی ملوم ہوا کہ پیر سائیں کے علاج سے اسے فیدہ ہوا ہے، ہور اس کا آسیب چلا گیا ہے۔ انہی دنوں میرے پتر کو پنڈ سے ذرا پرے ادھر ملا جہاں سے آگے پہاڑ شروع ہو رہے ہیں۔ میرا پتر اصل میں صداقت کا پیچھا کرتا ہوا ہی ادھر گیا تھا۔ اس نے ادھر دیکھا کہ صداقت جیب سے کوئی پڑیا نکال کر اسے سگریٹ میں بھر کر پی رہا ہے۔ اسے وڈی حیرت ہوئی کہ صداقت جیسا پڑھنے لکھنے والا منڈا سگریٹ کب سے پینے لگا۔ وہ تو کبھی شوق میں بھی پان چھالیا کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس نے صداقت کو پکڑ لیا ہور سگریٹ کے بارے میں پوچھا۔ اس کے پوچھنے پر صداقت ہنسنے لگا اور بولا کہ یہ جادو کی پڑیا مجھے پیر سائیں نے دی ہے اور یہ سگریٹ میں ڈال کر پینے سے ہی اپنا اصل اثر دکھاتی ہے اس لیے میں مجبوراً سگریٹ پی رہا ہوں۔ میرے پتر نے اس سے پڑیا کے بارے میں بہت سوال کیے لیکن اس نے کچھ نہیں بتایا بلکہ اپنی دوستی کا واسطہ دے کر کہا کہ یہ گل کسی کو نہیں بتانا اور یاد رکھنا کہ میرا آسیب اسی پڑیا سے قابو میں رہتا ہے۔ میرے پتر نے وعدہ کر لیا پر جب صداقت کے مرنے کی خبر ملی تو وہ چپ نہیں رہ سکا ہور میرے سامنے سارا قصہ بیان کر دیا۔ اس نے شک ظاہر کیا کہ صداقت نشہ کرنے لگا تھا، پر میں نے اس کی زبان سختی سے بند کر دی ہور یہی حکم دیا کہ کسی کو کچھ نہ بتائے کیونکہ مجھے ملوم تھا کہ اگر اس نے کسی ایسی ویسی گل کے ساتھ پیر سائیں کا نام لیا تو پیر سائیں کے مرید اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ وہ سارے ہی وڈے جنونی ہیں۔ ایک واری پنڈ کے ایک لڑکے نے مذاق میں دوستوں میں بیٹھ کر پیر سائیں کو جعلی پیر کہہ دیا تھا تو بعد میں اس کے مریدوں نے لڑکے کی زبان گدی سے کھینچ لی تھی۔ میرے پتر کو بھی وہ واقعہ یاد تھا اس لیے میرے منع کرنے پر اس نے اپنی زبان بند کر لی، پر مجھے لگتا ہے کہ شفقت راؤ کو بھی کسی نہ کسی طرح اس مالے کی خبر ہو گئی تھی اسی لیے اس نے خانقاہ کو آگ لگا دی۔ فیر اس کے بعد جو ہوا، وہ تو آپ کو بھی ملوم ہی ہے۔"

"ہوں۔" مشابرم خان نے ایک زوردار ہنکارا بھرا۔ وہ جس سرے کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا وہ اسے مل گیا تھا اور آخر کار شہریار کے شک کے مطابق پیر سائیں کی شخصیت کے بارے میں ایک اہم انکشاف ہو ہی گیا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ حامد راؤ کے گھر کو آگ لگانے کے بعد اب اس کے بارے میں غلط سلط کہانیاں بنائی جا رہی ہیں۔ وہ کہانیاں کیا ہیں؟"

"پیر سائیں کے چاہنے والے اصل مالے کو چھپانے کے چکر میں ہیں۔ انہوں نے شفقت راؤ کا ذکر ہی کہانی سے نکال دیا ہے اور کہانی یہ بنائی ہے کہ حامد راؤ نے اپنے گھر میں ڈاکوؤں کو چھپا رکھا تھا۔ پنڈ والوں کو ملوم ہوا تو انہوں نے حامد راؤ کا گھر گھیر لیا ہور اس سے ڈاکوؤں کو باہر نکالنے کا مطالبہ کیا، پر حامد راؤ نے یہ گل ماننے کے بجائے نہتے لوگوں پر فائرنگ کروا دی۔ بندے مرے ہور زخمی ہوئے تو غصے میں لوگوں نے اس کے گھر اور کھیتوں کو آگ لگا دی۔ اب پولیس رپٹ میں حامد راؤ ہور اس کے گھر والے ڈاکوؤں کے ساتھی ہور قاتل بن گئے ہیں، پر میں جانتا ہوں کہ میرا مالک حامد راؤ ایسا بندہ ہی نہیں ہے کہ اس کے ڈاکوؤں سے تعلقات ہوں۔ یہ ساری چکر بازی پیر سائیں ہور اس کے مریدوں کی ہے۔"

نور بخش نے بے لاگ تبصرہ کرتے کرتے اپنا سر اوپر اٹھایا تو اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں سی لہرا گئیں۔ اس کی کیفیت کو محسوس کر کے مشابرم خان نے تیزی سے پیچھے پلٹنے کی کوشش کی لیکن اس کوشش میں کامیاب ہونے سے قبل ہی اس کے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی اور اس کا ذہن تیزی سے تاریکی کے اندھیروں میں ڈوبنے لگا۔ مکمل بے ہوشی طاری ہونے سے قبل اس کے کانوں نے جو آخری آواز سنی وہ گولی چلنے کے دھماکے کی تھی۔

یہ پرپیچ وسنسنی خیز داستان جاری ہے
مزید واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ فرمائیں

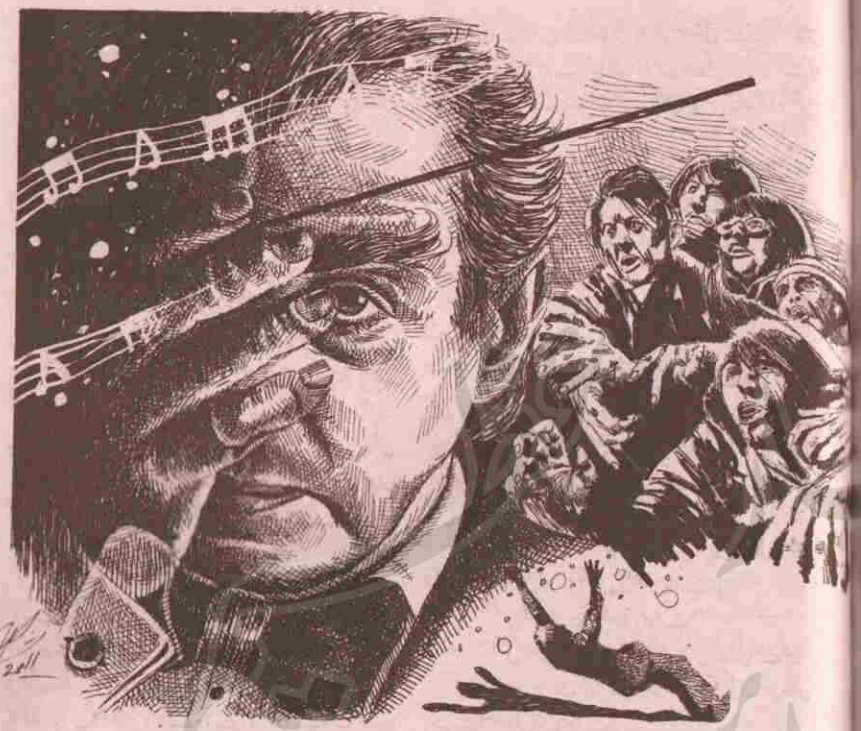

نشانہ

کاشف زبیر

انسانی فطرت کے کئی پہلو ایسے ہیں جو طویل رفاقت کے باوجود نگاہوں سے اوجھل رہتے ہیں ...وہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھی تھے ... مگر وقت کے ایک ہی جھونکے نے انہیں ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا ... اَن دیکھے جذبوں کی عکاسی جنہیں وقت کی دھول نے مٹنے نہیں دیا تھا...

قتل کی ایک سنگین واردات...... قتل اور قاتل دونوں معما بن چکے تھے۔

قتل معمّا بن گیا تھا۔ سام بورمین کی ڈیوٹی ختم ہونے والی تھی کہ اسے اطلاع ملی، میرین تھیٹرز میں ایک آدمی کا قتل ہو گیا ہے۔ کیپٹن گورڈن نے اسے وہاں جانے کا حکم دیا۔ سام کے پاس دو کیس تھے اور مزید کسی کیس کی تفتیش کے لیے وقت نکالنا دشوار تھا لیکن حکمِ حاکم کا تھا اس لیے جانا مجبوری تھی۔ ویسے بھی گورڈن جب سے پولیس کیپٹن بنا تھا، تب سے سام کی کم بختی آئی رہتی تھی۔ سام دس سال سے میامی پولیس کے ہومی سائڈ کے شعبے میں کام کر رہا تھا۔ جب وہ یہاں آفیسر بن کر آیا تو گورڈن اس وقت لیفٹیننٹ تھا اور بدقسمتی سے وہ اسی کی ماتحتی میں آیا تھا۔ تب سے گورڈن اسے ناپسند

کرنے لگا تھا۔ اگرچہ اس کی وجہ کوئی نہیں جانتا تھا لیکن یہ سب جانتے تھے کہ گورڈن سام کو پسند نہیں کرتا اس لیے جب وہ کیپٹن بنا، تب ہی سب جان گئے تھے کہ اب سام بورمین کی کم بختی آئے گی۔ پھر ایسا ہی ہوا۔

کیونکہ کیپٹن نے اسے ابتدائی تفتیش کی ذمے داری سونپی تھی اس لیے سام نے مناسب سمجھا کہ ابھی احتجاج نہ کرے۔ ہاں اگر گورڈن کیس باضابطہ اس کے سپرد کرنا چاہتا تو وہ احتجاج کر سکتا تھا۔ ہومی سائڈ میں اس کے کئی ساتھی افسران فارغ بیٹھے تھے۔ گورڈن چاہتا تو ان میں سے کسی کو یہ ذمے داری سونپ سکتا تھا مگر اس نے سام سے ہی کہا۔

بادلِ ناخواستہ وہ اپنے پارٹنر بل کے ہمراہ میرین تھیٹر پہنچا۔ تھیٹر اور آڈیٹوریم کی دلکش عمارت ساحل سے کچھ ہی دور تھی۔ یہ اعلیٰ درجے کا تھیٹر تھا اور یہاں عام طور سے بڑے فن کاروں کو اپنے فن کا مظاہرہ کرنے کا موقع ملتا تھا۔ تماشائیوں میں پوش طبقہ اور درمیانی طبقہ شامل ہوتا تھا۔ یہاں کا ٹکٹ ہر آدمی نہیں لے سکتا تھا۔

جب سام اور بل وہاں پہنچے تو پولیس پہنچ چکی تھی اور اس نے حالات کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔ تھیٹر کی عمارت شائقین سے خالی ہو چکی تھی کیونکہ قتل کا انکشاف ہوتے ہی لوگ افراتفری میں وہاں سے نکل بھاگے تھے۔ البتہ تھیٹر کا عملہ اور فن کا مظاہرہ کرنے والے آرکسٹرا کے لوگ موجود تھے۔ پولیس نے تھیٹر کے سامنے پیلی پٹیاں لگا کر عام لوگوں کا داخلہ روک دیا تھا۔ سام اور بل سیڑھیاں چڑھ کر عمارت میں داخل ہوئے۔ سامنے ہی تھیٹر مالک اور منیجر موجود تھے۔ سام اور بل ان کو نظر انداز کر کے ڈیوٹی پر موجود پیٹرولنگ آفیسر کی طرف آئے۔ جیکمین سے سام واقف تھا، ایک زمانے میں وہ اس کے ساتھ بھی کام کر چکا تھا۔

"ہیلو جیک! کیا معاملہ ہے؟" سام نے اس سے ہاتھ ملایا۔

"موسیقار ہنرک شیفلڈ کو قتل کر دیا گیا ہے۔"

سام چونکا۔ "ہنرک... یہ وہی موسیقار ہے جسے اس سال آسکر ایوارڈ کے لیے بھی نامزد کیا گیا ہے۔"

"بالکل وہی... اس نے فلم بلو کیچ کی موسیقی ترتیب دی تھی۔" جیکمین نے سر ہلایا۔ "جس وقت اسے قتل کیا گیا، وہ اپنے فن کا مظاہرہ کر رہا تھا۔"

سام کے لیے یہ ایک اور چونکانے والی خبر تھی۔ گویا قتل ہزاروں افراد کے سامنے ہوا تھا۔ "وہ کیسے؟"

جیکمین انہیں ہال کی طرف لے جانے لگا۔ "مجھے جو معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق ہنرک موسیقی کے لیے مخصوص اشارے دیتے ہوئے اچانک ڈائس سے گرا اور ساکت ہو گیا۔ کچھ افراد نے جب اس کے پاس جا کر دیکھا تو وہ ختم ہو چکا تھا۔"

"یہ کیسے پتا چلا کہ اس کی موت قتل کا نتیجہ ہے؟"

"ڈاکٹر آ گیا ہے اور اس نے بتایا ہے کہ کسی ذریعے سے اس کے جسم میں سائنائڈ داخل ہوا ہے اور اس سے فوری موت واقع ہو گئی۔"

"جسم میں کیسے داخل ہوا... کیا کسی نے اسے کھلایا ہے؟"

"اس بارے میں تو ڈاکٹر ہی بہتر بتا سکے گا۔" جیکمین نے کہا۔ وہ ہال میں داخل ہوئے جہاں موسیقار کی لاش سفید چادر سے ڈھک دی گئی تھی اور پاس ہی ڈاکٹر رابن براؤن موجود تھا۔ وہ شاید ابتدائی رپورٹ لکھ رہا تھا۔ سام اور بل اس کے پاس آئے۔

"کیا ہوا ہے؟" سام نے لاش کی طرف دیکھا۔

"سائنائڈ۔" ڈاکٹر نے مختصر جواب دیا۔

"کس طرح سے استعمال ہوا ہے؟"

"ابھی معلوم نہیں ہے۔" ڈاکٹر رابن رکھائی سے بولا۔ "حتمی رپورٹ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی آ سکے گی۔ بہرحال، منہ سے استعمال نہیں ہوا ہے۔"

ڈاکٹر رابن بھی سام کو ناپسند کرتا تھا۔ ایک کیس میں سام نے اسے کچھ سنا دی تھیں کیونکہ اس نے لاش کا ٹھیک طرح سے معائنہ نہیں کیا تھا جس سے تفتیش میں رکاوٹ آئی تھی اور بعد میں جب درست طبی رپورٹ سامنے آئی تو مجرم کی شناخت ہو سکی تھی، تب سے ڈاکٹر رابن اس سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا تھا۔ سام کو بھی اس کی پروا نہیں تھی۔ اس نے جواب سن کر لاش کے چہرے سے کپڑا ہٹایا۔ اس کی رنگت اتنی دیر میں نیلی پڑ گئی تھی اور آنکھوں کے ڈیلے نمایاں طور پر سفید ہو رہے تھے۔ ہنرک دبلا پتلا شخص تھا۔ عمر پچپن سے زیادہ نہیں تھی۔ دیکھنے میں وہ بالکل بھی خوش رو نہیں تھا۔ چوہے جیسا چہرہ اور سامنے سے اڑنے والے بالوں نے رہی سہی کسر پوری کر دی تھی۔ سام کو موسیقی سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی اس لیے وہ ہنرک کے بارے میں نہ ہونے کے برابر جانتا تھا۔

تھیٹر میں اسٹیج پر نیم دائرے میں آرکسٹرا ترتیب دیا گیا تھا اور ہنرک لکڑی کے ایک دو فٹ اونچے ڈائس پر اس طرح کھڑا ہوتا کہ اس کا دایاں حصہ تماشائیوں کی طرف اور بایاں حصہ آرکسٹرا کے سازندوں کی طرف ہوتا تھا اور اس کا منہ سامنے دی آئی پی باکسز کی جانب ہوتا۔ ویسے عام تماشائی بھی اسے بہ خوبی دیکھ سکتے تھے۔ وہ سازندوں کو اپنی مخصوص چھڑی اور خالی ہاتھ کی مدد سے اشارے دے رہا تھا کہ اچانک وہ رک گیا اور اگلے ہی لمحے وہ دھڑام سے ڈائس سے نیچے اسٹیج پر گرا اور دائیں پہلو کے بل ساکت ہو گیا۔ وہ اس وقت بھی اسی انداز میں پڑا ہوا تھا، کسی نے اس کی پوزیشن تبدیل کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ جب تک دوسرے اس تک پہنچتے، اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

پولیس فوٹو گرافر نے لاش کی ہر زاویے سے تصویر لے لی تھی اور ڈاکٹر بھی اس کا معائنہ کر چکا تھا اس لیے اب اسے الٹنے پلٹنے اور اس کا معائنہ کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ سام نے دستانے پہنے اور لاش پر سے چادر مکمل ہٹا دی۔ ہنرک موسیقاروں کے مخصوص لباس میں تھا۔ یعنی لمبا سا کوٹ جو سامنے سے کھلا تھا اور پیچھے سے لٹکا ہوا تھا۔ اوپر مخصوص بُو اور شرٹ تھی۔ اس کا سر نہ صرف بالوں بلکہ کسی ٹوپی سے بھی بے نیاز تھا۔ سام نے جیب سے عدسہ نکالا اور اس کی مدد سے سب سے پہلے ہنرک کے جسم کے کھلے حصوں کا معائنہ کیا۔ اس کا چہرہ گردن تک لباس سے آزاد تھا۔ اس کے ہاتھوں میں سفید دستانے اور پیروں میں لیدر شوز تھے۔ گویا اگر اسے کسی دور مار چیز سے زہر کا نشانہ بنایا گیا تھا تو صرف اس کا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ لیکن یہ ضروری نہیں تھا... بہت طاقت سے پھینکی جانے والی فولادی سوئی موٹے سے موٹے کپڑے سے بہ آسانی گزر کر اس کے جسم تک رسائی حاصل کر سکتی تھی۔ سام نے اس کے چہرے کا معائنہ کیا، اسے کہیں کوئی نشان نہیں ملا۔ چہرہ بالکل صاف تھا۔ سام نے ڈاکٹر رابن کی طرف دیکھا۔

"اس کے لباس کا معائنہ کیا گیا ہے؟"

"ابھی نہیں لیکن پیرامیڈک اسے اٹھانے سے پہلے معائنہ کریں گے۔" ڈاکٹر نے جواب دیا۔

"یہ بہت ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ ایک لاش کا اور اضافہ ہو جائے۔ ممکن ہے کسی طاقت ور رائفل سے زہریلی سوئی پھینکی گئی ہو اور وہ ابھی تک لباس میں موجود ہو۔" بل نے کہا۔ طبی عملہ آ گیا تھا اور اب لاش کے سلسلے میں ڈاکٹر کی ہدایت کا منتظر تھا۔ سام نے اجازت دی تو ڈاکٹر نے فوری عملے کو احتیاطی تدبیر کے ساتھ لاش اٹھانے کا حکم دیا۔ انہوں نے مخصوص حفاظتی دستانوں کے ساتھ لاش کو احتیاط سے اسٹریچر پر منتقل کیا اور وہاں سے لے گئے۔ سام نے فی الحال اس کے لباس کی تلاشی لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ بعد میں وہ سامان دیکھ سکتا تھا جو پولیس کے پاس ہی آنا تھا۔ تھیٹر کا مالک اس وقت یہاں موجود نہیں تھا، وہ قتل کی اطلاع پر آیا تھا البتہ منیجر یہاں موجود تھا لیکن قتل کا عینی گواہ وہ بھی نہیں تھا کیونکہ اس وقت وہ اپنے دفتر میں تھا۔ عینی گواہ اسٹیج منیجر اور دوسرا عملہ تھا جو یہاں موجود تھا۔ ان کے علاوہ سازندوں اور ہزاروں دوسرے افراد نے ہنرک کو گرتے دیکھا تھا۔ سام نے سب سے پہلے اسٹیج منیجر سے بات کی۔ وہ ایک جوان آدمی تھا اور کسی قدر نروس تھا۔ سام نے اسے ایک گوشے میں بلایا۔ تھیٹر کے مالک اور منیجر سے بات کرنے کی ذمے داری اس نے بل کو سونپ دی تھی۔ سام نے اسٹیج منیجر جان کیلر سے پوچھا۔

"تم نے کیا دیکھا تھا؟"

"وہی جو سب نے دیکھا۔ ہنرک موسیقی دیتے دیتے اچانک گرا اور مر گیا۔"

"اس کے پاس سب سے پہلے کون پہنچا تھا؟"

"میں پہنچا تھا۔" اس نے جواب دیا۔ "کیونکہ میں اسٹیج پر پردے کے پیچھے اس سے سب سے زیادہ نزدیک تھا۔" اس نے آرکسٹرا والی جگہ کے عقب میں اشارہ کیا جہاں اسٹیج کے پردے کے پیچھے وہ موجود رہتا تھا۔ یہ اس کی ذمے داری تھی۔ اسٹیج کے تمام میکنزم کو وہی آپریٹ کرتا تھا۔

"تم سازندوں سے بھی زیادہ قریب تھے؟"

"نہیں، سازندے زیادہ قریب تھے لیکن وہ بیٹھے تھے اور اکثر کے ساتھ آلات تھے اس لیے وہ جلدی نہیں اٹھ سکتے یا ہنرک تک آ سکتے تھے، اس لیے سب سے پہلے میں اس کے پاس پہنچا۔"

"تم نے کیا دیکھا؟"

"ہنرک اسی طرح پہلو کے بل گرا ہوا تھا اور بالکل ساکت تھا۔ اس کا چہرہ اور سانس رکا ہوا لگ رہا تھا اس لیے میں نے سب سے پہلے گردن پر اس کی نبض چیک کی لیکن اس کی نبض رکی ہوئی تھی۔ میرا خیال ہے، وہ گرتے ہی مر گیا تھا۔"

"تمہارے علاوہ اور کون کون اس کے پاس آیا تھا؟"

"مجھے صحیح سے یاد نہیں ہے، دو تین سازندے تھے پھر میری نائب جیڈ آئی تھی۔ وہ پردے کے پیچھے میرے ساتھ ہی تھی۔ اس کے بعد تو سب ہی آ گئے تھے اور کسی کو اسٹیج کا پردہ گرانے کا ہوش بھی نہیں رہا تھا۔ پھر سازندوں میں سے کسی نے زور سے کہا کہ ارے... یہ تو مر گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ہال میں افراتفری مچ گئی اور لوگ جلدی جلدی ہال سے باہر

جانے لگے۔ میں نے کوشش کی کہ ان کو روک سکوں لیکن اس وقت کوئی سننے کے لیے تیار نہیں تھا اور پھر کچھ لوگ باہر چلے گئے تو باقی کو روکنے کا جواز نہیں بنتا تھا۔ انتظامیہ کو بھی واقعے کی دیر سے اطلاع ملی۔ اس وقت تک تقریباً پورا ہال خالی ہو گیا تھا۔''

''ہال میں اندازاً کتنے لوگ تھے؟'' سام نے نشستوں کی طرف دیکھا، ان کی تعداد ہزاروں میں تھی۔ یہ خاصا بڑا ہال تھا۔

''میرا خیال ہے کہ ڈھائی ہزار سے اوپر ہوں گے۔ جب سے ہنرک آسکر ایوارڈ کے لیے منتخب ہوا ہے، اس کے شوز فل جانے لگے ہیں۔''

''کیا وہ باقاعدگی سے یہاں شو کرتا تھا؟''

''تقریباً۔'' جان نے کہا۔ ''اصل میں وہ یہاں مہینے میں پانچ شو کرتا تھا لیکن دن مخصوص نہیں تھے۔ عام طور سے وہ اتوار والے دن شو کرتا تھا لیکن اگر اسے کوئی اور مصروفیت ہو تو دن بدل بھی جاتا تھا۔''

''جیسے آج منگل ہے... یعنی اس نے اس اتوار کو شو نہیں کیا؟''

''ہاں، اس اتوار کو اسے اپنی اکلوتی بیٹی کے پاس جانا تھا۔ وہ اس کی سابق بیوی کے ساتھ رہتی ہے اس لیے اس نے اتوار کو شو نہیں کیا۔ اس کی جگہ آج کا شو طے تھا۔''

''شو کتنے دن پہلے طے ہو جاتا ہے؟''

''دس دن پہلے... کچھ تشہیر اور ٹکٹوں کی بکنگ کا معاملہ ہوتا ہے اس لیے شو پہلے طے کرنا پڑتا ہے۔ اکثر اوقات دو مہینے پہلے طے ہو جاتا ہے لیکن کبھی کوئی ایمرجنسی آ جائے، تب بھی کم سے کم دس دن پہلے شو کا اعلان کر دیا جاتا ہے۔'' جان اب پُر اعتماد تھا۔ اس کے بعد سام نے اسٹیج پر موجود سازندوں سے پوچھ گچھ کی۔ ان کی تعداد تیس سے زیادہ تھی اس لیے سب سے تفصیلی انٹرویو ممکن نہیں تھا۔ سام نے چند سوالات کیے اور تقریباً سب سے کسی خاص چیز کے بارے میں پوچھا لیکن ان میں سے کوئی کسی خاص چیز یا بات کی نشان دہی نہیں کر سکا۔ ان سب کا یہی کہنا تھا کہ سب معمول کے مطابق ہو رہا تھا کہ یہ واقعہ پیش آیا۔

بل نے تھیٹر کے مالک اور منیجر سے جو گفتگو کی تھی، اس کے مطابق ان کے علم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی جو ہنرک کے قتل کی نشان دہی کر سکتی۔ ہنرک اپنے کام سے کام رکھنے والا اور مرنج مرنجاں قسم کا آدمی تھا۔ وہ دوسروں سے زیادہ گھلتا ملتا نہیں تھا بلکہ خاصی حد تک تنہائی پسند تھا۔ ریہرسل اور شو کے علاوہ وہ زیادہ تر اپنے ڈریسنگ روم میں رہنا پسند کرتا۔ اپنا کام ختم ہوتے ہی وہ تھیٹر سے رخصت ہو جاتا۔ وہ میامی کی ایک عمارت کی سب سے اوپری منزل میں اپنے پینٹ ہاؤس میں اکیلا رہتا تھا۔ اس کی کسی سے دوستی نہیں تھی اور اگر اس کی کوئی گرل فرینڈ تھی تو اس کا علم ان دونوں کو نہیں تھا۔ ہنرک نے بارہ سال پہلے شادی کی تھی اور صرف دو سال بعد اس کی بیوی سے طلاق ہو گئی تھی۔ طلاق کی وجوہات کے بارے میں ہنرک اور اس کی سابق بیوی جولیا دونوں خاموش تھے۔ ان کی ایک بچی تھی اور وہ ماں کے پاس رہتی تھی۔ بچی کا خرچ اور جولیا کے اخراجات کی ذمے داری عدالت نے ہنرک پر ڈالی تھی جسے وہ بہ خوبی ادا کر رہا تھا۔ مہینے میں ایک بار اسے ایک دن اپنی بیٹی کے ساتھ گزارنے کی اجازت تھی۔ اس نے اپنی زندگی کا آخری اتوار اپنی بیٹی نانسا کے ساتھ گزارا تھا۔

لاش اٹھائی جا چکی تھی اور ڈاکٹر اپنے عملے سمیت چلا گیا تھا۔ موقع سے ہر چیز اٹھالی گئی تھی اور فارنسک والے بھی اپنا کام کر چکے تھے۔ البتہ تھیٹر کے باہر میڈیا اور اخباری رپورٹر کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا۔ وہ بہ مشکل اس سے جان چھڑا کر وہاں سے نکلے۔ سام گھر سے ناشتا کر کے آیا تھا۔ اس کے بعد اسے کھانے کا موقع نہیں ملا تھا اور اسے زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ تھیٹر سے واپسی پر بل نے کار ایک فاسٹ فوڈ شاپ کے سامنے روک دی اور جا کر اندر سے برگر اور فرنچ فرائز لے آیا۔ موسم کی مناسبت سے ساتھ میں کولڈ ڈرنکس تھی۔ یہ ان کا ڈنر تھا۔ بل نے برگر کھاتے ہوئے سام سے پوچھا۔

''تمہارے کیا خیال ہے، قاتل کا مقصد کیا ہو سکتا ہے؟''

''کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ یہ رقابت سے لے کر پیشہ ورانہ چشمک تک کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ قاتل نے قتل کیسے کیا ہے؟''

بل نے منہ بنایا۔ ''تم الٹی بات کر رہے ہو۔ جب قاتل ہاتھ آ جائے گا تو وہ خود بتا دے گا کہ اس نے قتل کیسے کیا ہے؟''

''تب تم قاتل کو کیسے تلاش کرو گے؟ اب تک جو معلومات حاصل ہوئی ہیں، ان سے تو کسی کی طرف اشارہ نہیں ہوتا۔''

''ممکن ہے یہ وراثت کا چکر ہو۔ سنا ہے ہنرک نے بہت کما لیا ہے اور اس کی دولت اب بلین ڈالرز کے قریب جانے والی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے، اس کی سابق بیوی ملوث ہو سکتی

ہے؟'' سام نے اس کی بات پر غور کیا۔ ''یہ تو لازمی ہے کہ ہنرک کی وارث اس کی اکلوتی بیٹی ہو گی اور اگر دولت اس کی طرف آتی ہے تو جولیا خود بہ خود اس سے فیض یاب ہو گی۔''

''کیا ایسا ہونا ممکن ہے؟''

''بالکل ممکن ہے لیکن تب بھی جولیا نے ہنرک کو کس طرح قتل کیا؟''

اس سوال کا جواب فی الحال کسی کے پاس نہیں تھا کہ قاتل جو کوئی بھی تھا، اس نے ہزاروں لوگوں کے سامنے ہنرک کو کس طرح قتل کیا۔ بہرحال، ابھی قتل کو چند گھنٹے گزرے تھے اور ابھی تفتیش کا بڑا طویل مرحلہ باقی تھا۔ واپسی پر سام نے رپورٹ لکھ کر گورڈن کے دفتر بھجوا دی۔ وہ چھٹی کر کے جا چکا تھا اور اب وہ صبح ہی رپورٹ دیکھتا اور اس کے بعد کیس کسی کے سپرد کرتا۔ سام کی خواہش تھی کہ کیس کسی اور کو دیا جائے لیکن بل چاہتا تھا کہ کیس انہیں ملے کیونکہ اس میں میڈیا پبلسٹی کا بہت امکان تھا۔ سام کا کہنا تھا کہ انہیں پہلے ہی کئی کیسز میں خاصی پبلسٹی مل چکی ہے اور زیادہ پبلسٹی ان کے لیے اچھی نہیں ہو گی۔ اگلے دن گورڈن نے آتے ہی سام اور بل کو طلب کر کے ہنرک مرڈر کیس ان کے سپرد کر دیا۔ سام نے احتجاج کیا۔

''کیپٹن! ہمارے پاس پہلے ہی دو کیس ہیں۔''

''وہ کوئی خاص نہیں ہیں۔'' گورڈن نے سرد لہجے میں کہا۔ ''تم چاہو تو ان کو کسی اور کے سپرد کیا جا سکتا ہے۔''

سام کھول کر رہ گیا۔ جب انہوں نے کام کر کے کیسز کو تقریباً حل کر دیا تھا تو گورڈن انہیں کسی اور کے سپرد کرنے کی بات کر رہا تھا۔ سام نے سرد آہ بھری۔ ''نہیں، ان کو بھی ہم ہی ہینڈل کر لیں گے۔''

گورڈن شاطرانہ انداز میں مسکرایا۔ ''مجھے بھی یہی توقع ہے۔ میرے شعبے میں سب سے بہترین آفیسرز تم دونوں ہی ہو، اس لیے میں اہم کیس تمہارے سپرد کرتا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ تم جلد ہنرک شیفیلڈ کے قاتل کو تلاش کر لو گے۔''

''یہ ہمیں گدھا سمجھتا ہے۔'' سام نے باہر آ کر کہا۔

''بل کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں۔ ''لیکن اس نے ہمیں سب سے بہتر بھی تو قرار دیا ہے۔''

''کام کرنے والے گدھوں کو تھپکی بھی دی جاتی ہے۔'' سام نے بدمزگی سے اپنے ساتھی کو دیکھا۔ ''اب رات دیر تک کام کرنا ہو گا۔''

''وہ تو ویسے بھی ہمارا مقدر ہے۔'' بل نے بھی ٹھنڈی سانس لی۔

سام نے اپنی ڈیسک سے ڈاکٹر برائن کو کال کی۔ ''ڈاکٹر رابن! پوسٹ مارٹم رپورٹ آ گئی ہے؟''

''ہاں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''میرا اندازہ ٹھیک نکلا، اسے سوئی کے ذریعے سائنائڈ انجیکٹ کیا گیا تھا۔ یہ ہائڈروجن سائنائڈ کی ٹھوس شکل تھی۔ جسم کے درجۂ حرارت پر یہ گیس کی صورت اختیار کر جاتا ہے اور خون میں شامل ہوتے ہی موت کا باعث بن جاتا ہے۔''

''سوئی ملی ہے؟''

''ہاں، اس کے سینے میں پیوست سوئی ملی ہے۔ سوئی صرف ایک انچ کی ہے اور چوتھائی انچ سینے میں اتر گئی تھی۔ اس سے لگتا ہے کہ اسے خاصی طاقت سے پھینکا گیا تھا۔''

''پوسٹ مارٹم رپورٹ کب ملے گی؟''

''اگر ہارڈ کاپی چاہیے تو آ کر لے جاؤ، اس کا سامان بھی ہے۔''

ہنرک کا سامان انہیں قبضے میں لینا تھا اس لیے سام اور بل اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہنرک کو مردہ خانے منتقل کر دیا گیا تھا۔ اس کا سامان ایک نرس نے کارٹن میں لا کر سام اور بل کے سامنے رکھ دیا۔ اس میں ہنرک کا لباس، اس کی قیمتی گھڑی، جدید ترین آئی فون، اس کا پرس اور ایک کی چین شامل تھی جس میں اس کی مرسیڈیز کار کے علاوہ بھی کئی طرح کی چابیاں تھیں۔ سام نے اس کا پرس کھولا۔ اس میں تقریباً دو ہزار ڈالرز کی نقد رقم، دو عدد کریڈٹ کارڈز، اس کا ڈرائیونگ لائسنس، سوشل سیکیورٹی کارڈ اور موسیقاروں کی تنظیم کا کارڈ تھا لیکن اس کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ بل نے رقم دیکھ کر سیٹی بجائی۔ ''اسے خاصی رقم رکھنے کی عادت تھی۔''

''حیرت کی بات ہے، اسپتال میں کسی نے یہ رقم پار نہیں کی حالانکہ ہمیں اس کا علم بھی نہیں تھا۔'' سام بولا۔

''ڈاکٹر برائن ایمان دار شخص ہے، ظاہر ہے وہ اپنا عملہ بھی ایسا ہی رکھنا پسند کرے گا۔'' بل نے کہا۔ انہوں نے لاش کو بھی ایک نظر دیکھا۔ خاص طور سے سام نے اس کے سینے پر سوئی کے ننھے سے نشان کا معائنہ کیا۔ سام نے ڈاکٹر سے پوچھا۔

''ابھی تک کسی نے لاش کی حوالگی کے لیے رابطہ کیا ہے؟''

ڈاکٹر برائن نے سر ہلایا۔ ''ہاں، اس کی سابق بیوی جولیا نے رابطہ کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ لاش کی حوالگی

پولیس کی اجازت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔''

''اب اگر وہ رابطہ کرے تو لاش اس کے حوالے کر دینا۔'' سام نے کہا اور ڈاکٹر برائن کے پیش کیے جانے والے اجازت نامے پر دستخط کر دیے۔ وہ باہر آئے تو بل نے اس سے کہا۔

''تم نے لاش حوالے کرنے میں کچھ زیادہ جلدی نہیں کی ہے؟''

''اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر جولیا کو لاش جلدی ملے گی تو وہ ہم سے بہتر تعاون کرے گی۔'' سام نے کہا۔ ''تم نے غور نہیں کیا، لاش کا مطالبہ اس نے کیا ہے۔ اس کا مطلب ہے اس کے پاس ٹھوس وجہ ہے۔''

''یعنی ہنرک کی وصیت وغیرہ؟''

''بالکل، ورنہ وہ اس کی حق دار نہیں بنتی۔'' سام نے کہا اور اپنی کار میں بیٹھ کر ہنرک کا آئی فون چیک کیا۔ خوش قسمتی سے اس پر کوئی پاس ورڈ نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے جولیا کا نمبر نکالا اور اسے اپنے سیل سے کال کی۔ ''مس جولیا! میں ہومی سائڈ سے آفیسر سام بورمین بات کر رہا ہوں۔ میں ہنرک مرڈر کیس کا انچارج ہوں۔''

''آفیسر! میں تمہارے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' جولیا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ اس کی آواز سے دکھ یا کسی جذبے کا اظہار نہیں ہو رہا تھا۔

''پہلے میں تمہارے سابق شوہر کی موت پر تعزیت کرتا ہوں۔ دوسرے مجھے تم سے ملنا ہے۔''

''تم میرے گھر آ سکتے ہو۔'' جولیا نے کہا اور اپنا پتا بتایا۔ ''میں اس وقت فارغ ہی ہوں۔''

وہ آدھ گھنٹے بعد میامی سے ذرا دور ایک ساحلی قصبے میں واقع جولیا کے شان دار قسم کے گھر میں تھے۔ تقریباً نصف ایکڑ پر پھیلا یہ مکان خوب صورت اور قیمتی تھا۔ اس کے چاروں طرف سجا ہوا باغ تھا جس میں بے شمار اقسام کے پودے لگے ہوئے تھے۔ ساحل کی طرف سے تیز اور خوش گوار ہوا چل رہی تھی۔ جولیا پورچ کے ساتھ باغ میں ان کی منتظر تھی۔ سورج تیز تھا لیکن ہوا کی وجہ سے اس کی تیزی بھی بری نہیں لگ رہی تھی۔ جولیا خلافِ توقع زیادہ عمر کی نہیں تھی۔ اس کی عمر شاید تیس برس تھی اور وہ ہنرک سے کم سے کم بیس برس چھوٹی تھی۔ یعنی جب اس نے ہنرک سے شادی کی تو وہ عمر میں اس سے دگنا بڑا رہا ہوگا۔ وہ خوب صورت اور نازک اندام بھی تھی۔ سام کو حیرت ہوئی کہ وہ ابھی تک اکیلی تھی جبکہ اسے ہنرک سے طلاق لیے ہوئے بھی دس سال ہو چکے تھے۔ سام نے اپنا اور بل کا تعارف کرایا۔

''میں تمہارے تعاون کی شکر گزار ہوں۔'' جولیا نے کہا۔ ''تم نے لاش اتنی جلدی میرے حوالے کرنے کی اجازت دے دی ہے۔''

''پولیس کی ضرورت پوری ہو گئی ہے اس لیے لاش کو بلاوجہ روکنا ضروری نہیں ہے۔'' سام نے کہا۔ ''تم نے لاش کا مطالبہ کیا ہے، تمہارے پاس یقیناً اس کی معقول وجہ ہو گی؟''

جولیا نے سر ہلایا۔ ''ہنرک کا وصیت نامہ... اس کے مطابق اس کے انتقال کی صورت میں، میں اس کی ہر چیز کی نگران اور ذمے دار ہوں گی۔ اس کی آخری رسومات کی بھی۔''

''کیا اس نے تمہیں اپنا وارث بنایا ہے؟''

جولیا نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگرچہ میں نے اب تک وصیت نہیں دیکھی ہے لیکن ہنرک نے مجھے بتایا ہے کہ میں صرف نگران ہوں گی اس کی تمام دولت اور جائداد کی وارث اس کی بیٹی ناشا ہے۔''

''تمہیں اندازہ ہے کہ ہنرک کتنی دولت چھوڑ گیا ہے؟''

''نہیں۔'' جولیا نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔ ''مگر یہ اتنی دولت ضرور ہے کہ ناشا کو ساری عمر کوئی مالی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''ہنرک اتوار کو یہاں آیا تھا اور اس نے سارا دن یہاں گزارا تھا۔''

''ہاں لیکن اس نے یہ سارا دن اپنی بیٹی کے ساتھ گزارا تھا۔'' جولیا نے تصحیح کرنے کے انداز میں کہا۔ ''جب ہنرک آتا تھا تو میں عام طور سے اپنے بیڈ روم میں رہتی تھی یا کہیں چلی جاتی تھی۔ وہ عام طور سے اتوار کے دن آتا تھا اس لیے میں گھر پر ہی ہوتی تھی۔''

''تم جاب کرتی ہو؟'' بل نے پوچھا۔

جولیا نے سر ہلایا۔ ''میں شیڈوز کیمیکلز میں جاب کرتی ہوں۔''

شیڈوز کیمیکلز فلوریڈا کی چند بڑی کیمیکلز کمپنیوں میں سے ایک تھی۔ بل نے پوچھا۔ ''تمہاری جاب کیا ہے؟''

''میں... کیمیکل اینالسٹ سپروائزر ہوں۔'' جولیا نے جواب دیا۔

''اوہ... تم تو اہم پوسٹ پر ہو۔'' سام نے ستائشی لہجے میں کہا۔ ''یقیناً تم اعلیٰ تعلیم یافتہ ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں نے اپنے شعبے میں ماسٹر کی ڈگری لے رکھی ہے۔''

''ڈگری یقیناً تم نے ہنرک سے طلاق کے بعد لی ہو گی؟''

''جب میں نے ہنرک سے شادی کی تو اس وقت صرف ہائی اسکول تک پڑھا تھا۔ میں اس وقت بالکل ناتجربے کار اور نادان تھی اس لیے محض جذبات میں آ کر یہ فیصلہ کر بیٹھی۔''

''ہنرک تو ناتجربے کار یا نادان نہیں ہوگا؟''

''ہاں، اس نے مجھے جال میں پھنسا لیا تھا۔ دو سال بعد مجھے عقل آ گئی تھی۔''

''طلاق تم دونوں کی باہمی رضامندی سے ہوئی تھی؟''

جولیا نے سر ہلایا۔ ''ہاں لیکن یہ بات اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے۔ ہنرک کے قتل سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔''

''تمہیں کسی پر شبہ ہے کہ وہ ہنرک کو قتل کر سکتا ہے؟''

''نہیں کیونکہ گزشتہ آٹھ سال سے میں نے اس سے کوئی تعلق نہیں رکھا۔ ہمارے درمیان شاید ایک درجن بار بھی بات نہیں ہوئی ہوگی۔''

''اس کا مطلب ہے، تمہیں بالکل نہیں معلوم کہ اس کا کسی سے کوئی تنازع تھا؟''

''میں نے کہا نا، میں اس سے لاتعلق تھی۔ میرا اس سے واسطہ صرف ناشا کی حد تک تھا۔ ورنہ شاید میں اس کی صورت بھی دیکھنا پسند نہ کرتی۔''

''اس کے باوجود اس نے تمہیں اپنی دولت اور دوسرے امور کا نگران مقرر کر دیا؟'' سام نے کسی قدر چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

جولیا نے شانے اچکائے۔ ''یہ اس کا فیصلہ ہے حالانکہ میں نے انکار کیا تھا لیکن اس کا خیال تھا کہ میں ناشا کے مفادات کا تحفظ کسی بھی دوسرے شخص سے زیادہ بہتر طور پر کر سکتی ہوں۔''

''طلاق کے بعد اس نے تمہیں ماہانہ رقم دینا جاری رکھی؟''

''اس کے لیے وہ عدالت کے فیصلے سے مجبور ہوا۔ جب تک میں دوسری شادی نہ کر لوں وہ اس کا پابند تھا۔ یہ مکان اور بہت کچھ میں نے اس کی دولت سے حاصل کیا ہے۔ میری ذاتی مالی پوزیشن بھی بہت اچھی ہے۔ اگر میں چاہوں تو ناشا کو خود بھی تمام سہولیات دے سکتی ہوں، اسے

باپ کی دولت کی ضرورت نہیں ہے۔ مگر یہ اس کا حق ضرور ہے۔''

بل نے معنی خیز نظروں سے سام کی طرف دیکھا۔ وہ کچھ دیر اس سے بات کرتے رہے لیکن ملاقات کے خاتمے پر انہیں احساس ہوا کہ ان کے ہاتھ کچھ نہیں آیا ہے۔ جولیا کوئی ایسی بات نہیں بتا سکی جس سے قتل کی اس واردات پر روشنی پڑتی۔ جولیا نے ان کی تعزیت قبول کر لی تھی لیکن نہایت صاف گوئی سے انہیں بتا دیا تھا کہ اسے ہنرک کی موت کا کوئی افسوس نہیں ہے۔ وہ اس سے دلی تعلق برسوں پہلے ختم کر چکی تھی اس لیے اس کا جینا یا مرنا جولیا کے برابر تھا۔ جب ہنرک کو قتل کیا گیا تو ناشا البتہ اپنے باپ کی اچانک موت سے ذہنی طور پر ڈسٹرب ہو گئی تھی اور ڈاکٹر نے فی الحال اس سے اس موضوع پر بات کرنے سے منع کیا ہوا تھا۔ وہ باہر آئے تو بل نے کار میں بیٹھتے ہی کہا۔

''مجھے اس عورت پر شبہ ہے۔ یہ قتل میں کسی طرح ضرور ملوث ہے۔''

''یہ تم کیسے کہہ سکتے ہو؟''

''تم نے غور نہیں کیا، وہ ایک کیمیکل فرم میں کام کرتی ہے اور خود بھی کیمیکل اینالسٹ ہے۔ اس کے لیے ہائیڈروجن سائنائڈ کو ٹھوس صورت میں حاصل کرنا اتنا مشکل نہیں ہو گا... جبکہ عام آدمی کے لیے اس خطرناک زہر کا حصول بہت مشکل ہے۔''

''ٹھیک ہے، اس نے حاصل کر لیا لیکن استعمال کیسے کیا؟ جب ہنرک قتل ہوا تو وہ گھر میں تھی اور اس کے گواہ اس کا بٹلر اور اس کی بیٹی ناشا ہیں کہ وہ کل شام گھر سے نہیں نکلی تھی۔''

''یہ ناممکن نہیں ہے۔'' بل نے اصرار کیا۔ ''ممکن ہے وہ کسی طرح سے نکل گئی ہو اور اس کا بٹلر اور بیٹی سمجھ رہے ہوں کہ وہ گھر میں ہے۔ اس کا گھر میرین تھیٹر سے مشکل سے بیس منٹ کی ڈرائیو پر ہے، یعنی وہ کام کر کے ایک گھنٹے میں گھر واپس آسکتی ہے۔''

''فرض کر لو اس نے ایسا ہی کیا ہے، تب بھی اس نے قتل کس طرح سے کیا؟''

''زہریلی سوئی کسی بلو پائپ سے پھینکی گئی ہو گی۔''

''تمہارے خیال میں ایک عورت ہال میں بلو پائپ منہ سے لگا کر سوئی پھینکے تو کوئی اس کا نوٹس نہیں لے گا؟''

''ممکن ہے اس نے کوئی ایسی مشین استعمال کی ہو جس کی طرف کسی کی توجہ نہ جائے۔'' بل نے کہا تو سام نے گہری سانس لی۔

''یہ کوئی جاسوسی فلم نہیں ہے جس میں اس قسم کی مشینیں استعمال کی جائیں... اور دوسرے تم اہم ترین بات نظر انداز کر رہے ہو۔ سوئی ہنرک کے سینے سے نکلی ہے۔ ہال میں بیٹھے تماشائیوں میں سے کوئی کسی صورت اس کے سینے میں سوئی نہیں اتار سکتا تھا۔''

''تب یہ کام گیلری میں بیٹھ کر کیا گیا ہو گا۔'' بل نے اصرار کیا۔ ''ہنرک گیلری کے بالکل سامنے تھا۔''

''مگر ڈائس اور گیلری کے درمیان کوئی سوفٹ کا فاصلہ ہو گا۔'' سام نے کہا۔ ''اتنے فاصلے سے بلو پائپ یا کوئی ائر پریشر والی ڈیوائس استعمال کرنا آسان نہیں۔ دوسرے گیلری میں چند مخصوص لوگ بیٹھتے ہیں اور ان کے بارے میں تھیٹر سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ میرا نہیں خیال کہ کوئی گیلری میں بیٹھ کر یہ کام کر سکتا ہے۔''

بل کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ زچ ہو رہا ہے۔

''تب صرف سازندے رہ جاتے ہیں۔''

''مگر جس زاویے سے سوئی ماری گئی ہے، وہ سازندوں کی سمت سے بھی میل نہیں کھاتا ہے۔''

اس بار بل بھنّا گیا۔ ''تب سوئی یقیناً آسمان سے آئی اور ہنرک کا کام تمام کر گئی۔''

سام بے ساختہ ہنس دیا۔ ''لگتا ہے تم اس کیس کو حل کرنے کے لیے زیادہ ہی بے تاب ہو۔''

بل نے سر جھٹکا۔ ''یہ عجیب کیس ہے۔ نہ تو قتل کی وجہ سمجھ میں آرہی ہے، نہ ہی قاتل کی طرف کوئی اشارہ ملا ہے اور نہ ہی قتل کا طریقہ سمجھ میں آیا ہے۔''

''میرا خیال ہے کہ ہمیں خیالی گھوڑے دوڑانے کے بجائے کچھ اور عملی کام کرنا چاہیے۔''

''مثلاً کیا کرنا چاہیے؟'' بل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

''ہمیں تھیٹر جانا چاہیے۔'' سام نے جواب دیا۔

''مجھے لگ رہا ہے ہنرک کو اس کی دولت کی خاطر قتل کیا گیا ہے۔''

''تب تو شبہ صرف جولیا پر جائے گا۔ اس کی بچی صرف گیارہ سال کی ہے اور یقیناً وہ اپنے باپ کو قتل نہیں کر سکتی۔''

''جولیا کے خلاف یہ پوائنٹ بھی ہے کہ وہ کیمیکل اینالسٹ ہے اور اس کے لیے ہائیڈروجن سائنائڈ کو ٹھوس صورت میں حاصل کرنا زیادہ مشکل نہیں ہے جبکہ اس کی بہت معمولی سی مقدار ورکار ہو گی۔''

سام نے اس کی بات پر غور کیا اور پھر سیل فون سے ڈاکٹر برائن کو کال کی۔ ''ڈاکٹر، یہ بتائیے کہ ٹھوس صورت میں ہائیڈروجن سائنائڈ کی کتنی مقدار ایک شخص کو موت کے گھاٹ اتارنے کے لیے کافی ہو گی؟''

''مشکل سے چار ملی گرام۔'' اس نے جواب دیا۔ ''اتنی مقدار اگر آدمی کے خون میں شامل ہو جائے تو اسے مرنے میں پانچ سیکنڈ لگتے ہیں۔''

''کیا سوئی کی نوک پر اتنا زہر آسکتا ہے؟''

''بالکل آسکتا ہے۔ یہ اس زہر کی بہت معمولی سی مقدار ہے۔ سوئی پر اس سے بھی زیادہ زہر آسکتا ہے۔ اگر تمہیں شبہ ہے تو میں تصدیق کرتا ہوں کہ ہنرک کی موت اسی سوئی سے جسم میں زہر داخل ہونے کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر نہ تو کوئی اور نشان ہے اور نہ ہی اس کے معدے میں زہر کے آثار پائے گئے ہیں۔''

''شکریہ ڈاکٹر!'' سام نے کہا۔ ''تم یہ سوئی فارنسک لیب بھجوا دو۔''

''میں بھیج دوں گا۔''

سیل فون بند کر کے سام نے بل سے کہا۔ ''موت کی وجہ سوئی ہے اور ڈاکٹر کے مطابق اسے بہت قوت سے پھینکا گیا ہے جس کی وجہ سے سوئی چوتھائی انچ ہنرک کے سینے میں اتر گئی تھی۔''

''تب ڈیوائس والی تھیوری درست ہو سکتی ہے۔ قاتل نے گیلری میں بیٹھ کر اپنا کام کیا اور کسی کو اس پر شک نہیں ہوا۔''

''اس کا پتا تو وہاں پہنچ کر ہی چلے گا۔ قاتل کا ہنرک سے تعلق ہونا ضروری ہے۔ کوئی اتنے جتن کر کے کسی کو بلاوجہ تو قتل نہیں کرتا؟''

بل کا منہ بن گیا۔ ''اس کا مطلب ہے تم میری بات پر یقین نہیں کر رہے؟''

''یقین نہ کرنے کی بہت ساری وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ اگر کسی کو کسی شخص سے کوئی عداوت ہو اور وہ اسے قتل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے بہت ضروری ہے، وہ اس طرح قتل کرے کہ جائے واردات پر اس کی موجودگی ثابت نہ ہو سکے۔ اگر گیلری میں کوئی ایسا شخص نکل آیا جس کا ہنرک سے کوئی تنازع تھا تو وہ خود بہ خود شک کی زد میں آجائے گا اور میرا خیال ہے، اتنی ہوشیاری سے قتل کرنے والا کوئی احمق شخص کبھی ہو سکتا۔''

''تب وہ کون ہو سکتا ہے؟''

فاسٹ بالر نے انتہائی تیز گیند کرائی۔ بیٹس مین وکٹوں کے عین سامنے تھا اور گیند پیڈ پر لگی تھی۔

''ہاؤز یٹ۔'' بالر نے اپیل کی۔

''ناٹ آؤٹ۔'' امپائر نے کہا۔

بالر شدتِ غیظ سے گنگ ہو کر رہ گیا۔ اس نے دوسری گیند اور تیز کرائی۔ اس بار گیند بیٹ سے لگ کر بہت اونچی اچھلی اور سیکنڈ سلپ میں کھڑے فیلڈر نے اُسے کیچ کر لیا۔ اس بار تمام فیلڈرز نے زوردار اپیل کی۔

''ناٹ آؤٹ۔'' امپائر نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

بالر کے ساتھیوں نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا۔ اس نے پھر اسٹارٹ لیا۔ اس بار گیند پہلے سے بھی زیادہ تیز تھی۔ وہ گیند بیٹس مین کی سمجھ میں بالکل نہیں آئی۔ تینوں اسٹمپس اُکھڑ کر دُور جا گریں۔ بالر اپنے اسٹارٹ کی طرف مڑا۔ امپائر کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے نفی میں سر ہلایا اور آہستہ سے بڑبڑایا: ''کمال ہے، کیا بال بال بچا ہے۔''

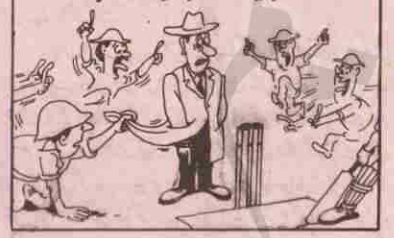

جوتی چرانے کی رسم

اس موقع پر دولہا کی سالیاں اپنے برادران لا کو جوتے اتار کر بیٹھنے پر زور دیتی ہیں چنانچہ جب وہ جوتے اتارتا ہے تو موقع پا کر یہ سالیاں جوتے غائب کر دیتی ہیں۔ بعد میں اس جوتے کی واپسی کے لیے دولہا کو منہ مانگی رقم ادا کرنا پڑتی ہے۔ مجھے بتایا گیا کہ جوتے چرانے کی یہ رسم شادی بیاہ کے علاوہ ہر جمعے کو مسجدوں کے باہر بھی ادا کی جاتی ہے اور یہ رسم سالیاں ادا نہیں کرتیں۔ ممکن ہے کہ یہ رسم سالے ادا کرتے ہوں تاہم میں نے اس ضمن میں کوئی تحقیق نہیں کی۔

عطاء الحق کی کتاب سے اقتباس

''کوئی ایسا شخص جس پر شک نہ کیا جا سکے... یعنی بہ ظاہر اس کی ہنرک سے کوئی دشمنی نہ ہو۔ اس کی طرف کسی کا دھیان نہ جائے اسی وجہ سے میں کہہ رہا ہوں کہ ہمیں اصل میں قتل کا طریقہ جاننا ہوگا کہ زہریلی سوئی کس طرح ہنرک کے سینے میں پیوست کی گئی۔''

بل سوچ میں پڑ گیا لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ صبح کا وقت تھا اس لیے تھیٹر اور اس سے متعلقہ ہال ویران پڑے تھے۔ صرف ایک ہال میں کسی ڈرامے کی ریہرسل جاری تھی۔ اسٹیج منیجر جان انہیں اسی ہال میں نظر آیا۔

''ہیلو آفیسر... کچھ پتا چلا ہنرک کے قاتل کا؟''

''ابھی تو ہم محرک ہی نہیں جان پائے ہیں۔'' بل نے استہزائیہ انداز میں کہا۔ ''تم قاتل کی بات کر رہے ہو؟''

''مسٹر جان! ہمیں اس ہال میں موجود لوگوں کے بارے میں جاننا ہے۔'' سام نے کہا۔ ''کیا تم گیلری میں بیٹھے افراد کے بارے میں بتا سکتے ہو؟''

جان نے سر ہلایا۔ ''کیوں نہیں، وہاں کل ایک درجن آئی پی باکس ہوتے ہیں اور یہ عام طور سے بک رہتے ہیں۔ میرے ساتھ آؤ۔''

جان انہیں اپنے دفتر میں لے گیا۔ اس نے ان لوگوں کی فہرست نکالی جو اس رات گیلری میں موجود تھے جب ہنرک کا قتل ہوا۔ اتفاق سے یہ سارے بڑے نام تھے اور سام ان سے واقف تھا۔ ان کا شمار شہر کی اہم شخصیات میں ہوتا تھا اور اگر ان سے پوچھ گچھ کی جاتی تو معاملہ میئر کے دفتر تک بھی پہنچ سکتا تھا مگر ان سے بات تو کرنا تھی۔ بہرحال، سام ان سے بیان حاصل کر سکتا تھا۔ اگرچہ اسے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس نے جان سے کہا۔

''شو کی مووی بھی بنی ہوگی؟''

''بالکل بنتی ہے جناب۔ ایک ٹی وی چینل بعد میں شو کو نشر بھی کرتا ہے، اس کا عملہ شو کو شوٹ کرتا ہے۔''

''کیا یہ شوٹنگ یہاں دستیاب ہوگی؟''

''بالکل... اس کی ایک کاپی ہمیں بھی دی جاتی ہے جو ریکارڈ کا حصہ بنتی ہے لیکن ابھی تک ہمیں کاپی موصول نہیں ہوئی ہے۔''

سام کے خیال میں شاید اس مووی سے انہیں مدد مل سکتی تھی۔ اس نے جان سے مذکورہ چینل کا نمبر لیا اور اس کے ریکارڈنگ روم کے انچارج کو کال کی۔ پولیس کا حوالہ دے کر اس نے کہا۔ ''ہمیں یہ مووی درکار ہے، بغیر کسی ایڈٹ کے اور مکمل شاٹس کے ساتھ۔''

''مل جائے گی۔'' روم انچارج نے جواب دیا۔ ''بشرطیکہ پولیس کی طرف سے باضابطہ درخواست کی جائے۔''

''درخواست بھی مل جائے گی۔'' سام نے جواب دیا پھر اس نے جان سے ہال دیکھنے کی فرمائش کی۔

تھیٹر کا یہ ہال پولیس کی طرف سے بند تھا۔ اسٹیج پر سامان اسی طرح موجود تھا اور فرش پر ہنرک کی لاش کا خاکہ بنا ہوا تھا۔ داخلی راستوں پر پولیس کی پیلی پٹی لگی ہوئی تھی۔ جان نے کہا۔ ''تب سے اب تک کوئی یہاں نہیں آیا ہے۔''

سازندوں والا حصہ بھی اسی طرح قائم تھا۔ یعنی سب کی نشستیں اور آلات موسیقی اپنی جگہ موجود تھے۔ سام نے ہنرک کے ڈائس پر کھڑے ہو کر سامنے گیلری کی طرف دیکھا۔ اس کا سینہ عین گیلری کے رخ پر تھا اور اگر وہاں سے کوئی اس کا نشانہ لینا چاہتا تو بہت آسانی سے لے سکتا تھا۔ لیکن یہ نشانہ بلو پائپ سے نہیں لیا جا سکتا تھا، اسے صرف کسی پستول یا رائفل کی گولی سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ ڈائس اور گیلری کے درمیان فاصلہ اس کے اندازے سے زیادہ تھا۔ سام نے جان کی طرف دیکھا۔

''اس جگہ سے گیلری کا فاصلہ کتنا ہوگا؟''

''کم سے کم ایک سو تیس فٹ۔'' جان نے جواب دیا۔

''اگر تم سوچ رہے ہو کہ قاتل نے وہاں سے ہنرک پر حملہ کیا تو یہ ممکن نہیں ہے۔ اول تو فاصلہ بہت زیادہ ہے اور دوسری بات یہ کہ گیلری تقریباً پورے ہال کی نگاہوں کے سامنے ہے اور اس میں کی جانے والی کوئی حرکت لوگوں سے چھپا کر نہیں کی جا سکتی۔ اگر کوئی شخص یہاں سے ہنرک کو نشانہ بنانا چاہتا تو وہ فوراً دوسروں کی نظروں میں آ جاتا۔''

''تجزیے کا شکریہ۔'' بل نے کسی قدر رکھائی سے کہا۔ ''یہ ہمارا کام ہے، ہم دیکھ لیں گے۔''

بے چارہ جان کھسیا کر رہ گیا۔ سام غور سے سازندوں کی نشستوں اور ان کے سازوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے بل کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ ''اس بے چارے نے غلط نہیں کہا ہے، اتنی دور سے نشانہ لینا ممکن نہیں ہے اور کسی کی نظروں میں آئے بغیر لینا تو قطعی ناممکن ہے۔ تم دیکھ سکتے ہو اگر اس گیلری میں کوئی شخص ذرا بھی حرکت کرے تو وہ صاف نظر آئے گی۔''

بل نے کوئی جواب نہیں دیا، شاید اسے اچھا نہیں لگا تھا کہ اس کا پارٹنر اس کے مقابلے میں ایک غیر پیشہ ور شخص کی بات کو ترجیح دے۔ وہ باہر نکلنے تک خاموش ہی رہا۔ جب سام اس کے برابر میں آ کر بیٹھا تو اس نے منہ بنا کر پوچھا۔

''اب کہاں جانا ہے؟''

سام مسکرایا۔ ''شاید تمہیں برا لگا کہ میں نے جان کی بات کی تائید کی۔ لیکن تم خود سوچو کہ ایک سو تیس فٹ کی دوری سے بلو پائپ استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ بیس تیس فٹ تک کارآمد ہوتا ہے۔ بہت طاقت ور آدمی بھی اس سے زیادہ دور سوئی نہیں پھینک سکتا۔ اس سے زیادہ فاصلے تک سوئی پہنچانے کے لیے لازمی کسی میکنزم کی مدد حاصل کرنی پڑتی ہے۔ لیکن کسی قسم کی بھی ڈیوائس لوگوں کی نظروں میں آئے بغیر استعمال کرنا ممکن نہیں ہے۔ جان بالکل ٹھیک کہہ رہا تھا، وہ گیلری ہزاروں نگاہوں کے بالکل سامنے تھی اور ناممکن تھا کہ ہمہ وقت کچھ نگاہیں اس طرف نہ لگی ہوں۔''

سوال وہی تھا کہ قاتل نے یہ کام کیسے کیا؟ اور بل کے نزدیک اس سے بھی بڑا سوال یہ تھا کہ اس نے یہ کام کیوں کیا؟ اس کی ہنرک سے کیا دشمنی تھی؟ سام نے بل سے کہا۔ ''ہمیں ٹی وی چینل کے دفتر جانا ہوگا کیونکہ وہ باضابطہ پولیس درخواست کے بغیر شو کی مووی دینے کو تیار نہیں ہیں۔''

چینل کے ریکارڈنگ انچارج اسٹیو کوفر نے بنا کسی گرم جوشی کے ان کا استقبال کیا۔ سام نے ہنرک کے قتل کا حوالہ دیا تب بھی اس کے تاثرات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ سام نے مووی کا مطالبہ کیا۔ اسٹیو نے نفی میں سر ہلایا۔ ''وہ مووی باقاعدہ درخواست کے بغیر فراہم نہیں کی جا سکتی۔''

''تو باقاعدہ درخواست اور کیا ہوتی ہے؟'' سام نے حیرت سے کہا۔ ''ہم اس کیس کے تفتیشی افسران ہیں اور وہ مووی دیکھنا ہماری ذمے داری ہے۔ وہ اس واردات کی اشیا میں شامل ہے اور پولیس اسے اپنی تحویل میں لینے کی مجاز ہے۔''

''بلکہ چینل کو اسے نشر کرنے کے لیے پولیس کی اجازت کی ضرورت ہوگی۔''

''اور اگر اسے بنا اجازت کے نشر کیا گیا تو عدالت میں جواب دہی تمہیں کرنا ہوگی مسٹر کوفر۔''

''اس کا چینل مالکان پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔'' بل نے مزید اضافہ کیا۔

''ہمیں وہ مووی ابھی دیکھنی ہے۔'' سام نے کہا تو اسٹیو نرم پڑ گیا۔ غالباً اسے بھی احساس ہو گیا تھا کہ پولیس کے اختیارات کیا ہوتے ہیں، اگر اس نے ان کی بات نظر انداز کی تو سچ مچ مشکل میں پڑ جائے گا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں مووی دے دیتا ہوں۔ مگر تم ایک چھوٹی سی تحریری درخواست تو دے سکتے ہو نا؟'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

سام نے اس کی فرمائش پوری کر دی اور اسٹیو نے اپنے شوٹ سیکشن کے انچارج کو بلایا۔ ''انہیں ہنرک کی آخری شو مووی دکھانی ہے جیسے یہ کہیں دیسے۔''

''آیئے میرے ساتھ۔'' انچارج نے سام اور بل سے کہا۔ وہ انہیں ایک پلے روم میں لے آیا۔ یہاں بے شمار ٹی وی لگے ہوئے تھے اور ان پر مختلف چیزیں چل رہی تھیں۔ انچارج نے ہنرک کے شو کی مووی کیسٹ نکالی اور انہیں بتایا۔ ''یہ چار کیمروں سے شوٹ کی گئی ہے۔ کل دورانیہ ایک گھنٹا ہے۔''

''یعنی یہ کل چار گھنٹے کی مووی ہے؟''

انچارج نے سر ہلایا اور سامنے رکھی ایک کیسٹ کی

بچے ہمارے عہد کے

استانی نے کلاس میں چوتھی جماعت کے ایک طالب علم سے پوچھا۔ ''تم بڑے ہو کر کیا کرو گے؟''

''نکاح!'' لڑکے نے بلا تامل جواب دیا۔

''میرا مطلب ہے کہ کیا بنو گے؟' استانی نے ٹپٹا کر اپنی بات دہرائی۔

''دلہا!'' لڑکے کے پاس جواب تیار تھا۔

''احمق! میں یہ پوچھ رہی ہوں کہ بڑے ہو کر تم کیا حاصل کرو گے؟''

''دلہن۔'' لڑکے کی سوئی ایک ہی جگہ اٹکی ہوئی تھی۔

''میں یہ جاننا چاہتی ہوں کہ تم اپنے ماں باپ کے لیے کیا کرو گے؟'' استانی نے جھنجلا کر سوال کیا۔

''بہو لاؤں گا۔''

''تمہارے والدین تم سے کیا چاہتے ہیں؟'' استانی اپنے سوال کا جواب سننے پر مصر تھی۔

''پوتا۔''

''گدھے! یہ بتاؤ کہ تمہاری زندگی اور اس تعلیم کا مقصد کیا ہے؟'' استانی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''شادی!''

اسلام آباد سے راشدہ اسلم کی برجستگی

طرف اشارہ کیا۔ ''یہ ایک نمبر کیمرا ہے۔ یہ مستقل ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر فوکس رہتا ہے۔ دوسرا کیمرا رول کرتا رہتا ہے لیکن یہ بھی ہنرک اور اس کے آرکسٹرا کو نظر میں رکھتا ہے، ساتھ ہی تماشائیوں کو بھی دکھاتا ہے۔ یہ تیسرا کیمرا تماشائیوں کے لیے مخصوص ہے اور ان پر رول کرتا رہتا ہے۔ یہ کرین کیمرا ہے اور خصوصی زاویوں سے مناظر کو شوٹ کرتا ہے۔ تم پہلے کیا دیکھنا پسند کرو گے؟''

''یہ کیسٹ جو مستقل ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر مرکوز رہی۔'' سام نے پہلی کیسٹ کی طرف اشارہ کیا تو انچارج اسے پلے کرنے لگا۔ اس نے کی بورڈ سامنے کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد ستائیس انچ کی وائڈ اسکرین پر ہال کا منظر نمودار ہوا۔ ہنرک اور اس کے آرکسٹرا پر سے پردہ اٹھ رہا تھا۔ لوگوں نے پُرجوش تالیوں سے ان کا استقبال کیا۔ ہنرک نے ڈائس سنبھالا اور موسیقی کے لیے اشارے دینے لگا۔ کچھ دیر میں اس کا آرکسٹرا پوری طرح حرکت میں آچکا تھا۔ سام نے انچارج سے کہا۔

''مووی کو وہاں تک لے جاؤ جہاں ہنرک گرتا ہے۔''

انچارج نے مووی کی رفتار تیز کی اور چند منٹ بعد وہ سین آگیا۔ اس پر وقت اٹھائیس منٹ کا آرہا تھا۔ گویا شو شروع ہوئے تقریباً پون گھنٹا ہوا تھا، تب یہ واقعہ پیش آیا۔ اس وقت آرکسٹرا اونچے سروں پر تھا اور ہال موسیقی کی تیز آواز سے گونج رہا تھا۔ ہنرک گرا تو سام نے مووی روکنے کا اشارہ کیا اور پھر بولا۔ ''اسے ریوائنڈ کرو... تقریباً پانچ منٹ تک۔''

انچارج نے مووی ریوائنڈ کی اور اسے چونتیس منٹ پر لے آیا۔ اب ہنرک دوبارہ اسکرین پر اپنے فن کا مظاہرہ کرتا ہوا نظر آرہا تھا۔ سام غور سے اس کی حرکات دیکھتا رہا۔ موسیقی دینے کے دوران میں وہ ساکت نہیں رہتا تھا۔ نہ صرف اس کے ہاتھ مستقل حرکت میں تھے بلکہ وہ جسم کو بھی دائیں اور بائیں گھما رہا تھا۔ یہ گھمانے والی حرکت وہ ایک خاص ردھم میں کر رہا تھا۔ ایک بار وہ دائیں طرف گھومتا تھا جس طرف تماشائی تھے اور ایک بار وہ بائیں طرف اپنے آرکسٹرا کی طرف۔ جب اس کے گرنے کا منظر آیا تو سام نے سین کو ایک منٹ ریوائنڈ کرنے کو کہا۔ انچارج نے اس سین کو ریوائنڈ کیا۔ جب ہنرک گرا تو سام نے پھر سے سین دکھانے کو کہا اور اس نے کوئی دس بار سین کو ریوائنڈ کر کے دیکھا۔ بل بیزاری سے بیٹھا بس اسکرین کو گھورے جا رہا تھا۔ تنگ آکر اس نے سام سے کہا۔

''میرے خدا... سام! کیا تم اس منظر کو یاد کرنا چاہتے ہو؟''

سام نے اس کی بات نظر انداز کر کے انچارج سے کہا۔ ''اب یہی سین مجھے آرکسٹرا کو زوم کر کے دکھاؤ۔''

انچارج نے ایسا ہی کیا۔ اب اسکرین پر آرکسٹرا نظر آرہا تھا۔ یہ سین بھی سام نے بار بار ریوائنڈ کر کے دیکھا حتیٰ کہ انچارج بھی بیزار نظر آنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''اگر تم کوئی خاص چیز دیکھنا چاہتے تو مجھے بتا دو، میں اسے واضح کر کے دکھا سکتا ہوں۔''

''یہ سازندوں کی دوسری قطار ہے، اوپر سے دوسری میں... اس کے درمیان والے حصے کو دیکھنا چاہتا ہوں۔''

انچارج نے یہ کام بھی کر دیا لیکن سام نے اسے بھی بار بار دیکھنا شروع کر دیا۔ بل کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے سام سے کہا۔ ''آخر تم کیا چیز دیکھنا چاہتے ہو؟''

سام مسکرایا۔ ''میں قاتل کو دیکھنا چاہتا ہوں اور میرا خیال ہے کہ میں نے قاتل کو دیکھ لیا ہے۔''

بل اچھل پڑا۔ ''کہاں ہے... کون ہے؟''

''ایک منٹ... ذرا صبر سے کام لو۔'' سام نے کہا اور انچارج سے کہا۔ ''یہ سب کیسٹس میں ساتھ لے جا رہا ہوں۔''

''ٹھیک ہے، تم مجھے ان کی رسید دے دو۔'' انچارج نے اعتراض نہیں کیا۔ اس نے اپنے باس کا رویہ دیکھ لیا تھا۔ ویسے بھی یہ ماسٹر پرنٹ نہیں تھا بلکہ اس کی نقل تھی۔ باہر آکر سام نے جان کو کال کی۔

''تم کہاں ہو؟''

''میں اپنے دفتر میں ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔

''وہیں رکو، ہم آرہے ہیں۔ ہمیں شو کی مووی دیکھنی ہے، اس کا انتظام کر کے رکھنا۔''

''تم بے فکر رہو، یہاں سب تیار ہوتا ہے۔''

وہ میرین تھیٹر پہنچے تو جان ان کا منتظر تھا۔ وہ انہیں براہ راست تھیٹر کے مووی روم میں لے گیا۔ یہ زیادہ بڑا نہیں تھا، یہاں مشکل سے سو افراد کی گنجائش تھی۔ سامنے ایک بڑی اسکرین والا ٹی وی تھا۔ یہاں خصوصی شوز کو دیکھا جاتا تھا۔ سام نے پہلی کیسٹ جان کے حوالے کی۔ ''اسے تیس منٹ تک لے جا کر پلے کرو۔''

جان نے ایسا ہی کیا۔ کچھ دیر بعد اسکرین پر ہنرک

اور اس کا آرکسٹرا ابھرا۔ اسکرین بڑی ہونے کی وجہ سے سب بہت واضح نظر آرہا تھا۔ جان نے مووی کو تیسویں منٹ تک فارورڈ کیا۔ اس کے بعد پلے کر دیا۔ ہنرک موسیقی دے رہا تھا۔ اس کی حرکات ایک ردھم میں جاری تھیں۔ سام نشست پر بیٹھنے کے بجائے ٹی وی کے سامنے جا کھڑا ہوا تھا۔ اس کی اسکرین کوئی نوفٹ بلند اور سولہ فٹ چوڑی تھی۔ مووی ہائی ڈیفینیشن تھی اس لیے اتنے بڑے سائز میں بھی واضح تھی۔ بل بھی اس کے پاس آگیا۔ جان مووی چلانے والے سسٹم کے پاس تھا۔ جیسے ہی مووی کو اڑتیس منٹ پورے ہوئے، سام نے جان سے کہا۔

''مووی کو سلوموشن کر دو۔''

جان نے اسے سلوموشن کر دیا، اب سین بہت آہستگی سے گزر رہا تھا۔ اسی مناسبت سے ہنرک اور اس کے ساتھیوں کی حرکت میں بھی آہستگی آگئی تھی۔ پھر موسیقی دیتے ہوئے ہنرک مخصوص ردھم میں آرکسٹرا کی طرف گھوما اور پھر جیسے ہی سیدھا ہونے لگا، اس کا جسم رکا اور پھر وہ یک دم لڑکھڑا کر ڈائس سے نیچے گرا اور ساکت ہو گیا۔ سام نے کہا۔ ''سین کو ایک منٹ پیچھے کر کے مزید سلو کر دو۔''

جان نے مووی ایک منٹ پیچھے کی اور اسے مزید سست کر دیا۔ سام نے بل سے کہا۔ ''اس نوجوان کو دیکھو جو بانسری بجا رہا ہے۔''

سام نے جس نوجوان کی طرف اشارہ کیا تھا، وہ اوپر سے دوسری قطار میں تقریباً درمیان میں بیٹھا ہوا تھا۔ گول چشمے اور بکھرے بالوں کے ساتھ وہ نرم مزاج اور سچ مچ کوئی بانسری نواز لگ رہا تھا۔ بل نے محسوس کیا کہ اس کی بانسری کا رخ ہنرک کی طرف تھا۔ پھر جیسے ہی وہ موقع آیا جب ہنرک آرکسٹرا کی طرف گھومتا ہے تو نوجوان نے اپنی انگلیاں بانسری کے سوراخوں سے ہٹاتے ہوئے اس کا رخ ہنرک کی طرف کر دیا اور پوری قوت سے پھونک ماری۔ اس سے موسیقی کے ردھم پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا کیونکہ اس وقت جو ردھم چل رہا تھا، اس کے مطابق بانسری نواز کو زور و شور سے بانسری بجانا تھا اور وہ ردھم کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔ اس نے پھونک مارنے سے پہلے گال پوری طرح پھلا لیے اور زور سے اس کے جسم نے جھٹکا لیا تھا لیکن یہ سب شاید سیکنڈ کے تیسرے حصے میں ہوا تھا اس لیے کوئی بھی اس کا نوٹس نہیں لے سکا۔ اگر وہ مووی کو نارمل رفتار سے چلا کر دیکھ رہے ہوتے تو شاید ان کو بھی نوجوان کی اس حرکت کا پتا نہ چلتا۔ اس کے پھونک مارنے کے دو سیکنڈ کے اندر ہنرک نیچے گر چکا تھا

حسنِ ظن

ایک بدشکل آدمی اپنی حسین و جمیل بیوی کے ساتھ سڑک سے گزر رہا تھا کہ ایک لڑکے نے فقرہ چست کیا۔ ''حور کے پہلو میں لنگور۔''

اس آدمی نے لڑکے کو پکڑ لیا اور اس کی پٹائی شروع کر دی۔ چند راہگیر بیچ بچاؤ کرنے آگے اور جھگڑے کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا۔

''یہ لڑکا میری بیوی کو لنگور کہہ رہا تھا۔''

برنس روڈ سے احمد حسن کی شوخی

اور جب تک دوسرے اس تک آتے، وہ ختم ہو چکا تھا۔ جان یہ منظر دیکھ کر اچھل پڑا۔ اس بار اس نے سام کے کہے بغیر سین کو ریوائنڈ کیا اور اسے مزید سست کر دیا۔ پھر اس نے اسے بانسری والے نوجوان پر زوم کیا اگرچہ اس سے کیمرے کی کوالٹی پر فرق پڑا تھا مگر انہوں نے بانسری سے کوئی چیز نکلتی ہوئی دیکھ لی تھی۔ اگرچہ سوئی واضح نہیں تھی تاہم زوم کرنے سے اتنا منظر واضح ہو گیا تھا۔

''تو یہ قاتل ہے؟'' بل نے کہا اور جان کی طرف دیکھا۔ ''تم اسے جانتے ہو؟''

''میں تو نہیں لیکن جیڈ جانتی ہوگی۔ سازندے اس کی ذمے داری ہیں۔'' جان نے کہا اور جیڈ کو کال کی۔ وہ بڑی پیاری لیکن سنجیدہ اور اپنے کام سے مخلص لڑکی تھی۔ جب جان نے اس سے آرکسٹرا کے بارے میں پوچھا تو وہ ان کا البم لے آئی۔ سام نے چشمے والے نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ کون ہے؟''

''یہ پین مائیکل ہے۔'' جیڈ نے کہا۔ ''ابھی ایک سال پہلے ہنرک کے آرکسٹرا میں شامل ہوا ہے۔ اچھا نوجوان ہے، کبھی کبھی ویسے بھی بانسری بجا کر دکھاتا ہے۔ اسے موسیقی سے بھی دلچسپی ہے۔''

''موسیقی سے دلچسپی؟'' سام نے سوالیہ نظر سے دیکھا۔

''میرا مطلب ہے، موسیقی ترتیب دینے سے دلچسپی ہے۔ ابھی یہ صرف سازندہ ہے لیکن بعض اوقات بڑے اچھے پیس خود سے بنا کر ہمیں سناتا ہے۔''

سام نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے، یہ بے تکلف قسم کا شخص ہے؟''

''بہت... اکثر شو ختم ہونے کے بعد یہ ہمارے ساتھ

آجاتا ہے۔'' جیڈ نے بتایا۔' ویسے یہ طالب علم ہے اور موسیقی سکھانے والے ایک ادارے میں پڑھ رہا ہے۔ ساتھ ہی ہنرک کے ساتھ کام بھی کرتا ہے۔ یوں اسے اتنا معاوضہ مل جاتا ہے جس سے یہ اپنی فیس ادا کرنے کے ساتھ اپنے دوسرے اخراجات بھی پورے کرلیتا ہے۔''

''اس کا پتا ہے؟''

''ہاں، ایک منٹ میں لے کر آتی ہوں۔'' جیڈ نے کہا اور چند منٹ بعد اس نے ایک کاغذ پر مائیکل کا پتا لکھ کر دے دیا۔ وہ میامی کے ایک متوسط علاقے میں رہتا تھا۔ ''یہ معاملہ کیا ہے؟''

''ہنرک کا قاتل مائیکل ہے۔'' ان سے پہلے جان نے جیڈ کو بتادیا۔

''کیا؟ مائیکل قاتل ہے؟'' وہ چیخ اٹھی۔

''لیکن ابھی یہ بات تم دونوں تک محدود رہنی چاہیے۔'' سام نے انہیں خبردار کیا۔ ''دوسری صورت میں تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ گے۔''

وہ لیسنس لے کر باہر آئے اور جیڈ کے دیے ہوئے پتے پر روانہ ہو گئے۔ پین مائیکل اپنے ایک کمرے کے اپارٹمنٹ میں تھا اور شاید کہیں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ پولیس بیج دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔

''ہمیں تم سے بات کرنی ہے۔'' سام نے کہا اور اسے دھکیل کر اندر داخل ہو گیا۔ بل اس کے پیچھے تھا۔

مائیکل نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ ''آفیسر! تم کیا چاہتے ہو؟''

''ہم صرف ایک بات جاننا چاہتے ہیں کہ تم نے ہنرک کو کیوں قتل کیا ہے؟'' سام نے کہا اور اپنا پستول نکال لیا۔ بل نے مائیکل کی تلاشی لی اور اس کی جیب سے تمام چیزیں نکال لیں پھر اسے اس کے حقوق بتاتے ہوئے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دیں۔ مائیکل کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سام نے بات جاری رکھی۔ ''ہمارے پاس مکمل ثبوت ہے کہ قتل تم نے کیا ہے اور بہت ہوشیاری سے کیا ہے... لیکن تمہاری بدقسمتی کہ مووی کیمرے نے وہ منظر ریکارڈ کرلیا جب تم نے ہنرک پر اپنی بانسری کی مدد سے زہریلی سوئی پھینکی تھی۔ وہ بانسری ابھی یہیں کہیں ہوگی اور نہ بھی ہو تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

☆☆☆

سام اور بل، جولیا کے عالی شان ساحلی مکان کے باہر اپنی کار میں بیٹھے تھے۔ بل نے فخر سے کہا۔ ''دیکھا، میرا اندازہ درست ثابت ہوا نا... یہ سارا دولت کا چکر تھا۔'

''ہاں، ہنرک اگر زندہ رہتا تو چند ہفتے بعد وہ امانڈا میئر سے شادی کرنے والا تھا۔'' سام نے ایک معروف سپر ماڈل کا نام لیا۔ ''اس سے اس کا افیئر خاصے عرصے سے جاری تھا اور انہوں نے اسے کامیابی سے چھپایا بھی تھا لیکن یہ راز بھی طشت ازبام ہو گیا۔ اس سے شادی کرنے کی صورت میں یقیناً وہ اس کی دولت کے وراثوں میں شامل ہو جاتی۔''

''اور یہی بات ہنرک کی موت کی وجہ بن گئی۔'' بل نے کہا اور مکان کے گیٹ کی طرف دیکھا جہاں جولیا کو پولیس کار میں بٹھایا جا رہا تھا۔ مکان کی اوپری منزل سے ہنرک اور جولیا کی گیارہ سالہ بچی ناشا حسرت سے اپنی ماں کو دیکھ رہی تھی۔ سام نے یہ منظر دیکھ کر گہری سانس لی۔

''مجھے اس بچی کا افسوس ہے۔ باپ سے محروم ہوئی تھی، اب ماں سے بھی محروم ہو گئی۔ جولیا کو یقیناً لمبی سزا ہو گی۔ اس نے ایک موسیقار کو قتل کرایا اور دوسرے موسیقار کو مجرم بنادیا اور اس کا کیریئر بھی تباہ کر دیا۔''

''مائیکل اس میں برابر کا شریک ہے۔ اس نے دولت کے لالچ میں قاتل بننا گوارا کیا۔''

''دولت کے لالچ سے زیادہ بڑی وجہ اس کی ہنرک سے نفرت تھی۔ اس نے موسیقی کے کچھ ٹکڑے بنا کر ہنرک کو رائے کے لیے دیے اور اس نے چالاکی سے انہیں اپنی موسیقی میں شامل کرلیا۔ اسے جس میوزک پر آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا ہے، اس میں بھی کچھ پیس مائیکل کے بنائے ہوئے شامل تھے۔ اس لیے جب جولیا نے اسے ہنرک کے قتل پر آمادہ کرنا چاہا تو وہ اسی وجہ سے آسانی سے مان گیا۔ ایسی بانسری اس نے خود بنائی جو بلو پائپ کا کام بھی کرتی اور زہریلی سوئی اسے جولیا نے فراہم کی۔ اس نے مائیکل سے کہا کہ وہ ہنرک کو قتل کرنے کی صورت میں نہ صرف بڑی رقم دے گی بلکہ اسے ایک موسیقار کے طور پر پروموٹ بھی کرے گی۔''

بل نے سر ہلایا۔ ''وہ لالچ میں آگیا۔ اب وہ ساری عمر جیل میں رہے گا۔''

''جولیا کی طرح!'' بل نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

مکان کی اوپری منزل سے جھانکتی ناشا ماں اور باپ دونوں سے محروم ہو گئی تھی۔

ایک ہی لڑکی کی چاہت میں مبتلا ہو جانے والے دو دوستوں کی کیفیات

زندگی کی گاڑی عمل کے پہیے سے چلتی ہے... کچھ کند ذہن رکھنے والوں کا خیال ہوتا ہے کہ ان کا خاندانی جاہ و جلال اور حسب نسب ان کی شخصیت کو معتبر بنانے کے لئے کافی ہے... ایک ایسے ہی بے عمل شخص کی کتھا...

نسب نما

منظر امام

لڑکی ایک تھی اور اُمیدوار دو۔ لڑکی کا نام صبا تھا اور اس کے دو امیدواروں میں ایک مختار تو دوسرا فیروز تھا۔

ان دونوں دوستوں نے صبا کو ایک ساتھ ہی پسند کیا تھا۔ دونوں اپنے کسی مشترکہ دوست کی شادی میں شریک تھے جب وہ لڑکی اچانک ان کے سامنے آگئی۔

اس وقت کھانا لگ چکا تھا۔ لڑکی کے ایک ہاتھ میں پلیٹ تھی اور وہ کولڈ ڈرنک کی تلاش میں گردن گھما رہی تھی۔ جس کے کریٹ اس سے کچھ فاصلے پر تھے جبکہ یہ دونوں اس کے قریب کھڑے تھے۔

''پلیز......'' اس نے ایک وقت میں شاید دونوں کو مخاطب کیا تھا۔ ''میرے لیے کولڈ ڈرنک لے آئیں گے؟''

لڑکی وہیں کھڑی رہی اور دونوں ہی اس کے لیے کولڈ ڈرنک

لینے دوڑ گئے۔

"یہ لیں۔" فیروز نے بوتل اس کی طرف بڑھائی۔

"اوہ بوتل تو یہ لے آئے ہیں۔" لڑکی نے مختار کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔ میں بھی تو لایا ہوں۔" فیروز نے کہا۔

"اب دیکھیں۔۔۔ میں دو کولڈ ڈرنک تو نہیں پی سکتی نا۔"

"فیروز تم ایسا کرو یہ بوتل مجھے دے دو۔" مختار نے کہا۔

"نہیں یہ میں ان کے لیے لایا ہوں۔ تمہیں کیوں دے دوں؟"

"لیکن میرے پاس تو ڈرنک ہے نا۔" لڑکی کچھ جھلانے لگی تھی۔

فیروز نے اس وقت بات بڑھانا مناسب نہیں سمجھا۔ لڑکی ایک طرف چلی گئی۔ مختار کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ فیروز اس سے کچھ ناراض ہو گیا ہے۔ اس نے فیروز کے پاس جا کر کہا۔ "کیا ہوا یار تم کیوں اتنے جذباتی ہو رہے ہو؟"

"جب تمہیں یہ پتا تھا کہ میں اس کے لیے کولڈ ڈرنک لینے گیا ہوں تو پھر تمہیں ہمدردی کی کیا ضرورت تھی۔" فیروز غصے سے بولا۔

"ارے یار کیا ہو گیا تمہیں۔" مختار حیران رہ گیا۔ "یہ کون سا ایسا ایشو ہے جس پر ناراض ہوا جائے؟"

"ایشو یہ ہے میرے دوست کہ وہ لڑکی مجھے اچھی لگی ہے۔" فیروز مسکراتے ہوئے بولا۔

"اوہ!" مختار نے گہری سانس لی۔ "اگر یہی بات میں کہوں تو۔۔۔؟"

"ہونہہ۔" فیروز نے ہونٹ سکیڑے۔ "دیکھا جائے گا۔"

صبا سے ملاقات پہلے ہی دن وہ لڑکی دونوں دوستوں کے درمیان اختلاف کا سبب بن گئی تھی حالانکہ دونوں اس کے نام سے بھی ناواقف تھے۔ یہ بھی نہیں جانتے تھے کہ وہ کون ہے اور کہاں رہتی ہے اور اس کے والدین کون ہیں۔

کچھ دنوں بعد فیروز اپنے دوست اختر کے پاس پہنچ گیا۔ وہ دوست جس کی شادی میں انہوں نے اس لڑکی کو دیکھا تھا۔

"یار میں نہیں جانتا کہ وہ لڑکی تمہاری رشتے دار ہے یا جان پہچان والی ہے؟" فیروز نے کہا۔ "لیکن بات صرف اتنی ہے کہ وہ مجھے اچھی لگی ہے۔"

"کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟"

"جس نے سفید چوڑی دار پاجامہ اور سفید کرتہ پہن رکھا تھا۔" فیروز نے بتایا۔

"اوہ۔" اختر ہنس دیا۔ "آخر چکر کیا ہے مختار بھی اسی کے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"

"کیا مطلب؟ کیا وہ معلوم کر گیا ہے۔"

"ہاں بھائی وہ اس کا نام اور پتا بھی پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتا دیا ہے۔ چھپانے کی ضرورت بھی کیا ہے۔"

"کیا نام ہے اس کا؟"

"صبا۔" اختر نے بتایا۔ "باپ کا نام قیصر ہے۔ کسی انگلش فرم میں اچھے عہدے پر ہیں اور اپنے مزاج کے اعتبار سے آدھے انگریز ہو چکے ہیں۔ انہیں اس بات کی پروا بھی نہیں ہے کہ صبا کتنے لڑکوں سے دوستی کرتی ہے، یہ اور بات ہے کہ صبا بہت سوبر کی لڑکی ہے۔ میں نے آج تک اس کے حوالے سے کوئی الٹی سیدھی بات نہیں سنی۔"

"چلو اب تم مجھے اس کا پتا بھی بتا دو۔" فیروز نے کہا۔

"دیکھو مجھے اندازہ ہو رہا ہے کہ اس لڑکی کی وجہ سے تمہارے اور مختار کے درمیان اختلافات پیدا ہو رہے ہیں اس لیے بہتر ہے کہ تم دونوں ہی اس کا خیال ترک کر دو۔"

"مختار سے کہو کہ وہ پیچھے ہٹ جائے۔" فیروز نے کہا۔ "اب تم خود سوچو۔۔۔ کیا مختار اس لڑکی کے قابل ہے۔۔۔ اس کا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے کچھ بھی تو نہیں۔"

"لیکن وہ تو اچھا ہے نا۔" اختر، فیروز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "وہ اپنا مستقبل بنانے کے لیے جدوجہد کر رہا ہے۔ خود بھی ذہین ہے۔"

"بے وقوف ہو تم۔" فیروز ہنس دیا۔ "اس معاشرے میں اصل اہمیت اسٹیٹس کی ہوتی ہے۔ اگر اسٹیٹس ہے تو سب کچھ ہے ورنہ کچھ بھی نہیں ہے۔"

"اچھا چلو۔ کم از کم اتنا تو وعدہ کر لو کہ تم مختار سے جھگڑا نہیں کرو گے۔"

"جھگڑا۔" فیروز ہنس دیا۔ "میری جان جھگڑا تو برابر والوں کے درمیان ہوتا ہے۔ تم بتاؤ تم پتا دے رہے ہو یا نہیں؟" اختر نے گہری سانس لے کر فیروز کو بھی پتا بتا دیا۔

فیروز نے براہِ راست صبا کے والد سے ملاقات کر لی تھی۔ وہ واقعی ایک اصول پرست انسان تھا۔ فیروز نے ان

سے اپنا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ "جناب عالی میرا تعلق ایک مستند گھرانے سے ہے۔ آپ نے شاید میرے ڈیڈ کا نام سنا ہو گا حمید الزماں صاحب۔"

"اوہ۔۔۔ تو تم حمید الزماں کے بیٹے ہو۔" قیصر نے خوشی کا اظہار کیا۔

"جی جناب، پھر تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ ہمارا فیملی بیک گراؤنڈ کیا ہے؟"

"بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔" قیصر نے کہا۔ "خیر تم یہ بتاؤ تم مجھ سے کیا چاہتے ہو۔۔۔ کیوں آئے ہو میرے پاس؟"

"جناب میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں اسی لیے اپنا کیس لے کر خود ہی آ گیا ہوں اور اگر بات آ گی بڑھی تو ڈیڈ بھی آ جائیں گے۔"

"جس طرح تم صاف بات کرنے کے عادی ہو اسی طرح میں بھی ہوں۔" قیصر نے کہا۔ "کھل کر کہو، کیا کہنا چاہتے ہو۔۔۔؟"

"انکل میں، میں آپ کی صاحبزادی سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔" فیروز نے اپنی بات کہہ دی تھی۔

"کیا تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟"

"اتنا نہیں جانتے۔" بس ایک بار ملاقات ہوئی۔" فیروز نے بتایا۔

"اور ایک بار کی ملاقات میں تم نے اتنا بڑا فیصلہ کر لیا اور یہ بھی کیا ضروری ہے کہ جو فیصلہ تمہارا ہے وہی صبا کا بھی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اس رشتے سے انکار کر دے تو پھر۔"

"انکل میرا خیال ہے کہ اگر آپ کی صاحبزادی کے پاس عقل ہو گی تو وہ انکار نہیں کریں گی۔" فیروز نے کسی قدر اکڑتے ہوئے کہا۔ "کیونکہ میرا بیک گراؤنڈ ہی ایسا ہے۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا کہ وہ کس حد تک تمہارا ساتھ دے گی لیکن اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ میں نے اس قسم کے سارے فیصلے اسی پر چھوڑ دیے ہیں۔ میری طرف سے کوئی جبر، کوئی دباؤ نہیں ہے۔"

"تو آپ بتائیں میں کیا کروں؟"

"تم چاہو تو اس سے ملاقات کر سکتے ہو۔ میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔" قیصر نے کہا۔ "بلکہ ایسا کرو تم دس منٹ رک جاؤ وہ ابھی آ رہی ہو گی۔ میں اپنی اسٹڈی میں جا رہا ہوں۔ تم جب تک چائے پیو۔" قیصر کے جانے کے بعد ملازم نے چائے لا کر رکھ دی۔

ابھی اس نے چائے ختم ہی کی تھی کہ صبا کے ہنسنے کی آوازیں آئیں، وہ مختار کے ساتھ کمرے میں داخل ہو رہی تھی۔

صبا اور مختار کو ایک ساتھ دیکھ کر فیروز کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ مختار، فیروز کو دیکھ کر جلدی سے اس کے پاس آ گیا تھا۔ "یار، تم یہاں۔۔۔؟"

"کیوں جب تم یہاں آ سکتے ہو تو میں کیوں نہیں آ سکتا۔" فیروز نے اس کے بڑھے ہوئے ہاتھ کو نظر انداز کر دیا۔

"میں آپ کو پہچان گئی۔" صبا نے کہا۔ "آپ سے بھی شاید اسی دن ملاقات ہوئی تھی۔"

"جی میں وہی ہوں۔۔۔ فیروز نام ہے میرا۔" فیروز نے بتایا۔ "ابھی کچھ دیر پہلے آپ کے ڈیڈ سے بھی ملاقات ہو چکی ہے۔"

"اچھا بھئی مجھے اجازت دو۔" مختار نے صبا کی طرف دیکھا۔

"اجازت کیسی جناب۔۔۔ ابھی تو مجھے آپ کے ساتھ باہر جانا ہے۔" صبا نے کہا پھر فیروز سے مخاطب ہوئی۔ "اچھا فیروز صاحب آپ ڈیڈی سے گپ شپ لگائیں میں ذرا باہر جا رہی ہوں۔" فیروز کے لیے یہ بڑی توہین کی بات تھی۔

صبا نے اسے مختار کے سامنے نظر انداز کر دیا تھا۔ یہ اس کے لیے بالکل نیا اور تکلیف دہ تجربہ تھا۔ اس نے ہمیشہ اپنی بات منوائی تھی اور وہ سب کچھ حاصل کیا تھا جو اس کی خواہش تھی لیکن مختار جیسے شخص کے سامنے اس کی حیثیت صفر ہو کر رہ گئی تھی۔

اس نے اپنے باپ حمید الزماں سے بات کی۔ "ڈیڈ آپ کو میرا ایک کام کرنا ہے۔"

"کہو، کیا کام ہے؟"

"ڈیڈ، میں نے ایک لڑکی شادی کے لیے پسند کر لی ہے۔" اس نے بتایا۔ "پلیز۔۔۔ آپ جا کر بات چلائیں۔ لڑکی کے والد آپ کو بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔"

"کیا نام ہے اس کے باپ کا؟"

"قیصر۔۔۔ مارٹن روڈ پر رہتے ہیں یہ لوگ۔"

"سمجھ گیا۔" حمید الزماں نے گردن ہلائی۔ "کسی زمانے میں وہ شخص میرا ماتحت ہوتا تھا۔"

"بس ڈیڈ پھر تو کام بن گیا۔" فیروز اچھل پڑا۔ "وہ

آپ کو انکار نہیں کر سکیں گے۔ آپ چلے جائیں ان کے پاس۔"

"زندگی بھر وہ آدمی میرے پاس آتا رہا ہے اور اب تم مجھے اس کے پاس بھیج رہے ہو؟"

"یہ رشتے کا معاملہ ہے ڈیڈ اسی لیے کہہ رہا ہوں۔"

"ٹھیک ہے میں چلا جاؤں گا لیکن تم اس کو پہلے اطلاع کر دینا۔"

"ظاہر ہے میں ابھی کہہ دیتا ہوں ان سے۔ میں ان کا نمبر بھی لے آیا ہوں۔" فیروز نے اسی وقت اپنے موبائل سے قیصر کے گھر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے قیصر ہی نے فون اٹھایا۔

"ہیلو انکل، میں فیروز بول رہا ہوں۔ حمید الزماں کا بیٹا۔"

"ہاں بیٹا پہچان گیا، کہو کیا بات ہے؟"

"انکل، ڈیڈ آپ کے گھر آنا چاہتے ہیں۔"

"میرے گھر....." دوسری طرف خاموشی چھا گئی پھر قیصر کی آواز آئی۔ "ان سے کہو کہ انہیں تکلیف کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں خود حاضر ہو جاؤں گا۔"

"نہیں انکل ان کی خوشی اسی میں ہے کہ وہ خود آئیں۔"

"ٹھیک ہے تو کل شام کی چائے پر ان کا انتظار رہے گا۔" فیروز نے سلسلہ ختم کر کے اپنے باپ کی طرف دیکھا۔

"ڈیڈ وہ بے چارے تو آپ سے بہت متاثر معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیوں نہ ہوں۔" حمید الزماں نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا۔ "وہ شخص ہمارے پورے خاندان سے واقف ہے۔ یہ اس کے لیے اعزاز کی بات ہوگی کہ میں اس کے گھر جا رہا ہوں اور رشتے کا سن کر تو اس کے ہوش اڑ جائیں گے۔"

"میں جانتا ہوں ڈیڈ۔ وہ بے چارہ میرا کیا مقابلہ کرے گا۔"

"کس بے چارے کی بات کر رہے ہو؟"

"ڈیڈ وہ جو میرا دوست ہے نا مختار، وہ بھی اس لڑکی کا امیدوار ہے۔"

"کون..... تمہارا دوست، اس بنیے کی اولاد؟" حمید الزماں نے پوچھا۔

"جی ڈیڈ، میں اسی کی بات کر رہا ہوں۔"

"تم اس کی فکر مت کرو۔ ایسے لوگوں کے پاس چار پیسے کیا آ جاتے ہیں ان کے دماغ آسمان پر پہنچ جاتے ہیں۔" حمید نے کہا۔ "تم دیکھ لینا، میں جس وقت قیصر کے پاس پہنچوں جاؤں گا اسی وقت اس کا پتا صاف ہو جائے گا۔" لیکن یہ بات اتنی آسان ثابت نہیں ہوئی۔

قیصر نے اگرچہ حمید الزماں کا بہت احترام کیا تھا اور بہت عزت سے گھر میں بلایا تھا لیکن رشتے کی بات پر اس نے کہا۔ "حمید صاحب، میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ آپ کون ہیں اور آپ کا خاندانی پس منظر کیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی میں مختار کے والدین سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ آپ میں اور ان لوگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"ہے نا۔" حمید الزماں مسکرا دیا۔

"جی جناب، اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مختار اور فیروز کے درمیان بھی زمین آسمان کا فرق ہے۔"

"وہ کیا.....؟"

"سامنے کی بات ہے۔" قیصر نے کہا۔ "مختار کا تعلق ایک اوسط بلکہ غریب خاندان سے ہے اسی لیے اس لڑکے میں آگے بڑھنے کا جوش اور ولولہ ہے۔ وہ اپنی ذہانت سے تعلیم کے سارے مراحل طے کرتا جا رہا ہے جب کہ فیروز کو اپنے حسب نسب پر فخر کرنے کے سوا اور کچھ نہیں آتا۔ اس کی تعلیمی رپورٹ بھی بہت کمزور ہے۔ اس نے اپنی موجودہ حیثیت کو اپنی منزل سمجھ لیا ہے اور یہیں سے اس میں وہ خرابیاں پیدا ہونا شروع ہو گئیں..... جو آج دکھائی دیتی ہیں۔ اسی لیے میں اس پنی سلسلے میں آپ سے معذرت چاہتا ہوں۔ میرے لیے مختار، فیروز سے لاکھ گنا بہتر ہے۔" حمید الزماں نے اپنی گردن جھکا لی۔ انہیں اندازہ تھا کہ قیصر جو کچھ کہہ رہا ہے ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے غم زدہ نگاہوں سے فیروز کی طرف دیکھا۔ وہ بھی قیصر کی بات سن کر خاموش ہو گیا تھا۔

"حمید الزماں صاحب معاف کیجیے گا میری باتوں سے آپ کو تکلیف پہنچی۔" قیصر نے کہا۔ "میں آپ کو ایک مستند ایک قول سنانا چاہتا ہوں۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ خرابی کہاں ہے۔"

"ہاں سناؤ۔" حمید الزماں نے دھیرے سے کہا۔

"وہ قول یہ ہے کہ جس کی رفتار کو اس کی بے عملی نے سست کر دیا ہو۔ نسب اس کی رفتار تیز نہیں کر سکتا۔"

برائے فروخت

آصف ملک

خرید فروخت کے سودے بڑی چابک دستی اور باریک بینی سے تکمیل پاتے ہیں... اور اس فن میں بہت کم لوگ کمالِ ہنر رکھتے ہیں... ایک ایسے ہی لڑکے کے عزائم جو نئے سرے سے اپنی کاروباری زندگی کا آغاز چاہتا تھا...

ایک سودے کی آڑ میں رونما ہونے والے خونی کھیل کا دلچسپ انجام

میں نے گرینج آرٹ اور ڈیزائننگ انسٹی ٹیوٹ سے لکڑی کا فرنیچر ڈیزائن کرنے کا ڈپلوما حاصل کیا اور اس کے بعد تین سال تک میک فرنیچر آرٹ میں کام کرتا رہا۔ یہاں میں نے کئی شاہ کار نفن پارے بنائے۔ یہ خصوصی طور پر آرڈر دے کر بنوایا گیا فرنیچر تھا اور اپنی مالکان نے یقیناً اس کی بہت بھاری قیمت وصول کی ہو گی لیکن مجھے سوائے تنخواہ اور داد کے کچھ نہیں ملا۔ انکل میئر فریڈ کا کہنا تھا کہ مجھے اپنا کام کرنا چاہیے۔

"جون! تمہیں اپنا کام جمانے میں کچھ وقت تو لگے گا لیکن اس طرح تمہیں اپنی محنت کا درست معاوضہ مل سکے گا۔"

انکل میئر ٹھیک کہہ رہے تھے لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اپنا کام شروع کرنے کے لیے سرمائے کی ضرورت تھی اور وہ میرے پاس نہیں تھا۔ میں صرف بارہ سال کا تھا جب انکل میئر کی تحویل میں آ گیا۔ میرے ماما اور پاپا ایک ائر کریش میں جاں بحق ہو گئے تھے۔ انکل میئر میرے ابو کے انکل کے بیٹے تھے، اس طرح ان کا رشتہ سیکنڈ کزن والا بنتا تھا۔ ماما کی طرف سے کئی فرسٹ کزن موجود تھے لیکن کسی نے میرا سرپرست بننا قبول نہیں کیا۔ انکل میئر نے عدالت میں درخواست دی اور میرے سرپرست بن گئے۔ وہ اکیلے رہتے تھے اور بعد میں بھی انہوں نے شادی کی کوشش نہیں کی۔ انہوں نے شادی کیوں نہیں کی، اس بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم تھا لیکن ایک بار ان کے رشتے کا ایک بھائی ملنے آیا تو اس نے چپکے سے مجھے بتایا کہ جوانی میں انکل میئر کسی سے محبت کر بیٹھے تھے۔ لڑکی نے ان سے بے وفائی کی، بس اسی کا روگ دل سے لگائے بیٹھے تھے اور اس کے بعد انہوں نے شادی نہیں کی۔ وہ میڈیسن پولیس میں آفیسر تھے۔ آخری دس سال انہوں نے جاسوس کے طور پر کام کیا۔

انکل میئر لمبے چوڑے لیکن بہت نرم طبیعت کے آدمی تھے۔ دفتر کا تو مجھے نہیں معلوم لیکن گھر میں وہ بہت خوش مزاج اور پیار سے پیش آنے والے انسان تھے۔ مجھے نہیں یاد کہ انہوں نے کبھی مجھ سے سخت لہجے میں بات کی ہو۔ جب میں ان کے پاس آیا تو وہ پچاس برس کے تھے اور جس سال میں نے ڈپلوما مکمل کیا، اس سال وہ ریٹائر ہو گئے تھے۔ اگرچہ انہوں نے ملازمت کا سارا وقت امریکا کی ریاست میڈیسن میں گزارا تھا لیکن ان کا آبائی تعلق ایک چھوٹے سے گاؤں میری ٹاؤن سے تھا۔ یہ ماہی گیروں کی ایک چھوٹی سی بندرگاہ ہے جو جھیل میں مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ ریٹائرمنٹ کے بعد انکل میری ٹاؤن منتقل ہو گئے۔ میں ان دنوں ایک نزدیکی شہر میں ڈپلوما کر رہا تھا۔ ڈپلوما مکمل کرنے کے بعد مجھے میڈیسن میں ہی ملازمت مل گئی اور میں نے وہیں رہائش اختیار کر لی۔ میری ٹاؤن یہاں سے کوئی ڈیڑھ سو کلومیٹر کی مسافت پر تھا۔ میں مہینے میں ایک دو بار میری ٹاؤن کا چکر لگا لیتا اور یوں انکل سے ملاقات ہو جاتی۔ انکل میڈیسن نہیں آتے تھے حالانکہ انہوں نے یہاں اپنی عمر کے پینتیس برس گزارے تھے اور یہاں ان کے بے شمار دوست اور جاننے والے تھے۔ وہ ان سب سے خط اور فون کے ذریعے رابطہ رکھتے تھے مگر خود نہیں آتے تھے۔

تین سال بعد میں نے میک فرنیچر چھوڑ دیا۔ مجھے ایک اور فرنیچر بنانے والی فرم میں جاب کی پیش کش تھی لیکن فی الحال میں نے اسے قبول نہیں کیا۔ انکل میئر کو معلوم ہوا کہ میں نے جاب چھوڑ دی ہے تو انہوں نے مجھے کال کی۔ "جون! میرے پاس آ جاؤ۔"

"انکل! میں دوسری جاب کے لیے سوچ رہا ہوں۔"

انکل میئر نے ایک گونج دار قہقہہ لگایا۔ "میرے بیٹے! میری ٹاؤن میں سوچنے پر کوئی پابندی نہیں ہے۔"

یوں میں میری ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گیا۔ ڈیڑھ سو کلومیٹرز کا یہ سفر عام حالات میں دو سے ڈھائی گھنٹے میں طے ہو جاتا ہے لیکن اس روز بہت شدید بارش ہو رہی تھی۔ اس وجہ سے ہائی وے پر رفتار سست تھی اور جب پہاڑی علاقہ شروع ہوا تو میں رفتار مزید کم کرنے پر مجبور ہو گیا۔ یہاں پہاڑ زیادہ اونچے نہیں ہیں لیکن حادثے کے لیے دو ڈھائی فٹ کی کھائی کافی ہوتی ہے۔ دو گھنٹے میں، میں نے بہ مشکل ساٹھ کلومیٹرز کا فاصلہ طے کیا تھا۔ اس سے پہلے میں نے شہر سے باہر اس قسم کے موسم میں سفر نہیں کیا تھا اس لیے مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ایسے موسم میں ہائی وے پر سفر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔ تین گھنٹے بعد مجھے ہائی وے کے ساتھ ایک سروس اسٹیشن اور کیفے دکھائی دیا۔ میں نے فوراً گاڑی اس طرف موڑ دی۔ اگرچہ اگست کا مہینا تھا لیکن مسلسل بارش سے موسم سرد ہو چلا تھا۔ میں کیفے میں آیا جہاں مجھ جیسے چند افراد موجود تھے جو بارش سے تنگ آ کر یہاں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ کافی منگوانے کے بعد میں نے وقت گزاری کے لیے اخبار اٹھا لیا اور اس میں اشتہارات والا صفحہ دیکھنے لگا۔ ایک اشتہار نے میری توجہ مبذول کرا لی۔

یہ ایک کارپینٹر ورکشاپ کی فروخت کا اشتہار تھا۔ ورکشاپ جھیل مشی گن کے ساتھ تھی اور جو پتا دیا ہوا تھا، میرے حساب سے وہ میری ٹاؤن سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ورکشاپ میں تمام مشینیں اور اوزار بہترین حالت میں تھے اور مالک اس کے صرف پچیس ہزار ڈالرز مانگ رہا تھا۔ ورکشاپ کے ساتھ ایک کمرے کا چھوٹا سا مکان بھی اس قیمت میں شامل تھا۔ فون نمبر نہیں دیا تھا، صرف پتا تھا۔ ایک جملہ ہائی لائٹ کیا گیا تھا..... قیمت نقد لی جائے گی۔

دو گھنٹے بعد بارش ہلکی ہونے لگی اور مغرب کی طرف سے بادل چھٹنے لگے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور روانہ ہو گیا۔ ایک گھنٹے بعد میں انکل میئر کے چھوٹے سے لیکن خوب صورت اور سجے سجائے گھر میں موجود تھا۔ یہاں سردی کی شدت زیادہ تھی اور انکل نے آتش دان جلا لیا تھا۔ آتش دان کے سامنے انہوں نے میز پر برانڈی کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔ اس میں سے آدھی بوتل ہم دونوں پی چکے تھے۔ انکل معمول سے زیادہ موڈ میں تھے۔ انہوں نے بتایا کہ انہوں نے وقت گزاری اور کچھ اضافی کمائی کے لیے ایک مقامی دوست کے ساتھ شراکت کر لی ہے۔ وہ اپنے ٹرالر کے ذریعے تعمیراتی اور فرنیچر سازی میں کام آنے والی لکڑی کینیڈا سے امریکا لاتا ہے۔ اس کام میں اچھا نفع ہے کیونکہ کینیڈا سے لکڑی سستی مل جاتی ہے اور امریکا میں اس کی مانگ زیادہ ہے اس لیے یہاں قیمت اچھی ملتی ہے۔

"یوں سمجھ لو کہ اسے ایک ٹرپ میں کوئی بیس ہزار ڈالرز بچ جاتے ہیں اور... وہ سال میں ایسے سات آٹھ ٹرپ لگاتا ہے۔"

"یہ تو اچھا بزنس ہے۔" میں نے دلچسپی سے کہا۔ "آپ نے کتنے فیصد کی شراکت لی ہے؟"

"میں نے ایک تہائی بزنس لیا ہے۔ اس لحاظ سے نفع کا تناسب بھی ایک تہائی ہے۔ جب سے میں شامل ہوا ہوں، دو ٹرپ ہو چکے ہیں اور مجھے کوئی گیارہ ہزار ڈالرز کا نفع ہوا ہے۔ یہ بُرا نہیں ہے۔"

انکل کی بات پر مجھے خیال آیا اور میں نے انکل کو فروخت ہونے والی ورکشاپ کے بارے میں بتایا۔ انہوں نے کہا۔ "میں تو تمہیں کب سے کہہ رہا ہوں کہ اپنا کام شروع کرنے کے بارے میں سوچو۔ ملازمت میں تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔"

"انکل! اس مشورے کو قبول کرنے میں دو رکاوٹیں تھیں۔ ایک تو مجھے بزنس کا علم نہیں تھا، دوسرے میرے پاس رقم نہیں تھی۔ اب مجھے پتا ہے کہ بزنس کس طرح کیا جاتا ہے اور اب میرے پاس کچھ رقم بھی ہے۔ پھر مجھے بینک سے قرض بھی مل سکتا ہے۔"

"رقم کا تو مسئلہ نہیں تھا، میں بھی تمہیں سرمایہ فراہم کر سکتا ہوں لیکن یہ اچھی بات ہے کہ تمہیں بزنس کرنا آ گیا ہے۔ اگر تم یہ ورکشاپ لے لو تو اپنا کام شروع کر سکتے ہو۔ یہاں تمہیں لکڑی شہر کے مقابلے میں آدھی قیمت میں مل جائے گی بلکہ میں تمہیں اس سے بھی سستی اور بہترین لکڑی مہیا کر دوں گا۔ جہاں تک فروخت کا تعلق ہے، میرا مشورہ ہے کہ تم براہِ راست انٹرنیٹ کے ذریعے کاروبار کرو۔ آج کل اس کا رجحان بہت زیادہ ہے۔"

"ٹھیک ہے، [illegible] بارش رکتی ہے تو میں جا کر ورکشاپ دیکھ لیتا ہوں۔"

"پتا کہاں کا ہے؟"

میں نے پتا نوٹ کر لیا تھا، [illegible] اپنی داڑھی کھجائی اور بولے۔ "[illegible] ٹاؤن کے شمال میں کہیں ہے۔ بارش رکنے کا انتظار کیوں کر رہے ہو، ابھی چلتے ہیں۔ میرے پاس ہر موسم میں چلنے والی فور وھیل ڈرائیو ہے۔"

"نہیں، اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے۔ اگر ہم اس طرح ایمرجنسی میں گئے تو وہ سمجھ جائے گا کہ ہم زیادہ دلچسپی لے رہے ہیں پھر وہ قیمت میں کمی نہیں کرے گا۔"

انکل میئر ہنسے۔ "برخوردار..... لگتا ہے تمہیں واقعی بزنس کرنا آ گیا ہے۔"

اس کے بعد انکل نے موضوع بدل دیا۔ "تم نے شادی کے بارے میں سوچا؟ جہاں تک مجھے علم ہے فریڈ خاندان میں کسی بھی نوجوان کے ہاں کوئی بچہ نہیں ہے۔ فریڈ خاندان کو اگلی نسل کی ضرورت ہے۔"

میں مسکرایا۔ "انکل! آپ نے بھی تو فریڈ خاندان کو اگلی نسل نہیں دی؟"

انہوں نے تسلیم کیا۔ "ہاں، اس معاملے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی۔ اصل میں مجھ میں حوصلہ نہیں تھا کہ کسی عورت کو ہر وقت سولی پر لٹکا کر رکھوں۔ پولیس والے کی بیوی ہونا ہر عورت کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیے میں نے شادی نہیں کی۔"

"لیکن میں آپ کے جتنے دوستوں اور ساتھیوں کو جانتا ہوں، وہ سب شادی شدہ ہیں۔"

"ہاں لیکن ان کی بیویاں کتنی خوف زدہ رہتی تھیں، یہ بھی میں جانتا ہوں۔ ان میں سے کئی نفسیاتی مریض ہو گئی تھیں اور کئی نے تو اپنے شوہروں سے طلاق لے لی تھی۔"

انکل میئر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "خیر چھوڑو، یہاں میری ٹاؤن میں بہت سی خوب صورت لڑکیاں ہیں۔ تم ان سے ملو، ممکن ہے کسی سے تمہارا معاملہ سیٹ ہو جائے۔"

"فی الحال تو میں اپنا بزنس سیٹ کرنا چاہوں گا۔ اگر یہ ورکشاپ مل جاتی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ میرے پاس ایک بہتر جاب کی آفر موجود ہے۔"

"ورکشاپ مل جائے گی۔" انکل میئر نے یقین سے کہا۔ "اور نہ بھی ملے تو کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پچیس ہزار میں تم خود بہترین ورکشاپ بنا سکتے ہو۔"

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پچیس ہزار میں صرف مشینیں اور اوزار آئیں گے۔ مجھے جگہ بھی لینی پڑے گی اور اسے بنانا بھی پڑے گا۔ یوں سمجھ لیں کہ رقم ڈبل ہو جائے گی جبکہ یہاں بنی بنائی ورکشاپ ہے اور اس کے ساتھ رہائشی کمرا بھی ہے۔''

''چلو پہلے دیکھ لیتے ہیں۔'' انکل میئر نے کہا۔ ''ورنہ جگہ یہاں ہے اور رہائش کے لیے میرا مکان موجود ہے۔''

انکل کا مکان جھیل کے ساتھ ہی تھا اور ایک تختہ جھیل کے پانیوں کے اندر تک گیا ہوا تھا جس پر کوئی کشتی لنگر انداز ہو سکتی تھی اور اسے فشنگ یا ڈائیونگ کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا تھا۔ اگلے روز بھی موسم سرد تھا اور جھیل کا پانی تو شدید گرمی میں بھی سرد رہتا ہے لیکن اس میں تیراکی کا اپنا مزہ ہے۔ میں جب یہاں آتا تھا تو تیراکی ضرور کرتا تھا۔ ابھی انکل سو رہے تھے۔ میں نیکر پہن کر باہر آیا اور تختے سے جھیل میں چھلانگ لگا دی۔ پانی سرد تھا اور جسم پر ایک لمحے کو کرنٹ کی طرح لگا تھا لیکن جب کچھ دیر گزری تو مزہ آنے لگا۔ میں جھیل میں آگے کی طرف جانے لگا۔ اس پورے ساحل پر چھوٹے چھوٹے مکانات بنے ہوئے تھے جن کے ساتھ ڈاک بھی تھے اور تختے بھی۔ کئی مکانات کے سامنے کشتیاں کھڑی ہوئی تھیں۔ کوئی سو گز آگے نکل کر میں واپس آ رہا تھا کہ انکل میئر کے برابر والے مکان سے ایک نوجوان لڑکی نکلی۔ اس نے تیراکی کا لباس پہن رکھا تھا جس میں اس کا سڈول جسم نمایاں تھا۔ اس نے ذرا دوڑ کر چھلانگ لگائی اور پانی میں گری۔ ایک طویل غوطہ لگا کر وہ پانی سے برآمد ہوئی تو مجھ سے زیادہ دور نہیں تھی۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرائی۔

''ہیلو۔''

''ہیلو۔'' میں نے جواب دیا۔

میں انکل میئر کے گھر کی طرف جا رہا تھا، وہ سمجھ گئی۔ ''تم شاید انکل میئر کے بھتیجے ہو؟''

''درست..... میرا نام جون فریڈ ہے۔'' میں نے کہا۔

''شون کارلینڈ۔'' اس نے پانی میں میری طرف ہاتھ بڑھایا جو میں نے گرم جوشی سے تھام لیا۔

''تم سے مل کر خوشی ہوئی۔ تم یہاں رہتی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''میں اسٹیٹ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہوں، ان دنوں چھٹیاں گزارنے ماما کے پاس آئی ہوں۔''

''میں فرنیچر ڈیزائنر ہوں اور ان دنوں فارغ ہوں اس لیے انکل کے پاس چلا آیا۔''

''انکل میئر نے تمہارے بارے میں بتایا ہے۔''

کچھ دیر میں ہم پرانے دوستوں کی طرح بے تکلف ہو گئے۔ میں نے اسے بتایا کہ میں یہاں ایک ورکشاپ دیکھنے جاؤں گا جو میری ٹاؤن کے پاس ہے۔ جگہ پوچھنے پر میں نے بتا بتایا تو وہ چونک گئی۔ ''میرا خیال ہے کہ میں نے یہ جگہ دیکھی ہے۔ یہ جھیل کے ایک پکنک پوائنٹ کی طرف جانے والے راستے پر واقع ہے۔''

''یہ تو اچھی بات ہے کیونکہ انکل میئر کو بھی اس جگہ کے بارے میں درست پتا نہیں ہے۔ اگر تم ہماری راہنمائی کر سکو تو .....''

''میں چلوں گی۔'' اس نے کہا اور اسی لمحے بارش کا آغاز ہو گیا۔ بارش کا پانی اتنا یخ تھا کہ جھیل کا پانی اس کے مقابلے میں گرم محسوس ہونے لگا تھا۔ شون نے مجھے خدا حافظ کہہ کر اپنے مکان کا رخ کیا تو مجبوراً میں بھی واپس ہو لیا۔ جب اندر پہنچا تو انکل میئر ناشتا تیار کر رہے تھے۔ انہوں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ ''کیسی لگی یہ لڑکی؟''

میں جھینپ گیا۔ ''آپ دیکھ رہے تھے؟''

''ہاں تو اس میں کون سی خاص بات ہے؟ تم دونوں کی ملاقات اتفاقیہ ہو گی؟''

''شون اچھی لڑکی ہے اور اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ اس نے ورکشاپ دیکھی ہے۔''

''وہ یہاں گھومتی پھرتی رہتی ہے۔'' انکل میئر نے فرائنگ پین میں انڈا ڈالا اور بولے۔ ''جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ، ناشتا بس تیار ہے۔''

میں کپڑے پہن کر آیا اور ناشتا کیا۔ انکل شروع سے کھانا بنانے کے ماہر ہیں اور وہ ہر ڈش اتنی اچھی بناتے ہیں کہ چاہیں تو کسی ریستوران میں شیف بھی بن سکتے تھے۔ اس سارا دن بھی بارش ہوتی رہی لیکن شام کو بادل چھٹ گئے۔ رات کے کھانے کے بعد انکل میئر نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کل چلتے ہیں ورکشاپ دیکھنے۔''

میں بھی اب ورکشاپ دیکھ لینا چاہتا تھا۔ ''اگر پسند آ گئی تو میں بعنانہ دے کر بات پکی کر لوں گا۔''

''اتنی جلدی کی ضرورت نہیں ہے برخوردار۔'' وہ بولے۔ ''اس قسم کے معاملات میں آدمی کو سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا چاہیے۔''

''آپ شون سے بات کر لیجیے گا ساتھ چلنے کے لیے۔''

''میرا خیال ہے تم بات کر لو کیونکہ وہ تمہیں پہلے ہی رضامندی دے چکی ہے۔'' انکل کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ میں جھینپ گیا۔ اگلے دن بھرپور اور تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ میں تیراکی کے لیے جھیل کی طرف آیا تو شون بھی موجود تھی۔ اس ملاقات میں ہمارے درمیان بے تکلفی مزید بڑھ گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میری کوئی گرل فرینڈ نہیں ہے۔ تعلیمی زمانے میں ایک دو لڑکیوں سے دوستی رہی تھی لیکن یہ ایک حد سے آگے نہیں گئی تھی۔ شون نے صاف گوئی سے بتایا کہ چند مہینے پہلے تک اس کی ایک لڑکے سے دوستی تھی لیکن لڑکا منشیات استعمال کرنے لگا تھا اس لیے شون نے اس سے دوستی ختم کر دی۔ وہ سرخی مائل براؤن بالوں کی اور بہت نازک سے نقوش والی دل کش لڑکی تھی۔ مجھے تعجب ہوا کہ کسی اور نے اس کی طرف بڑھنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟ اس سے طے ہو گیا کہ دوپہر کے وقت ہم ورکشاپ دیکھنے جائیں گے۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ دو بجے تیار ملے گی۔

دو بجے ہم انکل کی سنگل کیبن فور وہیل ڈرائیو میں روانہ ہوئے۔ ڈرائیونگ انکل کر رہے تھے اور میں فرنٹ سیٹ پر تھا۔ درمیان میں شون بیٹھی تھی۔ اس نے جینز اور اس کے ساتھ بنیان نما شرٹ پہن رکھی تھی اور اس لباس میں بھی اچھی لگ رہی تھی۔ اتفاق سے میں نے دونوں بار اسے تیراکی کے لباس میں دیکھا تھا۔ پہلی بار اسے مکمل لباس میں دیکھ رہا تھا۔ انکل دورانِ سفر ہمیں قصے سناتے رہے اور لطیفوں سے ہنساتے رہے۔ ان کے ساتھ رہ کر آدمی بور نہیں ہو سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے بعد شون نے ایک ذیلی سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ''میرا خیال ہے کہ وہ ورکشاپ اس راستے پر آتی ہے۔ ایک بار میں اور میری یونیورسٹی فرینڈز یہاں پکنک منانے آئے تھے، تب میں نے ورکشاپ دیکھی تھی۔ مجھے یاد ہے، اس پر گولڈی کارپینٹر شاپ کا بورڈ لگا تھا۔''

اشتہار میں ورکشاپ کا نام یہی تھا اور اس کا مالک کوئی سین گولڈی تھا۔ انکل نے پک اَپ اس راستے پر موڑ دی۔ ''ابھی دیکھ لیتے ہیں۔''

راستہ کچا لیکن اچھی حالت میں تھا۔ چونکہ یہ آس پاس کے جنگل سے اونچا تھا اس لیے اس پر بارش کا پانی جمع نہیں ہوا تھا اور سوائے ٹائروں کے نشانات کے اس پر گھاس اگی ہوئی تھی۔ یعنی یہاں گاڑیوں کی آمد و رفت بہت زیادہ نہیں ہوتی تھی۔ ہم کوئی ایک کلومیٹر اندر گئے ہوں گے کہ بائیں جانب خاردار تاروں میں گھرا ایک احاطہ نظر آیا۔ احاطے کے داخلی دروازے پر گولڈی کارپینٹر شاپ کا بورڈ لگا تھا۔ شون کی بات درست ثابت ہوئی تھی۔ انکل نے پک اَپ احاطے کی طرف گھما دی۔ گیٹ کے دونوں پٹ کھلے تھے اور کوئی انتہائی بورڈ نہیں تھا اس لیے ہم بلا تکلف اندر چلے آئے۔ انکل نے احتیاطاً ہارن دے دیا اور ہم نیچے اتر آئے۔ احاطے میں ایک طرف شیڈ تلے لکڑی کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور یہ سب اعلیٰ درجے کی لکڑی تھی جس سے بہترین فرنیچر بنایا جا سکتا تھا۔ ورکشاپ کی عمارت لمبی اور مستطیل شکل کی تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کیبن تھا۔ ہارن کی آواز پر ایک نوجوان شخص ورکشاپ سے نمودار ہوا اور اس نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔ اس کی عمر پچیس چھبیس سال تھی، جسم چھریرا اور نقوش ستے ہوئے تھے۔ اس نے کام کا لباس پہن رکھا تھا۔ انکل میئر آگے آئے۔

''ہم اخبار میں تمہارے اشتہار کے جواب میں آئے ہیں۔ کیا تم ہی سین گولڈی ہو؟''

اس نے سر ہلایا۔ ''اشتہار میں غلطی سے سین گولڈی

حق تلفی

انگلستان میں ایک نئی نئی بیوہ نے بیمہ کمپنی میں جا کر اپنے شوہر کے بیمے کی رقم طلب کی۔ منیجر نے اخلاقاً کہا کہ ''سخت صدمہ مجھے آپ کے شوہر کی موت کا دلی صدمہ ہے۔'' ابھی وہ یہ کہنے ہی پایا تھا کہ وہ خاتون جھٹ بولیں۔

''ہاں، یہی تو تم مردوں کا قاعدہ ہے، جہاں عورتوں کو کوئی فائدہ ہونے لگا... انہیں اس کا صدمہ ہونے لگتا ہے۔''

راحیلہ امتیاز... منڈی بہاؤالدین

سلام

مجھے یہاں ایک شادی میں شرکت کا اتفاق ہوا۔ بڑی پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا گیا تھا تاہم میں نے دیکھا کہ کھانے سے قبل لوگ ایک ایک کر کے دولہا کے پاس جاتے تھے اور اسے کچھ روپے پیش کرتے تھے۔ دولہا کے ساتھ ایک شخص بیٹھا تھا جو یہ رقم گنتا اور ایک کاپی میں درج کرتا چلا جاتا۔ مجھے یہ رسم بہت اچھی لگی کہ ہر کوئی اپنے کھانے کا بل خود ادا کرتا ہے۔ ہمارے ہاں اسے ''ڈنچ سسٹم'' کہا جاتا ہے جبکہ یہاں کے لوگ اسے ''سلامی'' کہتے ہیں۔

انتخاب: شکیل کاظمی، اسلام آباد

چھپ گیا تھا، میرا اصل نام مارک گولڈی ہے۔''

''مارک اور سین۔'' انکل میئر نے پُرخیال انداز میں کہا۔ ''دونوں میں خاصا فرق ہے۔ پھر یہ غلطی کیسے ہوئی؟''

مارک گولڈی نے شانے اچکائے۔ ''میں کیا کہہ سکتا ہوں۔''

''یہ ایک ضمنی بات ہے۔'' میں نے مداخلت کی کیونکہ انکل میئر اس سے مزید بحث کے موڈ میں نظر آرہے تھے۔ ''اصل بات یہ ہے کہ ہم ورکشاپ دیکھنے آئے ہیں۔''

''تم لوگ شوق سے دیکھ سکتے ہو۔'' اس نے ورکشاپ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس میں کارپینٹر کے کام سے متعلق تقریباً ہر مشین اور اوزار موجود ہیں۔''

مارک گولڈی ہمیں ورکشاپ میں لایا۔ یہ کوئی چالیس فٹ لمبا اور پچیس فٹ چوڑا کمرا تھا جس میں لکڑی کو تراشنے، اسے ساخت دینے، کاٹنے اور پالش کرنے والی مشینیں موجود تھیں۔ ایک طرف بہت بڑے ریک پر ہر اوزار سلیقے سے رکھا ہوا تھا۔ باہر سے ورکشاپ کی حالت اتنی اچھی نہیں تھی لیکن اندر سے یہ بہت صاف ستھری تھی۔ فی الحال وہاں کوئی کام نہیں ہو رہا تھا اس لیے فرش بھی صاف ستھرا ہو رہا تھا لیکن وہاں آرا مشین نظر نہیں آرہی تھی۔ میں نے اس کے بارے میں پوچھا تو مارک نے کہا۔ ''وہ پیچھے لگی ہے کیونکہ وہ بلاوجہ بہت جگہ گھیرتی ہے اور اس سے اتنا کام بھی نہیں ہوتا۔''

میں مشینوں کا معائنہ کر رہا تھا۔ ہر مشین کے ساتھ اس کا پاور کنکشن الگ تھا اور اس کے لیے مین سوئچ سے الگ تار آرہی تھی۔ تمام مشینیں بہترین اور چلنے والی حالت میں تھیں۔ میں نے مارک گولڈی سے اجازت لے کر ان مشینوں کو باری باری چیک کیا۔ شون میرے ساتھ تھی لیکن میں نے غور نہیں کیا کہ انکل میئر ورکشاپ میں نہیں آئے تھے۔ مشینوں سے فارغ ہو کر میں نے ٹول ریک کا معائنہ کیا۔ یہ تمام اعلیٰ درجے کے ٹولز تھے اور ہر ٹول کا ایک اضافی ٹول بھی تھا۔ مجھے ٹولز میں بھی کسی قسم کی کوئی کمی نظر نہیں آئی۔ سچی بات یہ ہے کہ مجھے ورکشاپ اور اس کا سامان بہت پسند آیا۔ یہ بہت اچھی پروفیشنل ورکشاپ تھی۔ اندر کام کرنے کے لیے جگہ بھی مناسب تھی۔ اگرچہ ورکشاپ کا باہر والا حصہ کسی قدر خراب تھا لیکن میں اسے خود ٹھیک کر کے رنگ و روغن کر سکتا تھا۔ یہاں میں فرنیچر کے حصے تیار کر سکتا تھا اور انہیں جوڑ نے اور مکمل کرنے کے لیے میں یہاں ایک ہال اور بنا سکتا تھا۔ اس احاطے میں خاصی جگہ تھی۔ میں نے مارک سے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں نے ورکشاپ دیکھ لی ہے۔ کیا تم مجھے آرا مشین دکھاؤ گے؟''

مارک گولڈی نے اشارہ کیا۔ ہم ورکشاپ کے عقبی حصے میں آئے جہاں کھلے آسمان تلے ایک بڑی آرا مشین لگی ہوئی تھی۔ اس سے ہر سائز اور ہر قسم کی لکڑی کو ہر انداز میں کاٹا جا سکتا تھا۔ اس سے تختے اور لکڑی کی بلیاں بنائی جا سکتی تھیں۔ آرا مشین کی میز اور موٹر بہترین حالت میں تھی۔ کھلی جگہ ہونے کے باوجود اسے بہت اچھی طرح حفاظت سے رکھا گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ اس پر کہیں زنگ کا معمولی سا دھبا بھی نہیں تھا۔ جہاں کٹر نہیں تھا، وہاں سے دھات چمک رہی تھی۔ کھلی جگہ کی زمین پکی تھی لیکن اسے اس طرح رکھا گیا تھا کہ اس پر بارش کا پانی رکتا نہیں تھا۔ کل تک مسلسل بارش ہوتی رہی تھی لیکن زمین پر کہیں پانی نہیں کھڑا تھا۔ البتہ مٹی نم تھی جس سے پتا چل رہا تھا کہ بارش ہوئی ہے۔ ایک طرف چھوٹا کیبن تھا۔ شون نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ تمہاری رہائش ہے؟''

''ہاں، یہ بھی ورکشاپ میں شامل ہے۔'' مارک نے کہا۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ بنا کسی جوش یا تاثر کے بالکل سپاٹ لاتعلق سے انداز میں بات کر رہا تھا۔ کیبن بہت اچھے انداز میں بنایا گیا تھا۔ اس میں ایک طرف کچن اور باتھ روم بھی تھا۔ رفع حاجت کے لیے ایک باتھ روم آرا مشین والے صحن میں بھی بنا ہوا تھا۔ مجھے انکل میئر یہاں بھی نظر نہیں آئے۔ ہم واپس آئے تو انکل مجھے لکڑی والے شیڈ کی طرف سے آتے دکھائی دیے۔ انہیں دیکھ کر مارک کچھ پریشان نظر آنے لگا۔ اس نے کسی قدر عجلت میں کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ تم لوگوں نے ورکشاپ دیکھ لی ہے؟''

''ہاں، ہم نے دیکھ لی ہے۔''

''اگر تمہاری تسلی ہو گئی ہے تو میں تمہارا جواب جاننا چاہوں گا۔'' مارک نے مجھ سے کہا۔ میں نے جس انداز سے مشینیں اور ٹولز دیکھے تھے، وہ سمجھ گیا تھا کہ میں ورکشاپ میں لینا چاہ رہا ہوں۔

''میں اتنی جلدی تو جواب نہیں دے سکتا۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے قیمت زیادہ ہے، میں بیس ہزار سے اوپر نہیں دے سکتا۔''

''قیمت بالکل مناسب ہے۔'' اس نے اصرار کیا۔ ''یہ تو صرف ٹولز اور مشینوں کی قیمت ہے۔ اس کے ساتھ تمہیں پوری ورکشاپ اور ایک عدد مکان بھی مل رہا ہے۔ شیڈ میں تقریباً ستر کیوبک میٹرز لکڑی ہے۔ اس کی قیمت بھی اچھی خاصی بنتی ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا لیکن اس پر دباؤ ڈالنے کے لیے میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے، میں غور کروں گا۔ اگر مجھے مناسب لگا تو پھر میں یہ ورکشاپ تم سے خرید لوں گا۔''

''جیسی تمہاری مرضی۔'' اس نے شانے اچکائے۔ ''لیکن قیمت اس سے کم نہیں ہوگی۔''

انکل میئر ہمارے پاس آگئے۔ انہوں نے مارک گولڈی سے کہا۔ ''برخوردار! یہ احاطہ کہاں تک ورکشاپ کی ملکیت ہے؟''

''جہاں تک خاردار تار لگی ہے۔'' اس نے ناگواری سے کہا۔ ''میرا نام مارک ہے۔''

''ٹھیک ہے مارک۔'' انکل میئر نے اس کی بات پر کوئی تاثر دیے بنا کہا۔ ''اس ورکشاپ کو تم چلاتے رہے ہو؟''

مارک کا چہرہ بگڑ گیا۔ ''ظاہر ہے اگر میں نہیں چلا رہا تو پھر کون چلا رہا ہے اسے؟''

انکل میئر نے اس بار بھی متاثر ہوئے بغیر کہا۔ ''تم غصے میں آرہے ہو۔ میں کاروباری نقطۂ نظر سے پوچھ رہا ہوں۔ جب تمہارے پاس ہر چیز موجود ہے تو یقیناً بزنس بھی ہوگا؟''

انکل میئر کی بات پر اس کے تاثرات درست ہو گئے اور اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ہاں، اس ورکشاپ سے بہت سارے لوگ اوپر کیبنٹس چیزیں بنواتے ہیں۔''

''ان لوگوں کے کانٹیکٹس بھی ہمیں چاہئیں۔''

مارک نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میرے پاس کوئی کانٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ جسے کام کرنا ہوتا ہے وہ خود رابطہ کرتا ہے۔''

انکل میئر نے جرح جاری رکھی۔ ''ورکشاپ کی حالت سے لگ رہا ہے یہاں کئی دنوں یا ہفتے سے کوئی کام نہیں ہوا ہے؟''

مارک کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ اسے یہ پوچھ گچھ بالکل پسند نہیں آرہی ہے۔ وہ مجبوراً جواب دے رہا تھا۔ ''ہاں کیونکہ میں نے اسے فروخت کرنا ہے۔ اس لیے میں نے کوئی کام لینے سے منع کر دیا ہے۔''

''ویسے یہ جگہ کچھ زیادہ ہی دور نہیں ہے؟'' انکل میئر نے کہا۔ وہ بہ غور مارک کا جائزہ لے رہے تھے۔ ''یہاں سے نزدیک ترین آبادی بھی پندرہ منٹ کی ڈرائیو پر ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' مارک بولا۔ ''جنہوں نے کام لینا ہوتا ہے، وہ یہاں آتے ہیں اور میں سکون سے بغیر کسی کی مداخلت کے کام کرتا ہوں۔ آبادی میں لوگ آرا مشین کے شور پر اعتراض کرتے ہیں۔''

اس کا جواب درست تھا۔ کارپینٹر شاپ کی اکثر مشینیں بہت شور مچاتی ہیں اور اگر ان کے آس پاس کوئی گھر ہو تو اس میں رہنے والے اعتراض کر سکتے ہیں۔ یہاں نہ تو آبادی تھی اور نہ ہی مستقبل میں آبادی کا کوئی امکان تھا اس لیے یہ کام کے لیے آئیڈیل جگہ تھی۔ خاردار تاروں میں گھری جگہ کوئی چوتھائی ہیکٹر یا ڈھائی ہزار گز پر تھی اور کسی آبادی میں اتنی بڑی جگہ خاصی مہنگی پڑ جاتی۔ میں نے مارک سے پوچھا۔ ''تمہارے پاس زمین اور ورکشاپ کے کاغذات ہیں؟''

''زمین میرے انکل نے لی تھی۔ ان کے مرنے کے بعد یہ جگہ مجھے مل گئی لیکن میں نے زمین اپنے نام پر نہیں کرائی ہے۔ ورکشاپ کے کاغذات نہیں ہیں۔ میں تمہارے ساتھ سیل ایگریمنٹ سائن کروں گا اور ملکیت تمہیں منتقل کر دوں گا۔'' اس نے اس بار بھی دوٹوک انداز میں جواب دیا۔ میں نے کہا۔

''ٹھیک ہے، میں تمہیں مطلع کر دوں گا۔ تمہارا کوئی نمبر ہے؟''

''نہیں، یہاں فون لائن نہیں ہے اور میں موبائل نہیں رکھتا۔''

مجھے تعجب ہوا۔ ''تب تمہارے گاہک تم سے کس طرح رابطہ کرتے تھے؟''

''خود یہاں آکر۔''

آج کے دور میں کوئی شخص بغیر رابطے کے نہیں رہ سکتا، وہ اس ویرانے میں رہ رہا تھا اور کام بھی کر رہا تھا۔ بہرحال، یہ اس کا ذاتی مسئلہ تھا۔ ہم انکل میئر کی پک اَپ میں سوار ہوئے اور وہاں سے روانہ ہو گئے۔ مارک گولڈی ورکشاپ کے سامنے کھڑا ہمیں جاتے دیکھ رہا تھا۔ ڈرائیونگ کرتے ہوئے انکل میئر کچھ سوچ رہے تھے۔ جیسے ہی ہم احاطے سے باہر آئے، انکل میئر نے عقبی آئینے میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''جون! یہ شخص گڑبڑ ہے۔''

مجھے ان سے اتفاق نہیں تھا۔ ''مجھے تو اس میں کوئی گڑبڑ نظر نہیں آئی اور ورکشاپ بھی بالکل ٹھیک ہے بلکہ اے ون کنڈیشن میں ہے۔''

''میں ورکشاپ کی نہیں، اس شخص کی بات کر رہا ہوں جو اپنا نام مارک گولڈی بتاتا ہے۔''

اس بار شون نے سوال کیا۔ ''انکل! کیا یہ مارک گولڈی نہیں ہے؟''

''آپ کو اس کے بارے میں شبہ ہے؟'' میں نے

پوچھا۔

''ہاں، مجھے شبہ ہے۔'' انکل صاف گوئی سے بولے۔ ''یہ خود کو جو ظاہر کر رہا ہے، وہ نہیں ہے۔''

''آپ کا مطلب ہے یہ مارک گولڈی نہیں ہے؟''

''نہیں، ممکن ہے یہ مارک گولڈی ہو لیکن یہ کارپینٹر نہیں ہے اور میرا اندازہ ہے کہ یہ ورکشاپ بھی اس کا نہیں ہے۔''

''آپ کے اس اندازے کی وجہ؟'' میں نے کسی قدر جارحانہ انداز میں پوچھا۔

''ایک تو اس کے ہاتھ۔'' انکل میئر نے کہا۔ ''میں نے کسی کارپینٹر کے ہاتھ اتنے صاف ستھرے اور نازک نہیں دیکھے۔ اس کے شانے بھی کمزور سے ہیں جبکہ بھاری لکڑی کو اٹھانے رکھنے والے کے شانے لازمی مضبوط ہونے چاہئیں۔''

''میں نے غور نہیں کیا۔'' میں نے اعتراف کیا۔

''کیونکہ تم نے غور کرنے کی تربیت حاصل نہیں کی ہے۔'' انکل میئر بولے۔ ''دوسرے وہ ورکشاپ کے بارے میں بہت لاتعلقی سے بات کر رہا تھا جیسے یہ اس کی ملکیت نہ ہو۔ آدمی کبھی اپنی ملکیت کے بارے میں اتنی لاتعلقی سے بات نہیں کرتا۔''

''انکل میئر ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' شون نے انکل کی تائید کی۔ ''یہ بات میں نے بھی محسوس کی ہے۔''

یہ بات میں نے بھی محسوس کی تھی لیکن میں اتنی آسانی سے مارک گولڈی پر شک کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ جب وہ فروخت کی کارروائی کرتا تو لازمی بات ہے اپنی شناخت کے لیے کچھ نہ کچھ ضرور دکھاتا۔ اس کا مطلب ہے وہ فراڈ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی باتوں میں بس ایک چیز مجھے کھٹکی تھی کہ اس کے پاس کوئی رابطے کا ذریعہ نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''انکل! میرا خیال ہے وہ کچھ عجیب ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس پر شک کیا جائے۔''

''نہیں، شک کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ کچھ وجوہات میں تمہیں بتا چکا ہوں۔''

''اس کے علاوہ بھی کوئی بات ہے؟'' میں نے پوچھا۔

انکل نے سر ہلایا۔ ''میں لکڑی والے شیڈ کی طرف گیا تھا، اس طرف سے خاردار تاروں کا ایک حصہ کٹا ہوا اور اس میں باقاعدہ راستہ ہے۔ میں اس سے باہر نکلا تھا۔ تاروں سے کوئی دس قدم دور جھاڑیوں کے درمیان زمین کی تازہ کھدائی کی گئی ہے۔''

میں اور شون چونکے۔ ''آپ کو کیسے معلوم ہوا کہ زمین میں کھدائی کی گئی ہے؟''

''کھدی ہوئی زمین خود بتاتی ہے۔'' انکل نے کہا اور اس دوران میں ہم سڑک تک پہنچ گئے۔ انکل نے پک اَپ مزید آگے بڑھانے کے بجائے ایک طرف روک لی۔ ''خاص بات یہ تھی کہ اس کھدی زمین سے کچھ ہی دور مجھے ایک جوتا نظر آیا۔''

''ممکن ہے مارک نے وہاں زمین میں کچھ کچرا دبایا ہو اور جوتا بھی اس کا ہو۔'' میں نے کہا۔

''جوتا مارک کا نہیں ہو سکتا۔ میں نے اس کے جوتے کا سائز دیکھا ہے۔'' انکل میئر نے نفی میں سر ہلایا۔

انکل میئر کا ہمیشہ سے یہ کہنا رہا ہے کہ وہ شرلاک ہومز ٹائپ نہیں ہیں اور جاسوسی کے لیے مروجہ طریقہ کار کی پیروی کرتے ہیں لیکن اس وقت وہ بالکل شرلاک ہومز کے انداز میں تفتیش کر رہے تھے، یعنی زبانی کلامی..... اور اب بس جا کر مجرم کو پکڑنے کی کسر باقی رہ گئی تھی۔ لیکن یہ نہ تو شرلاک ہومز کا زمانہ ہے اور نہ ہی اس معاملے میں کہیں جرم نظر آ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ''انکل! ممکن ہے وہ جوتا کسی اور کا ہو لیکن اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟''

انکل میئر ہچکچائے۔ ''برخوردار! مجھے پولیس سے ریٹائر ہوئے خاصا عرصہ ہو گیا ہے اس لیے میں ہچکچا رہا ہوں۔ ورنہ یہ معاملہ بہت مشکوک لگ رہا ہے۔ آخر اس نے وہاں زمین کیوں کھودی ہے؟''

''یہ بات ہم اس سے پوچھ لیتے ہیں واپس چل کر۔''

انکل نے نفی میں سر ہلایا۔ ''اگر وہ سچ مچ مجرم ہوا تو پھر ہمیں بھی مارنے کی کوشش کرے گا اور میں یہ رسک نہیں لے سکتا۔ خاص طور سے جب شون ہمارے ساتھ ہے۔''

شون کا رنگ بدلا ہوا تھا لیکن اس نے بہادری سے کہا۔ ''انکل! ہمیں چیک کرنا چاہیے۔''

''چیک کیسے کریں؟'' میں نے پوچھا۔

''زمین جہاں سے کھودی گئی ہے، ہم وہاں کھدائی کر کے دیکھ سکتے ہیں..... خاموشی سے رات کے وقت جا کر۔''

پہلے انکل کو تفتیش کی پڑ گئی تھی اور اب شون بھی ان کے نقشِ قدم پر چلنا چاہ رہی تھی۔ میں نے گہری سانس لی۔ ''انکل! آپ کو شبہ ہے کہ وہ مارک گولڈی نہیں ہے یا یہ ورکشاپ اس کا نہیں ہے تو اس کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔''

''کس سے؟''

''اس کے گاہکوں سے۔''

''اس کے گاہکوں کے بارے میں ہم کچھ نہیں جانتے اور میں شرط لگا کر کہہ سکتا ہوں کہ میری ٹاؤن میں بھی کوئی اس کے بارے میں نہیں جانتا ہوگا۔''

''اور اگر کوئی جان پہچان والا نکل آیا؟''

''تو میں ہار مان لوں گا۔'' انکل میئر نے فراخ دلی سے کہا۔

ہم میری ٹاؤن کی طرف روانہ ہو گئے۔ شون کو اس کے گھر پر اتار کر میں اور انکل میئر پیدل ہی مارک گولڈی کے بارے میں کسی جاننے والے کی جستجو میں روانہ ہوئے۔ انکل نہایت مہارت سے اس کے بارے میں اپنے واقف کاروں سے معلوم کرنے کی کوشش کر رہے تھے لیکن جیسے جیسے ہم لوگوں سے پوچھتے جا رہے تھے، انکل میئر کا خیال درست ثابت ہو رہا تھا۔ میری ٹاؤن میں کوئی مارک گولڈی کے بارے میں نہیں جانتا تھا۔ صرف ایک بوڑھے نے بتایا تھا کہ اس نے کوئی بیس سال پہلے گولڈی ورکشاپ سے کچھ کام کرایا تھا اور اس وقت وہاں اس کا ہم عمر کوئی آدمی کام کرتا تھا۔ وہ یقیناً مارک گولڈی کا انکل تھا۔ سب سے آخر میں انکل میئر نے شیرف آفس کا رخ کیا۔ سابق پولیس افسر ہونے کی وجہ سے وہاں گرم جوشی سے ان کا استقبال ہوا۔ انکل نے آفس کے سب سے پرانے اور معلومات رکھنے والے افسر سے گولڈی ورکشاپ کے بارے میں معلوم کیا لیکن اسے یا شیرف آفس میں کسی کو بھی اس بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں تھیں۔ خاص طور سے مارک گولڈی سے سب ہی ناواقف تھے۔ جب ہم شیرف کے آفس سے نکلے تو انکل میئر کا انداز فاتحانہ تھا۔

''بولو برخوردار..... اب تم کیا کہو گے؟''

''ٹھیک ہے، مارک گولڈی کو یہاں کوئی نہیں جانتا لیکن یہ اس کے مجرم ہونے کی دلیل نہیں ہے۔''

''ایک اور جگہ سے تصدیق ہو سکتی ہے۔'' انکل نے کہا اور مجھے لے کر پیدائش و اموات کا ریکارڈ رکھنے والے مقامی دفتر پہنچے۔ یہاں کا انچارج انکل میئر کا بہت اچھا دوست تھا اس لیے اس نے انکل کے لیے مستعدی سے اپنا کمپیوٹر استعمال کیا اور تصدیق کر دی کہ پچھلے بیس سال میں کسی گولڈی کی وفات واقع نہیں ہوئی ہے۔ ہم دفتر سے باہر آئے تو انکل میئر نے کہا۔ ''یہ بات ثابت ہو گئی ہے کہ وہ جھوٹا ہے۔ اس نے کہا کہ اس کے انکل کے مرنے کے بعد یہ جگہ اس کے پاس آئی ہے لیکن اس کے انکل کی وفات کہیں سے ثابت نہیں ہوتی ہے۔''

''یعنی اب ہمیں آدھی رات کو پوری چھپے ورکشاپ تک جا کر زمین کھودنی ہوگی؟'' میں نے مُردہ لہجے میں کہا۔

''لازمی بات ہے برخوردار..... یہ معاملہ اب صرف ورکشاپ کے سودے تک محدود نہیں رہا ہے، یہ جاننا ضروری ہو گیا ہے کہ مارک گولڈی نامی یہ شخص کیوں جھوٹ بول رہا ہے۔''

انکل میئر کی پولیس والی رگ پوری طرح پھڑک چکی تھی اور وہ اس معاملے کو پایۂ تکمیل تک پہنچائے بغیر سکون سے نہیں بیٹھتے..... طے پایا کہ میں اور انکل رات کو ورکشاپ کی طرف جائیں گے اور زمین کھود کر دیکھیں گے کہ مارک گولڈی نے وہاں کیا دبایا تھا۔ کوئی کچرا تھا یا اس نے اپنے انکل کو دبا دیا تھا۔ انکل میئر کو اصل شبہ یہی تھا۔ میرے خیال میں شون کو اس معاملے میں ملوث کرنا ٹھیک نہیں تھا اس لیے ہم نے اسے مطلع نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ جب ہم ایک مقامی ریستوران میں ڈنر کر کے واپس انکل میئر کے گھر پہنچے تو وہ خود آ گئی۔

''رات کا کیا پروگرام ہے..... تم دونوں جاؤ گے ورکشاپ کی طرف؟''

میں نے سر کھجایا۔ ''نہیں، آج ارادہ نہیں ہے۔ ویسے یہ اتنی اہم بات نہیں ہے، خود انکل کا شبہ کم ہو رہا ہے۔''

شون نے مشکوک نظروں سے ہمیں دیکھا۔ ''سچ کہہ رہے ہو؟''

''ہاں، تم سے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟'' میں نے پورے خلوص سے کہا۔ شون کے جانے کے بعد انکل میئر نے میری طرف دیکھا۔

''برخوردار! یہ لڑکی تم میں دلچسپی لینے لگی ہے کیونکہ میں نے اس کے انداز میں وہ شک دیکھا ہے جو لڑکی صرف اسی آدمی پر کرتی ہے جسے وہ پسند کرتی ہو۔''

میں ہنسا۔ ''ممکن ہے یہ بھی صرف آپ کا شک ہو انکل۔''

''اب ہمیں بہت احتیاط سے جانا ہوگا، مجھے یقین ہے شون ہماری روانگی پر نظر رکھے گی۔''

انکل کی پک اَپ کا ڈیزل انجن خاصا ٹور کرتا تھا اس لیے بارہ بجے کے قریب روانگی اس طرح ہوئی کہ پہلے میں نے انکل کے ساتھ مل کر پک اَپ کو دھکا دے کر باہر سڑک تک پہنچایا۔ گھر سے دور نکل کر انکل نے اس کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور ہم روانہ ہوئے۔ ہم نے زمین کھودنے

کا سامان ساتھ رکھ لیا تھا۔ میں نے کہا۔ ''فرض کریں انکل کچھ نکل آتا ہے تو؟''

''مثلاً کیا نکل آتا ہے؟''

''یہی کوئی لاش وغیرہ تو کیا ہوگا؟''

''کیا ہونا ہے، میں پولیس کو اطلاع کروں گا۔''

''میں مارک کی نہیں، ورکشاپ والے معاملے کی بات کررہا ہوں..... اس کا پھر کیا ہوگا؟''

انکل میئر نے شانے اچکائے۔ ''پھر دیکھنا پڑے گا کہ ورکشاپ کی ملکیت کس کے پاس آتی ہے اور وہ اسے بیچنا پسند کرتا ہے یا نہیں۔''

یعنی اگر مارک گولڈی مجرم نکل آتا تو امکان تھا کہ ورکشاپ کی ملکیت بھی اس کے پاس نہیں رہے گی اور یہ کسی اور کو مل جائے گی جو ممکن ہے اسے فروخت کرنا پسند نہ کرے۔ میں نے دل سے دعا کی کہ کاش مارک گولڈی ہی مالک ہو اور وہ کسی چکر میں ملوث نہ ہو۔ کچھ دیر میں ہم ورکشاپ کی طرف جانے والے کچے راستے پر تھے۔ انکل نے پک اَپ کی روشنیاں بجھا دیں اور اسے ورکشاپ کے احاطے سے کوئی دو سو گز پہلے روک دیا تاکہ مارک انجن کی آواز سن کر ہوشیار نہ ہو جائے۔ ہم اترے، بیلچے سنبھالے اور احاطے کی طرف روانہ ہو گئے لیکن ہم نے احاطے میں داخل ہونے کی کوشش نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے لکڑیوں والے شیڈ کی طرف آئے۔ یہاں سے خاردار تاریں کاٹ کر راستہ بنایا گیا تھا لیکن جب انکل میئر نے چھوٹی سی ٹارچ کی روشنی میں دیکھا تو خاردار تاریں دوبارہ جوڑ دی گئی تھیں۔ اب یہاں راستہ نہیں تھا۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔

''تم نے دیکھا..... دوپہر میں راستہ تھا لیکن اب یہاں کوئی راستہ نہیں ہے۔''

''زمین کہاں کھودی گئی ہے؟''

''آؤ میرے ساتھ۔'' انکل نے کہا اور مجھے جھاڑیوں میں لے آئے۔ انہوں نے ٹارچ کی روشنی زمین پر ڈالی۔ ''یہ دیکھو، کھدائی کے بعد مٹی ڈالی گئی ہے۔ میرا اندازہ ہے مٹی ڈالے اڑتالیس گھنٹے سے زیادہ نہیں گزرے ہیں۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''میں کھدائی کرتا ہوں، آپ ذرا اردگرد نظر رکھیں تاکہ کوئی آئے تو ہم خبردار ہو جائیں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں۔'' انکل نے کہا اور میں نے بیلچہ اٹھا کر احتیاط سے کھدائی شروع کر دی۔ میری کوشش تھی کہ آواز نہ ہو۔ مٹی واقعی نرم تھی جیسے کچھ وقت پہلے ڈالی گئی ہو، ورنہ بارش کے بعد مٹی اور جم جاتی ہے۔ ممکن ہے اسے بارش کے بعد کھودا گیا ہو اور اسی وجہ سے زمین پر اتنے نمایاں نشانات باقی رہ گئے۔ میں مٹی کھود کر باہر پھینک رہا تھا اور انکل میئر مجھے ٹارچ سے روشنی دکھا رہے تھے۔ ساتھ ہی وہ آس پاس نظر بھی رکھ رہے تھے۔ کوئی تین فٹ کی کھدائی کے بعد مٹی بہت آسانی سے نکلنے لگی۔ میں بیلچہ مارتا تو وہ اندر دھنس جاتا۔ انکل میئر نے کہا۔ ''ذرا آہستہ بیٹے..... اگر اندر کچھ ہوا تو بیلچہ اسے لگ سکتا ہے۔'' انہوں نے لاش کا واضح ذکر نہیں کیا تھا لیکن میں سمجھ گیا اور اس کے بعد بہت احتیاط سے بیلچہ مارنے لگا۔ میں کھودنے کے بجائے مٹی سمیٹ رہا تھا۔ اچانک بیلچہ کسی چیز سے ٹکرایا۔ میں رک گیا۔

''انکل! کچھ ہے۔'' میں نے کہا اور جھک کر ہاتھوں سے مٹی ہٹانے لگا۔ پھر میرے ہاتھ میں جو چیز آئی، اسے محسوس کر کے میرا دل ڈوبنے لگا۔ یہ جوتا تھا اور صرف جوتا نہیں تھا بلکہ اس میں ایک انسانی پاؤں بھی تھا۔ انکل روشنی ڈال رہے تھے۔ ''انکل! یہاں سچ مچ لاش ہے۔''

''ہاں، یہ لاش ہے۔'' کسی نے کہا لیکن آواز انکل کی نہیں تھی بلکہ مارک گولڈی کی تھی۔ میں عجلت میں گڑھے سے نکلا تو انکل میئر ہاتھ اوپر کیے کھڑے تھے۔ مارک پاس ہی ایک تیز روشنی والی لائٹ اور پستول لیے کھڑا تھا۔ اس نے انکل میئر سے کہا۔ ''جب میں نے یہاں سے جوتا غائب پایا تو میں سمجھ گیا کہ تم نے گڑھا دیکھ لیا ہے۔''

''تم ہمارا انتظار کررہے تھے؟'' انکل نے سکون سے کہا۔ وہ مجرموں اور اسلحے کا سامنا کرتے رہے تھے اس لیے پُرسکون تھے لیکن میں گھبرا رہا تھا۔

''ہاں، مجھے نوّے فیصد یقین تھا کہ تم یہاں آؤ گے۔''

''لیکن دس فیصد امکان یہ بھی تو تھا کہ ہم پولیس کو بتا دیتے اور اس وقت یہاں ہماری جگہ پولیس ہوتی۔''

''ہاں، اس کا امکان تھا لیکن میں نے خطرہ مول لیا۔ اگر پولیس آجاتی تو میں نے فرار کا راستہ تیار رکھا تھا۔ پولیس مجھے نہیں پکڑ سکتی تھی۔''

''گڑھے میں کون ہے..... اصل مارک گولڈی؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، مارک گولڈی میں ہوں۔ یہ میرا انکل ہے۔''

''اوہ..... تو تم نے اسے مار کر اس کی جگہ لے لی۔ اس کی ورکشاپ پر قبضہ کرلیا اور اب اسے بیچ رہے ہو۔''

''میں اسے کبھی نہ بیچتا اگر مجھے کارپینٹر کا کام آتا۔'' اس نے تلخی سے کہا اور گڑھے کی طرف اشارہ کیا۔ ''لیکن اس شخص نے مجھے کئی سال گدھے کی طرح استعمال کیا اور بے وقوف بناتا رہا کہ جلد مجھے کام سکھانا شروع کرے گا۔'' مارک گولڈی مشتعل نظر آنے لگا۔

''اس لیے تم نے اسے مار دیا؟'' انکل میئر نے کہا۔

''نہیں، میں نے اس لیے اسے نہیں مارا تھا بلکہ جب اس نے چپکے سے ورکشاپ کی فروخت کی کوشش کی، تب میں نے اسے مار دیا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ میں پانچ سال اس کے ساتھ کام کروں تو وہ ورکشاپ میرے حوالے کردے گا۔''

''لیکن اس نے نہ تو تمہیں کارپینٹر کا کام سکھایا اور نہ ورکشاپ تمہارے حوالے کی؟'' انکل میئر کی بات پر اس نے سر ہلایا۔

''ہاں، اس کے بجائے وہ اسے چپکے سے فروخت کر کے یہاں سے جانے کی تیاری کر رہا تھا۔'' مارک مزید مشتعل ہو گیا۔ ''میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے گالیاں دیں اور دھکے دے کر یہاں سے نکالنے لگا۔ میں نے اس کا پستول لیا اور اس کے سر میں سوراخ کر دیا۔''

''اس کا مطلب ہے اخبار نے غلط نام نہیں دیا تھا؟ تمہارے انکل کا نام سین گولڈی ہے؟''

''تم نے درست پہچانا۔'' اس نے سر ہلایا۔

''تم نے اس کی لاش یہاں اتنی قریب دفنا کر حماقت کی ہے۔'' انکل میئر نے کہا۔ ''پھر زمین پر سے کھدائی کے آثار بھی نہیں مٹائے، اسی وجہ سے یہ جگہ میری نظر میں آگئی۔''

''میں کوئی پیشہ ور مجرم نہیں ہوں۔'' مارک غرایا۔ ''اب مجھے تم دونوں کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔''

''کیا مطلب؟'' میں چونکا۔

''تم۔'' اس نے پستول کا رخ میری طرف کر دیا۔ ''اس گڑھے کو بڑا کرو۔''

اس کی بات کا مطلب سمجھ کر میرے جسم میں سرد سی لہر دوڑ گئی۔ وہ اسی گڑھے میں ہم دونوں کو مار کر ڈالنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ انکل میئر نے کہا۔ ''برخوردار! تم پھر وہی حماقت کرنے جا رہے ہو۔ احاطے کے اتنے قریب موجود لاشیں تمہیں کسی وقت بھی پکڑوا سکتی ہیں۔''

اس نے دانت نکالے۔ ''اب مجھے کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ تمہارے جانے کے بعد ایک آدمی آیا تھا اور اس سے ورکشاپ کا سودا ہو گیا ہے۔ وہ آج رقم لے کر آئے گا اور میں ورکشاپ اس کے حوالے کر کے ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلا جاؤں گا۔ اس کے بعد اگر تم لوگوں کی لاشیں یہاں سے ملتی

زندگی اے زندگی

☆ زندگی ایک ایسا نغمہ ہے جس کی فرمائش کی جائے تو دوبارہ نہیں چلتا۔

☆ زندگی کا ہم پر کتنا احسان ہے کہ وہ ہم سے صرف ایک بار روٹھتی ہے۔

☆ زندگی کی مشکلات گھاس کے مانند ہوتی ہیں اگر ان پر توجہ نہ دی جائے تو بڑھنے لگتی ہیں۔

☆ زندگی اتنی تلخ تو نہیں کہ اس سے بھاگا جائے اور اتنی شیریں بھی نہیں کہ اس کے پیچھے بھاگا جائے۔

☆ زندگی کے اخبار میں سب سے اچھا صفحہ بچوں کا ہوتا ہے۔

☆ زندگی میں سوال زیادہ ہیں اور جواب کم۔

☆ زندگی ایک بینک کے مانند ہے جو کچھ اس میں جمع کر جاؤ گے وہی نکلوا سکو گے۔

❖❖❖

نمک پارے

اکثر خاوندوں کو یہ تو یاد رہتا ہے کہ ان کی شادی ہوئی تھی لیکن یہ یاد نہیں رہتا کہ کیوں ہوئی؟

جو شخص اتنا سست ہو جائے کہ وہ سوچ بھی نہ سکے تو اس شخص کو فوراً شادی کر لینی چاہیے۔

زیادہ بہتر یہ ہے کہ اپنا منہ بند رکھو اور لوگوں کو سمجھنے دو کہ تم بے وقوف ہو۔ بہ نسبت اس کے کہ اپنا منہ کھولو اور لوگوں کے تمام شبہات ختم کردو۔

❖❖❖

رضامندی

میں جلد ہی تم سے شادی کرلوں گا بس ذرا اپنے گھر والوں کو راضی کرلوں۔'' نوجوان نے اپنی چاہت کا یقین دلاتے ہوئے کہا۔

''آپ کے گھر میں کون کون ہے؟'' لڑکی نے شرماتے ہوئے پوچھا۔

''اور کوئی نہیں بس میری بیوی، ساس اور چھ بچے ہیں۔'' نوجوان نے سادگی سے جواب دیا۔

وزیر محمد خان، بٹل مانسہرہ

بھی ہیں تو مجھے اس کی کوئی پروا نہیں ہوگی۔"
وہ پستول لیے ہمارے سر پر موجود تھا اور ہم میں سے کوئی ایسا ہیرو نہیں تھا جو پستول کی پروا کیے بغیر اس سے بھڑ جاتا اور... اسے قابو کر لیتا۔ انکل اپنی عمر گزار چکے تھے اور مجھے لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ خاص طور سے جب فریقِ ثانی مسلح ہو اور پہلے ہی ایک قتل کر چکا ہو۔ اس لیے مجبوراً میں نے بیلچہ سنبھالا اور گڑھے میں اتر گیا۔ انکل میئر ایک طرف کھڑے تھے اور مارک گولڈی پوری طرح چوکنا تھا۔ میں ست روی سے گڑھا بڑا کر رہا تھا اور اس کے لیے مجھے مجبوراً لاش پر کھڑے ہونا پڑا تھا۔ مارک میری رفتار پر غرایا۔
"تیزی سے ہاتھ چلاؤ، ایسا نہ ہو میں تمہیں مار دوں اور پھر گڑھا مجھے بڑا کرنا پڑے۔"
"تم ہمیں بعد میں بھی مار دو گے۔" میں نے رک کر کہا۔ "اس لیے میں محنت کیوں کروں؟"
"تاکہ کچھ دیر زندہ رہ سکو۔" اس نے کہا۔ "لیکن اگر تم جلدی مرنا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔"
"ایک منٹ..... میں کھدائی کر رہا ہوں۔" میں نے جلدی سے کہا اور بیلچہ چلانا شروع کر دیا۔ مارک گولڈی آہستہ سے ہنسا۔ انکل میئر بالکل ساکت اور سکون سے کھڑے تھے جیسے کوئی مسئلہ ہی نہ ہو۔ میں جل گیا۔ اس مصیبت میں انہوں نے ہی پھنسایا تھا اور اب ان کو کوئی پروا نہیں تھی۔ گڑھا بڑا ہوتے ہی مارک ہم دونوں کے سر میں بھی سوراخ کر دیتا اور اس کے بعد اسے صرف گڑھے میں مٹی بھرنا پڑتی۔ جیسے جیسے گڑھا بڑا ہوتا جا رہا تھا، موت سامنے نظر آنے لگی تھی۔ اب گڑھا اتنا گہرا ہو گیا تھا کہ میرا سر بھی اس کے اندر تھا اس لیے اوپر اچانک کھٹ کی آواز آئی اور اچانک مارک لیٹ کر گڑھے میں جھانکنے لگا تو میری سمجھ میں بالکل نہیں آیا کہ کیا ہوا ہے۔ البتہ انکل میئر کا قہقہہ سنائی دیا اور پھر انہوں نے کہا۔
"گڈ گرل!"
میں جو مارک کے سر پر بیلچہ رسید کرنے جا رہا تھا، رک گیا کیونکہ مارک پہلے ہی بے ہوش تھا۔ وہ اس طرح گرا تھا جیسے لیٹ کر گڑھے میں جھانک رہا ہو۔ میں جلدی سے باہر نکلا تو انکل میئر شون کا شانہ تھپتھپا رہے تھے جس کے ہاتھ میں ایک موٹی سی لکڑی تھی اور یقیناً یہی لکڑی مارک گولڈی کے سر پر لگی تھی اور وہ بے ہوش ہوا تھا۔ میں نے مارے خوشی کے اسے سینے سے لگا لیا۔ شون نے ہماری جان بچائی تھی اور میں اس کا شکر گزار تھا۔ جب یہ شکر گزاری عملی حدود میں داخل ہوئی تو انکل نے مناسب سمجھا کہ وہ مارک کو دیکھ لیں۔ جب میرے جذبات ذرا اعتدال میں آئے تو میں نے شون سے پوچھا۔ "تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم یہاں آئے ہیں؟"
"میں نے کھڑکی سے تم لوگوں کو جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا۔" شون بولی۔
"میں نے تمہیں کھڑکی میں کھڑے دیکھ لیا تھا۔" انکل میئر بولے۔
"آپ نے مجھے بتایا نہیں ہے۔" میں نے شکوہ کیا۔
"برخوردار! ضروری نہیں تھا کہ شون ہمارے پیچھے آتی اس لیے تمہیں بتانے کا فائدہ نہیں تھا۔ بس ایک امید تھی کہ شون ہمارا تعاقب کرے گی۔"
"اور اگر میں نہ آتی تو؟" شون ہنسی۔ اپنے کارنامے پر وہ بھی بہت خوش نظر آ رہی تھی۔ اس سوال کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ انکل کو مارک کی نگرانی پر چھوڑ کر ہم ورکشاپ میں آئے لیکن وہاں سچ مچ کوئی فون یا موبائل نہیں تھا اس لیے مجبوراً ہمیں سڑک تک جانا پڑا اور ایک فون بوتھ سے پولیس کو کال کرنا پڑی۔ آدھے گھنٹے بعد وہاں پولیس اور پھر ایمبولینس بھی آ گئی تھی۔ سین گولڈی کی لاش سرد موسم کی وجہ سے زیادہ خراب نہیں ہوئی تھی اور تقریباً اصل حالت میں تھی۔ اس کے ایک پاؤں کا جوتا دفنانے کے دوران میں نکل گیا تھا اور اسی جوتے نے مارک کو پکڑوا دیا تھا۔ پولیس کو بیانات دیتے اور دوسرے معاملات نمٹاتے ہوئے صبح ہو گئی، تب ہمیں گھر جانے کا موقع ملا۔
میرا اندازہ درست ثابت ہوا۔ ورکشاپ مارک کے بجائے سین گولڈی کے ایک اور رشتے دار کو مل گئی تھی اور اس نے اسے فروخت کرنے کے بجائے خود چلانا شروع کر دیا۔ مجبوراً مجھے انکل کی پیش کش قبول کرنا پڑی۔ جھیل کے ساتھ ان کی کچھ زمین میری ٹاؤن میں تھی۔ میں نے اس پر اپنی ورکشاپ قائم کر لی اور فرنیچر بنانا شروع کر دیا۔ لکڑی انکل میئر نے سرمائے کی صورت میں فراہم کی اور جب میرا کام چل نکلا تو میں نے انہیں رقم قسطوں میں لوٹا دی۔ دو سال بعد جب شون یونیورسٹی سے تعلیم مکمل کر کے واپس آئی تو ہم نے وقت ضائع کیے بغیر شادی کر لی۔ آج میری ٹاؤن میں میرا فرنیچر سازی کا کارخانہ ہے جس میں مجھ سمیت دس افراد کام کرتے ہیں۔ شون بزنس دیکھتی ہے اور میں فرنیچر ڈیزائن کرتا ہوں جبکہ انکل میئر ہمارے بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور سب سے زیادہ خوش وہی ہیں۔

پہلا رنگ

گمانِ بے گماں

سرور اکرام

تمہارے اور میرے درمیاں اک بات ہونا تھی
بلا کا دن نکلنا تھا بلا کی رات ہونا تھی
بلا کا دن بھی نکلا اور بلا کی رات بھی گزری
عذابِ ذات بھی گزرا فنائے ذات بھی گزری

خواہشات اور خوابوں کا سفر کبھی رکتا نہیں ... یہ انسان کو ہمیشہ دوڑائے رکھتا ہے ... تاوقتیکہ اپنے ہدف کو نہ پالے ... تلاش و تجسس کا ایک ایسا ہی سفر در سفر ... اپنے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ دیوانہ وار بھٹک رہے تھے ... اور ان کی دیوانگی ... ایک لڑکی کے لیے عذاب بن گئی تھی ...

اس لڑکی کے گرد گھومتی کہانی..... جس کی زندگی مسلسل حادثات کا شکار ہو رہی تھی

شاہد سے میری ملاقات.... ایک چھوٹے سے حادثے کی وجہ سے ہوئی تھی۔
میں نہ جانے کس کام سے اپنے فلیٹ سے باہر گئی ہوئی تھی۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ اچانک بارش شروع ہو جائے گی اور وہ بھی اتنی تیز کہ ذرا سی دیر میں ہر طرف پانی ہی پانی ہو جائے گا۔
میرا خیال تھا کہ بارش اگر ہوئی بھی تو دوسرے دن تک ہوگی۔ آسمان پر بادل تو تھے لیکن محکمۂ موسمیات والوں کی پیش گوئی دوسرے دن کی تھی۔
بہرحال، میں گھر سے نکلی اور بارش میں پھنس گئی اور

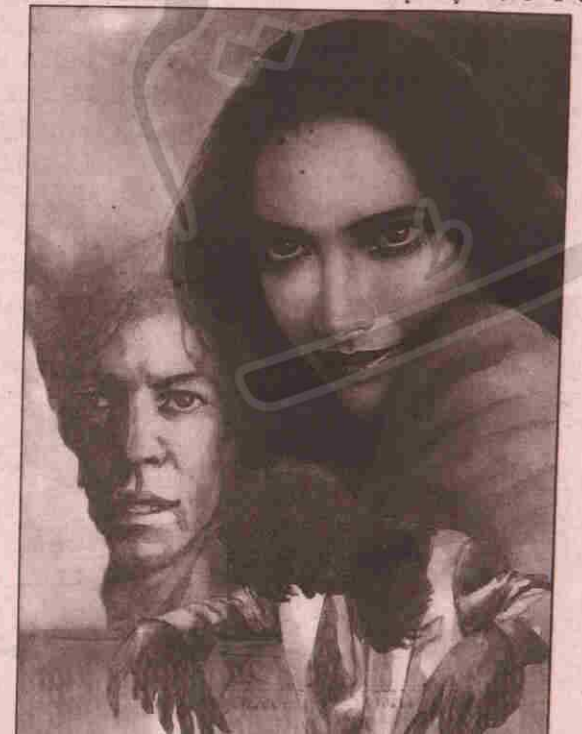

میرے لیے واپسی بھی دشوار ہوگئی۔ میں جس سڑک پر تھی، اس سڑک پر رکشا یا ٹیکسی وغیرہ بہت کم چلا کرتی تھی۔

میں اندھیری رات اور بارش میں فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی تھی کہ اچانک ایک گاڑی آتی ہوئی دکھائی دی۔ اس گاڑی کی روشنی براہِ راست مجھ پر پڑ رہی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گاڑی یا تو تیزی سے آگے گزر جائے گی یا میرے پاس آکر رک جائے گی۔

لیکن وہ تو سیدھی میری طرف چلی آرہی تھی۔ جیسے مجھے کچل دینا چاہتی ہو۔ قریب ...قریب اور قریب... میں بوکھلا کر فٹ پاتھ کے کنارے سے اور پیچھے کی طرف چلی گئی اور وہ گاڑی مجھ سے کتراتی ہوئی گزرتی چلی گئی۔

میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

کیا تھا یہ سب۔ کیا یہ گاڑی والوں کا مذاق تھا یا انہوں نے مجھے مارنے کی کوشش کی تھی... لیکن کیوں۔ اگر مذاق تھا تو پھر ایسا مذاق کون کرسکتا ہے۔ اور اگر مارنے کی کوشش کی تھی تو کس لیے؟ میں نے کسی کا کیا بگاڑا تھا؟

اتنی دیر میں اس اندھیرے میں کسی اور گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ شاید یہ وہی گاڑی تھی یا کوئی اور تھی... بہرحال، وہ بھی سیدھی میری ہی طرف آرہی تھی۔

میں خوف سے کانپ رہی تھی۔ گاڑی والا کیوں پیچھے پڑ گیا تھا۔ اچانک وہ گاڑی اسٹاپ پر آکر رک گئی۔ ایک نوجوان گاڑی سے اُتر کر میری طرف آگیا۔ اس نے اپنی گاڑی کی روشنیاں جلا رکھی تھیں۔ اسی لیے میں اس کا چہرہ دیکھنے کے قابل ہوسکی تھی۔

''آپ ٹھیک تو ہیں؟'' اس نے بہت نرم آواز میں پوچھا۔

''جی، جی ہاں... ٹھیک ہوں۔''

''میں نے دور سے ایک گاڑی کو آتے دیکھا تھا۔ میں یہ سمجھا شاید وہ آپ کو ہٹ کرگئی ہے۔ یہ سوچ کر آپ کی طرف آگیا تھا۔''

''نہیں، مجھے کچھ نہیں ہوا ہے۔''

''چلیں، میں آپ کو پہنچا دوں۔ اس طرح رات کے وقت آپ کا بارش میں کھڑے رہنا ٹھیک نہیں۔''

''نہیں، میں چلی جاؤں گی۔ کوئی نہ کوئی سواری مل جائے گی۔''

''بے وقوفی نہ کریں۔ چلیں بیٹھ جائیں۔''

اس کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ میں زیادہ دیر تک تردد نہیں کرسکی اور اس کی گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہی نوجوان شاہد تھا۔

اس نے راستے میں مجھ سے صرف میرا ایڈریس معلوم کیا تھا۔ اس کے سوا اس نے اور کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے اتار کر جاتے ہوئے اس نے اتنا کہا۔ ''پلیز! اس طرح بے دھڑک رات کے وقت نہ نکل جایا کریں، آپ کو اپنا خیال رکھنا ہے۔''

وہ گاڑی آگے بڑھا لے گیا اور میں اس کے بارے میں سوچتی رہ گئی۔

کون تھا یہ شخص... اگر یہ وہاں نہ آجاتا تو پھر میں نہ جانے کب تک وہیں کھڑی رہتی اور ایسا آدمی تھا جس نے تنہائی سے فائدہ اٹھانے کی کوشش بھی نہیں کی۔

اس نے بات تک نہیں کی تھی۔ بہرحال، میں نے دل ہی دل میں اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنے فلیٹ واپس آگئی۔ شاہد سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد ہم ملتے رہے۔ شاہد ایک مہربان اور خیال رکھنے والا نوجوان ثابت ہورہا تھا۔ البتہ وہ کبھی کبھی اس بات پر پریشان ہوجاتا کہ بارش کی اس رات کس گاڑی نے مجھے خوف زدہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ کیا چاہتے تھے وہ لوگ؟

لیکن اس کے بعد چونکہ ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔ اس لیے رفتہ رفتہ وہ واقعہ ہمارے دھیان سے نکل گیا۔

کچھ دنوں کے بعد پھر ایک واقعہ ہوا۔

یہ بھی پہلے والے سے کم نہیں تھا۔ کسی نے مجھ پر گولی چلائی تھی۔ اس رات بھی میں اپنے گھر کی طرف واپس آرہی تھی۔ میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوائی تھی۔ یہ میں عام طور پر کرتی تھی۔

نہ جانے کیوں ہمارا معاشرہ کچھ ایسا ہوگیا ہے۔

اگر کوئی اکیلی لڑکی ٹیکسی میں آتی جاتی دکھائی دے تو اس کے بارے میں طرح طرح کے سوالات پیدا ہونے لگتے ہیں۔ کہاں جاتی ہے۔ کس کے پاس جاتی ہے؟ چاہے وہ بے چاری کسی کام ہی سے جارہی ہو۔

تو اس رات بھی میں نے ٹیکسی کچھ فاصلے پر رکوائی اور اپنے فلیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ایک ایک گلی تھی، بلڈنگز کے درمیان میں گلی۔

اس گلی سے گزرتے ہوئے مجھ پر حملہ ہوا۔

کوئی شخص میرے پیچھے چل رہا تھا۔ میری چھٹی حس نے مجھے کسی خطرے سے آگاہ کردیا تھا۔ میں نے مڑ کر دیکھا ہی تھا کہ اس نے فائر کردیا۔

گولی چلنے کی آواز تو نہیں آئی تھی لیکن مجھے یقین تھا کہ اس نے فائر کیا تھا۔ گولی ایک دیوار پر لگی تھی۔ یا تو اس کا نشانہ

چوک گیا تھا یا اس نے جان بوجھ کر صرف مجھے خوف زدہ کیا تھا۔

بہرحال، میں نے گلی میں دوڑ لگا دی۔ اب وہ میرے پیچھے نہیں آرہا تھا۔ میں جب اپنی بلڈنگ کے گیٹ پر پہنچی تو میری سانسیں بُری طرح پھول رہی تھیں اور شاہد یہاں موجود تھا۔

وہ میرا یہ حال دیکھ کر جلدی سے میرے پاس آگیا۔

''کیا ہوا روشی۔ خیریت تو ہے نا؟''

''نہیں... خیریت نہیں ہے۔'' میں پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔ ''آؤ میرے فلیٹ میں آجاؤ۔''

فلیٹ پہنچ کر میں نے اسے پوری بات بتا دی۔

وہ حیران اور پریشان ہوگیا۔ ''آخر کیوں، تمہارے ساتھ ایسا کیوں ہورہا ہے؟''

''میں کیا بتاؤں، خود میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے۔''

''روشی، ایک بات بتاؤ۔ کیا تمہاری ذات سے کوئی راز پوشیدہ ہے... یا کوئی ایسی بات ہے جو تمہیں معلوم ہے۔ کوئی بھی بات؟''

''نہیں تو... ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔''

''یاد کرو روشی... یہ تمہارے لیے بہت ضروری ہے۔ ہر پوائنٹ آف ویو سے سوچو۔ چھوٹی سے چھوٹی بات کو بھی نظر انداز مت کرو۔ ہوسکتا ہے کہ جس کی تمہاری نگاہوں میں کوئی اہمیت نہ ہو کسی اور کے لیے وہ زندگی اور موت کا سوال بن گئی ہو۔''

''نہیں، مجھے کچھ یاد نہیں آرہا۔'' میں نے سر پکڑتے ہوئے کہا۔ ''اس وقت تو اور بھی یاد نہیں آرہا۔''

''خیر، پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' شاہد نے تسلی دی۔

خدا جانے کیا ٹھیک ہونا تھا یا کیا نہیں ہونا تھا۔

لیکن حیرت یہ تھی کہ آخر کون مجھے مارنا چاہتا ہے۔ میری کسی سے کیا دشمنی ہوسکتی ہے۔ اگر شاہد نہیں ہوتا تو... حالانکہ شاہد نے مجھے بچانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا تھا۔ اس کے باوجود اس کی وجہ سے میری ڈھارس بندھی ہوئی تھی۔

اسے دیکھ کر ایک خاص تقویت کا احساس ہوتا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہ شخص میرے لیے ڈھال بنا جارہا ہو۔ کون تھا وہ؟

بہرحال وہ جو کچھ بھی تھا۔ ایک محبت کرنے اور خیال رکھنے والا ثابت ہورہا تھا۔

اس کے بعد بھی وہ کئی بار مجھ سے ملا۔ مجھے تسلی دی۔ میرا حوصلہ بڑھاتا رہا۔ ایک شام میں اپنے فلیٹ میں تھی کہ شاہد کا فون آگیا۔ وہ بہت خوش گوار موڈ میں تھا۔ ''کیا کررہی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

''کچھ نہیں۔ آج دفتر نہیں گئی تھی۔ سوچا کچھ کام ہی کرلوں۔''

''چھوڑو کام کو۔ ذرا باہر نکل کر دیکھو۔ موسم کتنا خوب صورت ہورہا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''آجاؤ باہر۔''

''باہر کہاں آؤں؟''

''میں تمہاری بلڈنگ کے سامنے ہی گاڑی لیے کھڑا ہوں۔'' اس نے بتایا۔

مجھے بہت اچھا لگا۔ کوئی تو ہے جس نے اتنی اپنائیت سے مجھے آواز دی تھی۔ جو میرے لیے گاڑی لیے کھڑا تھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہوکر نیچے آگئی۔

شاہد معمول کے مطابق اپنے لاابالی پن کے ساتھ اپنی نئی گاڑی میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ گاڑی اس نے حال ہی میں خریدی تھی۔ اور مجھے اس کے بارے میں بتایا تھا۔

میں اس کے برابر والی سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ''ہاں بھئی، کہاں چلنا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''افق کے اس پار۔'' اس نے رومینٹک ہوکر کہا۔

''لیکن میرے پاس اتنی فرصت کہاں ہے کہ تمہارے ساتھ افق کے اس پار جاؤں۔'' میں مسکرا کر بولی۔

''میرے لیے تو فرصت نکالنی ہی پڑے گی۔''

اس نے ایک جھٹکے سے گاڑی آگے بڑھا دی۔ ہم بہت دیر تک یونہی گھومتے رہے۔ پھر ساحل پر آکر ایک دوسرے کو پکڑنے کے لیے دوڑتے رہے۔ ایک بچکانا سی خوشی حاصل ہورہی تھی ہمیں۔ نہ جانے کتنے برسوں بعد زندگی میں ایسی خوشی آئی تھی۔ ورنہ اب تک تو بس سوائے پریشانیوں کے اور کچھ بھی حاصل نہیں ہوا تھا۔

ہم نے رات کا کھانا بھی باہر ہی کھایا تھا۔

اس رات میں بہت خوش تھی۔ شاہد شاید میری زندگی کا ایک لازمی حصہ بنتا جارہا تھا لیکن اسی رات پھر ایک حادثہ ہوگیا۔

میں بہت گہری نیند میں تھی جب اچانک کمرے کی کھڑکی کے شیشے ٹوٹ گئے۔ شاید کسی نے بے آواز گولی چلائی تھی۔ میں خوف سے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

اگر میں اس وقت جاگ رہی ہوتی اور کھڑکی کے پاس ہی ہوتی تو پھر میرا کیا حشر ہوتا؟

میں نے اسی وقت شاہد کے موبائل کا نمبر ملا دیا۔ وہ نیند سے جاگا تھا۔ اسی لیے اس کی آواز بوجھل بوجھل سی تھی۔

''کیا بات ہے روشی، خیریت تو ہے؟''

''شاہد خدا کے لیے میرے پاس آجاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''کسی نے مجھ پر گولی چلائی ہے۔''

''اوہ۔'' یہ سن کر اس کی نیند اڑ گئی۔ ''پریشان مت ہو۔ میں دس منٹ میں پہنچ رہا ہوں۔''

دس منٹ کے بعد دروازے کی گھنٹی سنائی دی۔ میں آہستہ آہستہ دروازے تک پہنچ گئی۔ ''کون ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''روشی، دروازہ کھولو۔ میں آگیا ہوں۔''

میں نے دروازہ کھول دیا۔ شاہد اندر آگیا۔ اس وقت مجھے نہ جانے کیا ہوا کہ میں.... اس سے لپٹ کر رونا شروع ہوگئی۔ وہ آہستہ آہستہ مجھے تھپکیاں دیتا جارہا تھا۔

''شاہد! وہ کم بخت مجھے مار دیں گے۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

''کوئی نہیں مارے گا تمہیں۔'' شاہد نے مجھے سہارا دے کر ایک طرف بٹھایا۔ ''اور اتنا یاد رکھو کہ کوئی تمہیں مارنا بھی نہیں چاہتا۔''

''مارنا نہیں چاہتا تو پھر یہ سب کیا ہو رہا ہے میرے ساتھ؟''

''صرف تمہیں خوف زدہ کرنا۔'' اس نے کہا۔ ''خود سوچو... تم پر اب تک کتنے حملے ہو چکے ہیں۔ تمہیں خراش تک بھی نہیں آئی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف تمہیں ڈرا رہا ہے۔''

''شاہد کچھ بھی ہو، معاملہ اب میری برداشت سے باہر ہوگیا ہے۔''

''میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں تمہارے لیے کیا کروں۔'' اس نے کہا۔ ''کیونکہ میں خود یہاں سے جارہا ہوں۔''

''تم جارہے ہو۔ کہاں کس لیے؟'' میں ایک دم سے پریشان ہوگئی۔ ''میں تمہیں کہیں نہیں جانے دوں گی۔ تمہاری وجہ سے بڑا حوصلہ ہے مجھے۔''

''بے وقوف! میں ایک ہفتے کے لیے مری جارہا ہوں۔ ایک کام کے سلسلے میں۔ ایک ہفتے کے بعد واپس آجاؤں گا۔''

''تو پھر میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''تم کہاں میرے ساتھ جاؤ گی؟''

''نہیں، میں بھی جاؤں گی۔ میں ان حالات میں یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''اگر میں خود ہی تمہارا دشمن نکلا تو...'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔'' میں ہنس پڑی۔

''تمہاری دشمنی بھی قبول ہے۔''

''اوکے، تو پھر اپنا سامان پیک کرلو۔ ہم کل صبح ہی یہاں سے جارہے ہیں۔''

اور میں شاہد کے ساتھ اسلام آباد آگئی۔

ہم نے اسلام آباد کے ایک ہوٹل میں قیام کیا تھا۔

بہت خوب صورت ہوٹل تھا... اور یہاں سے اسلام آباد کی خوب صورت عمارتیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ شاہد کے ساتھ اس طرح آنا اچھا لگ رہا تھا۔

نہ جانے کیوں کچھ لوگ بہت جلدی قریب آجاتے ہیں۔ ان کی رفتار طوفانی ہوتی ہے۔ شاہد بھی ایسا ہی تھا۔ اس نے بہت تیزی سے میرے دل میں اپنی جگہ بنالی تھی۔

وہ مجھے ہوٹل میں چھوڑ کر کسی کام سے چلا گیا تھا۔

''دیکھو، کمرے کا دروازہ صرف اس وقت کھولنا جب میری آواز پہچان لو۔ ہوسکتا ہے کہ وہ خطرہ یہاں بھی تمہارے ساتھ ساتھ چلا آیا ہو۔'' اس نے کہا۔

''شاہد تم مجھے اور بھی ڈرا رہے ہو۔''

''ایک بات کہہ رہا ہوں یار۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''ویسے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ سب ٹھیک ہے۔''

''چلو، اگر تم کہہ رہے ہو تو پھر ٹھیک ہی ہوگا۔'' میں بھی مسکرادی۔

☆☆☆

میں شاہد کا انتظار کررہی تھی کہ موبائل کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

یہ ایک نامانوس نمبر تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ ''ہیلو!'' میں نے کہا۔

''سنو، تم مجھے نہیں جانتیں لیکن میں تمہارا ہمدرد ہوں۔'' دوسری طرف سے کسی کی آواز آئی۔

''جی ہمدرد صاحب فرمائیں۔ مجھے کیوں کال کی ہے؟''

''روشی! میں تمہیں شاہد کی طرف سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''تم اس سے محبت کرنے لگی ہو لیکن وہ تمہیں مارنا چاہتا ہے۔''

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے موبائل آف کردیا گیا۔

میں ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی۔ کون ہوسکتا تھا یہ۔ اس کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ مجھے شاہد کی طرف سے خبردار کرتا۔

شاہد... وہ میرا دوست تھا۔ یہ دوستی زیادہ پرانی بھی نہیں تھی۔ لیکن ہم ایک ساتھ دیکھے جاتے تھے۔ کم از کم شام کا وقت تو ہمارا ساتھ ہی گزرتا تھا۔

وہ ایک مہذب اور بظاہر سلجھا ہوا انسان دکھائی دیتا تھا پھر اس کے لیے کسی نے ایسی بات کیوں کی تھی؟

میں ان ہی سوچوں میں تھی کہ شاہد آگیا۔ وہ میرے سامنے اپنا ہاتھ نچاتے ہوئے بولا۔ ''ہیلو بے بی۔ جاگ جاؤ۔ کس سوچ میں پڑی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' میں نے اس کی طرف گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ''میں تمہارے بارے میں سوچ رہی تھی کہ تم کتنے خطرناک انسان ہو۔''

''اوہ، تو اب میں خطرناک بھی ہوگیا۔'' وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''ہاں، مجھے ابھی ابھی اطلاع ملی ہے کہ تم ایک خطرناک انسان ہو اور مجھے مار دینا چاہتے ہو۔''

''ویری گڈ۔''

''کسی نے ابھی موبائل پر بتایا ہے۔''

''کیا؟'' اس کے چہرے پر غصے کا رنگ نمایاں ہوگیا۔ ''کون کمینہ ہے۔ کیا نمبر ہے اس کا؟''

''میں اسے نہیں جانتی اور نمبر سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا... کیونکہ یہ نمبر کسی پی سی او کا ہے۔''

''خدا کی پناہ۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''اس دنیا میں کیسے کیسے لوگ ہوتے ہیں۔ اب اس کا فون آئے تو مجھ سے بات کرادینا۔''

''تم نے اس کی بات کو دل پر کیوں لے لیا۔ اس قسم کی کالز تو آتی رہتی ہیں۔''

''لعنت بھیجو۔ چلو کہیں لانگ ڈرائیو پر چلتے ہیں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھئی۔ میں تمہارے ساتھ نہیں جاسکتی۔'' میں مسکراتے ہوئے بولی۔ ''اب مجھے تم سے ڈر لگنے لگا ہے۔ نہ جانے کس وقت تمہارا دماغ پھر جائے اور تم مجھے جان سے مار دو۔''

''مائی بے بی۔ تمہیں جان سے مارنے کے لیے پلاننگ کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ تمہیں تو ویسے ہی مار سکتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟''

''اپنے پیار سے۔ اپنی محبت سے۔''

''یہ تو ہے۔'' میں نے گردن ہلادی۔ ''اس طرح تو تم مجھے مار ہی چکے ہو۔''

''چلو، اب اٹھو یہاں سے۔''

ہم پارکنگ کی طرف چل پڑے۔ جہاں شاہد نے اپنی گاڑی کھڑی کی تھی اور گاڑی کے پاس پہنچتے ہی موبائل پھر بول اٹھا۔ ''ہیلو!'' میں نے موبائل کان سے لگالیا۔

''روشی! تم شاہد کے ساتھ کہیں مت جانا۔ وہ تمہارا دشمن ہے۔'' دوسری طرف سے کہا گیا اور اس بار آواز لڑکی کی تھی۔

''تم کون ہو؟ اور مجھ سے ہمدردی کیوں کررہی ہو؟'' میں نے غصے سے پوچھا۔

''اس تفصیل میں مت جاؤ اور اپنی جان بچاؤ۔'' دوسری طرف سے اتنا کہہ کر موبائل آف کردیا گیا۔

''کیا بات ہے؟'' شاہد نے پوچھا۔ ''کیا اسی کا فون تھا؟''

''اس کا نہیں۔ اس بار کسی لڑکی کا فون تھا۔'' میں نے بتایا۔ ''لیکن وہ بھی یہی کہہ رہی تھی کہ شاہد سے اپنی جان بچاؤ۔''

''یہ کون لوگ ہیں کم بخت۔'' شاہد غصے سے دانت پیس کر بولا۔ ''کیوں تمہیں ڈرا رہے ہیں۔ لاؤ تم اپنا موبائل دکھاؤ۔ میں نمبر دیکھوں گا۔''

میں نے موبائل اس کی طرف بڑھادیا۔

اس نے نمبر دیکھنے کے بعد موبائل واپس کرتے ہوئے کہا۔ ''لعنت ہو۔ کسی پی سی او کا نمبر معلوم ہوتا ہے۔''

''شاہد! اب تو مجھے واقعی ڈر لگنے لگا ہے۔'' میں نے کہا۔

''ارے، اس قسم کے کمینے لوگ ہر معاشرے میں ہوتے ہیں۔ جن کا کام... دوسروں کو پریشان کرنا ہوتا ہے۔ تم پریشان ہوگئیں۔ یہی تفریح اس کے لیے بہت ہے۔''

''نہیں شاہد ہمیں سنجیدگی سے سوچنا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''یہ کوئی گہری پلاننگ معلوم ہوتی ہے۔ خود سوچو۔ پہلے ایک مرد نے فون کیا۔ اب کوئی لڑکی فون کررہی ہے۔ تو یہ کوئی تفریح نہیں ہوسکتی۔''

''خیر، تم پریشان مت ہو۔ میں ان فون کرنے والوں سے نمٹ لوں گا۔''

میں اس کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گئی۔

اس وقت ہم اسلام آباد میں تھے اور شاہد نے میرے بیٹھ جانے کے بعد یہ بتایا کہ اس کا ارادہ مری کی طرف جانے کا تھا اور تھوڑی سی سیر کرکے واپس آجاتے۔

''شاہد مجھے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مجھ سے؟''

''تم سے نہیں، مری کی اونچی نیچی سڑکوں سے۔'' میں

نے کہا۔ ''ان سڑکوں کے لیے بہت مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔''

''پاگل ہو تم۔ تم نے کیا مجھے اناڑی ڈرائیور سمجھ رکھا ہے۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''درجنوں بار ان سڑکوں پر سفر کر چکا ہوں۔''

پھر اس نے اپنی گاڑی مری روڈ کی طرف دوڑا دی۔

اس وقت اتفاق سے موسم بھی بہت خوب صورت ہو گیا تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے ہوں اور جب سخت گرمی میں بھی ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں اور جب ایک خوش گوار سی غنودگی کا احساس ہونے لگے... اور جب گاڑی میں ہلکی ہلکی موسیقی گونج رہی ہو تو اس وقت سب کچھ اچانک بہت خوب صورت ہو جاتا ہے۔

سارے اندیشے ایک طرف رہ جاتے ہیں۔ بس ایک سبک رفتار اور خوب صورت سی زندگی کے سوا اور کچھ بھی نہیں ہوتا۔ شاہد گاڑی بہت تیز چلانے لگا تھا۔

''شاہد یہ کیا کر رہے ہو؟'' میں نے اس کا بازو تھام لیا۔ ''اسپیڈ کم کرو۔ دیکھ رہے ہو کتنے خطرناک موڑ ہیں۔''

''ڈرنے لگیں نا۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''مائی بے بی! تم تو جانتی ہو کہ تیز ڈرائیونگ میرا جنون ہے۔''

''جنون تو ہے لیکن یہ جنون ایسی سڑکوں پر مت دکھاؤ، پلیز۔''

''اچھا بس۔'' اس نے رفتار کم کر دی۔

ہم ڈیڑھ گھنٹے کی مسافت کے بعد مری پہنچ گئے تھے۔ وہی چھوٹا سا خوب صورت شہر... وہی مال روڈ کی رونقیں اور دونوں اطراف بنے ہوئے ہوٹلز۔ جہاں سے کھانوں کی خوشبوئیں باہر آ رہی تھیں۔

ہم نے ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر کافی پی۔ یہاں کی کافی بہت اچھی ہوا کرتی تھی... اور کافی پینے کے دوران میں ہی موسم کے تیور اچانک خطرناک ہو گئے۔

بادلوں نے دن کی روشنی غائب کر دی تھی۔ اس کے ساتھ ہی بادلوں کی گرج نے مری کی پہاڑیوں میں گونج پیدا کرنی شروع کر دی۔

یہاں بارش اسی انداز سے شروع ہو جاتی تھی۔ یہ بارش خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ خوف زدہ کرنے والی بھی ہوا کرتی ہے۔

میں اب واقعی پریشان ہو گئی۔ ''شاہد اب کیا ہو گا؟''

''انجوائے کریں گے اور کیا ہو گا؟''

''میرا مطلب ہے واپس کیسے جائیں گے؟''

''کیسی بات کر رہی ہو۔ ایسے موسم میں واپس کیسے جا سکتے ہیں؟'' شاہد نے کہا۔

''تو پھر کیا کریں؟''

''یہیں رہ جاتے ہیں۔''

''کسی ہوٹل میں؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں، ہوٹل میں نہیں۔ یہاں میرے ایک دوست کا ایک خوب صورت اپارٹمنٹ ہے۔'' شاہد نے بتایا۔ ''وہ آج کل کراچی گیا ہوا ہے اور اس کی چابی میرے پاس ہے۔''

میرے ذہن میں گھنٹیاں سی بجنے لگیں۔ اس اپارٹمنٹ کی چابی شاہد کے پاس کیوں تھی۔ کیا وہ یہ سوچ کر چلا تھا کہ ہمیں مری میں رکنا ہو گا۔ کیا باقاعدہ پلاننگ کے تحت وہ مجھے مری لے کر آیا تھا اور موسم نے بھی اس کا ساتھ دیا تھا۔

''کیا سوچنے لگیں؟ کیا گھر والوں کی طرف سے پریشانی ہے؟''

''گھر والے؟'' میرے ہونٹوں پر ایک دکھ بھری مسکراہٹ آ گئی۔ ''کون سے گھر والے؟ شاہد کیوں میرے زخموں کو کریدّ رہے ہو۔ تم تو یہ جانتے ہو کہ اس دنیا میں میرا کوئی بھی نہیں ہے۔''

''ہاں۔'' وہ دھیرے سے بولا۔ ''معاف کرنا۔ نہ جانے کس رو میں، میں نے یہ بات کہہ دی۔''

اس وقت میری آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

☆☆☆

دو سال پہلے تک سب کچھ ٹھیک تھا۔

زندگی بہت آرام دہ اور خوشیوں سے بھری ہوئی تھی۔

میرے باپ کے پاس بہت دولت تھی۔

بہت بڑا کاروبار تھا ان کا۔ اور میں اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ میں نے خوشیوں کے ان خوب صورت دنوں کے درمیان یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ اچانک سب کچھ بدل جائے گا۔

یہ بدلاؤ پاپا کے ایک دوست جلال کی وجہ سے آیا تھا۔

کسی زمانے میں پاپا نے اس آدمی سے بہت بڑی رقم قرض کے طور پر لی تھی۔ پاپا نے کئی بار اس کی رقم واپس کرنی چاہی... لیکن اس نے ہر بار رقم لینے سے انکار کر دیا۔ وہ یہی کہتا رہا۔ ''ارے نہیں بھائی، اس وقت ہمیں ضرورت نہیں ہے۔''

''پھر بھی تمہارا قرض تو ہے۔''

''قرض تو ہے لیکن تمہارے سر پر جبر کی کوئی تلوار نہیں ہے۔'' وہ کہا کرتا۔ ''جب مناسب سمجھوں گا، تم سے واپس

لے لوں گا۔"

پاپا کو اس کی طرف سے اطمینان تھا۔

لیکن جب پاپا بینک کے ایک معاملے اور کاروبار کی طرف سے پریشان ہو گئے تو جلال نے پیسوں کا تقاضا شروع کر دیا۔

اس نے پاپا کو پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ پاپا اتنی بڑی رقم ایک ساتھ ادا نہیں کر سکتے تھے۔ انہوں نے فوری طور پر دینے سے معذرت کر لی اور اس نے پاپا کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔

نہ جانے وہ پاپا سے کب کی دشمنی نکال رہا تھا۔ اس نے ایک عجیب شرط عائد کر دی۔ اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کا رشتہ میرے لیے مانگ لیا۔ اس کا یہی کہنا تھا کہ اگر وہ میری شادی اس کے لڑکے سے کر دیں تو وہ قرض کی واپسی کا تقاضا نہیں کرے گا۔

یہ صورتِ حال ناقابلِ برداشت تھی۔

میں نے اس کے بیٹے کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کی شہرت بے حد خراب تھی۔ وہ لوفر اور بدمعاش قسم کا لڑکا تھا۔ میں نے اسے آج تک دیکھا نہیں تھا لیکن اس کی بے شمار حرکتیں میرے علم میں تھیں۔

ہمارے لیے اس انکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس نے ایک لڑکی کے ساتھ زبردستی شادی رچائی تھی اور بعد میں اسے چھوڑ دیا تھا۔

یہ ایک مشہور کیس تھا۔ اس لڑکی نے خودکشی کر لی تھی لیکن مرنے سے پہلے اس نے جلال کے بیٹے کے بارے میں بتا دیا تھا۔ جلال چونکہ ایک دولت مند اور اثر رسوخ والا آدمی تھا اس لیے یہ کیس دبا دیا گیا۔

اس کے علاوہ اس سے انکار کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ جلال اس طرح مجھے اور پاپا کو بلیک میل کرنا چاہتا تھا اور ہم کسی بھی صورت زبردستی کی اس شادی کے لیے تیار نہیں تھے۔

جلال کو جب اس انکار کا پتا چلا تو وہ بہت بری طرح تلملا گیا تھا۔ پاپا سے انکار سننے کے باوجود وہ شخص میرے پاس پہنچ گیا۔ "بیٹا! میں یہ کیا سن رہا ہوں۔ تم نے میرے بیٹے کے ساتھ شادی سے انکار کر دیا ہے؟"

"جی انکل! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔"

"لیکن کیوں، منصور میں کیا خرابی ہے؟"

"انکل! اس کی خرابیاں آپ خود جانتے ہیں۔ اب میں آپ کی معلومات میں کیا اضافہ کر سکتی ہوں۔"

جلال کے چہرے پر غصے کا رنگ آ کر گزر گیا۔ اس نے اپنے آپ پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ "دیکھو بیٹا! جوانی میں تو ایسی شرارتیں سب ہی کرتے ہیں۔"

"جی ہاں سب ہی کرتے ہیں لیکن شرارت اور بدمعاشی میں بہت فرق ہوتا ہے انکل۔" میں نے کہا۔ "میں نے آپ کے بیٹے کے بارے میں سنا ہے کہ وہ ایک بدمعاش اور عیاش قسم کا انسان ہے اس لیے پلیز مجھے اس رشتے کے لیے مجبور نہ کریں۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" وہ جھلا کر کھڑا ہو گیا۔ "ویسے میں اتنا ضرور کہنا چاہتا ہوں کہ تم نے انکار کر کے اچھا نہیں کیا۔"

"اور میں بھی اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ جب پاپا نے میری طرف سے انکار کر دیا تھا تو پھر آپ کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔"

میرے اس دوٹوک جواب نے شاید اس کے اندر کی خباثت کو بیدار کر دیا تھا۔ اس نے پاپا کے خلاف ایک محاذ کھڑا کر دیا۔

پاپا کو اس نے عدالت سے نوٹس بھجوا دیا تھا۔

بہرحال، یہ ایک لمبی چوڑی کہانی ہے، اس شخص نے اپنی کمینی حرکتوں کی وجہ سے ہمیں کس طرح برباد کیا۔ پاپا نے اپنی ساکھ اور عزت بچانے کے لیے اپنی فیکٹری فروخت کر دی۔ اس کے قرض واپس کیے۔ بینک والوں کو رقم لوٹائی۔ اس چکر میں وہ بیمار پڑتے چلے گئے۔ انہیں دل کا عارضہ ہو گیا۔

ہمارا خوب صورت مکان ان کے علاج کے لیے فروخت ہو گیا۔ پھر یہ ہوا کہ پاپا چل بسے... اور ان کے چند مہینوں کے بعد امی کا بھی انتقال ہو گیا۔

رشتے داروں کی طرف سے تو ویسے بھی کسی سپورٹ کی امید نہیں تھی۔ اس لیے میں نے جاب کر لی اور کرائے کے ایک فلیٹ میں چلی آئی۔

یہ تھی میری زندگی کی پوری داستان۔ اس دوران شاہد سے ملاقات ہو گئی۔ اس کی باتیں بہت خوب صورت تھیں۔ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا۔ لہٰذا میری اس سے دوستی ہو گئی۔

اور اب میں اس کے ساتھ طوفانی بارش میں مری کے ایک فلیٹ میں موجود تھی۔

☆☆☆

اس کمرے میں اچھی خاصی سردی تھی۔

شاہد نے مجھے ایک موٹی سی شال لا کر دے دی تھی۔ اس شال کو لپیٹ لینے کے بعد ٹھنڈک کا احساس کچھ کم ہو گیا تھا۔

"کیا بات ہے، کھڑکی سے باہر کیا دیکھ رہی ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں، اتنے اندھیرے میں کیا دکھائی دے گا؟" میں نے کہا۔ "ویسے یہ اپارٹمنٹ بہت اچھا ہے۔"

"ہاں اور یہ عام طور پر میرے ہی استعمال میں رہتا ہے۔"

"اور تم یہاں آ کر کیا کرتے ہو؟"

"کوئی خاص نہیں۔ جب دنیا اور دنیا والوں سے کوفت ہونے لگتی ہے تو یہاں آ کر چھپ جاتا ہوں۔ چائے پیو گی؟"

"ہاں لیکن میں بناؤں گی۔"

"کیوں، تم کیوں بناؤ گی؟"

"اس لیے کہ مجھے چائے بنانا اچھا لگتا ہے۔"

"اوکے، جاؤ سامنے کچن ہے۔" اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

میں کچن کی طرف جانے لگی اور وہ میرے سامنے دونوں ہاتھ پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ اس وقت اس کے چہرے کی عجیب کیفیت تھی۔

"اس طرح تو نہیں جانے دوں گا۔" وہ شرارت آمیز انداز میں بولا۔

"شاہد! ہٹ جاؤ ایک طرف۔" میں نے اس کے ہاتھ کو جھٹک دیا۔ "ورنہ میں اسی موسم میں باہر چلی جاؤں گی۔"

"اچھا بھئی ہٹ گیا۔" وہ ایک طرف ہٹتے ہوئے بولا۔ "لیکن کچن میں تو تمہارے ساتھ رہوں گا۔"

"وہ کس خوشی میں؟"

"تمہیں کچن میں کام کرتا ہوا دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"اچھا بابا آ جاؤ۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ اور کچن کی طرف بڑھ گئی۔ وہ کچن میں میرے پاس ہی کھڑا رہا۔

کچھ دیر بعد ہم دونوں لاؤنج میں اپنی اپنی پیالی لیے بیٹھے تھے۔ شاہد کی نگاہیں مجھ پر جمی ہوئی تھیں۔ "اس طرح کیا دیکھے جا رہے ہو؟"

"میں یہ سوچ رہا ہوں کہ وہ کون لوگ تھے جو تمہیں فون کر رہے تھے؟" اس نے کہا۔

"ہاں۔" میں چونک پڑی۔ "میرے ذہن سے تو ان کا خیال نکل ہی گیا تھا۔"

"کیا چاہتے تھے وہ؟"

"اب میں یہ کیا بتا سکتا ہوں۔" میں نے کہا۔ "ویسے پہلے کبھی ایسی بات نہیں ہوئی۔"

"اچھا، تم یہ بتاؤ، کیا میں تمہارا دشمن ہو سکتا ہوں؟ اور وہ بھی اس حد تک کہ تمہارے قتل کی پلاننگ کرنے لگوں۔"

"کچھ نہیں کہہ سکتی۔" میں دھیرے سے بولی۔ "انسان کی فطرت کا آسانی سے اندازہ نہیں ہوتا کیونکہ میں لوگوں کو بدلتے اور بے رحم ہوتے دیکھ چکی ہوں۔ اس کی مثال وہ جلال تھا۔ میں جس کے بارے میں تمہیں بتا چکی ہوں۔"

"ہاں ہاں، بتا چکی ہو مجھے۔" وہ کچھ جھلا کر بولا۔ "لیکن بار بار اس تذکرے سے کیا فائدہ؟"

"فائدہ کچھ نہیں ہے شاہد... فائدہ تو ہم نے کبھی حاصل ہی نہیں کیا۔ میں تو یہ سوچتی رہتی ہوں کہ لوگوں کے کتنے چہرے ہوتے ہیں۔ ایک طرف انتہائی مہربان اور دوسری طرف انتہائی بے رحم۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے تمہارا؟" اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔

"تم بھی ایک عام انسان ہو اس لیے تمہیں دوسروں سے الگ نہیں سمجھتی۔" میں نے کہا۔ "تمہاری آنکھیں یہ بتا رہی ہیں کہ تم میرے لیے خطرناک بھی ہو سکتے ہو۔"

"ہو نہیں سکتا بلکہ ہوں۔" اس نے اچانک میرا ہاتھ تھام لیا۔ "اب بتاؤ، کیا تم مجھ سے زیادہ طاقتور ہو۔ اگر میں نہ چاہوں تو کیا تم یہاں سے نکل سکتی ہو؟"

"ہاں۔" میں نے اس کے ہاتھ سے گرفت چھڑالی۔ "میں چاہوں تو یہاں سے جا بھی سکتی ہوں۔" میں نے کہا۔ "والدین کی موت کے بعد جب مجھے تنہائی کا احساس ہوا... اور یہ خیال آیا کہ میں انسان نما بھیڑیوں کے درمیان اکیلی رہ گئی ہوں تو میں نے اپنے آپ کو مضبوط بنانا شروع کر دیا۔ سیلف ڈیفنس کے ہر حربے سے واقف ہوں۔ اب کوئی بھی اتنی آسانی سے مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ دو منٹ میں اس کی ہڈیاں توڑ کر رکھ دوں گی۔"

"واہ، یہ تو مجھے معلوم ہی نہیں تھا۔" وہ ہنس پڑا۔ اس کی ہنسی مجھے اس وقت بہت کھوکھلی محسوس ہوئی تھی۔

"خیر، اب تو معلوم ہو گیا نا۔" میں مسکرا دی۔ "اچھا اب تو میں سونے جا رہی ہوں۔"

''ابھی سے۔ ابھی تو صرف دس بجے ہیں۔ ہمیں تو ساری رات باتیں کرنی ہیں۔''

''باتیں پھر کبھی سہی۔ اس وقت مجھے نیند آرہی ہے، شب بخیر۔''

میں نے کمرے میں جا کر دروازہ بند کرلیا۔

اب مجھے بہت احتیاط سے کام لینا تھا۔ شاہد ایک مرد تھا۔ چاہے وہ جیسا بھی سہی..... میں جوڈو کراٹے جاننے کے باوجود ایک لڑکی ہی تھی۔

اگر وہ کسی قسم کی شرارت پر اتر آتا تو شاید میں اس کا کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔

میں نے کمرے میں موجود ایک بھاری کرسی دروازے کے ساتھ لگادی حالانکہ دروازہ اندر سے بند کرچکی تھی۔ اس کے باوجود.... میں خوف زدہ تھی۔

میں بہت دیر تک بستر پر لیٹی ان فون کرنے والوں کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ کون تھے اور مجھے شاہد سے دور رہنے کا مشورہ کیوں دے رہے تھے؟

انہیں کیسے معلوم ہوا کہ میں شاہد کے ساتھ ہوں۔ اگر وہ میرے ہمدرد تھے تو کیوں؟ مجھ سے ہمدردی کیوں ہوگئی تھی۔ اور اچانک اسی وقت ایک آواز نے مجھے بری طرح چونکا دیا۔

یہ کسی وزنی چیز کے گرنے کی آواز تھی۔ ایک ہلکی سی چیخ بھی تھی پھر خاموشی چھا گئی۔ یہ آواز کمرے کی کھڑکی کے عقبی حصے سے آئی تھی۔

اس طرف لان تھا۔ وہ میں شام کے وقت ہی دیکھ چکی تھی۔ میں نے کھڑکی کھول کر باہر جھانکا۔ اس وقت بارش بند ہوچکی تھی۔

برآمدے کا بلب روشن تھا اور اس روشنی میں کوئی دکھائی دے گیا۔ کوئی ایسا آدمی جس نے چار خانوں والا کوٹ پہن رکھا تھا۔

یہ کہنا چاہیے کہ میں صرف اس کا کوٹ ہی دیکھ سکی تھی۔ پھر وہ اندھیرے میں ایک طرف دوڑتا چلا گیا۔ مجھے خوف تو محسوس ہورہا تھا... لیکن میں اب ایسی بھی نہیں تھی کہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل جاؤں... یا چیخنا چلانا شروع کردوں۔ زندگی نے مجھے کافی حد تک بے خوف بنادیا تھا۔

میں کچھ دیر تک آنکھیں پھاڑے دیکھتی رہی اور جب کچھ نظر نہیں آیا تو کھڑکی بند کرکے بستر پر آکر لیٹ گئی۔ اب نیند آنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔

شاہد دوسرے کمرے میں تھا۔

اور میں سوچتی جارہی تھی۔ ایک ایک کرکے سارے واقعات۔ نہ جانے اس وقت مجھے اتنی ڈھیر ساری باتیں کیوں یاد آرہی تھیں پھر ایک اور بات میرے ذہن میں آگئی۔

میرے ساتھ یہ دو مختلف حادثے ہوئے تھے اور دونوں دفعہ شاہد سامنے آگیا تھا۔ کیوں؟ اس کی کیا وجہ ہوسکتی تھی؟ یا تو وہ اتفاقاً سامنے آیا تھا یا پھر کوئی اور بات ہوسکتی تھی۔

ہاں، کوئی اور ہی بات ہوگی۔

شاہد کا دونوں دفعہ میرے سامنے آنا اتفاق نہیں ہوسکتا تھا.......... وہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا تھا لیکن میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ وہ کون ہے۔ اس کا بیک گراؤنڈ کیا ہے؟ اس کے والدین کیا ہیں، کہاں ہیں؟

یہ سب اس نے کبھی جاننے کا موقع ہی نہیں دیا تھا۔ مجھے یاد آرہا تھا کہ دو ایک بار میں نے معلوم بھی کرنا چاہا تو شاہد نے ٹال دیا تھا۔

آخر کیوں، یک بیک مجھے شاہد کی طرف سے خوف محسوس ہونے لگا۔ مجھے فون پر خبردار کرنے والے بھی تو یہی کہہ رہے تھے کہ میں اس کی طرف سے ہوشیار رہوں۔ وہ مجھے مارنا چاہتا ہے۔

شاہد کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ دوسرے کمرے سے باہر آرہا تھا... اور اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔ اس کی طرف سے میرے اندیشے درست ثابت ہونے لگے تھے۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ سکتا، میں نے ایک دم جست لگائی اور باہر اندھیرے میں چھلانگ لگادی۔ شاہد نے بوکھلا کر آواز دی۔ ''روشی... روشی... رکو۔ لیکن میں اب کہاں رکنے والی تھی۔ میں تو گیٹ سے بھی باہر آچکی تھی۔

☆☆☆

میں نہیں جانتی تھی کہ میں کس طرف جارہی ہوں۔

بس اپنی جان بچانے کے لیے دوڑ رہی تھی۔ شاہد نے ریوالور یونہی نہیں اٹھا رکھا ہوگا۔ لیکن میں اس وقت کہاں جاسکتی تھی۔ یہاں کی گلیاں اور راستے میرے لیے اجنبی تھے۔

مری کی سرد ہوائیں... اندھیرا... اور کسی لڑکی کا اس طرح دوڑتے جانا۔

پھر یہاں کے راستے بھی انتہائی خطرناک تھے۔ قدم قدم پر گہری کھائیاں۔ میں شاہد کی آوازیں سن رہی تھی۔ وہ مجھے پکار رہا تھا۔ اس ویرانے میں اس کی آواز گونج رہی تھی۔

لیکن میں پھر اس کے جال میں نہیں آنا چاہتی تھی۔ میری واپسی میری موت ہوتی اور میں فی الحال مرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ میرے سامنے اندھیرا تھا۔ خطرناک راستے تھے اور میرے پیچھے ایک یقینی موت تھی۔

اور اچانک کیا کچھ ہوا۔

مجھے یوں لگا جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی ہو۔ میں فضا میں معلق تھی پھر گری اور لڑھکتی چلی گئی۔ اس وقت میں بری طرح چیخ رہی تھی پھر میں سنبھل گئی۔

میں زیادہ گہری کھائی میں نہیں گری تھی اسی لیے مجھے چوٹ تو نہیں آئی تھی لیکن دہشت زدہ ضرور ہوگئی تھی۔ اور اس دہشت کے عالم میں میرے ہوش جاتے ہوئے محسوس ہورہے تھے۔

پھر ایک روشنی نظر آئی۔ یہ لالٹین کی روشنی تھی۔ کوئی لالٹین اٹھائے اسی طرف آرہا تھا۔ میں اپنی جگہ خاموش بیٹھی رہی۔ کم از کم آنے والا شاہد نہیں ہوسکتا تھا۔ ورنہ اس کے پاس لالٹین کہاں سے آتی؟

وہ قریب آگیا۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ جو لالٹین کی روشنی میں مجھے دیکھ رہا تھا۔ میرا جائزہ لے رہا تھا۔ ''تمہیں چوٹ تو نہیں آئی؟'' اس نے نرم لہجے میں پوچھا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''اندھیرے میں یہ کھائی دکھائی نہیں دی تھی۔''

''شکر کرو کہ یہیں آکر رک گئی ہو۔ ورنہ اس کے بعد سیکڑوں فٹ کی کھائی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''کہاں جانا ہے تم کو؟'

''پتا نہیں، میں راستہ بھٹک کر اس طرف آگئی ہوں۔''

''آؤ میرے ساتھ۔'' بوڑھے آدمی نے کہا۔

وہ لالٹین کی روشنی میں مجھے اپنے ساتھ لیے چلتا رہا۔ راستہ تو ابھی بھی ویسا ہی خطرناک تھا لیکن لالٹین کی روشنی میں، صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں اس کے ساتھ چلتی رہی۔ اونچے نیچے راستوں سے گزرنے کے بعد وہ مجھے ایک کچے مکان میں لے آیا۔ یہ مکان کسی پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا تھا۔

''رات یہیں رک جاؤ۔'' اس نے کہا۔ ''سویرا ہوتے ہی چلی جانا۔''

''نہیں بابا، تمہارا بہت شکریہ۔'' میں جلدی سے بولی۔ ''میری فکر نہ کرو۔ میں چلی جاؤں گی۔''

''نہیں جاسکوگی۔'' اس نے کہا۔ ''جب ہم لوگ ان راستوں میں بھٹک جاتے ہیں تو پھر تم تو یہاں نئی ہو۔''

وہ مجھے اندر لے آیا۔

یہ ایک بڑا سا کمرا تھا۔ جہاں فرش پر چٹائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ تین آدمی اور ایک عورت وہاں پہلے سے موجود تھے۔ وہ سب مجھے عجیب نظروں سے دیکھنے لگے۔

''بابا! یہ کون ہے؟'' ایک آدمی نے پوچھا۔

''راستہ بھول کر گڑھے میں گر گئی تھی۔'' بوڑھے نے بتایا۔

''واہ بابا، تمہارا ابھی جواب نہیں ہے۔'' ان میں سے ایک نے کہا۔ ''تم ہمیشہ ایسی ہی چیزیں لے کر آتے ہو۔''

میرے ذہن میں کھٹکا سا ہوا۔ یہ آدمی کیا کہہ رہا تھا۔ کون لوگ تھے یہ؟ کیا میں شاہد کے چنگل سے نکل کر پھر کسی مصیبت میں پھنس گئی تھی یا اس آدمی نے بس یونہی ایک بات کہہ دی ہو۔ اس کا کوئی مفہوم نہ ہو۔ ہوسکتا ہے کہ بوڑھے نے پہلے بھی کسی کو پناہ دی ہو یا کسی کو اپنے ساتھ لایا ہو۔ صورتِ حال جب تک واضح نہیں ہوتی، میں کچھ نہیں کہہ سکتی تھی۔

وہ عورت اٹھ کر میرے پاس آگئی۔ ''چلو، دوسرے کمرے میں جاکر آرام کرو۔ صبح اٹھ کر چلی جانا۔''

وہ میرا ہاتھ تھام کر مجھے دوسرے کمرے میں لے آئی۔ اس کمرے میں ایک چارپائی بچھی ہوئی تھی اور کچھ پرانا سا فرنیچر رکھا تھا۔

''بیٹھ جاؤ، میں تمہارے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔'' عورت نے کہا۔ ''اتنی ٹھنڈ ہورہی ہے۔ بیمار پڑ جاؤ گی۔'' اس نے کہا اور دروازے کی طرف جاتے جاتے پلٹ آئی۔ ''میرے باہر جانے کے بعد دروازہ اندر سے بند کرلینا۔ جب تک میری آواز نہیں سنو، دروازہ نہیں کھولنا۔ یہ سب ایک نمبر کے کمینے ہیں۔''

اس کی بات نے مجھے خدشات میں مبتلا کردیا۔

کیا مطلب تھا اس کا؟ خطرے کا احساس تو مجھے یہاں آتے ہی ہوگیا تھا۔ اب یہ عورت بھی یہی کہہ رہی تھی۔ اگر یہ عورت ان لوگوں کی ساتھی تھی تو پھر اس نے مجھے خبردار کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟

اچانک کچھ ہوا۔

یہ میرے موبائل کی گھنٹی تھی۔ میرے خدا! اس تمام بھاگ دوڑ میں... یاد ہی نہیں رہا تھا کہ موبائل سیٹ میرے پاس ہی ہے۔

میں نے نمبر دیکھا۔ شاہد مجھے فون کررہا تھا۔ میں اس

سے خوف زدہ ہو کر تو فرار ہوئی تھی لیکن نہ جانے کیوں اس وقت اس کا فون مجھے بہت بڑے سہارے کی طرح محسوس ہوا۔ ''روشی! کہاں ہو تم! کیسی ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''میں نہیں جانتی، میں کہاں ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''میں کسی جگہ پھنس گئی ہوں۔ ایک بوڑھے آدمی کے ساتھ آگئی تھی۔''

''کون سی جگہ ہے۔ خدا کے لیے کچھ تو بتاؤ۔''

''میں نے کہا نا کچھ نہیں معلوم۔ بس ایک کمرا ہے اور باہر کچھ لوگ بیٹھے ہیں۔ ان میں ایک عورت بھی ہے۔ اور ہاں اتنا معلوم ہے کہ یہ کمرا کسی پہاڑی کے دامن میں ہے۔ کچا مکان ہے۔''

دروازے پر دستک ہونے لگی۔ میں نے موبائل آف کر دیا۔ اس عورت کی ہدایت پر میں نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ ''کون ہے؟'' میں نے دروازے کے پاس جا کر پوچھا۔

''میں ہوں۔'' اس عورت کی آواز آئی۔ ''کھول دو دروازہ۔''

میں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ عورت ٹرے میں چائے لیے کھڑی تھی۔ کچھ بسکٹ بھی اپنے ساتھ لائی تھی۔ ''یہ لو۔'' اس نے ٹرے میرے ہاتھ میں پکڑا دی۔ ''چائے پی لو۔''

اس نے یہ جملہ بلند آواز میں کہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے آنکھ سے ایسا اشارہ کیا۔ جیسے وہ چائے پینے سے منع کر رہی ہو۔ اس نے شاید کسی کو سنانے کے لیے اونچی آواز میں چائے پینے کو کہا تھا۔ میں نے اس کا اشارہ سمجھ کر اس کا شکریہ ادا کر کے ٹرے لے لی۔

دروازہ بند ہو گیا۔

اب میں پھر کشمکش میں مبتلا ہو گئی۔ اس عورت نے واضح طور پر چائے پینے سے منع کیا تھا۔ یعنی اس چائے میں کوئی چیز ملا دی گئی تھی۔

لیکن وہ عورت تو انہی کی ساتھی تھی پھر میرے ساتھ اتنی ہمدردی کس لیے۔ وہ بھی خدا کی طرف سے میری مدد تھی۔

نہ جانے چائے پینے کے بعد میرا کیا حشر ہوتا۔

میں نے چائے ایک کونے میں پھینک دی اور خود چارپائی پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان لوگوں نے اسی لیے ایسی چائے دی ہو گی کہ میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہو جاؤں۔

پندرہ بیس منٹ بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ میں آنکھیں بند کیے لیٹی رہی۔ دوبارہ دستک ہوئی۔ اس بار بھی میں خاموش رہی اور اچانک موبائل پھر بج اٹھا۔ میں نے اس بار موبائل ہی آف کر دیا۔ وہ یقیناً شاہد ہی ہو گا۔ اس کا شکار اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا اسی لیے اس کی بے قراری سمجھ میں آ رہی تھی۔

دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی کسی مرد کی آواز آئی۔ ''کم بخت نے دروازہ اندر سے بند کر رکھا ہے۔''

''ہاں، ویسے بے ہوش تو ہو گئی ہو گی۔'' یہ دوسری آواز تھی۔

''اب اندر کیسے جائیں؟''

''کھڑکی سے۔'' دوسرے نے کہا۔ ''کھڑکی کا پٹ بہت آسانی سے نکل جاتا ہے۔''

یہ سنتے ہی میں جلدی سے کھڑی ہو گئی۔ کھڑکی کا پٹ میرے لیے بھی ایک راستہ ہو سکتا تھا۔ میں نے کھڑکی کے پاس جا کر کھڑکی کو ایک جھٹکا دیا اور اس کا پٹ باہر آ گیا۔

اب میں بڑی آسانی سے باہر جا سکتی تھی۔ میں نے ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر باہر اندھیرے میں چھلانگ لگا دی اور ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

نہ جانے میری قسمت میں کیا لکھا تھا۔

کچھ دیر پہلے تک تو صرف شاہد میرا دشمن تھا لیکن اب نہ جانے کتنے ہو گئے تھے۔ کھڑکی سے باہر جھاڑیاں تھیں۔ اندھیرا تھا اور سرد ہوائیں تھیں۔ میں وہاں رک کر یہ نہیں دیکھ سکتی تھی کہ میرے فرار ہونے پر ان کا کیا ردِ عمل ہوا ہو گا۔ بس میں ایک طرف دوڑتی چلی گئی۔

ایک بار پھر ویسی ہی دوڑ تھی... خوف بھری۔ بلا کی تعاقب کرتی ہوئی۔ موبائل کی گھنٹی پھر بجنے لگی تھی۔ میں دم لینے کے لیے ایک جگہ رک گئی۔ وہ شاہد ہی تھا جو مجھ سے پوچھ رہا تھا کہ میں کہاں ہوں اور میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟

''شاہد! میں اس مکان سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''تھینک گاڈ اور اس وقت کہاں ہو؟''

''یہ میں نہیں جانتی۔ بس دوڑ رہی ہوں۔ سامنے گاڑیوں کی روشنیاں نظر آ رہی ہیں۔ شاید وہ مین روڈ ہے۔ میں وہاں تک پہنچنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

''ہاں ہاں، تم وہاں پہنچو، میں بھی آ رہا ہوں۔''

میں گاڑیوں کی روشنیوں کی طرف چل دی۔ اس بار بہت دیکھ بھال کر راستہ طے کر رہی تھی۔ حالانکہ اندھیرا ویسا ہی تھا۔ اس کے باوجود میں بچتی بچاتی ہوئی روڈ تک آ ہی گئی۔

یہاں تو اچھی خاصی رونق تھی۔

کچھ کیبن بنے ہوئے تھے۔ جن میں کھانے پینے کی چیزیں بک رہی تھیں۔ دو تین گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔ جن میں عورتیں اور بچے تھے۔ یہ سب کچھ کھا پی رہے تھے۔ کولڈ ڈرنک پی رہے تھے۔

یہاں آ کر اطمینان سا محسوس ہوا۔ وہ لوگ کم از کم یہاں مجھ پر ہاتھ نہیں ڈال سکتے تھے۔

ایک دکان پر بورڈ لگا ہوا تھا۔ ''ماریا باربی کیو'' ہو سکتا ہے کہ یہ کوئی مشہور جگہ ہو۔ اس بھاگ دوڑ کے درمیان میرا بیگ میرے ساتھ رہا تھا۔

میرا موبائل سیٹ بھی اسی میں تھا۔ مجھے یاد آیا کہ مری کے مکان سے فرار ہوتے وقت میں نے میز پر رکھا ہوا اپنا بیگ اٹھا لیا تھا۔ وہی اس وقت میرے کام آ رہا تھا۔

میں نے روشنی میں دیکھا۔ بیگ میں پانچ چھ سو روپے تھے۔ میں نے اپنے اعصاب کو سکون دینے کے لیے ایک کولڈ ڈرنک منگوا لی اور اس کی ہلکی ہلکی چسکیاں لے ہی رہی تھی کہ اچانک کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

میں تقریباً اچھل ہی پڑی۔

یہ وہی عورت تھی اس مکان والی جو مجھے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

☆☆☆

میں اس وقت ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی۔

یہ کمرا اس عورت کا تھا۔ اس نے اپنا نام جمیلہ بتایا۔ جمیلہ مجھے اس کمرے میں لے آئی تھی۔ اس نے بتایا کہ ان کم بختوں کو اس کمرے کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔

''بی بی جی، میں سمجھ گئی تھی کہ آپ کمرے سے نکل کر اس طرف آ رہی ہوں گی۔ کیونکہ سڑک کی روشنیاں دور سے نظر آ جاتی ہیں۔ اسی لیے میں بھاگ کر یہاں آ گئی... اور آپ کو دیکھ لیا۔''

''یہ سب کیا ہے جمیلہ؟'' میں نے پوچھا۔ ''کون لوگ ہیں یہ؟''

''بڑے ظالم لوگ ہیں جی۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''وہ بوڑھا ایک نمبر کا بدمعاش ہے۔ وہ لڑکیاں گھیر کر لاتا ہے اور یہ لوگ انہیں بیچ دیتے ہیں۔''

''او خدایا!'' میں کانپ کر رہ گئی۔ ''یہ بتاؤ، تم مجھ پر کیوں مہربان ہو گئی ہو؟''

''آپ کو دیکھ کر دل نے کہا کہ ان بی بی کو بچانا ہے۔

پکنک پر جانے والے طلبہ کے لیڈر نے ٹیکسی ڈرائیور سے پوچھا: ''تمہاری ٹیکسی میں ہم ساتوں دوست آرام سے بیٹھ سکیں گے یا تم پیدل چلنا پسند کرو گے؟''

''سیڑھی سے نیچے اترنے کی کوشش مت کرنا۔ میں نے سیڑھی ہٹا لی ہے۔''

''اب بتا رہے ہو جبکہ میں آدھا راستہ اتر چکا ہوں؟''

جج (ملزم سے): ''تمہارا کوئی وکیل نہیں ہے؟''

ملزم: ''نہیں جناب والا۔ میں نے سچ بولنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔''

''تمہارا بھائی مجھ سے رقم ادھار لیتا رہا ہے اور آج تک اس نے ایک پیسہ بھی ادا نہیں کیا۔''

''ہاں، وہ بچپن ہی سے بچت کا عادی ہے۔''

بس خدا نے دل میں نیکی ڈال دی۔ میں تو ویسے ہی اتنے گناہ کر چکی ہوں جی۔ ہو سکتا ہے میری یہ نیکی خدا کو پسند آ جائے۔''

''ضرور پسند آئے گی جمیلہ۔'' میں نے کہا۔ ''تم اتنی اچھی ہو کر ان لوگوں کے چنگل میں کیسے پھنس گئیں؟''

''بس جی، یہ ایک لمبی کہانی ہے۔'' جمیلہ نے ایک گہری سانس لی۔ ''آپ تو جی اپنے بارے میں بتائیں۔ آپ کے ساتھ کیا ہوا۔ آپ کہاں بھاگتی پھر رہی ہیں؟''

''کیا بتاؤں جمیلہ... میں ایک بدقسمت لڑکی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''میرے ساتھ ایسے ایسے تماشے ہو رہے ہیں کہ میں پاگل ہو کر رہ گئی ہوں۔''

''بتائیں جی، شاید میں آپ کے کسی کام آ سکوں۔''

''جمیلہ! یہ بتاؤ، کیا تم مجھے مری سے نکال سکتی ہو؟''

''یہ کون سا مشکل ہے جی۔ صبح سویرے اتنی ویگنیں اسلام آباد کے لیے چلتی ہیں۔ آپ کسی میں بیٹھ جائیں۔ سیدھا اسلام آباد پہنچ جائیں گی۔''

''نہیں جمیلہ! یہ اتنا آسان نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ میرے دشمن ہیں۔ وہ ہر جگہ نگرانی کر رہے ہوں گے۔ ان سے بچ کر نکلنا بہت مشکل ہو گا۔''

''تو پھر ایک کام کریں۔ کل دن بھر یہیں رہیں۔ مغرب کے بعد مری کا ایک آدمی اپنی گاڑی لے کر روزانہ اسلام آباد جاتا ہے۔ وہ مرغیوں کی سپلائی کا کام کرتا ہے جی۔ میں اس سے کہہ دوں گی۔ وہ آپ کو اپنے ساتھ لے جائے گا۔''

''ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔''

''لیکن اس کے لیے آپ کو دن بھر اس کوٹھری میں رہنا ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''جبکہ میں ان کمینوں کے پاس جاؤں گی۔ ورنہ وہ مجھ پر شک کرنے لگیں گے کہ میں نے کہیں آپ کو چھپا کر رکھا ہے جی۔''

''ہاں، تمہیں ان کو مطمئن کرنا بھی ضروری ہوگا۔''

''اب آپ بے فکر ہو کر سو جائیں جی۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''یہاں کوئی نہیں آنے والا ہے۔''

پھر شاہد کا فون آ گیا۔ اس بار وہ پہلے سے زیادہ پریشان محسوس ہو رہا تھا۔ ''روشی! تم کہاں ہو۔ میں پاگلوں کی طرح تمہیں تلاش کرتا پھر رہا ہوں؟''

''شاہد! میں وہاں سے نکل کر ایک محفوظ مقام پر آ گئی ہوں۔'' میں نے بتایا۔

''کون سا محفوظ مقام؟''

''یہ میں نہیں بتا سکتی۔'' میں نے کہا۔ ''ویسے تم میری طرف سے بے فکر ہو جاؤ۔''

''خدایا آخر تمہیں ہوا کیا ہے، تم کیا کرتی پھر رہی ہو؟'' وہ غصے سے بولا۔ ''بے وقوف لڑکی! کیا تمہیں یہ اندازہ نہیں کہ تمہاری جان خطرے میں ہے۔''

''اندازہ ہے اسی لیے تو جان بچاتی پھر رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور خود تم سے بھی۔''

''روشی! پاگل مت بنو۔ بتاؤ کہاں ہو تم؟''

میں نے رابطہ ختم کر دیا۔ ''بی بی جی! یہ کیا سلسلہ ہے۔ آپ کس سے جان بچاتی پھر رہی ہیں؟''

''اس شخص سے جس سے میں نے محبت کی تھی۔'' میں تلخ ہو کر بولی۔ ''لیکن اچھے دن اور اچھی زندگی ہم جیسوں کو راس نہیں آتی۔''

''بتاؤ بی بی، کیا دکھ ہیں آپ کے ساتھ؟''

''میری داستان سننے والا کوئی ملا تھا۔ کسی نے اتنی ہمدردی کی تھی اسی لیے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ جمیلہ نے بہت پیار سے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ''ارے کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ آپ تو بہت حوصلے والی ہیں جی۔ پھر آپ کی آنکھوں میں یہ آنسو کیسے؟''

''جمیلہ! میرا حوصلہ اب جواب دیتا جا رہا ہے۔ میں بہت تھک چکی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''نہیں جی۔ ایسا نہ کہیں، انسان کو اللہ کی ذات سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔''

اس نے میرے لیے چائے بنا دی۔

میری زندگی کی یہ رات بھی بہت عجیب تھی۔

صرف بھاگ دوڑ ہوتی رہی۔ موت میرے تعاقب میں تھی۔ میں اس سے کترا کترا کر نکلتی جا رہی تھی لیکن کب تک۔ لیکن کب تک...

جمیلہ چائے بنا کر لے آئی۔ چائے پینے کے دوران میں نے اسے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ حیران ہو کر سنتی رہی۔ ''اس کا یہ مطلب ہوا جی کہ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔''

''ہاں جمیلہ، جلال نام کے ایک آدمی نے میرے باپ کو تباہ کر دیا۔ ہم محتاج ہو کر رہ گئے۔ اور آج سب سے بڑا افسوس یہ ہے کہ میں نے جس سے محبت کی اسی سے میری زندگی کو خطرہ ہو گیا۔''

''بی بی جی! میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔ ہو سکتا ہے کہ آپ جو کچھ سوچ رہی ہوں۔ وہ سب غلط ہو۔''

''کیا مطلب؟''

''یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ آپ نے جس سے محبت کی ہے۔ وہ واقعی آپ کا دوست اور ہمدرد ہو۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''آپ نے اسے غلط سمجھا ہو اسی لیے وہ آپ کے لیے اتنا پریشان ہو رہا ہے۔''

''لیکن میرے لیے جو فون آتا رہتا ہے، وہ کیا ہے؟''

''ہو سکتا ہے کہ فون کرنے والے آپ کو بہکا رہے ہوں۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''آپ نے شاہد کے ہاتھ میں پستول دیکھ کر یہ کیسے سمجھ لیا کہ وہ آپ کو مارنے کے لیے آ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کوئی اور وجہ ہو۔''

جمیلہ بہت عقل مندی کی باتیں کر رہی تھی۔ اس کی باتیں میرے ذہن کے دریچے کھول رہی تھی۔ آہستہ آہستہ میری آنکھوں سے پٹی ہٹتی جا رہی تھی۔ اگر شاہد ایسا ہی تھا تو پھر میں نے اس کے ساتھ بہت زیادتی کی تھی۔

''جمیلہ! کیا خیال ہے میں شاہد کو فون کروں؟''

''ضرور کریں جی۔ آپ کی یہ بھاگ دوڑ تو ختم ہو جائے گی نا۔''

میں نے موبائل پر شاہد کا نمبر ملایا لیکن دوسری طرف سے کوئی جواب نہیں مل رہا تھا۔ ''کیا ہوا بی بی؟'' جمیلہ نے پوچھا۔

''پتا نہیں۔ اس کا نمبر نہیں مل رہا ہے۔'' میں نے تھکے ہوئے انداز میں بتایا۔

اور اسی وقت دروازے پر دستک ہونے لگی۔ ہم دونوں ہی بری طرح چونک اٹھے۔ ''خدا خیر کرے۔'' جمیلہ نے کہا۔ ''پھر میرا ہاتھ تھام کر ایک کونے میں لے آئی۔ یہاں پانی کا ایک بڑا سا ڈرم رکھا ہوا تھا۔ ''اس میں پانی نہیں ہے۔ آپ جلدی سے اس میں چلی جائیں۔'' اس نے کہا۔

دروازے پر دستک ہوئی پھر کسی نے زور سے آواز دی۔ ''جمیلہ!''

''جلدی کریں۔''

میں نے اپنے آپ کو سمیٹا اور اس ڈرم میں داخل ہو گئی۔ وہ اتنا بڑا تھا کہ میں بہ آسانی اس میں داخل ہو گئی تھی۔ جمیلہ نے آنکھیں ملتے اور جماہی لیتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔

''تو کہاں سے آ گیا؟'' جمیلہ نے کسی سے پوچھا۔ ''اتنے سویرے سویرے۔''

''وہ میں سویرے سویرے سیر کو جاتا ہوں نا۔'' آنے والے نے بتایا۔ ''میں نے سوچا تجھ کو بھی ساتھ لے لوں۔''

''پاگل ہو گیا ہے۔ ساری نیند خراب کر دی۔ جا دفع ہو جا۔''

''نہیں، میں تو تجھ کو ساتھ لے کر جاؤں گا۔''

''نہیں میں اس وقت نہیں جاؤں گی۔ تو جا۔''

پھر دروازہ بند ہونے کی آواز آئی اور جمیلہ نے مجھے پکارا۔ ''آ جائیں جی۔ چلا گیا۔''

میں بڑی مشکل سے ڈرم سے باہر آئی۔ ''پڑوس میں رہتا ہے بی بی۔ کچھ پاگل سا ہے۔'' جمیلہ نے بتایا۔ ''میرا دماغ خراب کرنے چلا آتا ہے۔''

''جمیلہ! میں تو یہ دیکھ رہی ہوں کہ صرف ایک رات گزری ہے۔ لیکن ایسا لگ رہا ہے جیسے دوڑتے دوڑتے صدیاں گزر چکی ہوں۔''

''ہاں جی۔ مصیبت کی ایک گھڑی آرام کی ہزار گھڑیوں کے برابر ہوتی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بی بی! آپ ایسا کریں۔ سو جائیں۔ یہاں کوئی نہیں آتا۔ میں باہر سے تالا بھی لگا دوں گی۔ آپ مجھے اس گھر کا پتا سمجھا دیں۔ میں اس آدمی کو لے کر آ جاؤں گی۔''

''پتا تو مجھے بھی ٹھیک سے یاد نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر موبائل پر اس کا نمبر مل جاتا پھر تو کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا لیکن اس کا نمبر ہی نہیں مل رہا۔''

''آپ مجھے سمجھائیں تو۔ یہ پورا علاقہ میرا چھانا ہوا ہے۔ میں یہیں کی ہوں۔''

میں اپنی یادداشت سے کام لیتے ہوئے جو کچھ بتا سکتی تھی، وہ اسے بتا دیا۔ ''سمجھ گئی۔'' اس نے گردن ہلائی۔ ''میں اس بندے کو لے کر آتی ہوں۔ وہ گھر میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ گھبرانا نہیں۔ گھر میں کھانے پینے کی چیزیں رکھی ہیں۔ بس آپ کھڑکی سے بھی باہر نہیں دیکھیں گی۔''

''ٹھیک ہے جمیلہ، تم جاؤ۔'' میں نے کہا۔ ''میں اس کے نمبر پر ٹرائی بھی کرتی رہوں گی۔''

جمیلہ چلی گئی۔ اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا بلکہ تالا بھی لگا دیا تھا۔ میں اب پوری طرح حالات کے رحم و کرم پر تھی۔ نہ جانے میرے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔

یہ جمیلہ بھی ایک اجنبی عورت تھی۔ میں نے نہ جانے کیوں اس پر بھروسا کر لیا تھا۔ اب میں اس کے رحم و کرم پر تھی۔ اس نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا اور یہ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ پچھلے کمرے میں ایسا نہیں تھا۔ اسی لیے میں آسانی سے فرار ہو گئی لیکن اس کمرے سے نکلنا مشکل تھا۔

اچانک موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔

یہ شاہد کا نمبر نہیں تھا، یہ کوئی اور تھا۔ وہی جو مجھے شاہد کے خلاف بھڑکایا کرتا تھا۔ ''تم اس وقت کہاں ہو؟'' وہ مجھ سے پوچھ رہا تھا۔

''کیوں، کیا تمہیں یہ بتانا ضروری ہے؟''

''بے وقوف لڑکی! تمہاری زندگی خطرے میں ہے۔ شاہد تمہیں پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے۔ کیونکہ تم اس کے چنگل سے نکل بھاگی ہو۔''

''اوہ، بہت فکر ہے تمہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ میں شاہد کے چنگل سے نکل کر تمہارے چنگل میں پھنس جاؤں؟''

''دیکھو روشی! میں ہمدرد ہوں تمہارا۔ حالات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ تم بہت بڑے عذاب میں ہو۔ بتاؤ اس وقت کہاں ہو؟''

''میں خود نہیں جانتی کہ میں اس وقت کہاں ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''کسی نے مجھے پناہ دی ہے۔ میں اسی کے پاس ہوں۔''

''کس نے پناہ دی ہے؟''

''ایک عورت ہے۔ جمیلہ نام کی۔'' میں نے کہا۔ ''وہ

مجھے کمرے میں بند کر کے گئی ہے۔ باہر تالا لگا ہے۔''

''او خدا، آخر تم کسی چکر میں پھنس ہی گئیں۔ خیر، تم مجھے لوکیشن تو بتا سکتی ہو نا؟''

''میں کچھ بھی نہیں بتا سکتی۔ کیونکہ یہاں بالکل اجنبی ہوں۔''

''ٹھہرو۔ تمہارے لیے کچھ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

بیرونی دنیا سے رابطہ ختم ہو گیا۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ دوست تھا یا دشمن۔ دوستی اور دشمنی کی لکیریں کبھی کبھی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ چلنے لگتی ہیں... اور دوست دشمن کا اندازہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔

اس وقت میں نے سچے دل سے دعا کی کہ خدا مجھے راستہ دکھا دے۔ میرے ساتھ زندگی جو کھیل کر رہی ہے، وہ ختم ہو۔ میں نے سنا تھا کہ اس قسم کی دشمنی کی صرف ایک وجہ ہوتی ہے اور وہ ہے دولت۔

لیکن میرے پاس تو دولت نام کی کوئی چیز ہی نہیں تھی۔ میں تو بالکل مفلس ہو چکی تھی... پھر میرے خلاف ایسی سازشیں کیوں ہو رہی تھیں۔

میں نے دروازے پر جا کر دروازہ کھولنے کی کوشش کی لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ نہ جانے وہ عورت شاہد تک پہنچ بھی سکے گی یا نہیں۔ شاہد کا فون تو مسلسل بندل رہا تھا۔

میں نے وقت گزارنے کے لیے کمرے کا جائزہ لیا۔ ٹوٹے پھوٹے فرنیچر کے سوا وہاں اور کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک جگہ چائے کا سامان رکھا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی بسکٹوں کے ڈبے تھے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں بس یہی سامان تھا۔

عورت واپس آ کر ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس کو گئے ہوئے کئی گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے اس دوران اپنے لیے چائے بھی بنا لی۔ بسکٹ بھی کھائے۔ وقت کسی طرح گزرنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

پھر کچھ سوتے جاگتے، انتظار کرتے شام ہو گئی۔ اس عورت کی واپسی نہیں ہوئی۔ نہ جانے کہاں جا کر رہ گئی تھی یا اس کے ساتھ کیا حادثہ ہوا تھا۔

پھر اندھیرا اتر آیا... اور میں اس قید میں بیٹھی رہ گئی۔

اچانک دروازے پر دستک ہونے لگی۔ یہ یقیناً جمیلہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر جمیلہ ہوتی تو اسے دستک دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ کوئی اور تھا۔

پھر کسی کی آواز آئی۔ ''دروازہ کھولو جمیلہ۔ اب تو سیر کو چلو۔''

یہ وہی پاگل تھا جس کے لیے جمیلہ نے بتایا تھا کہ پڑوس میں رہتا ہے۔ ایک خیال میرے ذہن میں آیا۔ میں جلدی سے دروازے کے پاس آئی۔ ''سنو۔ دروازہ باہر سے بند ہے۔ کھول دو۔''

''ارے، تم کون ہو؟''

''میں جمیلہ کی مہمان ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''پھر میں تمہارے ساتھ سیر کو چلوں گی۔ اتنی دیر میں جمیلہ بھی آ جائے گی۔''

''اچھا، تو تم میرے ساتھ سیر کو چلو گی۔''

''ہاں ہاں، بتا رہی ہوں نا۔'' میں نے کہا۔ ''تم دروازہ تو کھولو۔''

''اس میں تالا نہیں لگا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ تو ابھی کھل جائے گا۔''

''تو کھولو، سنا نہیں۔''

اور اس نے دروازہ کھول دیا۔ میرے سامنے ایک مجہول سا آدمی کھڑا تھا۔ ''ارے واہ۔ تم جمیلہ کی مہمان ہو نا؟''

''ہاں، میں اس کی مہمان ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''چلو تم مجھے روڈ تک لے چلو۔''

''چلو۔ روڈ اس طرف ہے۔''

اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ سمجھ سکتا، میں نے اسی سمت دوڑ لگا دی۔ ایک بار پھر اندھیری رات اور میرا فرار۔ وہ بے چارہ آوازیں ہی دیتا رہ گیا لیکن میں دوڑتی چلی گئی۔

روڈ سامنے تھی اور میں کسی محفوظ جگہ کی تلاش میں تھی۔ میں گرتی پڑتی ہوئی کسی نہ کسی طرح روڈ تک پہنچ ہی گئی۔ یہاں گاڑیاں چل رہی تھیں۔ دکانیں کھلی تھیں۔ انسان دکھائی دے رہے تھے۔

میں نے ابھی اپنی سانسیں درست ہی کی تھیں کہ دو آدمی میرے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک وہی بابا تھا۔ جو مجھے اس مکان میں لے گیا تھا اور دوسرا وہ شخص تھا جس کو میں نے کمرے میں دیکھا تھا اور ان دونوں آدمیوں کے پیچھے جمیلہ کھڑی تھی۔

''اوہ تو یہ کھیل ختم ہو گیا۔'' میں نے مایوسی سے سوچا۔

''ہم سے کہاں بھاگے گی۔'' وہ آدمی غرایا۔ ''تم اس باؤلے کو دھوکا دے کر بھاگی ہو نا۔ اسی نے بتایا کہ تم اس طرف آئی ہو۔'' پھر اس نے جمیلہ کی طرف دیکھا۔ ''اور تو۔ تجھ سے تو ہم بعد میں نمٹیں گے۔ ہمارا کھا کر ہمی سے غداری کرتی ہے۔''

جمیلہ کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اس کی گردن پر نیل کے نشانات تھے۔ جو یہ ظاہر کر رہے تھے کہ اس پر تشدد بھی کیا گیا ہے۔ شاید دن بھر تشدد ہوتا رہا ہو۔ بالآخر اس کی ہمت اور برداشت جواب دے گئی ہو اور اس نے یہ بتا دیا ہو کہ وہ مجھے کہاں چھپا کر آئی ہے۔

''اب چل ہمارے ساتھ۔'' اس آدمی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔

''نہیں، کیا سمجھ رکھا ہے مجھے؟''

''چلتی ہے یا نہیں۔''

اسی وقت میں نے ایک زوردار ٹھوکر اس کی ناف کے نیچے رسید کر دی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہو گا۔ وہ ایک بھیانک چیخ کے ساتھ سڑک پر ہی لوٹنے لگا۔ میں نے کراٹے کا ایک بھرپور ہاتھ اس بوڑھے کو بھی رسید کر دیا۔ وہ بھی ڈھیر ہو گیا۔

''چلو جمیلہ جلدی۔'' میں نے کہا۔

''نہیں بی بی۔ تم جاؤ۔ جان بچاؤ اپنی۔ میں نہیں جا سکتی۔ میرا تو مرنا جینا ان کم بختوں کے ساتھ ہے۔ تم جاؤ۔''

اور میں ایک بار پھر وہاں سے چل دی۔

اس بار بھی راستے کا کوئی تعین نہیں تھا۔ بس چلتے جانا تھا۔ خدا جانے کس طرف۔ کہاں؟ پھر کسی گاڑی کی روشنی میں نہا گئی۔ گاڑی مجھ سے کچھ فاصلے پر آ کر رک گئی۔

اور کوئی گاڑی سے اتر کر میری طرف آنے لگا۔ میں خوف زدہ ہرنی کی طرح بھڑک اٹھی پھر اس نے آواز دی۔

''روشی! روشی!''

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گئی۔ یہ شاہد تھا۔ اس نے میرے قریب آ کر بہت بے تابی سے مجھے پکڑ لیا تھا۔

''خدا کی پناہ! تم نے تو پاگل بنا کر رکھ دیا ہے۔ کہاں کہاں تلاش کرتا رہا ہوں۔ دیکھ رہی ہو میری حالت۔ دو دنوں سے ایک لمحے کا سکون نہیں ہے۔''

''مکار۔'' میں نے اپنے دل میں سوچا۔

شاہد مجھے اپنے اپارٹمنٹ میں لے آیا تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہونے والی دستک نے مجھے بیدار کر دیا۔

دن نکل آیا تھا، اس کا مطلب یہ تھا کہ میں خاصی دیر تک سوتی رہی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا اور دروازے پر لڑکی کو دیکھ کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

وہ لڑکی دراصل ایک عورت تھی۔ چوبیس پچیس برس کی۔ بہت خوب صورت، اسمارٹ۔ اس کے ہاتھ میں چائے کی ٹرے تھی۔

''صبح بخیر۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''یہ لیں آپ کے لیے چائے حاضر ہے۔''

''لیکن... آ... تم کون ہو؟''

''ارجمند نام ہے میرا۔'' اس نے بتایا۔ ''فی الحال تم شاور لے کر چائے وغیرہ پی کر لاؤنج میں آ جاؤ۔ ہم وہاں تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

میں نے چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے لی۔

ارجمند مجھے اچھی لگی تھی۔ انسان کا چہرہ اس کے دل کا آئینہ ہوتا ہے۔ اس کا چہرہ بہت صاف تھا۔ تو اس کا دل بھی صاف ہو گا لیکن وہ تھی کون؟

کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ شاہد نے رات کے وقت اس کو بھی بلا لیا ہو۔ اس کے انداز... بتا رہے تھے کہ وہ اس اپارٹمنٹ کے لیے اجنبی نہیں ہے۔ اس کا یہاں آنا جانا لگا

اہم انتباہ

جملہ اشتہارات (جن کے مندرجات سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں ہوتا) نیک نیتی کی بنیاد پر شایع کیے جاتے ہیں۔ مشتہرین کے لیے ادارے کی معرفت آنے والی ڈاک ضایع کر دی جاتی ہے، قارئین رابطے یا معلومات کے لیے براہ راست مشتہرین سے رجوع کریں۔ اس ضمن میں کسی نقصان یا شکایت کی صورت میں جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمے داری نہیں ہوگی۔

رہتا ہوگا۔

بہرحال، جب میں لاؤنج میں پہنچی تو وہاں اس ارجمند کے علاوہ شاہد اور ایک شخص بھی تھا۔ گورا رنگ اور ہلکی لیکن گھنی مونچھوں نے اسے خاصا دلکش بنا دیا تھا۔

''روشی۔'' شاہد نے مجھے مخاطب کیا۔ ''ان سے ملو۔ یہ ہیں میرے دوست ارسلان۔ اور یہ ان کی مسز ارجمند۔ یہ اپارٹمنٹ ان ہی کا ہے۔ تم تو سو رہی تھیں۔ یہ دونوں رات کو آئے تھے۔''

او تو اب معاملہ واضح ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ہم اِدھر اُدھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ دونوں میاں بیوی بہت خوش اخلاق اور زندہ دل ثابت ہو رہے تھے۔

''ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے شاہد سے کہا۔ ''شاہد! میرا خیال ہے کہ اب ہمیں واپس جانا چاہیے۔''

''اتنی بھی کیا جلدی ہے، دو چار دن رک جاؤ۔'' ارجمند نے کہا۔

''نہیں، رکنا مشکل ہوگا۔'' شاہد بھی بول پڑا۔ ''میں نے سوچا ہے کہ میں روشی کا امتحان لیتا ہوا چلوں گا۔''

''کیسا امتحان؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمہاری ڈرائیونگ کا۔ تم کہتی ہو نا کہ تمہاری ڈرائیونگ بہت اچھی ہے۔ تو میں وہی دیکھنا چاہتا ہوں۔''

''ڈرائیونگ تو اچھی ہے لیکن مری کی خطرناک سڑکوں پر میں گاڑی نہیں چلا سکتی۔'' میں نے کہا۔

''تم تو بہت حوصلے اور بہادری کی باتیں کر رہی تھیں پھر کیوں ڈر رہی ہو؟''

''شاہد! کیا بے وقوفوں جیسی بات کر رہے ہو۔'' ارسلان نے بھی کہا۔ ''اچھے اچھے مردوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے ہیں اور تم بے چاری روشی سے کہہ رہے ہو۔''

''تو یہ کہہ دیں کہ عورت ایک کمزور مخلوق ہے۔''

''نہیں، میں یہ نہیں کہوں گی۔'' میں جلدی سے بول پڑی۔ ''شاہد مجھے تمہارا یہ چیلنج منظور ہے۔''

''یہ بات ہوئی نا۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''اب تم یہاں سے اکیلی گاڑی چلاتی ہوئی گھوڑا گلی تک جاؤ گی۔ وہاں ہم سب تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔''

''شاہد! یہ حماقت مت کرو۔'' ارجمند نے کہا۔

''نہیں ارجمند۔'' میں نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ ''میں اتنی کمزور دل کی نہیں ہوں۔ میں وہی کروں گی جو شاہد چاہتا ہے۔''

''تو پھر یہ طے پایا کہ ہم تم سے پہلے گھوڑا گلی کی طرف نکل جائیں گے۔'' شاہد نے کہا۔

لیکن ایسا نہیں ہو سکا۔

شاہد کی گاڑی کا انجن ہی سیز ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے طور پر بہت کوشش کر کے دیکھ لی لیکن انجن اسٹارٹ ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

''کیا ہو گیا ہے اس کم بخت کو؟'' وہ گاڑی کو ٹھوکر مارتے ہوئے بولا۔

''اب تم اپنی گاڑی یہیں رہنے دو۔'' ارسلان نے کہا۔ ''یہ مقابلہ اب ختم ہو گیا ہے۔ میں تم دونوں کو اسلام آباد پہنچا دیتا ہوں۔ ہم بھی اسی طرف جا رہے ہیں۔ واپس آ کر تمہاری گاڑی کسی اچھے مکینک کے حوالے کر دیں گے۔''

شاہد کے تاثرات بہت عجیب ہو رہے تھے۔ شاید اسے اس بات پر مایوسی ہو رہی تھی کہ وہ میری مہارت نہیں دیکھ پایا تھا۔

روانہ ہونے سے پہلے مجھے اپنے بیگ کا خیال آ گیا۔ جسے میں لاؤنج میں یا اپنے کمرے میں بھول آئی تھی۔ میں معذرت کر کے اپارٹمنٹ میں واپس آ گئی۔

میرا بیگ لاؤنج میں نہیں تھا۔ وہ اس کمرے میں ہو سکتا تھا جہاں میں نے رات گزاری تھی لیکن وہ بیگ کمرے میں ہی تھا۔ میں نے عادت کے مطابق اسے چیک کرنے کے لیے جب اس کی زپ کھولی تو ایک اجنبی سا کارڈ اس میں رکھا دکھائی دے گیا۔ حیرت انگیز بات تھی۔

وہ گتے کا ایک چوکور ٹکڑا تھا جس پر کسی نے لکھ دیا تھا۔

''خطرہ۔ تم اپنی جان بچا سکتی ہو تو بچا لو۔ اور شاہد سے دور رہو۔ وہ تمہارا قاتل ہونے جا رہا ہے۔''

میں کانپ کر رہ گئی۔

کئی طرح کے سوالات سانپ کی طرح کلبلانے لگے۔ ایسا کون ہو سکتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اسلام آباد سے آتے ہوئے اس قسم کی کوئی چیز میرے بیگ میں نہیں تھی اور اب کہاں سے آ گئی تھی۔

اس اپارٹمنٹ میں تو صرف شاہد تھا۔ یا وہ دونوں تھے جو بعد میں آئے تھے۔

پھر یہ کارڈ کس نے رکھا ہوگا۔ مجھے وہ آدمی بھی یاد آ گیا۔ جس کے شور سے میری آنکھ کھل گئی تھی اور جس نے چوکور خانوں والا کوٹ پہن رکھا تھا۔

میں نے وہ کارڈ دوبارہ بیگ میں رکھ لیا۔ نہ جانے

کیوں میں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھی۔ اس وقت خاموشی میں مصلحت تھی۔ اگر ان تینوں میں سے کوئی ہوگا تو وہ میرے ہاتھ میں بیگ دیکھ کر اس کے تاثرات کچھ بدل جائیں گے۔ وہ یہ جاننے کی کوشش کرے گا کہ میں نے اس کا لکھا ہوا کارڈ پڑھا یا نہیں۔

لیکن ایسی کوئی بات نہیں ہوئی۔

کسی کے تاثرات نہیں بدلے۔ کسی نے تجسس بھری نگاہوں سے میری طرف نہیں دیکھا۔ سب کچھ نارمل تھا۔

اسلام آباد آنے تک کچھ بھی نہیں ہوا۔ ان لوگوں نے میرے فلیٹ کی بلڈنگ کے گیٹ پر مجھے اتارا اور خود واپس چلے گئے۔

میرے سوچنے کے لیے بہت مواد تھا۔

آخر یہ سب کیا اور کیوں ہو رہا تھا۔ وہ بار بار آنے والی کالز۔ وہ کسی چیز کا گرنا۔ شاہد کی طرف سے خبردار کرنا۔ اور پھر میرے بیگ میں رکھا ہوا کارڈ۔ یہ سب کس کی طرف اشارہ کر رہے تھے؟

☆☆☆

ہم اپنے شہر واپس آ گئے۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے میں نے صدیوں کا سفر طے کیا ہو۔ کیسے کیسے واقعات ہوئے تھے۔ کیسی کیسی پریشانیاں ہوئی تھیں۔

موت کس کس انداز سے میرے قریب آتی رہی تھی۔

ایک انسان کے کتنے چہرے میرے سامنے آئے تھے۔ میں اس سفر کو بھلا نہیں سکتی۔ نہ جانے میری ذات سے وابستہ خطرے ختم بھی ہوئے تھے یا نہیں۔

شاہد مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ اس کے دوست ارسلان اور ارجمند واپس آ گئے ہیں۔

دو دن کے بعد شاہد کا فون آیا۔ اب مجھے اس کی کمی محسوس ہوا کرتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ وہ میرے قریب رہے۔ مجھے حوصلہ دیتا رہے۔

شاہد مجھے بتا رہا تھا۔ ''روشی! کیا تمہیں اندازہ ہو سکتا ہے کہ میری گاڑی کس طرح خراب ہوئی ہوگی؟''

''نہیں، مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔''

''اس کے انجن کو چینی ڈال کر سیز کر دیا گیا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''یہ بہت عام سی تکنیک ہے۔ لیکن مجھے حیرت ہے کہ میری گاڑی کے ساتھ ایسا کیوں ہوا اور کس نے کیا ہو گا؟''

اور ایک بار پھر میرے دھیان میں وہ رات آ گئی۔

کیا آپ
لبوب مُقوّی اعصاب
کے فوائد سے واقف ہیں؟

کھوئی ہوئی توانائی بحال کرنے اعصابی کمزوری دور کرنے تھکاوٹ سے نجات اور مردانہ طاقت حاصل کرنے کیلئے کستوری عنبر زعفران جیسے قیمتی اجزاء والی بے پناہ اعصابی قوت دینے والی لبوب مُقوّی اعصاب ایک بار آزما کر دیکھیں۔ اگر آپ کی ابھی شادی نہیں ہوئی تو فوری طور پر لبوب مُقوّی اعصاب استعمال کریں۔ اور اگر آپ شادی شدہ ہیں تو اپنی زندگی کا لطف دوبالا کرنے یعنی ازدواجی تعلقات میں کامیابی حاصل کرنے کیلئے بے پناہ اعصابی قوت والی لبوب مُقوّی اعصاب ٹیلیفون کر کے گھر بیٹھے بذریعہ ڈاک وی پی VP منگوالیں فون صبح 10 بجے تا رات 9 بجے تک

المسلم دار الحکمت (رجسٹرڈ)
(دیسی یونانی دواخانہ)
ضلع و شہر حافظ آباد پاکستان

0300-6526061
0301-6690383

آپ صرف فون کریں۔ آپ تک لبوب مقوی اعصاب ہم پہنچائیں گے

جب میں نے کھڑکی سے باہر آواز سنی تھی۔ اور ایک چوکور خانوں والا کوٹ پہنے ایک آدمی یاد آنے لگا۔

تو کیا وہ شخص صرف اس لیے آیا تھا کہ شاہد کے انجن میں چینی ڈال کر اسے سیز کر دے لیکن کیوں؟ کیا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ میں اس دوڑ میں حصہ لوں۔

کیا اسے معلوم تھا کہ شاہد مجھ سے کہے گا کہ میں مری کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتی ہوئی گھوڑا گلی تک پہنچ جاؤں اور یہ بات کس کو معلوم ہو سکتی تھی۔

''روشی! آج شام کیا کر رہی ہو؟'' شاہد کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔

''کوئی خاص نہیں۔'' میں نے بتایا۔ ''خیریت؟''

''ایک پارٹی میں چلنا ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بہت خاص قسم کی پارٹی ہے۔ یہاں اس قسم کی تقریبات بالکل بھی نہیں ہوتی ہیں۔''

''کیا خاص بات ہے اس پارٹی میں؟''

''یہ ایک فینسی ڈریس شو ٹائپ کی پارٹی ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''ہر شخص ماسک پہن کر اس میں شریک ہوگا۔ میں نے اپنے لیے ایک ماسک لے لیا ہے۔ تم بھی اپنے لیے اپنی مرضی کا ماسک لے لو۔''

''یہ ہے تو بہت تھرلنگ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ایسی پارٹی کا مقصد کیا ہے؟''

''انجوائے منٹ... اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''اب میں یہ نہیں بتاؤں گا کہ میرے پاس کیسا ماسک ہے۔ اسی طرح تم بھی اپنا ماسک مجھ سے چھپائے رکھنا۔ ہم دونوں وہاں پہنچ کر ماسک پہن لیں گے۔ اس کا خاص طور پر انتظام کیا گیا ہے کہ مہمان ایک دوسرے کے ماسک سے واقف نہ ہو سکیں۔ پھر سب بڑے ہال میں جمع ہو جاتے ہیں اور اصل مزہ وہیں آتا ہے۔''

''اور ایسا ماسک کہاں ملتا ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''پورے شہر میں صرف ایک ہی اسٹور ہے۔ Rainy Day وہاں سے مل جائے گا۔''

مجھے بھی یہ ایڈونچر سننے میں اچھا محسوس ہوا تھا اسی لیے میں نے ہامی بھر لی۔ ''اوکے، میں چلوں گی۔ لیکن ماسک لینے کے بعد کیا ہوگا؟''

''پھر تم میرے ساتھ اس مکان میں چلو گی جہاں یہ پارٹی ہو رہی ہے۔''

''لیکن وہ مکان ہے کس کا؟''

''اس شہر کے ایک نوجوان بزنس مین منصور کا۔'' شاہد نے بتایا۔ ''اس کا باپ بھی ایک بڑا بزنس مین تھا۔ جلال نام تھا اس کا۔''

میرے ذہن میں جیسے طوفان سے اٹھنے لگے۔ یہ وہی جلال تھا میرے خاندان کی تباہی کا ذمے دار۔ منصور اسی کے بیٹے کا نام تھا۔ جس نے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا۔ میں نے تو ان کم بختوں کو اپنے ذہن سے جھٹک ہی دیا تھا لیکن آج پھر ان کا ذکر بننے کو مل رہا تھا۔

وہ بدمعاش قسم کا نوجوان اب ایسی پارٹیز کرنے لگا تھا۔ یہ بھی اس کی عیاشی کا ایک پہلو ہو سکتا تھا۔

آج اس کے بنگلے میں داخل ہونے کا موقع مل رہا تھا لیکن کس انداز میں۔

پھر میں نے ایک فیصلہ کر لیا۔ میں نے شاہد سے کہا۔ ''ٹھیک ہے شاہد، میں تمہارے ساتھ چلنے کے لیے تیار ہوں۔ میں جا کر ماسک لے آتی ہوں۔ ایسا موقع تو زندگی میں کبھی کبھی ہی ملتا ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ میں ٹھیک سات بجے تمہیں لینے آجاؤں گا۔''

میں نے اپنے لیے ایک بوڑھی عورت کا ماسک منتخب کیا تھا۔ مجھے اس دکان کے بارے میں اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہاں اس قسم کے ماسک ملتے ہوں گے۔''

بوڑھی عورت کا ماسک انتہائی خوبی سے بنایا گیا تھا۔ زبردست کاریگری تھی۔ ہونٹوں کا سکڑاؤ۔ چہرے کی جھریاں۔ سفید بال۔ سب کچھ بالکل اور بیجل دکھائی دے رہے تھے۔

شام سات بجے میں شاہد کے ساتھ اس زبردست اور شاندار بنگلے میں داخل ہو رہی تھی جو ہمارے خاندان کے دشمن کا تھا۔ میں نے شاہد کو اپنے ماسک کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا اور خود اس نے بھی خاموشی اختیار کر رکھی تھی۔

اس نے جیسا کہا تھا، ویسا ہی ہوا۔

اس پارٹی میں ایسا اہتمام کیا گیا تھا کہ کسی کو ایک دوسرے کے ماسک کا پتا نہ چل سکے۔

تقریب کے ہال میں بہت گہما گہمی تھی۔

طرح طرح کے لوگ دکھائی دے رہے تھے۔ سب نے ماسک پہن رکھے تھے۔ کوئی چیل بنی ہوئی تھی۔ کوئی بھوت نظر آ رہا تھا۔ کوئی شہزادہ تھا۔ کوئی انارکلی تھی۔

یہ پتا چلانا مشکل تھا کہ کون کس روپ میں ہے۔ میں نے منصور کو نہیں دیکھا تھا۔ لیکن آج اسے دیکھنا چاہتی تھی۔ میرے دل میں اس کے لیے آگ بھڑک رہی تھی۔

ویسے تو میں نے اس آگ کو بہت عرصہ پہلے بجھا دیا تھا لیکن یہاں آنے کے بعد وہ پھر بھڑک اٹھی تھی۔ ہال میں ایک طرف ڈائس بنا ہوا تھا۔ جس پر ایک بینڈ تازہ دھن بجا رہا تھا۔ صرف وہی لوگ ماسک میں نہیں تھے۔ ان کے علاوہ سب نے ماسک پہن رکھے تھے۔

میں اور شاہد یہاں آ کر ایک دوسرے سے الگ ہو گئے تھے۔ اب میں نہیں جانتی تھی کہ وہ کس روپ میں ہال میں موجود ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ اس ہال میں شاہد کے علاوہ اور کچھ لوگ ہوں جنہیں میں پہچانتی ہوں گی۔ لیکن فی الحال تو کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

اچانک موبائل کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔

دوسری طرف سے کہا جا رہا تھا۔ ''مبارک ہو روشی! تم اپنی موت کے قریب پہنچ چکی ہو۔''

''کون ہو تم؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمہارا وہی ہمدرد۔ جو تمہیں شاہد سے دور رہنے کے لیے کہتا آیا ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''کیا تم یہ بتا سکتی ہو کہ تمہارا دوست شاہد اس ہال میں کہاں ہے؟''

''نہیں، یہ میں نہیں جانتی۔''

''کوئی بھی نہیں جانتا۔'' اس نے کہا۔ ''اگر کوئی کسی کا خون کر دے تو کوئی بھی نہیں بتا سکے گا کہ مارنے والا کون تھا۔''

اتنا کہہ کر دوسری طرف سے موبائل آف کر دیا گیا۔

میں ہیلو ہیلو کہتی رہ گئی۔ اس وقت ایک انجانا سا خوف میری رگوں میں سرایت کرتا جا رہا تھا۔ یہ واقعی ایک خطرناک سچویشن تھی۔

اگر کوئی بھی کسی کا خون کر دیتا تو ماسک کی وجہ سے کیا پتا چلتا۔ وہ بعد میں اپنا ماسک اتار کر ایک طرف پھینک کر مہمانوں میں آ کر شامل ہو جاتا اور لوگ اس مارنے والے کو تلاش ہی کرتے رہ جاتے۔

لیکن کیوں؟

شاہد مجھے کیوں مارنا چاہے گا۔ اس کی مجھ سے کیا دشمنی تھی۔ وہ تو میرا دوست تھا۔

میں ابھی یہ سب سوچ ہی رہی تھی کہ اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ اور اسی وقت اندھیرا چھا گیا تھا۔ ہال میں کئی چیخیں گونجنے لگیں۔

ہاتھ پکڑنے والے نے ایک جھٹکے سے مجھے ایک طرف کھینچ لیا۔ اس کے ساتھ ہی گولی چلنے کی آواز آئی۔ ایک بھیانک سی چیخ اور بے پناہ افراتفری۔

ہاتھ تھامنے والا اس اندھیرے میں مجھے ایک طرف دوڑائے لیے جا رہا تھا اور میں اس کے ساتھ تھی۔ بالکل بدحواسی کے عالم میں۔

کئی گھماؤ پھراؤ کے بعد اس نے ہلکے سے مجھے ایک طرف دھکیل دیا اور اس کے ساتھ روشنی ہو گئی۔ میں ایک چھوٹے سے کمرے میں تھی۔

یہاں بہت خوب صورت فرنیچر تھا۔ پورے کمرے میں سفید رنگ نمایاں تھا۔ اور میرے سامنے ایک شہزادہ کھڑا تھا۔ میرا مطلب ہے شہزادے کے ماسک اور گیٹ اپ میں ایک آدمی۔ وہی مجھے یہاں تک لایا تھا۔

''کیا بات ہے، کون ہو تم؟ مجھے یہاں کیوں لائے ہو؟''

''لڑکی! اپنی جان بچنے پر شکر ادا کرو۔'' اس نے کہا۔ ''... تمہارے لیے چلائی ہوئی گولی نے شاید کسی اور کی جان لے لی ہے۔''

''کیا؟'' میں سکتے میں رہ گئی۔ ''میری طرف... گولی؟''

''ہاں، تم نے گولی کی آواز تو سن ہی لی ہوگی۔'' اس نے کہا۔ ''وہ تم پر چلائی گئی تھی لیکن میں نے عین وقت پر تمہیں وہاں سے ہٹا لیا۔''

''میرے خدا! میں پاگل ہو جاؤں گی۔ آخر کون ہے میرا دشمن اور تم کون ہو؟''

''تمہارا دشمن شاہد ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''میں کئی بار تمہیں فون پر بتا بھی چکا ہوں۔''

''لیکن کیوں؟ وہ میرا دشمن کیوں ہونے لگا۔ میں نے اس کا کیا بگاڑا ہے؟''

''تم نے اس کی توہین کی... اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اپنی توہین کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کرتے۔''

''لیکن میں نے تو اس کی کبھی توہین نہیں کی۔''

''تم نے اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔''

''میں نے... میں نے کب انکار کیا۔ ہمارے درمیان ایسی بات تو کبھی نہیں ہوئی۔''

''روشی! تم نے مسٹر جلال کے لڑکے منصور سے شادی کرنے سے انکار کیا تھا نا؟''

''ہاں تو پھر؟''

''شاہد وہی منصور ہے۔ منصور شاہد پورا نام ہے اس کا۔'' اس نے بتایا۔

میں چکرانے لگی۔ ''نہیں، یہ... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

''ایسا ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اس نے ایک پلانگ کے تحت تم سے دوستی کی ہے۔ تمہارے قریب آیا ہے۔''

''اور تم... تم کون ہو؟''

اس نے اپنا ماسک اتار دیا اور وہ ارسلان تھا۔ شاہد کا وہ دوست جس کا اپارٹمنٹ مری میں تھا۔

میں شاید بے ہوش... ہوتی جارہی تھی۔

☆☆☆

ایک بار پھر ہم کہیں اور چلے جارہے تھے۔

یہ گاڑی ارسلان کی تھی۔ اس نے دوبارہ اپنا ماسک پہن لیا تھا اور مجھے اس بنگلے کی بھول بھلیوں سے نکال کر باہر لے آیا تھا۔ پتا چلا تھا کہ میرے دھوکے میں ایک اور لڑکی کو گولی لگ گئی ہے لیکن اس کی حالت تشویشناک نہیں تھی۔

پارکنگ میں ارسلان کی بیوی ارجمند گاڑی کے پاس کھڑی تھی۔

بنگلے میں ایک افراتفری مچی ہوئی تھی اور ہم کسی طرح وہاں سے نکل آئے تھے۔

گاڑی میں بیٹھ جانے کے لیے ہم تینوں نے ماسک اتار دیے۔ اس وقت میرے ذہن پر دھند طاری تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر یہ سب کیا ہورہا ہے۔

ارسلان اور اس کی بیوی مجھے کہاں لے جارہے ہیں لیکن اتنا احساس ہوگیا تھا کہ یہ دونوں میرے ہمدرد ہیں۔ اور مجھے موت کے منہ سے نکال کر لائے ہیں۔

گاڑی پندرہ بیس منٹ تک تیز رفتاری سے چلتی رہی۔ رات کی وجہ سے سمت کا اندازہ بھی نہیں ہورہا تھا۔ بہرحال، گاڑی ایک بڑے سے مکان کے گیٹ میں داخل ہوگئی۔

''اب تم یہاں محفوظ ہو۔'' ارسلان کی بیوی ارجمند نے کہا۔ ''شاہد کے تصور میں بھی نہیں ہوگا کہ ہم تمہیں یہاں لے آئے ہیں۔''

اس وقت ہم اس مکان کے ڈرائنگ روم میں تھے۔

''تم دونوں کا بہت بہت شکریہ۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ سب آخر ہے کیا۔ وہ مجھے کیوں مارنا چاہتا ہے؟ تم لوگ مجھے کیوں بچا رہے ہو؟ جبکہ تم دونوں شاہد کے دوست ہو۔ اگر یہ وہی منصور ہے تو...''

''ہاں، یہ وہی منصور ہے۔'' ارسلان نے بتایا۔ ''جلال کا بیٹا۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ تمہارے پاپا اور جلال دوست ہوا کرتے تھے۔ لیکن تمہارے پاپا کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جلال ایک دھوکے باز انسان ہے۔ اس نے تمہاری ساری دولت دھوکے سے اپنے قبضے میں کرلی۔ اور تمہارے پاپا کے سامنے شرط رکھی کہ منصور سے اگر تمہاری شادی ہوجائے تو پھر وہ کوئی کارروائی نہیں کرے گا۔''

''ہاں، یہ سب میں جانتی ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''اور میں نے بہت سختی سے اس رشتے کے لیے انکار کردیا تھا۔''

''بس تو شاہد کو یہ گوارا نہیں ہوا۔ وہ اپنی توہین پر بلبلا اٹھا۔'' اس کے باپ نے جو کچھ کیا، وہ تو ایک الگ کہانی ہے لیکن اس نے تم کو مارنے کا منصوبہ بنالیا اور ایک پلانگ کے تحت تمہارے نزدیک آنے لگا۔ اس نے تم سے دوستی کرلی۔ اس کے خطرناک ارادے ہمارے علم میں آگئے اور ہم تمہیں بار بار آگاہ کرتے رہے۔''

''تو وہ فون تم دونوں کرتے تھے؟''

''ہاں، تمہیں اس کی طرف سے ہوشیار کرنے کے لیے۔'' ارجمند نے کہا۔ ''وہ ایک منصوبے ہی کے تحت تمہیں اپنے ساتھ مری لے گیا تھا۔ اس رات میں اور ارسلان تمہیں خبردار کرنے کے لیے فوری طور پر اسلام آباد سے مری چلے گئے تھے۔ ہمیں اس کی باتوں سے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ وہ اپنی گاڑی تمہارے حوالے کردے گا۔''

''تاکہ تم اسے چلاتی ہوئی خطرناک حادثے کا شکار ہوجاؤ۔'' ارسلان نے بات آگے بڑھائی۔ ''کیونکہ اس نے تمہارے کمرے میں چلے جانے کے بعد گاڑی کے بریک فیل کردیے تھے۔''

''اوہ گاڈ۔'' میں کانپ کر رہ گئی۔

''اور اسی لیے ارسلان نے اس گاڑی کے انجن میں شگر ڈال کر اسے سیز کردیا تھا۔'' ارجمند نے بتایا۔

''اوہ، تو وہ تم تھے۔'' میں نے ارسلان کی طرف دیکھا۔

''ہاں، وہ میں تھا۔ میں اندھیرے میں کسی چیز سے ٹکرا گیا تھا۔ جس سے تمہاری آنکھ کھل گئی اور تم نے کھڑکی کھول کر مجھے دیکھ لیا تھا۔''

''پھر آج کیا ہوا؟''

''وہ ہر سال فینسی ڈریس شو اپنے مکان میں کیا کرتا ہے۔'' ارسلان نے بتایا۔ ''اس بار یہ پارٹی پندرہ دنوں پہلے کی گئی۔ صرف تمہاری وجہ سے۔ تاکہ تمہیں نشانہ بنایا جاسکے اور ہم نے اس کی یہ پلانگ بھی ناکام بنادی۔''

''لیکن کیوں؟ سوال وہی ہے کہ تم دونوں کو آخر مجھ سے کیوں دلچسپی ہوگئی؟''

''اس لیے کہ تمہارے پاپا جلال صاحب ہمارے باس ہوتے تھے۔'' ارسلان نے بتایا۔ ''ہم دونوں ہی

تمہارے پاپا کی فرم میں جاب کرتے تھے۔ یہ سمجھ لو کہ ہماری شادی بھی انہوں نے کرائی ہے۔ وہ ہمارے محسن تھے اور ہم ان کے احسانات کا بدلہ اتارنے کی کوشش کررہے ہیں۔''

''اوہ، تو یہ بات تھی۔''

''ہاں، اب تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ تم کچھ دنوں تک یہیں رہو۔'' ارجمند نے کہا۔ ''وہ اس وقت جھلا کر تمہیں پورے شہر میں تلاش کررہا ہوگا۔ یوں سمجھ لو کہ وہ اس وقت زخمی سانپ کی طرح تلملایا ہوا ہے۔ ہم اس کے قریب رہ کر تمہیں اس کی پلانگ سے آگاہ کرتے رہیں گے۔''

''اور ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس کی گولی نے کس بدنصیب کو نشانہ بنایا ہے۔'' ارسلان میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تم بے فکر ہوکر یہاں رہ سکتی ہو۔ یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔''

''ایک بات تو بتاؤ۔'' میں نے کچھ سوچ کر پوچھا۔ ''کیا صرف اتنی سی بات کے لیے کوئی شخص ایسی خطرناک پلانگ بھی کرسکتا ہے؟''

''میں کسی اور کے بارے میں تو نہیں کہہ سکتی۔ لیکن منصور اسی مزاج کا ہے۔'' ارجمند نے کہا۔ ''خیر، تم یہاں رہو۔ اس گھر میں تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ باہر گیٹ پر چوکیدار موجود ہے۔ کوئی ضرورت ہو تو اسے بتادینا۔''

''ٹھیک ہے، تم جاؤ۔''

☆☆☆

سوچتے سوچتے میرے دماغ کی چولیں ہل گئیں۔

کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ شاہد کی ایسی بے رحمی میرے خیال میں بھی نہیں آرہی تھی۔ اس نے مجھے قابو میں کرنے اور مارنے کے لیے ایسی منصوبہ بندی کی تھی۔

خدا نے ان دونوں میاں بیوی کو میرا ہمدرد بنا کر بھیج دیا تھا۔ ورنہ میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا تھا۔

رات بھیگ چلی تھی۔

اس وقت شاید گیارہ یا ساڑھے گیارہ بجے ہوں گے جب موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ اتنی دیر کے بعد یہ پہلا فون آیا تھا۔ میں نے دیکھا۔ وہ نمبر شاہد کا تھا۔ اس نے مجھے فون کیا تھا لیکن کیوں؟

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔

گھنٹی دوبارہ بجی۔ اس بار میں نے اس کی کال وصول کرلی تھی۔ ''روشی! کہاں ہو تم؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ ''تم اچانک کہاں غائب ہوگئی تھیں؟''

''تم کیا سمجھتے ہو کہ میں پھر تمہارے چنگل میں آجاؤں گی؟''

''کیا حماقت ہے۔ تم یہ کیا کہہ رہی ہو؟''

''مجھے سب پتا چل گیا ہے شاہد۔'' میں نے کہا۔ ''تم میرے سب سے پرانے دشمن ہو۔ تمہارا باپ بھی ہمارے خاندان کا دشمن تھا۔ اسی نے ہمیں تباہ کیا ہے اور اب تم مجھے مارنا چاہتے ہو۔''

''کیا بکواس ہے۔ یہ سب کیا کہہ رہی ہو؟''

''تم یہ بتاؤ کہ کیا تم جلال کے بیٹے منصور شاہد نہیں ہو؟'' میں نے پوچھا۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''جواب دو۔ کیا تم وہی نہیں ہو جس نے میرے لیے اپنا رشتہ بھیجا تھا؟''

''ہاں، ہاں... میں وہی ہوں لیکن اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟''

''فرق یہ پڑتا ہے کہ تم نے مجھے بھی مارنے کی کوشش کی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن اب تم اطمینان رکھو۔ میں تمہارے ہاتھ نہیں آنے والی۔ میں تم سے جان بچا کر ایک محفوظ جگہ پر آچکی ہوں۔''

''کون لایا ہے تمہیں... کہاں پر ہو؟''

''سوری، میں یہ سب نہیں بتاؤں گی۔ تم نے مجھے مارنے کے لیے پارٹی میں کسی بے گناہ پر گولی بھی چلوادی تھی۔ میری قسمت اچھی تھی جو عین وقت پر اس ہمدرد نے مجھے بچالیا۔''

''روشی! یہ سب غلط ہے۔ میں نے کسی پر گولی نہیں چلوائی۔ اور تم کس ہمدرد کی بات کررہی ہو۔ کون ہے وہ؟''

میں نے موبائل آف کردیا۔

گھنٹی بجتی رہی۔ بجتی رہی لیکن اب اس کی کال ریسیو نہیں کررہی تھی۔ ان دونوں میاں بیوی کی یہ بات درست ہوگئی تھی کہ شاہد ہی جلال کا بیٹا ہے اور اس کا نام منصور شاہد ہے اور اس نے خاص پلانگ کے تحت مجھ سے دوستی کی ہے۔ میرے قریب آیا ہے۔

دو بجے رات کے وقت دونوں میاں بیوی کی واپسی ہوئی تھی۔ ہم لاؤنج میں آکر بیٹھ گئے۔ ارجمند چائے بنا کر لے آئی تھی۔ میں ان دونوں سے صورتِ حال جاننے کے لیے بے چین ہورہی تھی۔ بالآخر ارسلان نے کہا۔ ''روشی! تمہارے سر پر منڈلانے والا خطرہ وقتی طور پر تو ٹل گیا ہے لیکن صرف وقتی طور پر۔ وہ کمینہ کسی بھی وقت تمہاری جان لے سکتا ہے۔''

''میرے پاس اس کی کال بھی آئی تھی۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ پوچھ رہا تھا کہ میں کس کے ساتھ ہوں؟''

''تم نے کچھ بتایا تو نہیں؟''

''نہیں، میں اتنی پاگل نہیں ہوں کہ تم دونوں کے بارے میں بتا دیتی۔'' میں نے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ پارٹی میں کیا ہوا۔ گولی کس کو لگی تھی؟''

''ایک عورت کو۔'' ارجمند نے بتایا۔ ''لیکن وہ صرف زخمی ہوئی ہے۔''

''اب پتا چلا کہ کہانی کچھ اور ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''میں بھی الجھا ہوا تھا کہ صرف شادی سے انکار کی وجہ سے کوئی آدمی اس طرح کسی کے پیچھے نہیں پڑتا۔ اب پتا چلا کہ بات کچھ اور ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''لاکر نمبر اٹھارہ۔'' اس نے بتایا۔

''لاکر نمبر اٹھارہ، یہ کیا ہے؟''

''کسی بینک کا..... لاکر ہے۔'' ارسلان نے کہا۔ ''اس میں تمہارے پاپا کے ایسے کاغذات ہیں جو جلال اور اس کے پورے کاروبار کو برباد کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ تمہارے پاپا نے اپنی زندگی میں ایسے کاغذات تیار کروا کے لاکر میں رکھوا دیے تھے۔ ان پر جلال کے دستخط بھی موجود ہیں۔''

''لیکن پاپا نے تو ایسا کوئی ذکر نہیں کیا۔''

''ہو سکتا ہے آدمی جب الجھا ہوا ہو تو بہت سی باتیں اس کے ذہن سے نکل جاتی ہیں۔'' ارجمند نے کہا۔ ''شاہد کو ان کاغذات کا علم ہے اسی لیے وہ تم سے دوستی کر رہا تھا تاکہ تم سے لاکر کی چابی حاصل کر کے کاغذات کو ضائع کر سکے۔''

''یہ تو بے وقوفی کی بات ہوئی۔ جب میں اس کی پلاننگ سے مر جاتی تو پھر چابی کیسے حاصل کر سکتا تھا؟''

''ہاں، میں بھی اسی نقطے پر سوچ رہا ہوں۔ پھر چیمہ صاحب سے ملنے کے بعد ساری پوزیشن کلیئر ہو گئی ہے۔''

''کون چیمہ صاحب؟''

''بینک منیجر۔'' ارسلان نے بتایا۔ ''جن کے بینک میں وہ لاکر ہے۔ وہ کاغذات ان کے سامنے لاکر میں رکھے گئے تھے۔ اس وقت جلال بھی موجود تھا۔ اس زمانے میں تمہارے پاپا اور جلال ایک دوسرے کے دوست ہوا کرتے تھے۔''

''ہم لوگ اس وقت چیمہ صاحب کے گھر سے ہی آ رہے ہیں۔'' ارجمند نے بتایا۔

''معاہدے کے مطابق اس لاکر پر پہلا حق تمہارے پاپا کا اور اس کے بعد تمہارا ہے۔ یعنی یا تو تمہارے پاپا وہ لاکر کھول سکتے تھے یا پھر تم..... اگر دونوں میں سے کوئی نہ رہے تو پھر یہ حق خود بخود جلال یا اس کی اولاد کو ٹرانسفر ہو جاتا ہے۔''

''اوہ، اب سمجھی۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''یعنی میری موت کے بعد شاہد اس لاکر کو کھلوا سکتا ہے۔''

''ہاں، یہی بات ہے۔ کیونکہ اسے یہ خوف لاحق ہے کہ اگر تمہیں اس لاکر کا خیال آیا اور تم نے وہ کاغذات دیکھ لیے اور اپنا حق مانگنے کے لیے کھڑی ہو گئیں تو پھر وہ فٹ پاتھ پر آ جائے گا۔''

''تو پھر بتاؤ مجھے کیا کرنا چاہیے؟''

''اس لاکر کی چابی لے کر ہمارے ساتھ کل صبح بینک چلو اور لاکر کھول کر وہ فائل نکال لو۔''

''لیکن پاپا نے تو مجھے ایسی کوئی چابی نہیں دی۔'' میں نے بتایا۔

''کیا؟'' دونوں حیران رہ گئے۔ ''اتنے اہم لاکر کی چابی تمہیں نہیں دی۔''

''ہو سکتا ہے کہ افراتفری اور پریشانی کے عالم میں پاپا چابی دینا بھول گئے ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن ٹھہرو، مجھے کچھ یاد آ رہا ہے۔''

''خدا کے لیے یاد کرو۔ کیونکہ اسی چابی پر تمہاری زندگی اور تمہارے مستقبل کا انحصار ہے۔''

اس وقت پاپا کے حوالے سے بہت سی یادیں میرے دھیان میں گردش کر رہی تھیں۔ لاکر نمبر اٹھارہ۔ چابی... چابی... چابی۔ اور اچانک مجھے وہ چابی یاد آ گئی۔

پاپا نے ایک بار مجھے ایک چابی دیتے ہوئے کہا تھا۔ ''بیٹا! یہ رکھ لو۔ یہ ایک لاکر کی چابی ہے۔ اس میں جو کچھ ہے۔ وہ تمہارے کام آ جائے گا۔''

اور میں نے اس وقت زیادہ دھیان دینے کے بجائے وہ چابی اپنے پاس رکھ لی تھی۔ شاید اپنی الماری میں یا اپنی میز کی دراز میں یا اپنے بکس میں۔ یہ یاد نہیں آ رہا تھا۔ میں نے جب ان دونوں کو بتایا تو وہ اچھل پڑے۔ ''یہ بات ہوئی نا۔ خدا کے لیے یاد کرو۔ اپنے ذہن پر زور دو اور سوچو کہاں رکھی ہو گی؟''

''شاید میرے کسی سوٹ کیس میں ہو گی۔'' میں نے کہا۔

''بس، تو تمہارے گھر چلتے ہیں۔ اسے تلاش کر لو۔

کہیں نہ کہیں مل ہی جائے گی۔ اور میں بینک سے وہ فائل نکال کر لے آؤں گا۔"

"ارجمند۔" میں نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ "پاپا کی موت کے بعد میں نے وہ مکان چھوڑ دیا تھا اور ایک فلیٹ میں چلی گئی تھی۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ چابی میرے سوٹ کیس میں ہوگی۔"

"تو پھر چلو۔" ارجمند جلدی سے بولی۔ "ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

پھر ہم اس مکان سے چل پڑے۔ آدھ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم اس بلڈنگ میں پہنچ چکے تھے جس کی دوسری منزل پر میں نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے رکھا تھا۔

اس وقت رات کے تین بج چکے تھے۔ لیکن اس بھاگ دوڑ میں نیند مکمل طور پر غائب ہو چکی تھی۔ میں نے دروازہ کھولا۔ ہم سب اندر آ گئے۔ میں نے دیوار پر لگا ہوا بٹن آن کر دیا۔ روشنی ہوئی اور اس روشنی میں شاہد دکھائی دے گیا جو صوفے پر بیٹھا ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک پستول بھی تھا۔

☆☆☆

"تو تم اسے یہاں لے ہی آئے۔" شاہد نے ارسلان کی طرف دیکھا پھر مجھ سے مخاطب ہوا۔ "روشی! آؤ میرے قریب آ جاؤ۔ گھبراؤ نہیں۔ یہ دونوں تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔"

"روشی! یہی ہے تمہارا دشمن۔" ارسلان نے کہا۔ "تم اس کے پاس مت جانا... ورنہ۔"

"اوہ تو اب تم یہ چال چل رہے ہو۔" شاہد غصے سے بولا۔ "روشی!" اس نے میری طرف دیکھا۔ "دوست، دشمن میں تمیز کرنا سیکھو۔ یہ دونوں تمہیں مار دینا چاہتے ہیں۔"

"مکار انسان۔ روشی کو سب کچھ معلوم ہو چکا ہے۔" ارجمند نے کہا۔ "اب یہ تمہاری جال میں نہیں آئے گی۔"

اور اسی وقت مجھ سے ایک حرکت سرزد ہو گئی۔

یہ بہت جرأت مندانہ حرکت تھی۔ شاہد کچھ بھی کر سکتا تھا۔ لیکن مجھ پر تو جنون سوار ہو گیا تھا۔ میں یہ پہلے بتا چکی ہوں کہ میں نے سیلف ڈیفنس کی تربیت حاصل کی تھی۔ اسی سے اس وقت کام لیا تھا۔

میں نے اپنی جگہ سے جست لگائی اور شاہد پر جا پڑی اور کچھ اس انداز سے کہ اس کے ہاتھ سے پستول چھوٹ کر گر پڑا۔

ارسلان اور ارجمند کے لیے اتنا موقع بہت تھا۔ ارسلان نے جھپٹ کر پستول اٹھا لیا جبکہ شاہد حیران... سکتے کے عالم میں کھڑا رہ گیا۔ پھر اس نے میری طرف دیکھا۔

"روشی! یہ تم نے بہت بڑی حماقت کی ہے۔"

"بس، اب روشی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔" ارسلان نے کہا۔ "چپ چاپ سامنے والی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔"

شاہد خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے اعصاب تنے ہوئے تھے۔ وہ بار بار میری طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

ارسلان نے میری اور ارجمند کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو! اگر کہیں رسی مل جائے تو..."

"ہاں، میں جس رسی سے اپنے بستر وغیرہ باندھ کر لائی تھی وہ گھر میں ہی ہے۔" میں نے بتایا۔

"جاؤ، وہ لے کر آؤ۔ جلدی۔"

میں جانے لگی تو شاہد نے آواز دی۔ "روشی! تم بہت بڑی غلطی کر رہی ہو۔ یہ دونوں بہت مکار اور خطرناک ہیں۔"

"روشی کو معلوم ہے کہ کون مکار اور خطرناک ہے۔" ارجمند نے غصے سے کہا۔

دس منٹ کی تلاشی کے بعد مجھے وہ رسی مل گئی۔ میں اسے لے کر لاؤنج میں واپس آ گئی۔ ارسلان نے ابھی تک شاہد کو کور کر رکھا تھا۔

ان دونوں نے شاہد کو باندھنے سے پہلے پستول میرے حوالے کر دیا۔ "روشی! تم اسے کور کیے رکھو۔" ارسلان نے کہا۔ "اور جیسے ہی اس کی طرف سے کوئی شرارت دیکھو۔ گولی مار دینا۔"

"اوکے۔" میں نے پستول اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

اس وقت شاہد کی بے تابی دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے پھر مجھ سے کہا۔ "روشی! ہوش میں آؤ۔ تم جو کر رہی ہو وہ بہت غلط ہے۔"

لیکن میں اس کی میٹھی باتوں پر اب دھیان نہیں دینا چاہتی تھی۔ میں نے اس کی طرف سے اپنے کان بند کر رکھے تھے۔ میں بے حس ہو گئی۔ اگر قانون کا خوف نہیں ہوتا تو شاید اس وقت اسے گولی بھی مار دیتی۔

ان دونوں نے شاہد کو رسیوں سے جکڑ دیا تھا، وہ اب بے بسی کی تصویر بنا کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

"چلو، اب اس کی طرف سے اطمینان ہو گیا۔" ارسلان نے پستول واپس لینے کے لیے میری طرف ہاتھ

بڑھایا۔ "لاؤ یہ پستول مجھے دو۔ اور جا کر وہ چابی تلاش کرو۔"

میں نے پستول اسے واپس کیا اور ارجمند کے ساتھ اپنے کمرے میں آ گئی۔ اب مجھے وہ چابی تلاش کرنی تھی۔ جس پر میری زندگی اور مستقبل کا انحصار تھا۔

مجھے یاد آ رہا تھا کہ وہ چابی میں نے اپنے سوٹ کیس میں رکھی تھی لیکن چابی سوٹ کیس میں نہیں تھی۔ "کیا ہوا؟" ارجمند نے بے تابی سے پوچھا۔ "کہاں گئی چابی؟"

"پتا نہیں۔ یاد تو ہے کہ وہ سوٹ کیس ہی میں تھی۔ لیکن اب نہیں مل رہی۔"

"بے وقوف لڑکی۔ جلدی تلاش کرو۔" ارجمند نے کہا۔

اور اس وقت اچانک میرے ذہن میں کوئی چیز کلبلانے لگی۔ ایک سوالیہ نشان میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔

آخر کیوں؟

یہ لوگ اس چابی کو حاصل کرنے کے لیے اتنے بے تاب کیوں ہو رہے تھے۔

انہیں مجھ سے ایسی کون سی ہمدردی ہو گئی تھی کہ میرے لیے انہوں نے اتنی جدوجہد کی اور شاہد سے دشمنی مول لے لی۔ کیوں؟ پھر ارجمند کا رویہ، اس کی بے تابی، اس کی بوکھلاہٹ۔ یہ سب کیا ظاہر کر رہا تھا۔

"بتاؤ نا چابی کہاں ہے؟" ارجمند نے پھر کہا۔ "اس بار اس کا لہجہ پہلے سے زیادہ سخت تھا۔ "اگر چابی نہیں ملی تو پھر تم مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔"

"ارجمند! ایک بات بتاؤ۔ اگر چابی مل گئی تو پھر تم دونوں کیا کرو گے؟"

"کرنا کیا ہے۔ ہم صبح سویرے بینک پہنچ جائیں گے۔" ارجمند نے کہا۔ "لیکن تم باہر رہو گی۔ بینک میں نہیں جاؤ گی۔"

"وہ کیوں۔ لاکر تو میرا ہے۔ وہ تو میں کھولوں گی۔"

"اچھا بھئی تم بھی ساتھ چلنا۔ اس وقت تو تلاش کرو۔"

میں نے چابی پھر تلاش کرنی شروع کر دی۔ بالآخر چابی تیسرے سوٹ کیس میں مل گئی۔ میں نے وہ چابی اپنی مٹھی میں دبا لی تھی۔ "چابی مل گئی ہے ارجمند۔" میں نے کہا۔ "اب صبح ہم تینوں بینک جائیں گے۔"

ارجمند نے غصے سے میری طرف دیکھا۔ کچھ کہنے کی کوشش کی پھر خاموش رہی۔ ہم واپس لاؤنج میں آ گئے۔ یہاں کی وہی پوزیشن تھی۔

ارسلان نے شاہد کو کور کر رکھا تھا۔ اور شاہد بے بسی کے عالم میں کرسی سے بندھا ہوا تھا۔

"ارسلان! چابی مل گئی ہے۔" ارجمند نے بتایا۔

"کہاں ہے چابی؟"

"وہ میرے پاس ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں کل صبح تم لوگوں کے ساتھ بینک جاؤں گی۔"

"نہیں، تم ساتھ نہیں جاؤ گی۔" ارسلان نے غصے سے کہا۔ "بلکہ تم ایک اتھارٹی لیٹر لکھ کر دو گی جس میں مجھے اس لاکر کو کھولنے کا اختیار دو گی۔"

"آخر کیوں، میں یہ سب کیوں کروں؟" میں نے جھلا کر پوچھا۔

"بکواس نہیں کرو۔" ارسلان غرایا پھر اس نے ارجمند کی طرف دیکھا۔ "چابی چھین لو اس سے۔"

ارجمند میرے پاس آئی اور یہی اس کی غلطی تھی۔

اس وقت میرا سیکھا ہوا ہنر میرے کام آ گیا۔ میں نے ایک کک اس طرح ارجمند کو رسید کی کہ وہ اچھل کر ارسلان پر جا گری لیکن ارسلان نے گرتے گرتے بھی ایک فائر جھونک مارا تھا۔

کوئی آگ کا گولہ سا میرے شانے میں اترتا چلا گیا۔ میں چیخ کر ایک طرف الٹ گئی۔ میرا شانہ بری طرح زخمی ہو گیا تھا۔

بہتے ہوئے خون نے میرے کپڑوں کو رنگین کرنا شروع کر دیا تھا۔ پھر مجھے اتنا ہی ہوش رہا کہ شاہد غصے سے دہاڑ رہا تھا اور میری آنکھیں بند ہوتی جا رہی تھیں۔

☆☆☆

میں غنودگی کے عالم میں تھی۔

یا شاید خواب دیکھ رہی تھی۔ اس وقت کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ لوگوں کی مختلف آوازیں... پاپا شاید آوازیں دے رہے تھے۔ یا شاہد پکار رہا تھا۔ کچھ اسی قسم کی باتیں ہو رہی تھیں پھر مجھے ہوا آ گیا۔

میرے زخمی شانے کی ڈریسنگ کر دی گئی تھی۔ دن ہو چکا تھا۔ لیکن پوزیشن وہی تھی۔ میں اسی لاؤنج میں تھی۔ شاہد اسی طرح کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ اور وہ دونوں یعنی ارسلان اور ارجمند میرے سامنے کھڑے تھے۔

"بے وقوف لڑکی۔ تو اپنی حماقت کی وجہ سے اس حال کو پہنچی ہے۔"

"میری ڈریسنگ کس نے کی ہے؟" میں نے نقاہت بھری آواز میں پوچھا۔

''میں نے۔'' ارجمند نے بتایا۔ ''میں ارسلان سے ملنے سے پہلے نرس رہ چکی ہوں۔''

''لیکن کیوں۔ جب تم نے مجھ پر گولی چلا ہی دی تھی تو پھر میری ڈریسنگ کیوں کروائی۔''

''تاکہ تم اتھارٹی لیٹر پر سائن کر سکو۔''

''میرے خدا۔ اس لاکر میں رکھی ہوئی فائل سے تم دونوں کا ایسا کیا تعلق ہے کہ اس کے پیچھے پڑے ہوئے ہو؟''

''روشی!'' شاہد بول پڑا۔ ''یہ دونوں بکواس کر رہے ہیں۔ تمہارے لاکر میں کوئی فائل وائل نہیں ہوگی۔ کچھ اور ہو سکتا ہے جس کا علم صرف ان دونوں کو ہے۔''

''خاموش رہو۔ یہ تم کہہ رہے ہو جس نے روشی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔''

''نہیں، میں نے اسے کبھی مارنے کی کوشش نہیں کی۔'' شاہد نے کہا۔ ''روشی کو خود اندازہ ہو گیا ہوگا کہ کون اس کا دوست ہے اور کون دشمن۔''

ارسلان نے اس کا جواب دینے کے بجائے ارجمند کی طرف دیکھا۔ ''ارجمند! جو ہم نے اتھارٹی لیٹر تیار کیا ہے۔ اس پر روشی سے سائن کروالو۔''

''نہیں روشی، ایسا کبھی مت کرنا۔'' شاہد چیخا۔ ''تمہارے سائن کرنے کے بعد یہ شخص تمہیں شوٹ کر دے گا۔''

''لگتا ہے اس سے پہلے تمہاری زبان بند کرنی ہو گی۔'' ارسلان نے کہا۔

ارجمند نے میرے سامنے ایک کاغذ اور قلم لا کر رکھ دیا۔ ''چلو اس پر سائن کرو جلدی۔ یہ سب ہم تمہاری بھلائی کے لیے کر رہے ہیں۔''

''اور اگر سائن نہ کروں تو پھر۔''

''پھر یہ کہ میں تمہارے ساتھ کچھ بھی کر سکتا ہوں۔'' ارسلان نے کہا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اس لاکر میں کوئی فائل نہیں بلکہ کچھ اور رکھا ہوا ہے۔''

''ہاں، کچھ اور ہے اس میں۔'' ارسلان کسی جنونی کی طرح چیخنے لگا۔ ''اس کو حاصل کرنے کے لیے میں نے بہت پاپڑ بیلے ہیں۔ بہت محنت کی ہے۔ تمہارے پاپا کے دفتر میں جھک مارتا رہا ہوں۔ لیکن اب معاملہ برداشت سے باہر ہو چکا ہے۔ اس میں جو کچھ ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔''

''میرا نہیں... بلکہ ہمارا۔'' ارجمند بول پڑی۔ ''میں نے بھی اس کے خواب دیکھے ہیں۔ پلاننگ کی ہے میں نے۔ تم اکیلے اس کے حق دار نہیں ہو سکتے۔''

''کیا تم مجھے روک لو گی؟''

''ہاں، روک سکتی ہوں تمہیں۔'' ارجمند اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ''ارسلان! یہ مت بھولو کہ شاہد سے تمہاری دوستی میں نے کرائی تھی۔ تاکہ تم اس کے قریب رہ کر اس کا اعتماد حاصل کر سکو۔''

''بکواس مت کرو۔ یہ ساری باتیں یہاں دہرانے کی کیا ضرورت ہے۔''

''بولتی رہو ارجمند۔'' میں نے کہا۔ ''تم ایک اچھی لڑکی ہو۔ مجھے اندازہ ہے کہ تم کسی مجبوری کی وجہ سے ارسلان کا ساتھ دے رہی ہو۔''

''خاموش۔'' ارسلان گرجا۔ پھر اس نے آگے بڑھ کر میرے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔

اور اسی وقت ارجمند اس سے لپٹ پڑی۔

وہ کسی خونخوار بلی کی طرح اس سے چمٹ گئی تھی۔ اس وقت ایک گولی اور چلی لیکن یہ گولی ارسلان نے نہیں چلائی تھی بلکہ دروازے پر کھڑے پولیس آفیسر نے ان دونوں کو خبردار کرنے کے لیے چلائی تھی۔

☆☆☆

یہ بہت گہری سازش تھی۔

پیچ در پیچ۔ پولیس اس طرح آ گئی تھی کہ گولی چلنے کی آواز نے آس پاس کے مکینوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی تھی۔

کہانی اس وقت سے شروع ہوتی ہے جب ارسلان اور ارجمند نے پاپا کے دفتر میں ملازمت حاصل کی۔ یہ دونوں اپنی کارکردگی اور محنت کی وجہ سے پاپا کی نگاہوں میں ایک خاص مقام حاصل کرتے چلے گئے۔

پاپا نے اس زمانے میں کچھ قیمتی ہیرے منگوا کر لاکر نمبر اٹھارہ میں رکھوا دیے تھے۔ جن کا کسی طرح ان دونوں کو علم ہو گیا تھا۔ اسی دوران جلال اور پاپا کے درمیان اختلافات شروع ہو گئے۔

اس کے بعد کی کہانی شاہد نے بتائی۔ ''جب روشی نے مجھ سے شادی سے انکار کیا تو اس وقت میں واقعی بہت غصے میں تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں اس لڑکی سے انتقام لوں۔ جس نے میری توہین کی تھی۔ پھر یہ ہوا کہ میرے ڈیڈی نے روشی کے پاپا کے خلاف سازشیں شروع کر دیں اور انہیں برباد کر دیا۔ پھر جب میں نے ان کی بربادی اور تباہی کے بارے میں سنا تو مجھے افسوس ہونے لگا۔ اسی زمانے میں ارسلان سے میری جان پہچان ہو گئی۔ جو بعد میں ارسلان اور

ارجمند کی طرف سے بے تکلفی میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔ مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ ان دونوں نے روشی کے پاپا کے یہاں جاب بھی کی تھی۔ ان دونوں کو یہ معلوم تھا کہ روشی کے پاپا نے لاکر میں ہیرے رکھوائے ہیں اور انہیں یہ یقین تھا کہ شاید کسی وجہ سے روشی کو ان ہیروں کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔ ورنہ وہ اتنے برے حالات میں زندگی نہیں گزارتی۔''

ہم سب اس علاقے کے ایس پی کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ یعنی اس کہانی کے سارے کردار۔ اور آہستہ آہستہ کہانی کے بھید کھلتے جا رہے تھے۔

بہت کچھ معلوم ہو رہا تھا۔

پھر ارسلان نے بیان دیا۔ ''اس دوران میں ہمیں پتا چلا کہ شاہد نے روشی سے دوستی کر لی ہے اور آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتا جا رہا ہے۔ اور اس نے روشی کو اپنا آدھا نام بتایا ہے۔ یعنی شاہد۔ ہم دونوں نے پھر ایک پلاننگ کے تحت شاہد سے مزید دوستی بڑھالی۔ ہماری پلاننگ یہ تھی کہ ہم شاہد کو روشی کی نگاہوں میں ایک خوفناک انسان ثابت کر دیں گے اور اس کا اعتماد حاصل کر کے لاکر کی چابی حاصل کر لیں گے۔ ہم نے چابی کے لیے بینک منیجر پر بھی دباؤ ڈالا تھا لیکن اس نے ہماری بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔''

پھر شاہد یعنی منصور شاہد نے کہا۔ ''یہ درست ہے کہ میں ایک آوارہ اور عیاش قسم کا نوجوان تھا۔ لیکن پاپا کی موت کے بعد اور یہ جان لینے کے بعد کہ پاپا کی وجہ سے روشی برباد ہو گئی ہے۔ مجھے اس سے ہمدردی ہو گئی۔ میں اس کا ساتھ دینا چاہتا تھا لیکن کس طرح۔ اس کے لیے میرے ذہن میں یہی بات آئی تھی کہ میں اس سے دوستی کر لوں اور اسے اعتماد ہو جائے تو یہ بتا دوں کہ میں کون ہوں۔ لیکن اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ اس سے پہلے ہی اس کہانی کا ڈراپ سین سامنے آ گیا۔''

''اگر یہ سچ ہے تو پھر وہ گاڑی چلانے کی آفر۔ تم کیوں چاہتے تھے کہ میں مری کی خطرناک سڑکوں پر گاڑی چلاؤں؟'' میں نے شاہد سے پوچھا۔

''وہ ایک مذاق کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔'' شاہد نے کہا۔ ''اور جب تم واقعی گاڑی چلانے لگتیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ اس کے انجن کو جان بوجھ کر خود میں نے ہی خراب کر دیا تھا۔''

''کیا؟ وہ خرابی خود تم نے پیدا کی تھی۔''

''ہاں بھئی۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''اس کا مقصد یہ تھا کہ تم بھی کسی قسم کے احساس میں نہ رہو۔ تم یہ کہہ سکو کہ تم تو ڈرائیونگ کے لیے تیار تھیں لیکن گاڑی ہی خراب ہو گئی تھی۔

یہ دراصل تم میں مزید خود اعتمادی پیدا کرنے کی ایک ترکیب تھی۔ جس کا فائدہ ان دونوں نے اٹھا کر میری طرف سے تمہیں اور بھی بدگمان کر دیا۔''

''اور وہ فینسی ڈریس شو میں فائرنگ، وہ کیا تھا؟''

''وہ کوئی فائرنگ نہیں تھی۔'' اس نے کہا۔ ''اندھیرا ہو گیا تھا۔ اور وہ بھی بجلی کی خرابی کی وجہ سے۔ اور وہ بجلی کی خرابی بھی ارسلان اور ارجمند نے ایک سازش کے ذریعے کی تھی۔''

''میں نہیں سمجھی۔''

''میں پوری پوزیشن بتاتا ہوں۔ پستول ارسلان کے پاس تھا۔ وہ تمہارے پاس پہنچا۔ ارجمند سوئچ بورڈ کے پاس تھی۔ اس نے مقررہ وقت پر سوئچ آف کر دیا۔ ارسلان نے جیب سے پستول نکال کر ہوائی فائر کیا اور تمہارا ہاتھ تھام کر تمہیں باہر نکال لایا۔ یہ پورا ڈراما ان دونوں نے اتنی ہوشیاری سے کیا تھا کہ تمہیں شبہ بھی نہیں ہو سکا اور تم یہ سمجھتی رہیں کہ میں نے تمہیں مارنے کے لیے یہ حرکت کی ہے۔''

''اوخدا! تو یہ ساری سازش ان دونوں کی تھی۔''

''ہاں، ان دونوں کی۔'' شاہد نے کہا۔ ''اور ایک سازش میری بھی تھی۔ اور وہ یہ تھی کہ تمہیں اعتماد میں لے کر تمہارا اعتماد بحال کیا جائے۔ تمہیں زندگی کی طرف واپس لایا جائے۔ کیونکہ تم بہت ٹوٹ گئی تھیں اور اب تمہارے پاس کروڑوں کے ہیرے ہیں۔ ایک نئی زندگی ہے۔ اگر تم چاہو تو اس شخص کو معاف کر سکتی ہو۔ جو پہلے واقعی بہت بھٹکا ہوا تھا۔ لیکن اب زندگی کے اتنے بے رحم پہلوؤں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں کھل گئی ہیں۔''

''اور اب میں بھی ایک بات بتا دوں۔'' ایس پی نے کہا۔ ''یہ دونوں میاں بیوی بھی نہیں ہیں۔ یہ لڑکی ارجمند اس سے پہلے بھی ایک بار جیل کاٹ چکی ہے۔ پھر ارسلان سے اس کی ملاقات ہوئی۔ دونوں نے ایک جگہ ملازمت کر لی۔ یعنی تمہارے پاپا کے یہاں۔ شروع میں تو ان کا یہی ارادہ تھا کہ شرافت کی زندگی گزاریں گے لیکن جب کروڑوں کے ہیرے کی بات سامنے آئی تو ان کے اندر کا مجرم پھر جاگ اٹھا اور اب جو بھی ہے۔ وہ سب کے سامنے ہے۔''

ارسلان اور ارجمند کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ شاہد یعنی منصور شاہد امید بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہا تھا اور اب ایک بار پھر ایک نئی زندگی میرے انتظار میں تھی۔ شاہد صبح کا بھولا ہوا تھا۔ جو شام کو گھر واپس آ گیا تھا۔

دوسرا رنگ

ریگِ رواں

سلیم فاروقی

صدیوں کا سفر طے کرنے کے باوجود واقعات و حالات... چاہے کسی بھی نوعیت کے ہوں... تاریخ کے صفحۂ قرطاس پر ہمیشہ کے لیے نہ مٹنے والی سیاہی کا لبادہ اوڑھ کر امر ہو جاتے ہیں... ہم ان تلخ و شیریں حادثات سے صرفِ نظر تو کر سکتے ہیں... مگر انہیں بھلا نہیں... سکتے... پاک و ہند کی تاریخ سے تعلق رکھنے والے ایک ایسے ہی سانحے سے وابستہ دل گداز تحریر...

فتح اور شکست کے درمیان ڈولتی ہوا بھرتی تلخ کہانی جس میں کئی راز پوشیدہ تھے

ہر طرف آتش و آہن کی بارش ہو رہی تھی، موت کا دیوانہ وار رقص جاری تھا۔ انسانی خون پانی سے بھی زیادہ ارزاں ہو گیا تھا۔ میرے بیشتر ساتھی جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ موت کا بے رحم ہاتھ کسی بھی وقت مجھے دبوچ سکتا تھا لیکن مجھ پر اس وقت ایک جنون کی سی کیفیت طاری تھی کہ مار دو یا مر جاؤ۔

بات گو کہ اب سے چالیس سال پرانی ہے لیکن مجھے ایسا لگتا ہے کہ یہ کل ہی کی بات ہو۔

میں نے ایک مہینے پہلے ہی پاکستان آرمی میں کمیشن حاصل کیا تھا۔ میری پہلی پوسٹنگ پنجاب رجمنٹ کے ایک یونٹ میں ہوئی۔ ان دنوں وطن کے حالات بہت دگرگوں تھے۔ مشرقی پاکستان (جو اب بنگلہ دیش بن چکا ہے) میں ہماری فوج گزشتہ سات ماہ سے مکتی باہنی سے نبرد آزما تھی۔

اچانک جی ایچ کیو سے حکم موصول ہوا کہ ہماری بٹالین کو مشرقی پاکستان جانا ہے۔

ہماری بٹالین کے ہر جوان اور افسر کا چہرہ خوشی سے روشن ہو گیا۔ ہم بھی اپنے ان ساتھیوں کے شانہ بشانہ دفاعِ وطن میں شریک ہونا چاہتے تھے جو گزشتہ سات ماہ سے مسلسل دشمن سے برسرِ پیکار تھے۔

روانگی سے قبل ہماری بٹالین کے سی او (کمانڈنگ آفیسر) لیفٹیننٹ کرنل احسان نے ایک ولولہ انگیز تقریر کی تو ہمارے حوصلے کئی گنا بڑھ گئے۔

ہماری بٹالین کو مشرقی پاکستان کے شہر کومیلا بھیجا جا رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر اندازہ ہوا کہ حالات اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں، جتنے ہم سمجھ رہے تھے۔

مکتی باہنی نے قتل و غارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ ان میں بھارت کے تربیت یافتہ لوگ بھی تھے اور بھارتی فوجی خود بھی مکتی باہنی کے روپ میں ہم سے برسرِ پیکار تھے۔

اس وقت تک مشرقی پاکستان کے جی او سی (جنرل آفیسر کمانڈنگ) جنرل ٹکا خان واپس جا چکے تھے اور ان کی جگہ لیفٹیننٹ جنرل نیازی نے لے لی تھی۔

ہماری بٹالین نے سب سے پہلے ان علاقوں کو مکتی باہنی سے پاک کیا جہاں سے ہمیں رسد و کمک مل سکتی تھی لیکن ایسا برائے نام ہی ہوتا تھا۔ عجیب بے سروسامانی کا عالم تھا۔ ہمارے پاس محدود ایمونیشن تھا لیکن ہمارے حوصلے محدود نہیں تھے۔

وہاں پہنچ کر مجھے شدت سے اندازہ ہوا کہ اگر اپنے ہم وطن ہی دشمن سے جا ملیں تو وطن کا دفاع انتہائی مشکل بلکہ ناممکن ہوتا ہے۔

جنگ کا زور بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ دشمن نے ہماری ائرفیلڈ کو ناکارہ کر دیا تھا۔ پاک فضائیہ کے کچھ جہاز موجود تو تھے لیکن ائرفیلڈ کی تباہی کے بعد ہمارے لیے ان کا ہونا نہ ہونا برابر تھا۔

یہ اکتوبر 71ء کے اواخر کی بات ہے جب ہم نے جنرل نیازی کا یہ بیان پڑھا کہ بھارتی ٹینک میرے سینے پر سے گزر کے ہی ڈھاکا میں داخل ہو سکتے ہیں۔

ان کے اس ولولہ انگیز بیان نے ہم میں گویا بجلیاں سی بھر دیں۔

انہی دنوں راج شاہی سے بلوچ رجمنٹ کی ایک بٹالین کومیلا پہنچی تو ہم نے سکون کا سانس لیا کہ اب ہم زیادہ سے زیادہ علاقے کو دشمن سے پاک کر سکیں گے لیکن دو دن بعد یہ سن کر مجھے بہت حیرانی ہوئی کہ ہماری بٹالین کو وہاں سے کسی دوسرے محاذ پر منتقل کیا جا رہا ہے۔

یہ مقام ''ہلی'' تھا۔ یہاں دشمن نے کچھ زیادہ ہی سر اٹھا رکھا تھا۔ ہمارے سی او نے صرف دو کمپنیوں کو وہاں تعینات کیا اور بقیہ دو کمپنیوں کو دوسری طرف تعینات کر دیا۔

ہلی تک پہنچنے کے لیے ہمیں دریا عبور کرنا پڑا۔ یہ ایک الگ داستان ہے کہ ہم نے کن مشکلوں سے دریا عبور کیا۔ اس کوشش میں حوالدار فتح محمد اور لانس نائیک احمد خان نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن ہم نے دشمن کو نزدیک بھی نہیں پھٹکنے دیا۔

یہ چودہ اور پندرہ دسمبر کی درمیانی شب کا واقعہ ہے۔

اب بھارت کھل کر ہمارے خلاف صف آرا ہو چکا تھا۔ اس کے پورے دو ڈویژن ہلی پر قبضہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ علاقہ جنگی نقطۂ نظر سے انتہائی اہمیت کا حامل تھا۔

وہ تین دن سے بھرپور حملے کر رہے تھے لیکن ہماری صرف دو کمپنیوں نے انہیں روک رکھا تھا۔

ہمارے کمپنی کمانڈر کیپٹن ضیا اور کیپٹن وقار وائرلیس پر مسلسل ہیڈ کوارٹر سے کمک اور رسد کی درخواست کر رہے تھے لیکن وہاں کمک کا کیا سوال! ہمارے پاس افرادی قوت محدود تھی۔

جس رات کا میں ذکر کر رہا ہوں، اس رات دشمن نے بہت بڑے پیمانے پر حملہ کیا اور نہ جانے اپنی کتنی فوج کو اس معرکے میں جھونک دیا۔ اس رات بہت ہی گھمسان کا رن

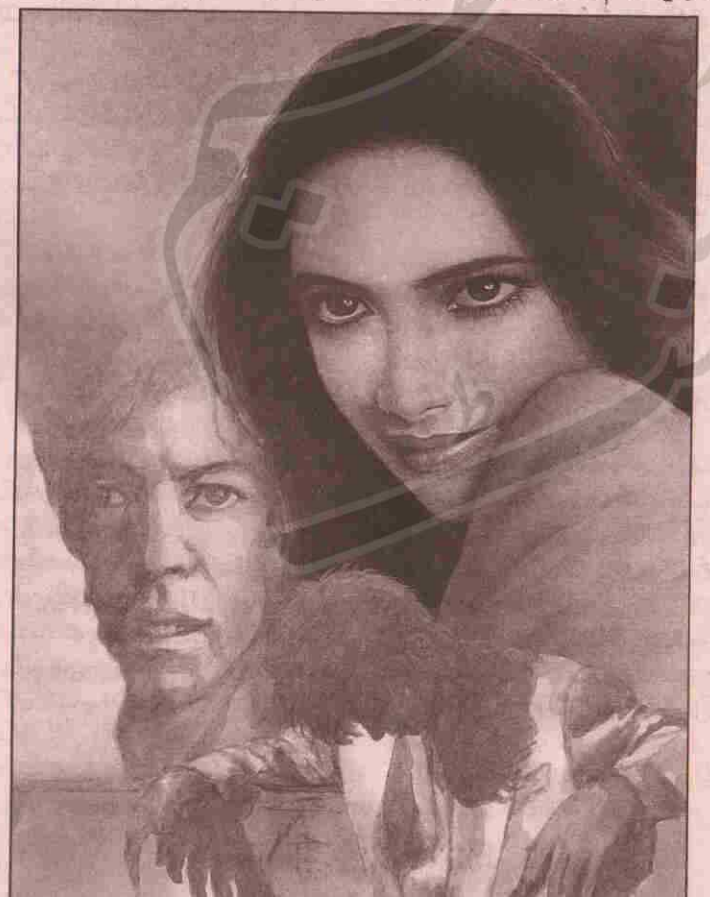

پڑا اور ہمارے بیشتر ساتھیوں نے جامِ شہادت نوش کیا لیکن ہم نے دشمن کو ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھنے دیا۔

رات کی تاریکی میں دشمن کی طرف سے اتنا زبردست حملہ ہوا تھا کہ ایک دفعہ تو ہمارے پاؤں بھی اکھڑ گئے لیکن ہم نے اپنے جوشِ جنوں کے سہارے دوبارہ سنبھالا لے لیا۔

پندرہ دسمبر کا سورج طلوع ہوا تو ہمارے آدھے سے زیادہ ساتھی جامِ شہادت نوش کر چکے تھے۔ ان شہداء میں ہمارے کمپنی کمانڈر کیپٹن ضیاالحسن بھی شامل تھے۔

کیپٹن وقار نے بچے کھچے جوانوں اور افسروں کو طلب کیا اور کہا۔ ”ساتھیو! ہمارے زیادہ تر ساتھی جامِ شہادت نوش کر چکے ہیں۔ جو لوگ باقی ہیں وہ بھی زخمی اور بری طرح تھکے ہوئے ہیں لیکن ہم یہ علاقہ اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے جب تک ہم میں سے ایک آدمی بھی زندہ ہے۔ ہمیں ہیڈ کوارٹر سے کمک ملنے کی امید نہیں ہے۔ ہمارے سامنے دو ہی راستے ہیں، پسپائی اختیار کریں یا لڑتے ہوئے یہیں شہید ہو جائیں۔“

”ہم سب آخری دم تک اس مورچے کی حفاظت کریں گے سر۔“ میں نے پُرجوش لہجے میں کہا۔

حوالدار دین محمد نے زوردار نعرہ لگایا۔ ”نعرۂ تکبیر۔“

سب نے اسی انداز میں ”اللہ اکبر“ کہہ کر اس کا جواب دیا۔

کیپٹن وقار کا چہرہ خوشی سے دمکنے لگا۔ اس وقت دشمن شدید جانی نقصان اٹھا کر کچھ پیچھے ہٹ گیا تھا لیکن مجھے اندازہ تھا کہ وہ جلد ہی پہلے سے بھی زیادہ شدت سے حملہ آور ہوگا۔

”آیئے، پہلے اپنے شہیدوں کو اللہ کے حوالے کر دیں۔“ کیپٹن وقار کا لہجہ عجیب تھا۔

وہاں جابہ جا ہمارے شہیدوں کے جسدِ خاکی بکھرے ہوئے تھے لیکن ان میں سے کسی کے چہرے پر بھی موت کا خوف یا اذیت کے آثار نہیں تھے۔

اسی وقت ہمارے وائرلیس نے دشمن کا ایک پیغام پکڑ لیا۔ ”سر! ہلی پر پاکستان کا پورا ایک ڈویژن موجود ہے۔ کل رات ہمارے آدھے سے زیادہ ڈویژن کا صفایا ہو چکا ہے۔ ہمیں مزید کمک چاہیے..... اوور۔“

”اس فرنٹ پر دو ڈویژن اور روانہ کیے جا رہے ہیں..... اوور۔“

ہمارے چہرے مسرت سے کھل اٹھے اور ہمارے حوصلے گویا آسمان کو چھونے لگے۔

ہم نے جس بے سروسامانی کے عالم میں دشمن کو پسپا ہونے پر مجبور کیا تھا، وہ ہمارا جوشِ جنوں ہی تھا۔ دشمن ہماری دو کمپنیوں کو ایک ڈویژن سمجھ رہا تھا۔

دشمن کی طرف سے حملہ اب اسی وقت ہوتا جب اسے کمک پہنچ جاتی۔

وہ سولہ دسمبر کی منحوس صبح تھی۔ ہم سب ایک نئے جوش اور ولولے سے صف بندی کر رہے تھے اور دشمن کو زیادہ سے زیادہ نقصان پہنچانے کے امکانات پر غور کر رہے تھے۔

اچانک وائرلیس آپریٹر نے آکر ایک اندوہ ناک خبر سنائی۔ ”سر! ہیڈ کوارٹر سے سی او صاحب کا پیغام آیا ہے کہ جنرل نیازی نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور سیز فائر ہو چکا ہے۔“

”ناممکن۔“ کیپٹن وقار نے بے یقینی سے کہا۔ ”یہ دشمن کا پروپیگنڈا ہے جوان! جنرل صاحب ”ٹائیگر نیازی“ کے نام سے مشہور ہیں۔ وہ ہتھیار کیسے ڈال سکتے ہیں؟ سی او سے میری بات کراؤ۔“

”کوشش کرتا ہوں سر!“ وائرلیس آپریٹر نے جواب دیا۔ دس منٹ کی مسلسل کوششوں کے بعد کیپٹن کا رابطہ سی او سے ہو گیا۔

”ہیلو سر! کمانڈر آف برادر کمپنی از ہیئر..... اوور۔“

”یس کیپٹن! سی او از اسپیکنگ..... اوور۔“

”سر! میں نے ابھی ابھی سنا ہے کہ.....“

”یس کیپٹن!“ کرنل صاحب نے سپاٹ لہجے میں ان کی بات کاٹ دی۔ ”جنرل نیازی نے ڈھاکا کے پلٹن میدان میں بھارتی جنرل اروڑا کے سامنے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ ہم سب کو بھی یہی حکم ملا ہے..... اوور اینڈ آل۔“ کرنل کا لہجہ گلوگیر تھا۔

ہم سب دکھ اور صدمے سے ساکت رہ گئے۔ پھر ہم میں سے کچھ جوان بُری طرح بلک بلک کر رونے لگے۔ حوالدار خدا بخش نے روتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہماری قربانیوں کا یہی صلہ ہے کہ ہم دشمن کے ہاتھوں ذلیل و خوار بھی ہوں؟“

خود میری یہی کیفیت تھی۔ میری آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ اگر ہمارے مذہب میں خودکشی حرام نہ ہوتی تو میں اس وقت یقیناً خود کو گولی مار لیتا۔ کیپٹن وقار کی آنکھیں بھی نم تھیں۔

انہوں نے ضروری نوعیت کے تمام کاغذات ایک جگہ جمع کر کے ان میں آگ لگا دی۔

اسی وقت بھارتی فوج کی طرف سے کوئی انتہائی کریہہ آواز میں میگافون پر چیخا۔ ”پاکستانیو! تمہارے سینا پتی نے ہتھیار پھینک کر خود کو ہمارے حوالے کر دیا ہے۔ تم بھی اپنے ہتھیار پھینک دو۔“

اگر میں نے سی او کا پیغام اپنے کانوں سے نہ سنا ہوتا تو میں اس بات پر کسی بھی قیمت پر یقین نہ کرتا۔ میرے دوسرے ساتھیوں کی کیفیت بھی یہی تھی۔

کیپٹن وقار کے حکم پر ہم نے اپنا بچا کھچا ایمونیشن دریا برد کر دیا۔ صرف ہمارے ریوالور اور رائفلیں ہمارے پاس تھیں اور دشمن بڑی بڑی کشتیوں میں ہماری طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ تاریخ میں ایک ذلت آمیز سیاہ باب کا اضافہ ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ہمیں جنگی قیدی کی حیثیت سے الٰہ آباد کے کیمپ میں پہنچا دیا گیا۔ ہمارے شانوں پر صرف عہدوں کے اسٹارز تھے، بقیہ نشانات ہم نے جنگ شروع ہونے سے پہلے ہی ہٹا دیے تھے تاکہ دشمن کو معلوم نہ ہو سکے کہ ہمارا تعلق پاکستان آرمی کی کس رجمنٹ سے ہے۔

جب ہمیں آرمی ٹروپس بسوں میں کیمپ کی طرف لے جایا جا رہا تھا تو سڑک کے دونوں اطراف تماشائیوں کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے۔ بھارتی ڈرائیوروں نے جان بوجھ کر گاڑیوں کی رفتار سست کر دی تھی۔ ہمیں دیکھنے والوں کے چہروں پر حیرانی تھی۔ شاید اس لیے کہ ان کے دلوں میں پاکستان آرمی کی دہشت تھی۔ وہ غالباً یہ سوچ رہے ہوں گے کہ جس فوج نے اب سے چھ سال قبل ہماری کئی گنا زیادہ فوج کو اس بُری طرح شکست دی تھی کہ وہ ہر محاذ پر اپنے جوتے اور کپڑے تک چھوڑ کر بھاگ گئے تھے، اب ان شیروں کو ہماری سینا نے کیسے قید کر لیا۔

وہ ہم پر آوازیں کس رہے تھے، گالیاں دے رہے تھے اور پاکستان کے خلاف نعرے لگا رہے تھے۔

ایک بات کی وضاحت کر دوں۔ ہمارے میڈیا سمیت دنیا بھر کے میڈیا میں یہ خبر پھیلی ہوئی تھی کہ پاکستان کی نوّے ہزار فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔ یہ بالکل غلط ہے۔ نوّے ہزار جنگی قیدی ضرور تھے لیکن ان میں لڑاکا فوج کی تعداد صرف چالیس ہزار تھی، باقی سرکاری اور نیم سرکاری اہل کار اور دفتروں میں کام کرنے والے دوسرے پاکستانی تھے۔

بہرحال، یہ بھی ذلت آمیز بات ہے کہ چالیس ہزار فوجی بھی کم نہیں ہوتے۔ ہم نہ جانے کس سازش کا شکار ہوئے تھے کیونکہ بے سروسامانی اور محدود وسائل کے باوجود ہمارے حوصلے جوان تھے۔ ہم دشمن کو مزید چھ مہینے ناکوں چنے چبوا سکتے تھے۔ اسے بھاری جانی اور مالی نقصان پہنچا سکتے تھے اور باعزت طور پر موت کو گلے لگا سکتے تھے۔ ہم تو آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کا عزم کر کے میدان میں اترے تھے۔

خدا خدا کر کے ہمارا سست رفتار کانوائے الٰہ آباد کی معروف سڑکوں سے گزر کر آبادی سے باہر نکلا تو میں نے کچھ سکون کا سانس لیا۔

الٰہ آباد کے نواح میں بھارتیوں نے خاصے بڑے قطعۂ زمین پر خاردار تار لگا کر جنگی قیدیوں کا کیمپ بنایا تھا۔

بھارتیوں کو اس سے پہلے جنگی قیدیوں کو رکھنے کا تجربہ نہ تھا کیونکہ انہیں توقع نہیں تھی کہ کبھی ایسا موقع بھی آئے گا اس لیے صاف محسوس ہو رہا تھا کہ یہ سارا انتظام انتہائی عجلت میں کیا گیا ہے۔

اس قسم کے کیمپ بھارت کے دوسرے شہروں میں بھی بنائے گئے تھے لیکن ان کا علم تو مجھے بعد میں ہوا۔

تھکن اور بھوک سے ہماری حالت تباہ تھی۔ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے ہم نے کچھ بھی نہیں کھایا تھا، نہ ہمیں سونے کا موقع ملا تھا۔

بھارتی فوجی خود کو اس وقت جرمن نازی سمجھ رہے تھے۔ سب سے پہلے ان کا ایک سکھ صوبیدار میجر آیا اور اس نے ہم سب کو میدان میں قطار بنا کر کھڑا ہونے کو کہا۔

کھڑا ہونا تو دور کی بات ہے، ہم میں تو بیٹھنے کی بھی سکت نہیں تھی لیکن ہم بھارتیوں پر اپنی کمزوری بھی ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ ہم سب پریڈ کے انداز میں قطاریں بنا کر کھڑے ہو گئے۔

صوبیدار رنبیر سنگھ نے کرخت آواز میں کہا۔ ”تم میں سے جو کمیشنڈ افسر ہیں، وہ اپنی اپنی قطاروں سے دو قدم آگے آ جائیں اور پھر وہ اپنی الگ قطار بنائیں۔ سردار صاحبان (جونیئر کمیشنڈ افسران کو فوجی اصطلاح میں سردار کہا جاتا ہے) اپنی الگ قطار بنائیں۔“

ہم نے اپنی تین قطاریں الگ بنا لیں، جے سی اوز کی سات قطاریں الگ تھیں۔

رنبیر سنگھ یہ حکم دے کر ان پر کس کی طرف چلا گیا جو کیمپ کے دوسرے سرے پر واقع تھیں۔

ہمارے سروں پر بھارتی فوجی رائفلیں تانے یوں

کھڑے تھے جیسے ہم اڑ کر وہاں سے فرار ہو جائیں گے یا خالی ہاتھ ان پر جھپٹ پڑیں گے۔

کھڑے کھڑے کافی دیر گزر گئی۔ میرے پاؤں شل ہو گئے۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اب میں کچھ ہی دیر میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر جاؤں گا۔

پھر اچانک دھڑام سے میرے ساتھ کھڑا ہوا کیپٹن سعید گر پڑا۔ وہ بے چارہ زخمی بھی تھا اور بخار میں پھنک رہا تھا۔ اس کے بعد کئی افسر اور جوان غش کھا کر زمین پر گر پڑے۔ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے گزشتہ دو مہینے سے اپنے جوتے تک نہیں اتارے تھے، جو زخمی اور بیمار تھے۔

ہمارے ایک جوان نے آگے بڑھ کر اپنے افسر کو سہارا دینا چاہا تو اس کی پشت پر بھارتی سپاہی کے بوٹ کی ٹھوکر پڑی اور وہ خود بھی وہیں گر گیا۔

بھارتی فوجیوں کے رویّے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نہ صرف 65ء کی ہزیمت کی بلکہ گزشتہ ہزار برس کی غلامی کا بدلہ لینا چاہتے ہیں۔ انگریزوں سے پہلے ہزار برس تک مسلمانوں نے ان پر حکومت کی تھی۔

صوبیدار میجر رنبیر سنگھ ایک مرتبہ پھر اکڑتا ہوا آیا۔ اس نے آ کر بلند آواز اور غلط سلط انگریزی میں کہا۔

''تم میں سب سے سینئر افسر آگے آ جائے۔''

اس کیمپ میں سب سے سینئر بریگیڈیئر منیر تھے۔ وہ دو قدم آگے بڑھ کر کھڑے ہو گئے۔

''بریگیڈیئر!'' رنبیر سنگھ نے کہا۔ ''آپ ان سب میں سینئر ہیں سر! آپ یقیناً جانتے ہوں گے کہ پی او ڈبلیوز (Prisoner of war) کو کس طرح رہنا چاہیے اور احکامات کی خلافِ ورزی پر ان کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔'' اس نے پھر پنجابی لہجے میں الٹی سیدھی انگریزی بولی۔ ''سر! میں چاہتا ہوں کہ آپ خود ہی اپنے لوگوں کو کنٹرول میں رکھیں۔'' وہ ''سر'' بھی یوں کہہ رہا تھا گویا احسان کر رہا ہو۔

بریگیڈیئر نے باوقار لہجے میں کہا۔ ''میں اور میرا ہر جوان جانتا ہے کہ جنگی قیدیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے لیکن شاید آپ لوگ جنیوا کنونشن سے واقف نہیں ہیں۔''

''ہم جنیوا کنونشن سے اچھی طرح واقف ہیں سر!'' صوبیدار رنبیر سنگھ نے منہ ٹیڑھا کر کے کہا۔

''اگر واقف ہوتے تو سب سے پہلے زخمی اور بیمار قیدیوں کی سہولت کے لیے کچھ کرتے۔ آپ شاید دیکھ نہیں رہے ہیں کہ میرے کتنے افسر اور جوان کمزوری اور نقاہت سے بے ہوش ہو گئے ہیں۔''

''میں ابھی ان لوگوں کو فیلڈ اسپتال میں بھجوا دیتا ہوں۔'' صوبیدار میجر نے کہا۔ ''آپ لوگوں کو عہدوں کے لحاظ سے ٹینٹ الاٹ کر دیے گئے ہیں۔ سنتری آپ کو وہاں پہنچا دیں گے۔ وہیں آپ کا سامان بھی پہنچ جائے گا۔''

''میں کیمپ کمانڈنٹ سے ملنا چاہوں گا۔'' بریگیڈیئر صاحب نے کہا۔

''کیمپ کمانڈنٹ کرنل پرتاپ ایک ضروری میٹنگ میں ہیں۔ وہ ابھی تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔''

بریگیڈیئر کے قیدی ہونے کے باوجود صوبیدار میجر ان کی پُروقار شخصیت اور عہدے سے مرعوب تھا۔ شاید اسے زندگی میں پہلی دفعہ کسی اتنے بڑے فوجی افسر سے بات کرنے کا موقع ملا تھا۔

ہمیں چھوٹے چھوٹے ٹینٹ الاٹ کر دیے گئے تھے۔ میرے ساتھ بلوچ رجمنٹ کے دو افسر کیپٹن خالد اور لیفٹیننٹ وقار اور پنجاب رجمنٹ کے مجھ سمیت چار افسر کیپٹن وقار، کیپٹن جہاں زیب، لیفٹیننٹ اکرام اور میں یعنی سیکنڈ لیفٹیننٹ خرم تھے۔ یہ ساٹھ پونڈ کا چھوٹا سا خیمہ تھا۔

فوجی اصطلاح میں خیموں کے سائز کو پونڈز کے حساب سے ناپا جاتا تھا۔

کیمپ میں بھارتی فوجیوں کا بہیمانہ سلوک، جنیوا کنونشن کی خلاف ورزیاں اور پاکستان آرمی کے جوانوں پر تشدد کی علیحدہ سے ایک طویل داستان ہے۔ کبھی موقع ملا تو میں آپ کو کیمپ کے شب و روز سے بھی آگاہ کروں گا۔ مختصراً اتنا سمجھ لیں کہ بھارتی فوجی نہ صرف خود کو نازی سمجھتے تھے بلکہ ان جیسی بلکہ ان سے بھی زیادہ اذیت ناک اور پُرتشدد کارروائیاں کرتے تھے۔

میرے ساتھیوں میں کیپٹن وقار خاصا زندہ دل اور پُرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ وہ ہمیشہ مجھے ''کچا لیفٹین'' کہہ کر پکارتا تھا۔ میرے دوسرے ساتھی اس پر ہنستے تھے کہ تم نے سیکنڈ لیفٹیننٹ کا اچھا مترادف ڈھونڈا ہے۔

اس کے ساتھ ہی کیپٹن وقار انتہائی جی دار، خودسر اور سرکش افسر تھا۔ وہ بھارتی فوجیوں کو بھی جھڑکنے سے نہیں چوکتا تھا۔ اس کے نتیجے میں وہ کئی دفعہ ان کے عتاب کا شکار بھی ہو چکا تھا۔

اس میں اور مجھ میں یہی قدر مشترک تھی۔ میں بھی اکثر یہ بھول جاتا تھا کہ میں جنگی قیدی ہوں اور اس وقت بھارتیوں کے رحم و کرم پر ہوں۔

مجھے اکثر اپنے والدین یاد آتے تھے، بہن یاد آتی تھی

اور ثمینہ یاد آتی تھی تو میری شرمندگی شدید ہو جاتی تھی۔ وہ لوگ بھی کیا سوچتے ہوں گے کہ خرم نے تو بڑے بڑے دعوے کیے تھے کہ بھارتیوں کو نیست و نابود کر دوں گا۔

میں گھر سے یہ کہہ کر چلا تھا۔ ''ابا جی! اب دو ہی صورتیں ہیں یا تو میں غازی بن کر لوٹوں گا یا پھر آپ کو میری شہادت کی خبر ملے گی۔''

ابا جی خود بھی ریٹائرڈ فوجی تھے۔ انہوں نے میری پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا تھا۔ ''خرم بیٹا! مجھے تجھ سے یہی امید ہے۔''

میرا تعلق پنجاب کی تحصیل (رب ضلع) پنڈ دادن خان سے ہے۔ وہاں کے بارے میں مشہور ہے ۔ دادن خان کی مائیں فوجی افسروں کو جنم دیتی ہیں۔

بھارتیوں نے مجھ سے کہا کہ ریڈیو روم میں چلو اور ریڈیو پر اپنے گھر والوں کو اپنی خیریت کا پیغام دے دو۔

مجھے ایک مرتبہ پھر ندامت اور شرمندگی نے گھیر لیا۔ میں اپنے گھر والوں سے کیا کہتا کہ میں نہ غازی ہوں نہ شہید بلکہ دشمنوں کے سامنے ہتھیار پھینکنے والا ایک قیدی ہوں جو اس وقت دشمن کے ٹکڑوں پر زندہ ہے۔

''اٹھو لیفٹین صاحب!'' آنے والے صوبیدار نے تضحیک آمیز لہجے میں کہا۔

میں ریڈیو روم کی طرف بڑھا تو میرے قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔ مجھے یہ ندامت تھی کہ میرے گاؤں والے کیا سوچیں گے؟ گھر والے کیا سوچیں گے اور سب سے بڑھ کر ثمینہ کیا سوچے گی؟ ثمینہ میری عم زاد تھی۔ وہ بہت خوب صورت تھی اور مجھے بہت پسند تھی۔ اس کی بولتی آنکھوں نے اکثر مجھے بتایا تھا کہ وہ بھی مجھے پسند کرتی ہے۔ ہم دونوں نے آج تک اظہارِ محبت نہیں کیا تھا، بس بغیر کچھ کہے ایک دوسرے کو چاہے جا رہے تھے۔

میری روانگی کے وقت ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ''کیا میرا انتظار کرو گی؟'' یہ جملہ بے اختیار میری زبان سے ادا ہو گیا تھا۔

ثمینہ نے مسکرا کر مجھے دیکھا پھر سر جھکا کر اثبات میں گردن ہلا دی۔

میرے چاچا بھی فوجی تھے اور ان کا بیٹا راشد بھی فوج میں میجر تھا۔

وہ لوگ کیا سوچ رہے ہوں گے؟ کیا وہ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایک ایسے آدمی کے ہاتھ میں دے دیں گے جو دشمن کے سامنے گھٹنے ٹیک چکا ہو؟

یہی سوچتا ہوا میں ریڈیو روم تک پہنچا۔

مجھ سے پہلے دو افسر اور تین جوان اپنی باری کے انتظار میں بیٹھے تھے اور اس وقت کیپٹن کے عہدے کا ایک فوجی اپنا پیغام ریکارڈ کرا رہا تھا۔ ''میں کیپٹن علی حسن، نمبر 5031331، سکنہ چک ایک سو چوبیس، تحصیل گوجر خان، ضلع راولپنڈی خیریت سے ہوں اور اس وقت بھارتی فوج کی قید میں ہوں۔ ابا جی، اماں، شاداں سب کو میرا اسلام اور گڈو کو بہت بہت پیار۔'' اس نے اپنا پیغام ختم کیا تو اس کی پیشانی پسینے میں تر تھی اور آنکھیں نم۔ وہاں موجود ہر جنگی قیدی کی یہی کیفیت تھی۔

اپنی باری آنے پر میں نے بھی اسی قسم کا پیغام ریکارڈ کرایا اور کوشش کی کہ سننے والوں کو میرے کرب اور ذہنی اذیت کا اندازہ نہ ہو سکے۔ پیغام ریکارڈ کرانے کے بعد میری بھی وہی کیفیت تھی۔ میرا چہرہ پسینے میں تر تھا اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔

میں یوں بوجھل قدموں سے لوٹا جیسے اپنے گھر والوں کو اپنی موت کی خبر دی ہو۔

میں آ کے بیٹھا ہی تھا کہ کیپٹن وقار میرے پاس آ گیا اور آہستہ سے بولا۔ ''کچے! میرے ذہن میں یہاں سے فرار کا ایک پلان ہے...... چلے گا میرے ساتھ؟''

میں نے چونک کر اسے دیکھا، وہ اس وقت بالکل سنجیدہ تھا۔

''میری بات کو مذاق مت سمجھ۔'' وقار نے کہا۔ ''میں فرار کی تیاریاں کافی دنوں سے کر رہا ہوں۔''

''لیکن سر! اگر پکڑے گئے تو......''

''تو کیا؟'' وقار نے کہا۔ ''زیادہ سے زیادہ یہ لوگ گولی مار دیں گے نا...... تو مار دیں۔ ذلت کی اس زندگی سے تو بہتر ہے کہ ایک کوشش کر کے مرا جائے۔''

''پلان کیا ہے سر؟'' میں نے بھی سرگوشی میں پوچھا۔

''پلان بھی تجھے بتا دوں گا۔'' وقار نے کہا۔ ''پہلے تو یہ تو بتا کچے لیفٹین کہ تو میرے ساتھ چلے گا یا نہیں؟''

''ہمارے ساتھ اور کون کون جا رہا ہے؟''

''صرف سپاہی احمد یار نے میرے ساتھ چلنے کی ہامی بھری ہے۔'' وقار نے کہا۔ ''یوں بھی میں نے زیادہ لوگوں سے بات نہیں کی۔ زیادہ لوگوں میں پکڑے جانے کا خطرہ بڑھ جاتا ہے۔''

''میں چلوں گا سر!'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ اس وقت مجھے اپنے جسم میں گویا ایک نئی توانائی کا احساس

ہو رہا تھا۔

’’تمہارے پاس پیسے کتنے ہیں؟‘‘ وقار نے پوچھا۔

’’پیسے؟‘‘ میں نے چونک کر پوچھا۔ ’’میرے پاس تو کوئی پیسا نہیں ہے۔‘‘

’’نو پرابلم۔‘‘ وقار نے کہا۔ ’’میں نے پانچ پانچ، دس دس روپے کر کے کچھ پیسے بچائے ہیں۔ تم بھی آج سے بچانا شروع کر دو۔‘‘

بھارتی فوجیوں اور ریڈ کراس کی طرف سے ہمیں ہر ہفتے چھوٹے موٹے اخراجات کے لیے کچھ رقم ملتی تھی جو ہم صابن، ٹوتھ پیسٹ اور اس قسم کی دوسری چیزوں میں خرچ کرتے تھے۔ کیمپ میں ایک کینٹین بھی تھی۔ کینٹین کا بنیا ٹھیکے دار ایک نمبر کا کمینہ تھا۔ وہ ہر چیز ہمیں مہنگے داموں فروخت کرتا تھا۔

’’آپ وہ پیسے رکھتے کہاں ہیں سر؟‘‘ میں نے پوچھا۔

’’بھارتی فوجی ہفتے میں ایک دفعہ یا کبھی کبھی اچانک بھی ہماری تلاشی لے لیتے ہیں۔ وہ اتنی رقم دیکھیں گے تو نہ صرف چھین لیں گے بلکہ ہماری طرف سے مشکوک بھی ہو جائیں گے۔‘‘

’’میں بعد میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔ اس وقت وہ کمینہ بوٹا سنگھ بہت غور سے ہمیں دیکھ رہا ہے۔‘‘ یہ کہہ کر وہ قدرے بلند آواز میں بولا۔ ’’اب اس حقیقت کو تسلیم کر لو لیفٹیننٹ خرم! تم ایک جنگی قیدی ہو اور اس وقت فاتح فوج کی قید میں ہو۔‘‘ وہ ہنستا ہوا چلا گیا۔

بوٹا سنگھ کے ساتھ ساتھ وہاں موجود دوسرے سنتریوں نے بھی وقار کی بات سنی اور ان کی گردنیں فخر سے اکڑ گئیں۔ ان کے خیال میں وقار جیسے خودسر اور سرکش آدمی نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا۔

حوائج ضروریہ سے فراغت کے لیے بھارتی فوجیوں نے کیمپ کے ایک کونے میں ٹین کی چادریں لگا کر دو تین بیت الخلا بنا دیے تھے۔ بیت الخلا کیا، زمین میں خاصا گہرا ایک گڑھا کھود کر اسے بیت الخلا کا نام دے دیا تھا۔ وہاں پانی کا ایک ڈرم رکھ دیا گیا تھا۔ اس ڈرم میں پانی بھرنے کی ذمے داری بھی قیدیوں کی تھی۔

البتہ افسران کو ان لوگوں نے کچھ سہولیات فراہم کی تھیں۔ ان کے بیت الخلا کچھ بہتر تھے۔

لیفٹیننٹ کرنل اور بریگیڈیئر کو البتہ خاصی مراعات دی گئی تھیں۔ انہیں پختہ اور بہتر غسل خانے اور بیت الخلا دیے گئے تھے۔ ان کی خدمت کے لیے جنگی قیدیوں ہی میں سے اردلی بھی دیے گئے تھے اور ان کے لیے لانڈری کا بھی انتظام تھا۔

شروع شروع میں تو بیت الخلا جاتے وقت ایک سنتری بھی ساتھ ہوتا تھا جو بیت الخلا سے کچھ فاصلے پر کھڑا رہتا تھا۔ پھر ان لوگوں نے یہ تکلف بھی چھوڑ دیا کہ قیدی خاردار تاروں کی دو دو باڑوں میں سے نکل کر کیسے بھاگ سکتا ہے۔ ایک باڑ کے بعد تقریباً چھ سات فٹ کے فاصلے پر دوسری باڑ تھی۔ دونوں باڑوں کے درمیانی حصے میں بھارتی فوجیوں کا گشت جاری رہتا تھا۔

انہی دنوں کیپٹن وقار نے مجھے بتایا کہ ہم افسروں کے بیت الخلا سے ایک سرنگ کھودیں گے۔ اس نے اس کے لیے باقاعدہ نقشہ بھی بنا لیا تھا۔ بیت الخلا خاردار تاروں کی پہلی باڑ سے تین چار فٹ کے فاصلے پر تھا۔ گویا ہمیں تقریباً پچیس فٹ لمبی سرنگ کھودنا تھی۔ وہ سرنگ ایک میدان میں نکلتی۔ وہاں سے تقریباً دس بارہ فٹ کے فاصلے پر درختوں کے جھنڈ اور خودرو جھاڑیوں کا ایک جنگل سا بن گیا تھا۔

’’پہلے میں نے یہی سوچا تھا کہ ہم ان خودرو جھاڑیوں تک سرنگ کھودیں گے۔‘‘ وقار نے کہا۔ ’’لیکن میں نے سوچا کہ فضول کی محنت سے کیا فائدہ۔‘‘

رات بارہ بجے اور صبح چھ بجے ٹاور پر موجود سنتریوں کی ڈیوٹی تبدیل ہوتی تھی۔ پرانے سنتریوں کے جانے اور نئے سنتریوں کے آنے میں تقریباً چار منٹ کا وقفہ ہوتا تھا۔

’’ہمیں اسی وقفے میں سرنگ سے نکل کر خودرو جھاڑیوں کے اس جھنڈ تک پہنچنا ہے۔ پھر اگر تقدیر نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ ہم دشمن کی نظروں میں آئے بغیر وہاں سے نکل جائیں گے۔‘‘

سپاہی احمد یار نے نہ جانے کہاں سے وہ مضبوط کیل حاصل کی تھی جسے زمین پر گاڑ کر اس میں خیمے کی رسیاں باندھی جاتی تھیں۔

کیپٹن وقار نے مجھ سے کہا کہ ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کو نیچے سے کاٹ کر اس میں سے پیسٹ نکال دو اور اس میں نوٹ محفوظ کر لو۔

یہ طریقہ واقعی بہت بہترین تھا۔ بھارتی فوجی ہر ہفتے ہماری تلاشی لیتے تھے۔ ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب کی طرف تو ان کا دھیان بھی نہیں جا سکتا تھا۔

میں نے اسی طریقے سے ٹوتھ پیسٹ کے ٹیوب میں پیسے محفوظ کرنا شروع کر دیے۔

ہم لوگ باری باری سرنگ کھودتے تھے۔ جب ہم میں سے کوئی بیت الخلا میں ہوتا تو دوسرا کہیں آس پاس ہی

موجود ہوتا۔

کسی بھی خطرے کی صورت میں باہر نگرانی کرنے والا کوئی آواز نکال کر اندر والے کو ہوشیار کر دیتا۔

ہمارے ان تمام ساتھیوں کو سرنگ کا علم تھا جو وہ بیت الخلا استعمال کرتے تھے۔ احمد یار بھی سنتریوں کی آنکھ بچا کر اسی بیت الخلا چلا جاتا تھا۔

کھدائی کا کام ہم لوگ رات میں کیا کرتے تھے۔

ابتدا میں تو ہمیں تھوڑی سی دقت ہوئی لیکن ہمارے جنون نے اسے چیلنج سمجھ کر قبول کیا تھا۔ ہم تینوں رات رات بھر سرنگ کھودتے اور اس میں سے نکلنے والی مٹی کو اس گڑھے میں پھینک دیتے جو بیت الخلا کے لیے استعمال ہوتا تھا۔

پھر ہم مٹی کو وہیں پھیلانے لگے۔ سرنگ آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ ان دنوں الٰہ آباد میں شدید سردی تھی اس کے باوجود سرنگ میں جا کر ہم پسینے میں شرابور ہو جاتے تھے۔

میں زیادہ تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ یہ ایک دوسری سنسنی خیز داستان ہے۔ اگر کبھی موقع ملا تو میں آپ کو یہ داستان بھی سناؤں گا۔

تئیس دن کی جدوجہد کے بعد سرنگ تیار ہو گئی۔ ہم نے باری باری اس سوراخ سے باہر جھانکا جہاں سے ہمیں باہر نکلنا تھا۔ ہم کیمپ کی حدود سے تقریباً پندرہ فٹ باہر تھے۔ کیپٹن وقار نے مٹی کے ڈھیلے لگا کر چھوٹے سے اس سوراخ کو دوبارہ بند کر دیا۔

یوں بھی خاص طور پر اس طرف کوئی آتا نہیں تھا لیکن بھارتی فوجی کبھی کبھار پورے علاقے کا ایک چکر ضرور لگاتے تھے۔

ہماری تقریباً تمام تیاریاں مکمل تھیں، صرف کپڑوں کا بندوبست نہیں ہوا تھا۔ ہمارے کپڑوں پر خاصے جلی حروف میں POW لکھا ہوا تھا۔

میرے پاس چھوٹا سا ایک ٹرانزسٹر تھا۔ آج کی طرح ان دنوں ٹرانزسٹر ریڈیو اور گھڑیاں اتنی ارزاں نہیں تھیں۔ بھارتی تو یوں بھی ان چیزوں کے لیے ترسے ہوئے تھے۔ وہاں تو غیر ملکی اشیا کی امپورٹ پر پابندی تھی۔

ہمارے ٹینٹ میں صفائی کرنے کے لیے ایک خاکروب آیا کرتا تھا۔ ظاہر ہے، وہ شودر تھا اور کیمپ کے سنتریوں کا رویّہ اس کے ساتھ انتہائی اہانت آمیز تھا۔ ہم لوگ اکثر اسے کبھی چونی، کبھی اٹھنی دے دیا کرتے تھے۔ اکثر ہم اسے کھانے پینے کی وہ چیزیں بھی دے دیتے تھے جو ریڈ کراس کی طرف سے ہمیں ملا کرتی تھیں۔

پچھلا دروازہ

یہاں رمضان کے مہینے میں کھانے پینے کی دکانیں شام تک بند رہتی ہیں۔ ایک روز شہر میں گھومتے پھرتے مجھے بھوک محسوس ہوئی تو میں نے اپنے ایک مقامی دوست کو جو اس وقت میرے ہمراہ تھا، اس ہنگامی صورت حال سے آگاہ کیا، چنانچہ وہ چلتے چلتے ایک جگہ رک گیا اور ایک بند دکان کے باہر آویزاں گتے پر لکھی عبارت پڑھنے لگا۔ میں نے پوچھا کیا لکھا ہے؟ بولا لکھا ہے۔ ’’رمضان المبارک کے احترام میں ہوٹل بند ہے۔۔۔ کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے تشریف لائیں چنانچہ ہم کھانا کھانے کے لیے پچھلے دروازے سے داخل ہوئے اور کھانا کھا کر پچھلے دروازے ہی سے باہر آگئے۔ مجھے بتایا گیا کہ یہاں پچھلے دروازے کا استعمال بہت عام ہے۔ لوگ سیاست اور اقتدار میں بھی پچھلے دروازے سے داخل ہوتے ہیں اور پھر ایک روز ان کی واپسی بھی پچھلے دروازے ہی سے ہوتی ہے۔

عطاء الحق قاسمی کی تحریر، بلوچستان سے کشمالا کا انتخاب

میں نے کیپٹن وقار سے مشورہ کر کے اسے آزمانے کا فیصلہ کیا۔

ایک دن وہ صفائی کرنے آیا تو میں نے اس سے پوچھا۔ ’’یار! تم اتنے عرصے سے آرہے ہو، ہمیں آج تک تمہارا نام بھی معلوم نہیں ہوا؟‘‘

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ پہلے تو وہ بہت سہما رہتا تھا لیکن پھر ہمارے بہتر رویّے کی وجہ سے وہ ہم سے خاصا بے تکلف ہو گیا تھا۔

’’نام کی بھی خوب کہی صاب جی!‘‘ اس نے ہنس کر کہا۔ ’’مارا نام پچھ کے ’کے کرو گے؟ مارا نام تو بھولا رام ہے پر یہاں تو سب مارے کو بھنگی کہویں ہیں، بھنگی۔‘‘ اس کا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ’’جتنے بھی دلت (شودر) ہیں، وہ سارے ہی بھنگی ہیں صاب جی۔‘‘

’’اچھا بھئی، میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتا ہوں۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ جھاڑو رکھ کے وہیں پھسکڑا مار کے زمین پر بیٹھ گیا۔

شروع شروع میں تو وہ بھی محتاط تھا اور ہم سے بات کرنا تو دور کی بات ہے، ہماری طرف دیکھتا تک نہیں تھا لیکن جب بھارتی فوجیوں کی نگرانی میں ذرا نرمی واقع ہوئی تو بھولا رام بھی ہم سے بات چیت کرنے لگا۔

شام کو ریڈ کراس کی طرف سے ہم لوگوں کو بسکٹ اور کولڈ ڈرنک کے ٹن ملے تھے۔ دو سگریٹ کے پیکٹ بھی تھے۔

میں تو سگریٹ پیتا نہیں تھا۔ وہ سگریٹ میں اپنے ساتھیوں کو دے دیا کرتا تھا۔

میں نے کولڈ ڈرنک کا ایک ٹن، بسکٹ کا ایک ڈبا اور سگریٹ کے دونوں پیکٹ بھولا رام کو دے دیے۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر بولا۔ ''کے بات ہے صاب جی! مارے سے کوئی کام ہے؟''

وہ اتنا بھولا تھا نہیں جتنا شکل سے نظر آتا تھا۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ بھولا رام قابلِ اعتبار آدمی نہیں ہے۔ فی الحال اس سے کوئی بات نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ میرا ارادہ تھا کہ اسے اپنا ٹرانزسٹر دے کر معمولی کرتے پاجامے کے تین جوڑے منگوالوں گا۔ ہمارے لیے سب سے بڑا مسئلہ کپڑوں کا تھا۔ ہمیں جو قیمتی کپڑے ریڈ کراس کے ذریعے پاکستان سے بھیجے جاتے تھے، ان میں سے آدھے سے زیادہ تو بھارتی فوجی خود ہتھیا لیتے تھے۔ بقیہ پر بہت بے دردی سے POW (جنگی قیدی) کی مہر لگا دیتے تھے۔ ان کپڑوں میں تو ہم کیمپ سے نکلتے ہی دھر لیے جاتے۔

میں نے بھولا رام سے سرد لہجے میں کہا۔ ''مجھے تم سے بھلا کیا کام ہوگا؟ تم ہماری خدمت کرتے ہو اس لیے میں یہ چیزیں تمہیں خوش ہو کر دے رہا ہوں، آئندہ نہیں دوں گا۔''

''ارے صاب جی! ہم نے تے ایک بات پوچھی تھی، آپ تے نراض ہی ہو گئے۔''

''میں ناراض نہیں ہوا۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''جاؤ اپنا کام کرو۔''

وہ شرمندہ سا ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

شام کو میں نے اس کا ذکر وقار سے کیا تو وہ درشت لہجے میں بولا۔ ''تمہاری وجہ سے ہمارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا خرم۔'' وقار جب غصے میں یا بہت زیادہ سنجیدہ ہوتا تھا تو وہ مجھے کچا لیفٹین کہنے کے بجائے میرا نام لیتا تھا۔

''سوری سر۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے اس سے کوئی بات تو نہیں کی۔''

''کپڑوں کی فکر مت کرو کچے!'' وقار مسکرا کر بولا۔ ''اگلے مہینے جب ریڈ کراس والے ہمیں کپڑے دیں گے تو میں لینے سے انکار کر دوں گا۔''

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔

''تمہارے ساتھ پرابلم یہ ہے کچے لیفٹین کہ تم سوچتے بالکل نہیں ہو۔ میں تمام وقت اسی سوچ بچار میں گزارتا ہوں۔''

میں بھی سوچتا تھا۔ میں نے فرار کے بارے میں کچھ منصوبے بھی بنائے تھے لیکن وہ ابھی تک میرے ذہن میں تھے۔ شاید اس لیے کہ وقار جیسا سینئر آدمی ہمارا لیڈر تھا۔ وہ مجھ سے کافی سینئر تھا اور یہاں نہ ہوتا تو اب تک میجر بن چکا ہوتا۔

''سر! آپ نے بتایا نہیں کہ......''

''اپنا ذہن استعمال کرو۔'' وقار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''اور مجھے بتاؤ کہ تمہارے ذہن میں کیا ہے؟ اب ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ ریڈ کراس والے دو دن بعد آئیں گے۔''

''او کے سر!'' میں نے کہا۔ ''میں کل ہی اپنا پلان آپ کو بتا دوں گا۔''

شام کی چائے پینے کے بعد بھی میں یہی سوچتا رہا کہ کپڑوں کا کیا بندوبست کیا جائے؟ وقار نے ریڈ کراس والوں کا ذکر کیا تھا۔ میں نے بھی اسی رخ پر سوچنا شروع کر دیا۔

میں نے سوچا، میں ریڈ کراس والوں سے کہوں گا کہ اپنی نگرانی میں اور اپنے ہاتھوں سے سامان تقسیم کریں۔ بھارتی فوجی تو یوں بھی امپورٹڈ کپڑوں، صابنوں، ٹوتھ پیسٹ وغیرہ کے دیوانے تھے، بھارتی فوجی ہی کیا پورے بھارت کا یہی حال تھا۔ وہ حسد آمیز رشک سے کہتے تھے کہ تم لوگ خوش قسمت ہو کہ غیر ملکی اشیا تمہارے ملک میں اتنی آسانی سے دستیاب ہیں۔ مجھے اب خیال آتا ہے کہ یہ ہماری خوش نصیبی نہیں بلکہ بدنصیبی تھی۔ اگر ہمارے ملک میں بھی غیر ملکی اشیا پر پابندی ہوتی تو آج ہمارے ملک میں بھی صنعت بہت ترقی کر گئی ہوتی اور ہماری معیشت مضبوط ہوتی۔

ریڈ کراس والے جب یہ اشیا اپنے ہاتھوں سے کیمپ میں تقسیم کرتے تو بھارتی فوجیوں کے ہاتھ کچھ بھی نہ آتا۔

میں نے سوچا جو صوبیدار ان خوب صورت کپڑوں پر پی او ڈبلیو کی بدنما مہر لگا کر برباد کر دیتا ہے، اس سے کہوں گا کہ وہ مجھ سے سارے کپڑے لے لے لیکن اتنے نفیس اور قیمتی کپڑوں کو داغ دار نہ کرے۔ اگر وہ مان گیا تو مجھے ایک دو جوڑے ایسے مل جائیں گے جن پر POW کا منحوس نشان نہیں ہوگا۔ وہ کم بخت اس مہر کو چھاپتے بھی اتنے جلی حروف سے تھے کہ پہلی ہی نظر میں معلوم ہو جاتا کہ یہ آدمی جنگی قیدی ہے۔

شام کو وقار سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے اسے اپنے پلان سے آگاہ کیا۔

کیپٹن وقار اچھل پڑا اور جوش میں آکر میری پیٹھ پر اتنا زوردار دھپ مارا کہ چند لمحے کے لیے تو میری سانس ہی رک گئی۔ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ''یار کچے! تو تو بالکل میرے انداز میں سوچتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تیرا ذہن بھی خوب کام کرتا ہے۔ میں نے بھی بالکل یہی سوچا تھا بلکہ میں نے تو ریڈ کراس والوں کو پیغام بھی بھجوا دیا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''دو دن پہلے احمد یار کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی تھی۔''

''ہاں، یہ تو میں جانتا ہوں۔''

''اس کی طبیعت خراب ہوئی نہیں تھی بلکہ میرے کہنے پر اس نے خود ہی کی تھی۔ اس نے نہ صرف نیم کے پتے چبائے بلکہ انہیں نگل بھی گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسے زبردست الٹیاں شروع ہو گئیں۔ بریگیڈیئر منیر صاحب کے کہنے پر اسے کیمپ کے اسپتال میں منتقل کر دیا گیا۔ وہاں ریڈ کراس کا ایک نمائندہ ہمیشہ موجود ہوتا ہے۔ اس نے......''

''میں سمجھ گیا۔'' میں نے کہا۔ ''احمد یار نے ریڈ کراس کے نمائندے تک آپ کا پیغام پہنچا دیا ہوگا۔''

''یہی بات ہے۔ لیفٹین صاحب!'' وقار مسکرایا۔ ''آج کے بعد میں آپ کو کچا لیفٹین نہیں کہوں گا۔''

''تھینک یو سر!''

''ریڈ کراس والے کل یہاں آئیں گے۔ ہمارے پاس اب زیادہ وقت نہیں ہے۔ مجھے خدشہ ہے کہ سرنگ کہیں بیٹھ ہی نہ جائے ورنہ ہماری ساری محنت غارت ہو جائے گی۔''

''انشاء اللہ ایسا نہیں ہوگا سر۔'' میں نے کہا۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال ہوگا کہ میری وقار سے شام ہی کو ملاقات کیوں ہوتی تھی؟ دن بھر تو ہم پی ٹی پریڈ، ایکسرسائز کرتے رہتے تھے۔ سہ پہر کے وقت ہم باسکٹ بال، ہاکی یا فٹ بال کھیلتے تھے۔ شام ہی کا وقت ایسا ہوتا تھا جب ہم یکسو ہو کر بات چیت کر سکتے تھے۔

☆☆☆

اس دن ریڈ کراس والے سامان کی تقسیم کے لیے آئے تو انہوں نے بھارتی فوجیوں سے کہا کہ ہم یہ سامان خود اپنی نگرانی میں تقسیم کریں گے۔

اس سامان میں انتہائی خوب صورت کمبل، لحاف، پینٹ اور قمیصیں تھیں، ہماری ماؤں اور بہنوں کے ہاتھوں کے بنے ہوئے خوب صورت سویٹر اور جرسیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھا۔

جب وہ سامان ہمیں مل رہا تھا تو بھارتی فوج کے افسروں اور جوانوں کے سینوں پر سانپ لوٹ رہے تھے۔

اچانک صوبیدار میجر رنبیر سنگھ نے کہا۔ ''اس تمام سامان پر پی او ڈبلیو کی مہر لگے گی اس لیے تم لوگ اسے ابھی دوسرے سامان سے علیحدہ ہی رکھنا۔''

میں اور وقار سامان لے کر اپنے ٹینٹ میں آئے تو فوراً ہی وہ منحوس صورت صوبیدار بھی آ گیا جو ہمارے کپڑوں پر مہر لگایا کرتا تھا۔

کیپٹن وقار نے خوشامدانہ لہجے میں کہا۔ ''صوبیدار صاحب! آپ ان چیزوں میں سے جو چاہے لے لیں لیکن اسے وہ لعنتی ٹھپا لگا کر خراب نہ کریں۔''

صوبیدار نے آہستہ سے کہا۔ ''تم اس سامان میں سے صرف ایک کمبل، ایک سویٹر اور قمیص، پینٹ کے دو جوڑے رکھ سکتے ہو۔''

''آپ کی بہت مہربانی صوبیدار صاحب۔'' وقار نے کہا۔ ''اب آپ ہی بتایئے، اتنے قیمتی کپڑوں پر وہ لعنتی ٹھپا اچھا لگتا ہے؟ اس سے تو کپڑوں کا سارا حسن غارت ہو جاتا ہے۔''

''اصل میں یہاں ہمارے جتنے بھی افسر اور جوان ہیں، اس سامان میں ان سبھی کا حصہ ہوتا ہے۔''

''کوئی بات نہیں صوبیدار صاحب! یہ سب سامان آپ ہی کا ہے۔''

اس دن صوبیدار نے کسی بھی کپڑے پر وہ ٹھپا نہیں لگایا اور ساتھ ساتھ دھمکی آمیز لہجے میں یہ بھی کہا کہ کسی سنتری کو یہ معلوم نہ ہو کہ میں نے اسٹیمپ نہیں لگائی۔

''آپ فکر مت کریں صوبیدار صاحب! کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔'' میں نے کہا۔

وہ انتہائی لالچی اور احمق آدمی تھا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو یہ ضرور سوچتا کہ یہ کیپٹن کپڑوں پر ٹھپا کیوں نہیں لگوانا چاہتا؟

احمق صوبیدار نے کیپٹن وقار کو ایک خوب صورت جرسی، موزے اور کپڑوں کے دو جوڑے دے دیے۔ مجھے اس نے ایک خوب صورت اور قیمتی جیکٹ، کپڑوں کا ایک جوڑا اور چند چھوٹی موٹی چیزیں دے دیں۔

میری تو خوشی کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ہمیں بغیر کوئی

اضافی رقم خرچ کیے کپڑے مل گئے تھے۔ ہمارے پاس جوتوں کا ایک ایک جوڑا پہلے ہی موجود تھا۔

میرے پاس تقریباً پانچ سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ کیپٹن وقار کے پاس ساڑھے بارہ سو روپے تھے کیونکہ وہ پہلے سے فرار کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ احمد یار کے پاس ساڑھے چار سو روپے تھے کیونکہ اس بے چارے کا الاؤنس ہم سے کم تھا۔ الاؤنس بھی عہدوں کے لحاظ سے دیا جاتا تھا۔ ہماری تیاری ہر طرح سے مکمل تھی۔

شام کی چائے پر وقار نے کہا۔ ''ہم لوگ کل رات کو رول کال کے بعد یہاں سے نکل جائیں گے۔ کل تم دن میں اچھی طرح آرام کر لینا کیونکہ ہمیں رات بھر جاگنا ہے۔ مجھے احمد یار نظر نہیں آیا ہے۔ اسے بھی بتا دینا کہ وہ کل رات تیار رہے۔''

''او کے سر!'' میں نے مسکرا کر کہا۔

رات بھر مجھے فرار کے خیال سے نیند نہیں آئی۔ میں خواب میں بھی خود کو فرار ہوتا دیکھ رہا تھا۔ کبھی میں دیکھتا کہ بھارتی فوجیوں نے ہمیں پکڑ لیا ہے، کبھی میں بھارتی فوجیوں پر حملہ کر دیتا۔

رات بھر اسی قسم کے بے سروپا خواب دکھائی دیتے رہے اور میں چونک کر اٹھتا رہا۔

صبح میری طبیعت خاصی بھاری بھاری تھی۔ مجھے اپنے انسٹرکٹر میجر شاہد کا قول یاد آیا۔ ''کوئی بھی آپریشن شروع کرنے سے پہلے اس پر ہر پہلو سے غور کرو اور مطمئن ہونے کے بعد جب اس پر عمل کرو تو ذہن میں کسی بھی قسم کی ٹینشن نہیں ہونا چاہیے۔''

میں نے صبح چائے کے ساتھ دو گولیاں اسپرین کی لیں اور پھر لیٹ گیا۔ لیٹے لیٹے مجھ پر فکر و تشویش سوار ہوئی تو میں اٹھ کر باہر نکل آیا۔

اس وقت مجھے احمد یار دکھائی دیا۔ وہ لمبا تڑنگا اور گورا چٹا نوجوان تھا۔ بہت ہی ہنس مکھ اور بات بات پر قہقہے لگانے والا..... لیکن بھارتی فوجیوں سے اس کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ اگر اس کا بس چلتا یا کیمپ میں بریگیڈیئر منیر صاحب جیسے مخلص افسر نہ ہوتے تو وہ اب تک دو چار بھارتی فوجیوں کو قتل کر چکا ہوتا۔

وقار اکثر مجھے اور احمد یار کو سمجھاتا تھا کہ اس وقت ہم دشمن کی قید میں ہیں، ہمیں جوش کی نہیں ہوش کی ضرورت ہے۔ تم دونوں اپنے جوش پر فی الحال قابو پا لو، بعد میں جوش دکھانے کے کئی مواقع ملیں گے۔

میں نے احمد یار کو اشارے سے اپنی طرف بلایا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ اس نے فوجی انداز میں تن کر اپنے جسم کو دونوں پنجوں پر اٹھایا اور بولا۔ ''یس سر!''

''احمد یار! سب تیاری مکمل ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''یس سر! کپتان صاحب نے میرے ذمے جو کام لگائے تھے، وہ سب میں نے کر لیے ہیں۔''

''جاؤ، اب کچھ دیر آرام کر لو۔'' میں نے کہا۔

احمد یار ہنستا ہوا چلا گیا۔

اصل میں کیپٹن وقار نے ہم سب کی ذمے داریاں بانٹ دی تھیں۔ پنسل ٹارچ، زمین کھودنے کے لیے ٹینٹ کی بھاری اور نکیلی کیل، ایک مضبوط رسّی اور فرسٹ ایڈ کا سامان اکٹھا کرنا احمد یار کی ذمے داری تھی۔

میرے ذمے پانی اور خوراک کا کچھ ذخیرہ، درد رفع کرنے والی گولیاں اور ایک چھری کا بندوبست کرنا تھا۔ باقی ذمے داریاں وقار کی تھیں۔ میں نے اسے بتا دیا تھا کہ میں نے ہر چیز کا بندوبست کر لیا ہے، سوائے چھری کے۔

رات کو میں نے ان کپڑوں کی چھوٹی سی ایک گٹھڑی بنا کر اپنے پلنگ کے نیچے چھپا دی جن پر جنگی قیدی کی مہر نہیں تھی۔

حسبِ معمول دس بجے رول کال شروع ہوئی۔ یہ ایک طرح سے تمام قیدیوں کی حاضری اور گنتی ہوتی تھی۔

گیارہ بجے ہمیں وہاں سے نکل کر سرنگ کے دہانے پر ملنا تھا۔ ہمارے پاس گھڑیاں تو نہیں تھیں لیکن کیمپ کے کوارٹر گارڈ کے گھنٹے سے وقت کا علم ہو جاتا تھا۔

وقار نے آہستہ سے کہا۔ ''گیارہ کا گھنٹا بجتے ہی تم لوگ سرنگ پر پہنچ جانا۔ اس کے لیے ہمارے پاس صرف دس منٹ ہوں گے۔'' سرنگ میں کرالنگ کرنا بھی خاصا مشکل کام تھا۔ وقار نے اس کے لیے پینتالیس منٹ رکھے تھے۔ گویا گیارہ بج کر پچپن منٹ پر ہم سرنگ کے دوسرے دہانے پر ہوتے۔

بارہ بجے واچ ٹاور کے سنتریوں کی ڈیوٹی بدلتی تھی۔ دوسرے سنتری اوپر پہنچنے میں تقریباً پانچ سے سات منٹ لگاتے تھے۔ گویا ہمارے پاس وہی پانچ منٹ تھے جن میں ہم سرنگ سے نکل کر درختوں کے جھنڈ میں روپوش ہو سکتے تھے۔

ٹھیک گیارہ بجے میں نے اپنے سامان کا تھیلا اٹھایا اور دبے پاؤں اس طرف بڑھ گیا جہاں ہم نے سرنگ کھودی تھی۔

اس وقت وقار بھی وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ہاتھ میں کپڑے کا ایک تھیلا سا تھا۔ وہ اصل میں تکیے کا غلاف تھا۔

''تمہیں یہ بیگ کہاں سے مل گیا؟'' وقار نے پوچھا۔

''یہ میں نے لیفٹیننٹ نعیم کے پلنگ کے نیچے دیکھا تھا۔ اسے تو اس کی ضرورت نہیں تھی اس لیے میں لے آیا۔''

''یہ احمد یار اب تک کیوں نہیں آیا؟'' وقار نے بے تابی سے کہا۔

''بس آ رہا ہو گا سر!'' میں نے کہا۔ ''اس کے لیے دشواری زیادہ ہے کیونکہ یہ بیت الخلا افسران کے لیے ہے۔ رات کے وقت باہر نکلنے پر یوں بھی پابندی ہوتی ہے وہ.....''

میرا جملہ ادھورا رہ گیا کیونکہ وقار نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کی ہدایت کی تھی۔

چند لمحوں بعد مجھے بھی قدموں کی چاپ سنائی دی۔ وہ احمد یار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ وہ بھارتی لوگوں کی آواز تھی۔

میرا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ تو کیا ہمارا پلان ناکام ہو گیا تھا؟ میں نے دل گرفتگی سے سوچا۔

وہ آہٹیں بیت الخلا کے دروازے کے پاس آ کر رک گئیں۔ پھر مجھے ایک اجنبی آواز سنائی دی۔ ''وہ اسی طرف آیا ہے۔''

''تو اب کہاں گیا؟'' دوسری آواز سنائی دی۔

''کیا دھواں بن کر اڑ گیا یا زمین میں دھنس گیا؟''

''ہو سکتا ہے، وہ اندر چھپا بیٹھا ہو۔'' پہلے آدمی نے کہا۔

''کون ہے بھئی؟'' وہ چیخا اور ساتھ میں طاقت ور ٹارچ بھی روشن ہو گئی۔

کیپٹن وقار ایک دم زمین پر لیٹ گیا اور میں سامنے آ گیا اور بولا۔ ''کیا بات ہے جوان..... کیوں چیخ رہے ہو؟''

اس کی ٹارچ سے میری آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔ اس نے ٹارچ کا رخ دوسری طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ ''صاحب! ابھی آپ آئے ہیں ادھر؟''

''کیا کوئی اور بھی آیا ہے؟'' میں نے ناگواری سے کہا۔

''لیفٹیننٹ صاحب!'' ان میں سے ایک طنزیہ لہجے میں بولا۔ ''آپ جانتے ہو کہ رات کے اس سے باہر نکلنا منع ہے۔''

''ہاں میں جانتا ہوں جوان!'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''لیکن میرے پیٹ میں شدید درد ہو رہا تھا اس لیے.....''

''اوئے سیتا رام! وہ کوئی اور ہی تھا۔ تو یہاں کی اچھی طرح تلاشی لے لے۔''

میرا دل بُری طرح دھڑکنے لگا۔ وہ ذرا سے آگے بڑھتے تو وقار کو دیکھ لیتے۔

میری طرف سے بے فکر ہو کر وہ مڑے ہی تھے کہ میں نے پشت سے ان دونوں کے کالر پکڑ کر ان کے سر آپس میں زور سے ٹکرا دیے۔

لمحے بھر کے لیے وہ ہکا بکا سے رہ گئے۔ دوسرے ہی لمحے میں ہکا بکا رہ گیا کیونکہ عقب سے ایک ہیولا سا ان پر جھپٹا تھا اور ان میں سے ایک سنتری کو لے کر زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

میرے شکار کے ہاتھ میں ابھی تک روشن ٹارچ تھی۔ ٹارچ کی روشنی میں مجھے احمد یار نظر آیا۔ وہ ایک سنتری کی گردن دبا رہا تھا اور دوسرا ہاتھ مضبوطی سے اس کے منہ پر جما رکھا تھا۔

میں نے اپنے شکار کی کھوپڑی کی پشت پر ایک زوردار گھونسا رسید کر دیا۔ وہ ''ہے بھگوان'' کہتا ہوا زمین پر گر گیا۔

احمد یار اتنی دیر میں اپنے شکار کو ناک آؤٹ کر چکا تھا۔ یہ سب کچھ ایک منٹ سے بھی کم وقت میں ہو گیا۔

''ان دونوں میں سے کسی کو زندہ مت چھوڑنا۔'' نزدیک ہی سے کیپٹن وقار کی آواز سنائی دی۔ ''ورنہ یہ ہوش میں آتے ہی اتنی چیخ پکار کریں گے کہ بھارتی فوجی ہمیں اس سرنگ ہی میں زندہ دفن کر دیں گے۔''

احمد یار نے جھپٹ کر میرے شکار کی گردن پکڑی، پھر گردن چھوڑ کر بائیں ہاتھ سے اس کا سر پکڑا اور دائیں ہاتھ سے ٹھوڑی پکڑی۔ اس نے سنتری کی ٹھوڑی پکڑ کر مخصوص انداز میں جھٹکا دیا اور دوسرے لمحے ایسی آواز آئی جیسے سوکھی ہوئی شاخ کے ٹوٹنے سے آتی ہے۔

''جلدی کرو احمد یار!'' وقار نے کہا۔ ''دوسرے آدمی کو بھی ٹھکانے لگا دو۔''

''میں اسے ٹھکانے لگا چکا ہوں سر۔'' احمد یار نے کہا۔

''ان کی جیبوں سے نقدی نکال لو اور ان کی رائفلیں بھی اٹھا لو۔''

ان کی جیبوں میں نقدی تو زیادہ نہیں تھی۔ دونوں سنتریوں کی جیب میں مجموعی طور پر دو سو دس روپے تھے۔ ہمارے لیے تو وہ بھی اس وقت بہت تھے۔ البتہ ان سے ہمیں دو دستی گھڑیاں مل گئیں۔ اس وقت گھڑی کی ہمیں شدید

ضرورت تھی۔

احمد یار نے ایک گھڑی کیپٹن وقار کو دی اور دوسری میری طرف بڑھائی۔

''یہ گھڑی تم رکھو احمد یار!'' میں نے کہا۔

''نہیں سر! اس کی زیادہ ضرورت آپ کو ہے۔'' اس نے کہا۔ پھر کیپٹن وقار سے پوچھا۔ ''ان کی لاشوں کا کیا کرنا ہے؟''

''انہیں بھی ساتھ لے چلو۔'' کیپٹن وقار نے ہنس کر کہا۔ ''نہ جانے ہمیں کب کھانے کو ملے۔ کم سے کم انہیں روسٹ کر کے کھا تو سکیں گے۔''

پھر وہ سنجیدہ ہو کر بولا۔ ''انہیں یہیں کہیں ڈال دو اور جلدی کرو۔ ہمارے سات منٹ پہلے ہی ضائع ہو چکے ہیں۔''

لاشوں کو ایک طرف ڈالنے کے بعد سب سے پہلے کیپٹن وقار نے احمد یار کو سرنگ میں اترنے کا اشارہ کیا، پھر میں سرنگ میں اترا۔ سب سے آخر میں کیپٹن وقار سرنگ میں اترا۔ پہلے اس نے سرنگ کے منہ پر وہ تختہ رکھنا چاہا جو ہم احتیاط کے طور پر رکھتے تھے، پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا کیونکہ تختہ رکھتے ہی سرنگ میں حبس بہت بڑھ گیا تھا۔

ہمارے پاس ساڑھے سات گھنٹے تھے۔ بھارتی فوجیوں کو ہمارے فرار کا علم صبح رول کال سے پہلے نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ انہیں اس سے پہلے علم ہو جاتا تو ہمارا فرار ناکام ہو جاتا۔

وہ سرنگ اتنی چوڑی تھی کہ ایک آدمی اس میں کرالنگ کر کے آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس کی اونچائی اتنی بھی نہیں تھی کہ ہم اس میں بیٹھ سکتے۔

احمد یار بہت تیزی سے کرالنگ کرتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ وقار کے حکم پر اس نے بھارتی سنتریوں سے چھینی ہوئی طاقت ور ٹارچ روشن کر لی تھی۔

اس کے پیچھے میں تھا لیکن میری رفتار اتنی نہیں تھی۔ میں آپ کو شاید یہ بتانا بھول گیا کہ احمد یار تربیت یافتہ کمانڈو تھا۔ وہ اس قسم کے کاموں میں ماہر تھا۔ پریکٹس مجھے بھی تھی لیکن کافی عرصے سے کرالنگ کرنے کی مشق نہیں کی تھی اس لیے رفتار سست تھی۔ یہی حال کیپٹن وقار کا بھی تھا۔

پنسل ٹارچ وقار کے پاس تھی اور وہ مسلسل گھڑی بھی دیکھ رہا تھا۔

مزید بیس بائیس منٹ کی کرالنگ کے بعد وقار نے کہا۔ ''احمد یار! ٹارچ بند کر دو۔ ہم اب سرنگ کے دوسرے سرے تک پہنچنے والے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اس طاقت ور ٹارچ کی روشنی باہر چلی جائے اور واچ ٹاورز پر کھڑے ہوئے سنتری چوکنا ہو جائیں۔''

اچانک سرنگ میں گھپ اندھیرا چھا گیا۔ روشنی تھی تو اتنی گرمی اور گھٹن کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ اندھیرا ہوتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں جیتے جی کسی قبر میں دفن ہو گیا ہوں۔ شدید سردی کے باوجود میرے کپڑے پسینے میں تر ہو گئے تھے اور پسینا پانی کی طرح بہہ رہا تھا۔

مزید دس منٹ گزرے تو میرا دم گھٹنے لگا، سانس لینا دوبھر ہو گیا۔ وقار مسلسل پیچھے سے گھٹی گھٹی آواز میں کہہ رہا تھا کہ جلدی کرو، بس بارہ بجنے ہی والے ہیں۔

اچانک تازہ ہوا کا سرد جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا تو میری جان میں جان آئی۔

ہم سرنگ کے دوسرے سرے پر پہنچ چکے تھے اور احمد یار نے سرنگ کے منہ پر لگے ہوئے پتھر اور مٹی کے ڈھیلے ہٹا دیے تھے لیکن ابھی تک اس نے سرنگ سے باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

ہم وہیں پڑے اپنی سانسیں بحال کرتے رہے۔ کیپٹن وقار کی نظریں گھڑی پر تھیں۔

بارہ بجتے ہی میرے کانوں میں گھنٹے کی خفیف سی آواز آئی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ہم کیمپ سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھے۔

کیپٹن وقار نے ایک منٹ انتظار کرنے کو کہا، پھر وہ اچانک فوجی انداز میں بولا۔ ''موو! (MOVE)۔''

احمد یار نے آہستگی سے سر باہر نکالا اور ارد گرد کا جائزہ لینے کے لیے رک گیا پھر وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس کے بعد ہم دونوں بھی باہر نکل آئے۔

واچ ٹاورز ہم سے زیادہ دور نہیں تھے۔ یہ شدید خطرے کی بات تھی۔

کیپٹن وقار نے ہمیں کیمپ کی مخالف سمت میں بڑھنے کا حکم دیا۔

احمد یار کسی چھپکلی کی طرح کرالنگ کرتا ہوا ہم سے بہت آگے نکل گیا۔

میں بھی حتی الامکان بہت تیزی سے کرالنگ کر رہا تھا لیکن پیٹھ پر لدا ہوا سامان کا تھیلا اور سنتری سے چھینی ہوئی رائفل رکاوٹ بن رہی تھی۔ میں یہ رائفل ابھی پھینک بھی نہیں سکتا تھا۔

پھینکنے کی صورت میں ہم کم از کم کچھ بھارتیوں کو تو جہنم

رسید کر سکتے تھے۔ کرانگ کرنے میں میرے پیٹ، سینے پر خراشیں آئی تھیں، کہنیاں تو بالکل ادھڑ کر رہ گئی تھیں۔

کیپٹن وقار کے بتائے ہوئے وقت کے مطابق ہم درختوں اور خودرو جھاڑیوں کے جھنڈ تک پہنچ چکے تھے۔

احمد یار وہاں ہمارا انتظار کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک اوندھے منہ پڑا ہوا تھا اور اپنی سانس بحال کر رہا تھا۔

''اب ہمیں جھک کر چلنا ہوگا۔'' کیپٹن وقار نے کہا۔ ''یہ درختوں کا جھنڈ اور خودرو جھاڑیاں بھی واچ ٹاورز کے سنتریوں کی رینج میں ہیں۔''

ہم جھکے جھکے بہت تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ اس وقت مجھے ملٹری اکیڈمی کے انسٹرکٹر صوبیدار یوسف صاحب یاد آئے۔ وہ کیڈٹس کو سزا کے طور پر اس انداز میں دوڑایا کرتے تھے۔ یہ سزا میں نے بھی بہت بھگتی تھی اس لیے مجھے زیادہ دقت نہیں ہو رہی تھی۔

''یار لیفٹین!'' وقار نے ہنس کر سرگوشی کی۔ ''اس وقت تو مجھے ملٹری اکیڈمی یاد آگئی۔''

مجھے ہنسی آگئی کیونکہ میں بھی وہی کچھ سوچ رہا تھا۔

ہم نے اسی انداز میں دو فرلانگ کا فاصلہ تو طے کیا ہو گا۔ ایک ہی انداز میں چلتے چلتے میرے پاؤں شل ہو گئے تھے۔ کوئی عام آدمی اس طرح دوڑنا تو دور کی بات ہے، چلنے کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ میری پنڈلیوں اور رانوں کے مسل پُل ہو گئے تھے۔

ایک جگہ کیپٹن وقار نے رکنے کا اشارہ کیا۔ ہم وہیں خودرو گھاس پر پڑ کر ہانپنے لگے۔

کیمپ اب خاصا دور رہ گیا تھا لیکن ہم اب بھی خطرے میں تھے۔ فوجیوں کی کوئی بھی پیٹرول پارٹی ہمیں پکڑ سکتی تھی۔

وہاں رک کر ہم لوگوں نے پانی پیا۔ پھر کچھ دم لے کر آگے بڑھ گئے۔ اس مرتبہ ہم تیزی سے دوڑ رہے تھے۔ ہمارے پیروں میں اگر مضبوط سول کے جوتے نہ ہوتے تو اس خاردار راستے پر ہمارے پاؤں لہولہان ہو جاتے۔ ہمارے کپڑے خاردار جھاڑیوں میں الجھ کر پھٹ گئے تھے جسم پر کانٹوں کی بے شمار خراشیں تھیں۔ بس ہم دوڑ رہے تھے۔

آدھے گھنٹے تک دوڑنے کے بعد کیپٹن وقار نے ایک مرتبہ پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''ہمیں کیمپ سے فرار ہوئے دو گھنٹے ہو چکے ہیں۔ اب تھوڑی دیر رک کر دم لے لو۔''

ہم وہیں زمین پر ڈھے گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ کچھ دیر ستانے کے بعد ہم نے ایک مرتبہ پھر پانی پیا۔

جب ہماری توانائی ذرا بحال ہوئی تو وقار نے کہا۔ ''یہاں سے ہمارے سفر کا دوسرا مرحلہ شروع ہوگا۔ ہم یہیں اپنے کپڑے بدلیں گے اور فالتو سامان سے چھٹکارا حاصل کریں گے۔''

ہم نے رائفل کی سنگینوں سے وہیں ایک گڑھا کھودا اور اس میں اپنے کپڑے، سنتریوں کی دونوں رائفلیں، پانی کی بوتلیں اور سارا فالتو سامان اس گڑھے میں ڈال دیا۔ ہم نے رائفلوں کی سنگینیں البتہ اتار لی تھیں۔ یہ سنگینیں ہمارے کام کی تھیں لیکن انہیں چھپانا بھی ایک مسئلہ تھا۔ اگر کسی کی نظر ان پر پڑ جاتی تو فوراً سمجھ جاتا کہ یا تو فوج سے ہمارا تعلق ہے یا پھر ہم کیمپ کے مفرور ہیں۔

کیپٹن وقار نے چند لمحے غور کیا پھر رائفلوں کی سنگینیں بھی اس گڑھے میں ڈال دیں۔ پھر ہم نے اس گڑھے میں مٹی بھر کے اس پر درختوں کے پتے اور خودرو جھاڑیاں پھیلا دیں۔

''اب تم لوگ اپنے اپنے پیسے نکالو۔'' کیپٹن وقار نے کہا۔

میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر سارے نوٹ نکالے اور وقار کے حوالے کر دیے۔ ہمارے پاس مجموعی طور پر چوبیس سو روپے تھے۔ اس نے اس رقم کے تین حصے کرنے کے بعد کچھ رقم میری طرف بڑھادی اور بولا۔ ''میں نے احمد یار کو کچھ پیسے زیادہ دیے ہیں۔ اب یہاں سے ہمارے راستے جدا ہو جائیں گے۔''

یہ سن کر مجھے ایک دھچکا سا لگا۔

''ہم تینوں ساتھ رہے تو پکڑے جانے کے امکانات زیادہ ہوں گے۔'' وقار نے کہا۔ پھر باری باری مجھ سے اور احمد یار سے بغل گیر ہوا اور بولا۔ ''اللہ حافظ دوستو! اگر زندگی رہی تو پھر ملیں گے۔ مجھ سے اگر کوئی زیادتی ہوگئی ہو تو معاف کر دینا۔'' اس کی آواز گلوگیر ہوگئی۔

''کیسی باتیں کرتے ہیں سر!'' میں نے کہا۔ ''ہمیں ہنسی خوشی رخصت ہونا چاہیے۔ آپ تو ہمنسانے کے بجائے رلا رہے ہیں۔''

احمد یار کچھ نہیں بولا۔ اس نے فوجی انداز میں مجھے اور وقار کو تعظیم دی اور اپنے آنسو پونچھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ میں نے بھی کیپٹن وقار کو اس انداز میں تعظیم دی اور ہم مخالف سمتوں میں روانہ ہو گئے۔ میں نے مڑ کر ایک دفعہ اپنے ساتھیوں کو دیکھا۔ وہ بھی مجھے ہی دیکھ رہے تھے۔ ہم میں

سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ اب کبھی ملاقات ہو گی بھی یا نہیں۔ ہم میں سے کون زندہ بچ کر پاکستان تک پہنچ پائے گا اور کون اس دوڑ میں اپنی زندگی کی بازی ہار دے گا۔

☆☆☆

اجنبی راستے، اجنبی منزلیں اور اجنبی دیس! میں تن بہ تقدیر ہو کر ایک سمت میں چلتا رہا۔ میرے دل سے یہی دعا نکل رہی تھی۔ ''اے ربِ کائنات! تو میرے گناہوں کو معاف فرما دے اور مجھے اور میرے ساتھیوں کو بہ عافیت پاکستان پہنچا دے۔ اے اللہ! ہم نے تیرے ہی آسرے پر یہ قدم اٹھایا ہے، تو ہی ہماری حفاظت فرمانے والا ہے۔ ہمیں مزید ذلیل و خوار ہونے سے بچالے میرے معبود!''

میں نے کیمپ کا تصور کیا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ ابھی بھارتیوں کو ہمارے فرار کا علم نہیں ہوا ہوگا۔ میں تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔

ابھی تک اندھیرا تھا۔ سردیوں میں تو یوں بھی سورج دیر سے نکلتا ہے۔

چلتے چلتے آخر افق پر سپیدۂ سحر نمودار ہو گیا۔ میں مزید تیز تیز قدم بڑھانے لگا۔

اب اجالا چاروں طرف پھیل گیا تھا۔ سوا سات بج رہے تھے۔ اب بھارتیوں کو ہمارے فرار کا علم ہو گیا ہوگا۔ یہ سوچ کر مجھے کچھ ندامت سی ہوئی کہ ہمارے اس اقدام سے کیمپ کے قیدیوں کی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ بھارتی فوجی ان پر اب شدید سختی کریں گے۔ ممکن ہے، اب تک وہ میرے دوسرے ساتھیوں سے پوچھ گچھ کر رہے ہوں اور ان پر تشدد کر رہے ہوں۔

میں نے دن کے اجالے میں اپنا جائزہ لیا۔ میرے نئے کپڑے بھی مٹی میں اٹ گئے تھے، جوتے پر مٹی کی تہیں تھیں اور بالوں میں بھی یقیناً مٹی ہوگی۔

اچانک مجھے اپنی ہولناک غلطی کا احساس ہوا۔ میرے جسم کے کپڑے اگرچہ میلے ہو گئے تھے، اس کے باوجود وہ الگ سے پہچانے جا سکتے تھے۔ میں الٰہ آباد کے کسی گاؤں کے نزدیک تھا۔ گاؤں میں ایسے کپڑے کون پہنتا ہے اور کوئی شہر سے آنے والا پہنتا بھی ہوگا تو اتنے قیمتی اور امپورٹڈ کپڑے اور اونی جرسی نہیں پہنتا ہوگا۔

میں مزید آگے بڑھا تو کھیتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

ایک کھیت کی پگڈنڈی پر چلتے ہوئے اچانک کسی کے گانے کی آواز سن کر میرے قدم رک گئے۔ میں نے اردگرد دیکھا تو مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ آواز کنوئیں کے پاس سے آرہی ہے۔ اس گاؤں میں اور ہمارے پنجاب کے گاؤں میں بالکل فرق نہیں تھا۔ وہی ریت، وہی کنواں، وہی ہینڈ پمپ..... فرق صرف زبان اور لباس کا تھا۔

کنوئیں کے ساتھ ہی چار دیواری اٹھا کر غالباً چھوٹا سا ایک غسل خانہ بنایا گیا تھا۔ گانے والا بہت ترنگ میں کوئی پوربی گیت گا رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے ہینڈ پمپ چلنے کی آواز آرہی تھی۔ اچانک میری نظر کنوئیں کی منڈیر کے پاس رکھے ہوئے کپڑوں پر پڑی۔

میں نے جلدی سے وہ کپڑے اٹھا لیے اور وہاں سے تیزی کے ساتھ روانہ ہو گیا۔

وہاں سے کافی دور جا کر میں نے چوری کیے ہوئے کپڑوں کا جائزہ لیا۔ ان کپڑوں کا مالک ہی غالباً اندر نہا رہا تھا۔ یہ ایک دھوتی اور کُرتہ تھا۔ کُرتہ بہت زیادہ میلا اور بوسیدہ نہیں تھا، دھوتی بھی ایسی حالت میں تھی۔ اس کے علاوہ ایک بنڈی بھی تھی جو گاؤں کے علاوہ شہروں کے لوگ بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس بنڈی میں پیسے بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ چوکور سا ایک کپڑا اور تھا۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کا مالک اسے سر پر باندھتا ہوگا۔

میں نے ایک محفوظ جگہ پر کپڑے بدلے۔ میں نے پہلے جرسی پہنی، اس کے اوپر سے بنڈی پہن کے کُرتہ پہن لیا اور دھوتی باندھ لی۔ میں نے اپنی جیبوں کی تمام چیزیں بنڈی میں منتقل کر دیں۔ ان میں سر درد اور پیٹ کا درد رفع کرنے والی گولیوں کے علاوہ نقد رقم بھی تھی۔

اپنے کپڑے میں نے اس چارخانے والے رومال میں باندھ لیے۔ اب میں کسی حد تک محفوظ تھا اور کوئی بھی مجھ پر شبہ نہیں کر سکتا تھا کہ میں اس علاقے میں اجنبی ہوں۔

کھیتوں کی اس پگڈنڈی پر چلتے ہوئے کئی گھنٹے گزر چکے تھے۔ راستے میں کئی راہ گیروں سے میرا سامنا بھی ہوا لیکن وہ لوگ توجہ دیے بغیر گزر گئے۔

آخر مجھے آبادی کے آثار نظر آہی گئے۔ وہ خاصا بڑا گاؤں تھا۔ گاؤں کیا بلکہ قصبہ ہی ہوگا کیونکہ وہاں بہت سے کچے پکے مکانات تھے۔

میں مزید آگے بڑھا تو مجھے وہاں چھوٹا سا ایک بازار بھی نظر آیا۔ وہاں ایک دکان میں موٹا سا ایک آدمی بڑے سے کڑاہ میں پوریاں تل رہا تھا۔ پوریوں کی اشتہا انگیز مہک سے میرے پیٹ میں بھوک کے مارے اینٹھن ہونے لگی۔ رات کو کیمپ میں بھی مجھ سے زیادہ نہیں کھایا گیا تھا۔

میرے قدم بے اختیار حلوائی کی دکان کی طرف اٹھ

گئے۔ اب مسئلہ تھا کہ میں اسے پوریوں اور ترکاری کے لیے کتنے پیسے دوں۔

میری یہ مشکل یوں حل ہوئی کہ ایک دیہاتی آدمی نے چوٹی دے کر اس سے ڈھیر ساری پوریاں اور ترکاری لی تھی۔

میرے پاس ریزگاری تو تھی نہیں۔ میں نے اپنی بنڈی کی جیب سے ایک روپے کا نوٹ نکالا اور حلوائی کی دکان پر پہنچ گیا۔

ملٹری اکیڈمی کاکول اور میری رجمنٹ میں کچھ راجپوت افسر اور جوان بھی تھے۔ وہ آپس میں اپنی زبان میں بات کرتے تھے جو اس گاؤں میں بولی جارہی تھی۔ ان کی باتیں سن سن کر میں بھی تھوڑی بہت پوربی زبان سیکھ گیا تھا لیکن دو چار جملوں کے علاوہ کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

میں نے ایک روپے کا نوٹ موٹے حلوائی کو دیا تو اس نے مجھے گھور کے دیکھا اور بولا۔ ''اب اس سمے میں چُھٹا کہاں سے لاؤں۔ تیرے کتے پچیس پیسے نہ ہیں؟''

''تیں مجھے پوریاں اور جلیبیاں دے دے بھائی۔'' میں نے حتی الامکان اسی جیسا لہجہ بنانے کی کوشش کی۔ ''ہم مسافر ہیں بھیا! ادھر ہماری جنانیاں اور بچے بھی کھڑے ہیں تُو آدھے پیسوں کی پوری اور باقی آدھے پیسوں کی جلیبی دے دے۔''

اس نے بڑے سے ایک کاغذ میں نہ جانے کتنی پوریاں باندھ دیں، ایک پتے کے اوپر آلو کی ترکاری بھی رکھ دی۔

اتنی زیادہ پوریاں تو میں کھا بھی نہیں سکتا تھا۔

حلوائی اب جلیبیاں تول رہا تھا۔ ''ایسا کر بھائی! جلیبیاں رہن دے..... اب تیرے پاس اتنا چھٹا تو ہووے گا؟''

اس نے ایک مرتبہ پھر مجھے گھورا پھر گلّے میں ہاتھ ڈال کر ایک اٹھنی مجھے دے دی۔

میں نے وہ پوریاں سمیٹیں اور وہاں سے کچھ فاصلے پر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ کر پوریوں پر ٹوٹ پڑا۔ میں اتنا بھوکا تھا کہ دیکھتے ہی دیکھتے ساری پوریاں چٹ کر گیا۔

کھانے سے فارغ ہو کر میں اس گاؤں کی آبادی کی طرف بڑھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ یہ کوئی گاؤں نہیں بلکہ قصبہ ہو گا۔

اچانک میری نظر وہاں ایک بوسیدہ سی مسجد پر پڑی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہاں مسلمان بھی موجود تھے۔ اب سے چالیس سال پہلے بھارتی مسلمان ذہنی اور جذباتی طور پر پاکستان کے ساتھ تھے۔

میں نے مسجد میں جا کر ہاتھ منہ دھویا، سر بھی اچھی طرح صاف کر لیا۔

امام صاحب ابھی تک مسجد میں موجود تھے۔ ان کے ساتھ صاف ستھرے کُرتے پاجامے میں ملبوس ایک صاحب اور بھی موجود تھے۔

امام صاحب ان سے باتیں کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر وہ خاموش ہو گئے۔ میں نے نزدیک پہنچ کر بڑے ادب سے انہیں سلام کیا۔ انہوں نے سلام کا جواب دے کر کہا۔ ''بیٹھ جا بھائی! مارے سے کوئی کام ہے؟''

''میں مسافر ہوں مولوی صاحب۔'' میں نے کہا۔ ''راستے میں میری جیب میں سے کسی نے سارے پیسے نکال لیے۔''

''تیں نے کچھ کھایا بھی ہے؟''

''ہاں، ایک روپیا میرے کُرتے کی جیب میں پڑا تھا۔ میں نے ابھی پوریاں کھائی ہیں۔''

''جانڑا کدھر ہے بھائی؟'' وہ صاحب پہلی دفعہ بولے۔

''الٰہ آباد۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''بھائی! تُو ایسا کر مارے ساتھ چل۔ میں تیرے واسطے کچھ پیسوں کا بندوبست تو کر ہی سکتا ہوں۔''

امام صاحب نے بھی رضامندی ظاہر کر دی۔ میں نے انہیں پھر اسی طرح باادب ہو کر سلام کیا اور ان صاحب کے ساتھ روانہ ہو گیا جنہیں مولوی صاحب عبدالرحمٰن کے نام سے مخاطب کر رہے تھے۔

وہ صاحب سارے راستے بہت گہری نظر سے میرا جائزہ لیتے رہے۔ مجھے کچھ گھبراہٹ سی ہونے لگی لیکن اب میں انکار کرتا تو مزید انہیں شک میں مبتلا کرتا اس لیے ان کے ساتھ چلتا رہا۔

وہ شاید اس قصبے کے خاصے خوش حال آدمی تھے۔ ان کا گھر بھی پختہ اور دو منزلہ تھا۔ انہوں نے مجھے دروازے پر ٹھہرنے کو کہا اور خود مکان میں چلے گئے۔ مکان کے مرکزی دروازے کے ساتھ ہی ایک اور دروازہ بھی تھا۔ رحمٰن صاحب نے اندر جا کر وہی دروازہ کھول دیا۔ اس میں ایک نواڑی پلنگ اور چند مونڈھے رکھے ہوئے تھے۔ وہ شاید ان کی بیٹھک تھی۔

''لے بھائی! اب تو آرام سے بیٹھ جا۔ اگر تیں نے کھانا نہیں کھایا ہے تو حجاب نہ کریو۔ تیرے واسطے کھانے کو

کچھ لاؤں؟''

''آپ کا بہت شکریہ! کھانا تو میں کھا چکا ہوں۔''

''تو پھر میں تیرے واسطے چاء بنواتا ہوں۔ صورت سے بھی تو بہت تھکا ہوا دِکھے ہے۔ میری گھر والی ایسی چاء بناتی ہے کہ تیری ساری تھکن اتر جاوے گی۔''

وہ اندر گئے تو پندرہ سولہ سال کا ایک لڑکا بستر لے کر آ گیا۔ اس نے مجھے سلام کیا اور پلنگ پر بستر بچھا دیا۔ وہ ایک رضائی بھی لایا تھا اور تکیے بھی۔

وہ بستر لگا کر چلا گیا تو رحمٰن صاحب ایک تشتری میں چائے کے دو گلاس لے کر آ گئے۔

وہ گڑ کی چائے تھی جس میں رحمٰن صاحب کی گھر والی نے الائچی اور شاید کچھ اور بھی ڈالا تھا۔ چائے واقعی بہت لذیذ تھی۔

میں چائے پی کر فارغ ہوا تو رحمٰن صاحب چھوٹا سا ایک ٹرانزسٹر لے کر آ گئے۔ انہوں نے ٹرانزسٹر درمیان میں رکھی ہوئی ایک میز پر رکھا اور کچھ سوچتے گئے پھر بولے۔ ''ایک بات پوچھوں، سچ سچ بتائیو۔''

ان کا لہجہ اور سوال سن کر میرا دل اُن جانے خدشات سے دھڑکنے لگا۔ ''جی پوچھیں؟'' میں نے کہا۔

''تو بھی ان تین قیدیوں میں سے ایک ہے جو جنگی کیمپ سے بھاگے ہیں؟''

مجھے ایسا لگا جیسے انہوں نے میرے سر پر لٹھ رسید کر دیا ہو۔ میں پھٹی پھٹی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''دیکھ، جھوٹ مت بولیو ورنہ نقصان میں رہے گا۔ میں اسی وقت پہچان گیا تھا جب تُو نے امام صاحب کو سلام کیا تھا۔''

میں نے سوچا کہ اب جو ہو سو ہو، میں فرار ہو کر زیادہ دور بھاگ بھی تو نہیں سکتا تھا۔ نہ مجھے وہاں کے راستوں کا علم تھا، نہ ہی یہ معلوم تھا کہ اس وقت میں جس قصبے میں ہوں اس کا نام کیا ہے اور الٰہ آباد سے کتنی دور ہے؟ میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

رحمٰن صاحب اچانک اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے والہانہ انداز میں میری پیشانی چوم لی اور بولے۔ ''تو مسلمان ہے اور مسلمان بھائی کی مدد کرنا ہمارا فرض ہے۔ اب تُو بالکل فکر مت کر۔ یہاں تیرے لیے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اللہ کی قسم! میں بالکل سچ بول رہا ہوں۔'' ان کے لہجے میں خلوص تھا۔

''مجھے ایک بات بتایئے۔'' میں نے کہا۔ ''آپ نے مجھے پہچانا کیسے؟''

''تیرے جوتوں اور بالوں سے۔'' رحمٰن صاحب نے کہا۔ ''تیرا جوتا شہری بابو والا ہے اور بال بھی فوجی انداز میں کٹے ہوئے ہیں۔ پھر تُو الٰہ آباد جانے کی بات کر رہا تھا۔ الٰہ آباد یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ مشکل سے بیس کلومیٹر ہو گا۔ تُو نے بتایا تھا کہ تیرے پاس ایک روپیا تھا۔ تُو نے زیادہ سے زیادہ پچیس پیسے کی پوریاں کھائی ہوویں گی۔ الٰہ آباد کے لیے لاری یہاں سے پچیس پیسے لیتی ہے۔''

مجھے فوراً اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ میری باتوں ہی سے وہ شبہے میں پڑ گئے ورنہ کوئی مقامی آدمی ہوتا تو بس میں بیٹھ کر سیدھا الٰہ آباد چلا جاتا۔

''پھر مجھے یہاں سے جانا چاہیے۔'' میں نے گھبرا کر کہا۔

''کہاں جاوے گا؟'' رحمٰن صاحب نے پوچھا۔ ''الٰہ آباد میں کون ہے تیرا؟'' پھر وہ نرم لہجے میں بولے۔ ''ابھی تُو آرام کر، رات بھر کا جاگا ہوا ہے۔ مجھ پر بھروسا رکھ۔ میں تیرا دشمن نہیں ہوں۔''

میں اب بھی ان کی طرف سے مطمئن نہیں تھا لیکن ان کے اصرار پر لیٹ گیا۔ میں واقعی تھکن سے چُور چُور تھا اور میرے جسم کا جوڑ جوڑ فریاد کر رہا تھا۔

رحمٰن صاحب نے ٹرانزسٹر کھول لیا اور بولے۔ ''خبروں کا وقت ہونے والا ہے۔''

اس وقت ٹرانزسٹر پر لتا منگیشکر کا کوئی گانا بج رہا تھا۔

گانا ختم ہوتے ہی نیوز بلیٹن شروع ہو گیا۔ ''یہ آل انڈیا ریڈیو ہے۔ اب آپ سادھنا سے سماچار سنیے۔ کل رات الٰہ آباد کے جنگی کیمپ سے تین پاکستانی فوجی سرنگ کھود کر فرار ہو گئے ہیں۔ وہ جاتے جاتے کیمپ کے دو سنتریوں کو بھی مار گئے ہیں۔ ان میں ایک سپاہی، ایک سیکنڈ لیفٹیننٹ اور ایک کیپٹن کے عہدے کا قیدی ہے۔ لوگ ان لوگوں سے ہوشیار رہیں کیونکہ وہ اپنے ساتھ سنتریوں کی رائفلیں بھی لے گئے ہیں۔''

پھر نیوز کاسٹر دوسری خبریں سنانے لگی۔

بلیٹن ختم ہوا تو کوئی مرد اناؤنسر بولا۔ ''الٰہ آباد کے کیمپ سے جو قیدی فرار ہوئے ہیں، ان کے نام اور حلیے یہ ہیں۔ سپاہی احمد یار خان، لمبا تڑنگا اور سرخ و سفید آدمی ہے۔ اس کی گردن پر دائیں جانب ایک مَسا ہے۔ اس کی عمر تقریباً بائیس سال ہے۔ دوسرا قیدی سیکنڈ لیفٹیننٹ خرم خان ہے۔ اس کی عمر تقریباً تیئیس چوبیس سال ہے۔ یہ قیدی بھی لمبا تڑنگا

ہے، جسم ورزشی ہے۔ بال بھورے ہیں اور چہرے پر مونچھیں ہیں۔ تیسرا آدمی کیپٹن وقار علی ہے۔ اس کا قد لمبا، جسم گٹھیلا اور عمر تقریباً تیس سال ہے۔ ماتھے پر بائیں جانب چوٹ کا نشان ہے، رنگ گورا ہے اور چہرے پر گھنی مونچھیں ہیں۔''

میں سناٹے میں رہ گیا۔ میں نے رحمٰن صاحب سے پوچھا۔ ''جنگی قیدیوں کا کیمپ یہاں سے کتنی دور ہے؟''

''زیادہ دور نہیں ہے..... پینتیس، چالیس کلومیٹر کا فاصلہ ہوگا۔''

''یعنی تقریباً بیس بائیس میل؟'' میں نے پوچھا۔ پاکستان میں اس وقت تک میل ہی رائج تھا۔

''یہاں تو کلومیٹر ہی ہووے ہے اور یہ جو تو اٹھنّی، چونّی اور آنی کہتا ہے نا، یہ اب ادھر نہیں چلتا۔ پچیس پیسے اور پچاس پیسے بولتے ہیں ادھر۔''

''پیسے تو وہاں بھی ہیں لیکن لوگوں کی زبان پر اب تک دو آنے، چار آنے اور آٹھ آنے ہی چڑھے ہوئے ہیں۔'' یہ کہتے ہوئے نیند سے میری پلکیں بوجھل ہو رہی تھیں۔

''تو اب سوجا اور فکر بالکل مت کریو۔'' رحمٰن صاحب نے کہا اور ٹرانزسٹر لے کر وہاں سے چلے گئے۔ میں بھی فوراً ہی سو گیا۔

میری آنکھ کھلی تو کمرے میں بلب جل رہا تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی، اس میں ساڑھے نو بج رہے تھے۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بھرپور نیند کے بعد میری ساری تھکن اتر گئی تھی اور میں پھر پہلے کی طرح چاق و چوبند ہو گیا تھا۔

بیٹھک کے اندرونی دروازے سے رحمٰن صاحب نے جھانکا اور مجھے دیکھ کر کمرے میں آگئے اور ہنس کر بولے۔ ''یار! تو تو گدھے گھوڑے سب بیچ کر سو گیا تھا۔ میں پہلے بھی تین بار آیا تھا مگر تو سو رہا تھا۔ چل اٹھ، میں نے تیرے نہانے کا بندوبست کر دیا ہے۔ بالٹی میں گرم پانی ہے۔ جا کر نہا لے اور کپڑے بھی بدل لے۔''

میں گرم پانی سے نہایا تو گویا مجھ میں نئی زندگی دوڑ گئی۔ غسل خانے ہی میں ایک طرف تولیا اور بالکل نیا کُرتہ پاجامہ ٹنگا ہوا تھا۔ میں نے وہ کپڑے پہنے لیکن اپنی بنڈی پہننا نہیں بھولا۔

میں نہا دھو کر باہر نکلا تو رحمٰن صاحب ہنس کر بولے۔ ''یار! تو تو بہت سوہنا جوان ہے۔''

میں مسکرا کر رہ گیا۔

وہ اچانک سنجیدہ ہو گئے اور بولے۔ ''یار خرم! ایک بات بتا۔ یہ پاکستانی فوج کو کیا ہو گیا کہ اس نے ان گیدڑوں اور کتوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیے؟''

''مجھے تو لگتا ہے کہ جنرل نیازی نے اپنی جان کے خوف سے ہتھیار ڈال دیے ورنہ ہم تو آخری آدمی اور آخری گولی تک لڑنے کا عزم کیے بیٹھے تھے۔''

''جس دن ہمیں یہ خبر ملی، قسم اللہ کی...... اس دن ہمارے گھروں میں چولہا نہیں جلا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے گھر میں کسی کی میت ہو گئی ہو۔'' یہ کہتے ہوئے عبدالرحمٰن صاحب کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''آپ اداس مت ہوں۔'' میں نے جبراً مسکراتے ہوئے کہا۔ ''اس شکست کا بدلہ لیے بغیر ہم بھی چین سے نہیں بیٹھیں گے۔''

وہ چونک کر بولے۔ ''باتوں میں مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ تُو بھوکا بھی ہوگا۔ چل کھانا کھا لے، کھانا تیار ہے۔ آجا، اندر ہی آجا! تو میرے بیٹوں کی طرح ہے۔ میری گھر والی تجھ سے کیا پردہ کرے گی۔''

ان کے اصرار پر میں اندر چلا گیا۔ ان کی بیگم بھی بہت شفیق اور مہربان خاتون تھیں۔ میں نے انہیں سلام کیا تو انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیر کے مجھے ڈھیروں دعائیں دیں۔

''بس بھئی، یہی اپنا خاندان ہے۔'' رحمٰن صاحب مسکرائے۔ دو بیٹے اور ایک بیوی۔ ایک بیٹا احسان تو یہی ہے۔''

انہوں نے اس لڑکے کی طرف اشارہ کیا جو میرے لیے بستر لے کر آیا تھا۔

''دوسرا بیٹا فرقان دلّی میں پڑھتا ہے۔ وہ چھٹیوں پر گھر آتا ہے۔''

کھانے کے بعد ان کی بیگم دیر تک مجھ سے پاکستان کی باتیں کرتی رہیں۔ پھر رحمٰن صاحب کی فرمائش پر انہوں نے وہی چائے بنائی جو میں دن میں پی چکا تھا۔

میں اٹھ کر پھر بیٹھک میں جانے لگا تو رحمٰن صاحب بولے۔ ''میں نے تیرے لیے وہ کمرا تیار کر دیا ہے۔'' انہوں نے ایک کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ تو بیٹھک ہے۔ وہاں تو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔''

میں خاموشی سے اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہاں وہ ٹرانزسٹر بھی موجود تھا جو رحمٰن صاحب کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ میں نے یونہی ٹرانزسٹر آن کر دیا۔

خبریں شروع ہو چکی تھیں۔ اچانک نیوز کاسٹر بولی۔

''الہ آباد کیمپ سے فرار ہونے والے قیدیوں میں سے ایک کو بہت زبردست مقابلے کے بعد گرفتار کر لیا گیا ہے۔''

خبر سن کر میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ''سپاہی احمد یار خان کو پولیس نے رام پور کے ایک ہوٹل سے گرفتار کیا ہے۔ اس نے ہوٹل کے مالک آنند بخشی جی کو یرغمال بنا لیا تھا اور انہی کے پستول سے مقابلہ کر رہا تھا۔ اس مقابلے میں پولیس کے دو افسر اور تین جوان بہت بری طرح زخمی ہو گئے ہیں۔ دونوں افسر ایک گھنٹے بعد چل بسے، تین زخمیوں کی حالت بھی نازک ہے۔ پولیس کے ایک انسپکٹر نے اپنی جان پر کھیل کر اس پاکستانی درندے کو پکڑ لیا اور بعد میں آرمی کے حوالے کر دیا لیکن دو پاکستانی درندے اب بھی آزاد گھوم رہے ہیں۔''

خبریں سن کر میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ سپاہی احمد یار کا ہنستا مسکراتا چہرہ میری نظروں کے سامنے آ گیا۔

ریڈیو کی آواز سن کر رحمٰن صاحب بھی کمرے میں آ گئے اور بولے۔ ''تو ابھی تک جاگ رہا ہے اور...... تُو تو زنانیوں کی طرح... رو رہا ہے۔ بات کیا ہے؟''

''میرا ایک ساتھی رام پور سے پکڑا گیا۔'' میں نے کہا۔

''کب؟'' وہ افسردگی سے بولے۔

''نیوز کاسٹر تو یہ بتا رہی تھی کہ اسے ایک گھنٹا پہلے گرفتار کیا گیا ہے۔''

''اور کچھ؟'' رحمٰن صاحب نے پوچھا۔

''ایک تو خبروں میں ہندی کے الفاظ اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ بعض اوقات کچھ بھی پلے نہیں پڑتا۔''

وہ دیر تک بیٹھے میری دل جوئی کرتے رہے۔ مجھے تسلیاں دلاسے دیتے رہے، بچوں کی طرح بہلاتے رہے۔

ان کے جانے کے بعد میرے دل سے بے اختیار یہ دعا نکلی کہ الٰہی تو مجھے اور کپتان صاحب کو ہر بلا، ہر آفت سے محفوظ رکھنا اور ہمیں بہ خیریت اپنے پیاروں سے ملا دے۔

میں دن بھر سو لیا تھا اس لیے نیند نہیں آ رہی تھی۔

میں نے سوچا کہ میں آئندہ کا لائحہ عمل ہی طے کر لوں۔ بنیادی مسئلہ پیسوں کا تھا۔ میرے پاس پیسوں کی بہت کمی تھی۔ گو کہ اس زمانے میں تو سو روپے کی بھی بہت قدر تھی لیکن ایک اجنبی ملک میں، اجنبی لوگوں کے درمیان سے گزر کر اپنے ملک پہنچنے کے لیے یہ رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ مجھے کسی ریوالور یا پستول کی شدید ضرورت تھی۔ مسلح رہ کر میں زیادہ بہتر طریقے سے اپنا دفاع کر سکتا تھا۔ خطرہ تو وہاں قدم قدم پر موجود تھا۔ کہیں بھی، کسی بھی وقت کچھ بھی ہو سکتا تھا۔

میں یہ تو جانتا تھا کہ میں شاہ جہاں پور کے راستے کھٹمنڈو کی طرف نکل سکتا ہوں۔ راجستھان سے تھرپارکر کی طرف نکل سکتا ہوں۔ سیالکوٹ کا بارڈر بھی بھارت سے ملتا تھا۔ میں مشرقی پنجاب کے راستے لاہور پہنچ سکتا تھا۔

اس وقت قریب ترین راستہ کھٹمنڈو کا تھا۔ میں نے سوچا کہ میں ان تمام راستوں کا ایک نقشہ بنا لوں لیکن پھر خود ہی میں نے اس تجویز کو مسترد کر دیا۔ خدانخواستہ اگر میں گرفتار ہوتا تو میرے پاس سے وہ نقشہ برآمد ہوتا۔ بھارتی فوجی کیمپ سے فرار کے ساتھ ساتھ مجھ پر جاسوسی کا الزام بھی عائد کر دیتے ـــ پھر یا تو وہ مجھے فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیتے یا... میں زندگی بھر بھارت کے کسی قید خانے بلکہ عقوبت خانے میں پڑا سڑتا رہتا۔

میں نے سوچا ریوالور نہ سہی، میں بڑا سا ایک شکاری چاقو ہی حاصل کر لوں۔ انسان اگر مسلح ہو تو اس کے اعتماد میں کئی گنا اضافہ ہو جاتا ہے، پھر کوئی فوجی تو اسلحے کے بغیر ادھورا ہوتا ہے۔

میں کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں یہاں کب تک پڑا رہ سکتا ہوں۔ صبح میں اگر یہاں سے الہ آباد کے لیے نکل جاتا تو وہاں سے شاہ جہاں پور پہنچنے کی کوشش کر سکتا تھا۔

یہی سوچتے سوچتے نہ جانے کب مجھے نیند آ گئی۔

عادت کے مطابق علی الصباح میری آنکھ کھل گئی۔ گھر

جنگی تربیت

میں نے محسوس کیا ہے کہ لاہور کے عوام بچوں سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور ان کی تربیت پر بہت دھیان دیتے ہیں۔ میرے ایک دوست نے مجھے یہاں ایک بار اپنے گھر پر مدعو کیا تو مجھے اس کا بخوبی احساس ہوا۔ ڈرائنگ روم میں میزبان کا چار سالہ بچہ بھی موجود تھا، بہت کیوٹ، میں نے اسے گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگا۔ میزبان نے مجھے بتایا کہ یہ بہت شریر ہے اور اس کا ثبوت دینے کے لیے انہوں نے بچے کو چمکارا۔ ''منے! انکل کو چپت مارو۔'' اور پیشتر اس کے میں اس ضمن میں حفاظتی اقدامات کرتا، منے نے ہاتھ گھما دیا۔ میری عینک ٹوٹ کر نیچے جا گری۔ اس پر میزبان ہنستے ہنستے دہرے ہو گئے اور منے کو گود میں اٹھا کر چومنے لگے۔ یہاں کے لوگ اپنے بچوں کو بہادر دیکھنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے شروع ہی سے ان کی تربیت جنگی بنیادوں پر کرتے ہیں۔

کراچی سے دائمہ یونس کا تعاون

میں چہل پہل کے آثار تھے۔ رحمٰن صاحب فجر کی نماز کے لیے مسجد جارہے تھے۔

میں نے دروازہ کھول کر باہر جھانکا تو رحمٰن صاحب مسکرا کر بولے۔ ''لگتا ہے رات کو تجھے ٹھیک طرح نیند نہیں آئی؟''

''مجھے نیند تو خوب آئی۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں بھی آپ کے ساتھ نماز کے لیے مسجد جانا چاہتا ہوں۔''

''نہیں بیٹا!'' انہوں نے پہلی دفعہ مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا۔ ''تیرا باہر نکلنا خطرے سے خالی نہیں ہوگا۔ یہاں کچھ مسلمان ایسے بھی ہیں جو پاکستان اور پاکستانیوں کے سخت خلاف ہیں۔ انہیں شک بھی پڑ گیا تو وہ فوراً پولیس کو خبر کردیں گے کہ عبدالرحمٰن کے گھر میں کوئی مشکوک آدمی ٹھہرا ہوا ہے۔ تو گھر ہی میں نماز پڑھ لے۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

میں نے اپنے کمرے ہی میں نماز پڑھی۔ نماز کے بعد دعا مانگتے ہوئے میرے آنسو بہنے لگے۔

میں دیر تک رو رو کر اللہ سے دعائیں مانگتا رہا، اس سے حیرت انگیز طور پر میرا کھویا ہوا اعتماد لوٹ آیا اور مجھ میں ایک نئی توانائی آگئی۔

نماز کے بعد میں نے کمرے ہی میں ہلکی پھلکی ایکسرسائز کی اور پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ناشتے کے بعد میں نے رحمٰن صاحب سے پوچھا۔ ''یہاں اخبار نہیں آتا؟''

''یہاں تو بیٹا سارے اخبار ہندی میں ہوتے ہیں۔ انگریزی کا ایک اخبار بھی آتا ہے لیکن اخبار والا گنتی کے چند اخبار لاتا ہے جو یہاں کے دو چار گھروں میں جاتے ہیں۔ اگر میں اس سے انگریزی کا اخبار مانگوں گا تو وہ مجھ پر شک کرے گا کہ میرے گھر میں انگریزی کا اخبار پڑھنے والا کون آگیا؟ میرا بڑا بیٹا فرقان یہاں ہوتا تو اور بات تھی۔'' پھر وہ کچھ سوچ کر بولے۔ ''میں ہندی کا اخبار منگوا لیتا ہوں۔ احسان تمہیں پڑھ کر سنا دے گا۔ اسے ہندی بھی آتی ہے اور میں نے اسے اردو بھی پڑھائی ہے۔''

''تو پھر ہندی ہی کا اخبار منگوا دیں۔'' میں نے کہا۔

''احسان اس وقت تو اسکول گیا ہوا ہے۔ وہ واپس آئے گا تو منگوا دوں گا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولے۔ ''ہاں، تمہاری خالہ جی نے تمہارے کپڑے دھو دیے ہیں۔''

''میرے کپڑے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں، تیرے وہ کپڑے جو تو نے ایک پوٹلی میں باندھ رکھے تھے۔ الٰہ آباد جاؤ گے تو تمہیں ان کپڑوں کی ضرورت بھی پڑے گی۔ میں نے تمہارے جوتے اور کپڑے ایک تھیلے میں رکھ دیے ہیں اور جو دھوتی اور کرتہ تم نے پہن رکھا تھا، میں نے وہ بھی دھلوا کر اسی تھیلے میں رکھ دیا ہے۔''

رحمٰن صاحب واقعی بہت دور اندیش آدمی تھے۔ مجھے اگر عجلت میں وہاں سے فرار ہونا پڑتا تو کسی قسم کی پریشانی نہ ہوتی۔

میں ٹرانزسٹر لے کر اپنے کمرے میں لیٹ گیا۔ خبروں سے صرف یہ معلوم ہوا کہ بھارت کی پولیس، خفیہ ایجنسیاں اور ملٹری انٹیلی جنس ہر طرف مفرور قیدیوں کو تلاش کررہی ہیں۔ ان کے گرفتار ہونے والے ساتھی نے بھی ان کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔

میں نے بیزار ہوکر ریڈیو بند کردیا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد احسان بازار سے ہندی کا ایک اخبار لے آیا اور مجھے دے دیا۔

''یار! مجھے پڑھ کر بھی تم ہی سناؤ گے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔ ''میں تو ہندی کا ایک لفظ بھی نہیں پڑھ سکتا۔''

اخبار ہی سے معلوم ہوا کہ پولیس نے یوپی سے باہر نکلنے والے تمام راستوں کی ناکا بندی کردی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ مفرور قیدی ابھی تک یوپی سے باہر نہیں نکلے ہیں۔ سرنگ کھود کر ان کے فرار کی خبر ملتے ہی انہوں نے ناکا بندی کردی تھی اور وہ ہر گاڑی، ہر بس کی تلاشی لے رہے تھے۔ لاری اڈوں اور ریلوے اسٹیشن پر بھی ان کی ناکا بندی تھی۔ اس صورتِ حال میں کوئی فرار ہونے کا تصور بھی نہیں کرسکتا تھا۔

میں نے کافی دیر تک احسان سے اخبار کی خبریں سنیں پھر مجھے احساس ہوا کہ احسان اب بور ہوگیا ہے۔ میں نے کہا۔ ''بس احسان میاں! تمہاری آج کی ڈیوٹی ختم۔ کل اسی وقت پھر اخبار لے آنا۔''

سردیوں کے دن بہت مختصر ہوتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے سورج غروب ہوگیا۔ رحمٰن صاحب کئی گھنٹے سے باہر تھے۔ میں شدت سے ان کی واپسی کا انتظار کررہا تھا کیونکہ میں آج رات وہاں سے نکلنے کا فیصلہ کرچکا تھا۔

بھارتی انٹیلی جنس اور پولیس اگر مسلسل ناکا بندی رکھتی تو کیا میں ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا؟ رات کو رحمٰن صاحب واپس آئے تو ان کے چہرے پر فکر و تشویش کے آثار تھے۔

میں کھانا کھا کر اپنے کمرے میں چلا گیا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' چاچی نے پوچھا۔ ''آپ اتنے پریشان کیوں ہیں؟''

''مجھے خرم کی وجہ سے پریشانی ہے۔'' رحمٰن صاحب کی آواز آئی۔

''اس کی وجہ سے کیا پریشانی ہے؟'' انہوں نے پوچھا۔

''سنا ہے کہ بھارتی فوجی آس پاس کے تمام دیہات کی تلاشی لے رہے ہیں۔ خاص طور پر مسلمانوں کے گھروں کی۔''

''تو کیا وہ یہاں تک بھی پہنچ گئے ہیں؟'' چاچی نے کہا۔

''وہ یہاں تک آج نہیں تو دو چار دن بعد پہنچ جائیں گے۔ میں اس سے پہلے خرم کو الٰہ آباد بھیج دوں گا۔ وہاں میرے ایک دوست کی پرچون کی دکان ہے۔ وہ بھی پاکستانیوں کا حامی ہے اور مجھے امید ہے کہ وہ خرم کا ساتھ ضرور دے گا۔''

میں اچانک کمرے سے باہر آگیا اور بولا۔ ''چاچا جی!'' میں انہیں چاچا جی کہنے لگا تھا۔ ''اگر ایسی بات ہے تو میں ابھی اور اسی وقت نکل جاتا ہوں۔ میری وجہ سے کہیں آپ بھی مصیبت میں نہ پڑ جائیں۔''

''ابھی خطرے کی کوئی بات نہیں ہے بیٹا!'' چاچا جی نے کہا۔ ''پھر اس وقت تجھے کوئی لاری بھی نہیں ملے گی۔ تو جائے گا کیسے؟''

''پھر میں صبح ہوتے ہی یہاں سے نکل جاؤں گا۔'' میں نے کہا۔ ''لاریاں کس وقت چلنا شروع ہوتی ہیں؟''

''الٰہ آباد کی لاری تجھے صبح آٹھ بجے ملے گی۔'' چاچا نے کہا۔

میں واپس کمرے میں آگیا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنے سامان کا جائزہ لیا۔ ہر چیز تھیلے میں تھی۔ عام استعمال کے لیے چاچا جی نے وہاں کے مقامی موچی سے میرے لیے ایک بدنما سا کھسا خرید لیا تھا۔ میں کرتہ پاجامہ اور وہی کھسا استعمال کررہا تھا۔

اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور احسان اندر آگیا۔ اس نے اخبار میں کوئی چیز لپیٹ رکھی تھی۔

''خیریت تو ہے احسان؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، خرم بھائی خیریت ہے۔ آپ بھول گئے آپ نے مجھ سے ایک کام کہا تھا؟'' اس نے اخبار میں لپٹی ہوئی وہ چیز باہر نکالی تو وہ باریک پھل کا دو دھاری خنجر تھا۔ ''یہ رکھ لیں۔''

''یہ تم کہاں سے لے آئے؟'' میں نے پوچھا۔

شراب پر پابندی

میں جن دنوں پاکستان میں تھا وہاں شراب پر پابندی تھی، البتہ میرے لیے یہ امر انتہائی حیرت انگیز تھا کہ اس پابندی سے بیئر نہ صرف یہ کہ مستثنیٰ تھی بلکہ یہ کھلے بندوں فروخت ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کے بعض پادری بھی اسے پیتے تھے اور پھر سڑکوں پر لڑکھڑاتے پھرتے تھے۔ میں نے پہلی بار سخت گرمیوں کے موسم میں لاہور کے ایک مشہور علاقے بھاٹی گیٹ میں اس بیئر کا ایک گلاس پیا۔ یہ بیئر سفید رنگ کی ہوتی ہے، دہی سے تیار ہوتی ہے اور اسے گاہک کے سامنے کشید کیا جاتا ہے۔ دنیا کی یہ واحد بیئر ہے جس میں پانی حل ہوجاتا ہے تاہم میں نے اسے نشے میں ہر بیئر سے بہتر پایا۔ اس کا ایک گلاس پینے سے جسم ڈھیلا پڑنا شروع ہوجاتا ہے اور ایک عجیب طرح کی غنودگی سی طاری ہونے لگتی ہے۔ لاہوریے صبح شام یہ بیئر پیتے ہیں، چنانچہ صبح سے شام تک اونگھتے رہتے ہیں! اس بیئر کو مقامی زبان میں لسی کہا جاتا ہے۔

کنزیٰ یونس کی شگفتگی کراچی سے

''اس کے لیے میں خاص طور پر رام نگر گیا تھا۔ وہاں ایک لوہار خنجر اور چھریاں بنانے میں ماہر ہے۔ لوگ دور دور سے اس کے پاس آتے ہیں۔''

میں نے خنجر کا جائزہ لیا۔ اس کا پھل پتلا لیکن مضبوط تھا۔ اس کے دونوں طرف دھار تھی اور اس کی نوک بہت خطرناک تھی۔ اس کا دستہ بھی مضبوط لکڑی کا بنا ہوا تھا۔

''اس لوہار نے تم سے پوچھا نہیں کہ تمہیں یہ خنجر کیوں چاہیے؟''

''پوچھا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔ ''میں نے کہا کہ میں اکثر شکار پر جاتا ہوں۔ یہ خنجر میں اپنی حفاظت کے لیے بنوا رہا ہوں۔''

''تمہارے کتنے پیسے خرچ ہوئے ہیں احسان؟'' میں نے پوچھا۔

''خرم بھائی! پیسوں کی بات مت کریں۔ یہ خنجر آپ کے لیے میری طرف سے تحفہ ہے۔'' اس نے کہا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ میں اس خنجر کو چھپاؤں کہاں؟ اگر میں اسے اپنی کمر میں اڑستا تو وہ مجھے بھی زخمی کرسکتا تھا۔ پنڈلی پر باندھنے کے لیے بھی اس کے کور کی ضرورت تھی۔

میں نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑائی۔ مجھے دیوار کے ساتھ لٹکی ہوئی چمڑے کی ایک بیلٹ نظر آئی۔ وہ بیلٹ شاید رحمٰن صاحب کے بیٹے فرقان کی تھی۔ میں نے وہ بیلٹ اتار کے اپنی پنڈلی پر لپیٹی اور دو تین بل دینے کے بعد وہ خنجر پنڈلی کے ساتھ باندھ لیا۔ اب میری پنڈلی کی جلد اور خنجر کے درمیان مضبوط چمڑے کی وہ بیلٹ تھی۔ اب خنجر کے گرنے کا کوئی بھی امکان نہیں تھا اور ضرورت پڑنے پر میں اسے فوراً ہی نکال بھی سکتا تھا۔ میں نے خنجر نکال کر اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور سونے کے لیے لیٹ گیا۔

اچانک کسی کے جھنجھوڑنے سے میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے چاچاجی کا وحشت زدہ چہرہ نظر آیا تو میں بھی گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ''کیا بات ہے چاچاجی؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''خرم بیٹا! وہ لوگ ہمارے قصبے ساون پور تک آ پہنچے ہیں۔ وہ گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں اور کسی اجنبی کے بارے میں پوچھ رہے ہیں۔''

میں جھٹ کر کھڑا ہو گیا۔ میں نے اپنا خنجر تکیے کے نیچے سے نکال کر پنڈلی پر بندھی ہوئی بیلٹ میں اڑس لیا اور اپنا تھیلا اٹھا کر روانگی کے لیے تیار ہو گیا۔

''وہ لوگ اس وقت کہاں ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ ابھی گاؤں کے دوسرے سرے پر ہیں لیکن جلد ہی یہاں پہنچ جائیں گے۔ تمہیں مولوی صاحب کے علاوہ کسی نے بھی نہیں دیکھا ہے۔ مولوی صاحب سادہ آدمی ہیں۔ وہ فوجیوں کو بتا دیں گے کہ دو دن پہلے ایک اجنبی یہاں آیا تو تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب اسے اپنے گھر لے گئے تھے۔ پھر وہ سیدھے یہاں کا رخ کریں گے۔''

''میں اس سے پہلے ہی نکل جاتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ٹھہرو!'' چاچاجی نے کہا۔ ''میں تمہیں فی الحال ماسٹر رام پرشاد کے گھر لے جاتا ہوں۔ ان پر کوئی بھی شک نہیں کرے گا۔ اگر فوجیوں نے ان کے گھر کی تلاشی بھی لی تو زیادہ باریک بینی سے نہیں لیں گے۔ وہ اس علاقے کے معزز آدمی ہیں۔'' پھر چاچاجی نے پانچ پانچ سو روپے کے دو نوٹ نکالے اور میرے کرتے کی جیب میں ٹھونس دیے اور بولے۔ ''رکھ لو، تمہیں ان کی ضرورت پڑے گی۔ یہ پیسے بھی کم ہی ہیں۔ فی الحال میرے پاس اتنے پیسے ہی ہیں۔''

چاچی روتی ہوئی آگے بڑھیں اور انہوں نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے مجھے دعا دی۔ پھر انہوں نے بھی پانچ پانچ سو روپے کے کئی نوٹ مجھے پکڑا دیے اور بولیں۔ ''خرم بیٹا! انکار مت کرنا۔ ایک ماں کی طرف سے تحفہ سمجھ کر رکھ لو۔''

میں انکار نہ کر سکا۔ چاچاجی نے مجھے ساتھ لیا اور اندھیرے میں باہر نکل گئے۔ وہ گلیوں گلیوں ہوتے ہوئے ماسٹر رام پرشاد کے گھر پہنچ گئے۔

میں نے تو اب سب کچھ تقدیر پر چھوڑ دیا تھا اس لیے کسی روبوٹ کی طرح چاچاجی کے کہنے پر عمل کر رہا تھا۔

چاچاجی نے آہستہ سے دروازے پر دستک دی لیکن کوئی جواب نہ آیا۔ دوسری مرتبہ چاچاجی نے قدرے زور سے دستک دی تو اندر سے کسی کی نیم غنودہ آواز سنائی دی۔

''کون؟''

''میں ہوں عبدالرحمٰن۔'' چاچاجی نے کہا۔ ''دروازہ کھولو رام پرشاد!''

قدموں کی آہٹ دروازے کے نزدیک آئی اور دروازہ کھل گیا۔ اندر صحن میں بلب جل رہا تھا۔ میں نے اس کی روشنی میں رام پرشاد کا جائزہ لیا۔ وہ چاچاجی ہی کے ہم عمر ہوں گے لیکن ان کی صحت قابلِ رشک تھی۔ ان کے سر پر گھنے بال تھے جنہیں مہندی لگا کر انہوں نے سرخ کر لیا تھا۔ ہنس مکھ چہرہ تھا اور اس پر موٹے فریم کا چشمہ۔

''خیریت تو ہے رحمٰن! رات کے اس سے .....''

''خیریت نہیں ہے رام پرشاد!'' چاچاجی نے کہا پھر سرگوشی میں انہیں کچھ بتانے لگے۔

''کام تو خطرناک ہے۔'' رام پرشاد نے کہا۔ ''لیکن تم نے پہلی دفعہ مدد مانگی ہے اس لیے میں انکار بھی نہیں کر سکتا۔'' پھر وہ مجھ سے بولے۔ ''آؤ بیٹا! اندر آ جاؤ۔''

چاچاجی نے مجھے گلے لگا لیا اور بولے۔ ''قدرت کو منظور ہوا تو ہم جلد ہی دوبارہ ملیں گے۔ ہاں، میں احسان کے ہاتھ کل اپنے اس دوست کا پتا بھجوا دوں گا جو الٰہ آباد میں رہتا ہے۔'' وہ آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے لوٹ گئے۔

رام پرشاد جی مجھے لے کر اندر چلے گئے۔ ان کا مکان پختہ اور خاصا بڑا تھا۔

''بیٹا! یہاں تمہیں کوئی تکلیف نہیں ہو گی۔ کس کی جرأت ہے کہ رام پرشاد کے گھر کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔'' ''آپ یہاں اکیلے رہتے ہیں؟'' میں نے پوچھا کیونکہ ابھی تک مجھے کوئی اور وہاں نظر نہیں آیا تھا۔

''ہاں، اب تو اکیلا ہی سمجھو۔'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''کسی زمانے میں یہ گھر بھرا پرا تھا۔ میرے تین بیٹے، ان کے بچے، بہوئیں تھیں۔ سب یہیں رہتے تھے۔ لیکن اب سب

شہروں میں جا بسے ہیں۔ اس گاؤں میں انہیں گوبر کی بو آتی ہے۔ انہیں مچھر کاٹتے ہیں۔'' انہوں نے ایک کمرا کھولتے ہوئے کہا۔ ''تین بیٹیاں بھی ہیں۔ دو بیٹیوں کی شادی کر چکا ہوں، تیسری ابھی ایف اے میں پڑھ رہی ہے۔ وہی میرے ساتھ رہتی ہے اور پگلی کہتی ہے کہ پتاجی! میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں گی۔ بھلا بیٹیاں بھی کبھی باپ کے گھر رہی ہیں؟'' رام پرشاد بہت بولتے تھے۔ ''پڑھائی مکمل کر لے تو میں اس کے ہاتھ بھی پیلے کر دوں۔ ویسے تو یہ فرض ماؤں کا ہوتا ہے لیکن میری گھر والی مجھے اکیلا چھوڑ کر برسوں پہلے پرلوک سدھار گئی۔'' پھر وہ چونک کر بولے۔ ''میں بھی کتنا بے وقوف ہوں۔ خود ہی بولے جا رہا ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے بیٹا؟''

''میرا نام خرم ہے اور .....''

''بس اتنا ہی کافی ہے، مجھے اپنے بارے میں زیادہ مت بتاؤ۔ میری زبان پھسل جاتی ہے۔ کسی کے سامنے میرے منہ سے یہ باتیں نکل گئیں تو میں بھی مارا جاؤں گا۔ اب تم اطمینان سے سو جاؤ۔ صبح ملاقات ہو گی۔ بھئی عبدالرحمٰن کا بھتیجا ہے تو ہمارا بھی بھتیجا ہوا۔ عبدالرحمٰن میرے بچپن کا دوست ہے۔ اس نے قدم قدم پر میرا ساتھ دیا ہے۔ اب اس نے زندگی میں پہلی دفعہ مجھ سے مدد مانگی ہے۔ وہ بھی اپنے بھتیجے کو، اپنے خون کو بچانے کے لیے ..... میں بھلا پیچھے کیسے ہٹ سکتا ہوں۔ اب تم سو جاؤ۔'' انہوں نے شاید یہ جملہ چوتھی بار ادا کیا تھا۔

پھر وہ واقعی چلے گئے اور میں پلنگ پر بیٹھ کر موجودہ حالات پر غور کرنے لگا۔

سردی شدید تھی اس لیے میں نے کمبل اوڑھ لیا اور بستر پر لیٹ گیا۔ میرا سونے کا ارادہ نہیں تھا۔ بھارتی فوجی نہ جانے کب وہاں آ جاتے۔ یوں بھی وہ کمرا دھول اور مٹی سے اٹا ہوا تھا۔ بستر کی چادر پر بھی دھول تھی جسے میں نے جھٹک کر صاف کر دیا تھا۔ کمبل کو بھی اچھی طرح جھاڑ کر دھول نکال دی تھی اس کے باوجود اس کمرے میں عجیب سی بو تھی۔

لیٹے لیٹے نہ جانے کب میری آنکھ لگ گئی۔

صبح میری آنکھ دروازے پر ہولے ہولے ہونے والی دستک سے کھلی۔

میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو گویا دن میں چاند طلوع ہو گیا۔ وہ اتنی ہی خوب صورت تھی۔ اس کی بڑی بڑی بولتی ہوئی آنکھیں اس کے خوب صورت چہرے پر نمایاں تھیں۔ متناسب اور پرکشش جسم اور لمبے سیاہ بال! میں چند لمحے تو مبہوت سا ہو کر اسے دیکھتا رہ گیا۔ ایسا مکمل حسن میں نے ابھی تک نہیں دیکھا تھا۔

''ایسے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو جی؟'' اس کی مترنم آواز گونجی۔

''میں سوچ رہا ہوں کہ رام پرشاد جی نے اچانک لڑکی کا روپ کیسے دھار لیا۔'' میں نے کہا۔

وہ کھلکھلا کر ہنس دی۔ اس کی ہنسی کی آواز سے گویا جلترنگ سے بج اٹھے۔

''میں..... رام پرشاد!'' وہ ایک مرتبہ پھر ہنسی تو اس کی سفید رنگت سرخ ہو گئی۔ ''میں ان کی بیٹی کا نتاہوں بھولے ناتھ!'' اس نے یوں کہا جیسے کسی ننھے بچے کو سمجھایا جاتا ہو۔

''اچھا تم ہو کا نتا!'' میں نے کہا۔ ''رام پرشاد جی نے ٹھیک ہی کہا تھا۔''

''کیا کہا تھا انہوں نے؟'' وہ منہ بنا کر بولی۔

''اب چھوڑو اس بات کو۔ میں.....''

''نہیں، پہلے مجھے بتاؤ کہ انہوں نے میرے بارے میں کیا کچھ کہا؟'' وہ بچوں کی طرح اڑ گئی۔

''انہوں نے کہا تھا کہ کا نتا ابھی بچی ہے۔ اس کی کسی بات کا برا مت ماننا!'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں..... میں بچی ہوں؟'' اس نے آنکھیں نکالیں۔ ''پتاجی تو پتا نہیں کب تک مجھے بچی ہی سمجھتے رہیں گے۔''

''میں نے کہا کہ ماسٹر جی..... آپ فکر مت کریں۔ اگر وہ بڑی بھی ہوئی تو میں اس کی کسی بات کا برا نہیں مانوں گا۔''

''اچھا چلو، اب منہ ہاتھ دھو کر ناشتا کر لو۔'' اس نے کہا۔ ''تم ہو کون اور اچانک کہاں سے آئے ہو؟''

''ارے ماسٹر جی نے تمہیں میرے بارے میں نہیں بتایا؟ میں ان کا شاگرد ہوں بھئی۔ یہاں اپنے ایک کام سے آیا تھا تو ماسٹر جی کو بھی سلام کرنے آ گیا۔ انہوں نے مجھے یہیں ٹھہرا لیا۔''

''وہ سامنے ٹوائلٹ ہے۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔ ''اور اس کے برابر میں باتھ روم ہے۔''

''واہ! تمہیں تو انگریزی بھی آتی ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''میں جاہل نہیں ہوں۔ ایف اے میں پڑھتی ہوں۔'' اس نے گردن اکڑا کر کہا۔

میں ہاتھ منہ دھو کر آیا تو اس نے ناشتا ایک چھوٹی سی

تپائی پر لگا دیا تھا۔

''ماسٹر جی کہاں چلے گئے؟'' میں نے پوچھا۔

''نہ جانے پتا جی صبح ہی صبح کہاں چلے گئے۔ مجھ سے کہہ گئے تھے کہ کنال بھیا کے کمرے میں ایک مہمان سو رہا ہے۔ وہ اٹھے تو اسے ناشتا دے دینا۔''

میں خاموشی سے ناشتا کرنے لگا۔ ناشتے میں پراٹھے تھے، آلو کی بھجیا تھی، حلوہ تھا اور مکھن تھا۔

میں ناشتا کر کے فارغ ہوا ہی تھا کہ وہ میرے لیے چائے لے آئی اور بولی۔ ''مہمان جی! آپ کا نام کیا ہے؟''

''مہمان تو مہمان ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کا کوئی نام نہیں ہوتا۔'' میں نے سوچا، پتا نہیں ماسٹر جی نے اسے میرے بارے میں کیا بتایا ہے۔؟

''اچھا، تو تمہارا کوئی نام ہی نہیں ہے؟''

''میرا نام گنگا رام ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''گنگا رام!'' وہ ہنس کر بولی پھر ہنستی چلی گئی۔

اسی وقت ماسٹر جی گھر میں داخل ہوئے اور کانتا سے بولے۔ ''تم پاگلوں کی طرح ہنس کیوں رہی ہو؟''

''پتا جی! اس مہمان کا نام گنگا رام ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھر ہنسنے لگی۔

اچانک دروازے پر زوردار دستک ہوئی۔ میں بری طرح چونک اٹھا۔

''کون ہے بھئی؟'' ماسٹر جی نے پوچھا۔

''دروازہ کھولو۔''

''بھائی تم ہو کون اور دروازہ کیوں توڑے ڈال رہے ہو؟''

دروازے پر ایک ٹھوکر پڑی اور باہر سے کوئی چیخ کر بولا۔ ''ملٹری پولیس!''

میرے پیروں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ ماسٹر جی کا چہرہ بھی دھواں دھواں ہو رہا تھا، انہوں نے سرگوشی میں مجھ سے کہا۔ ''تم اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔ کانتا تم بھی جاؤ۔''

میں کانتا کو لے کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''آ رہا ہوں بھائی!'' ماسٹر جی نے بلند آواز میں کہا۔ ''دروازہ تو مت توڑو۔''

میرے کان باہر کی آوازوں پر لگے ہوئے تھے۔

دروازہ کھلتے ہی مجھے فوجی بوٹوں کی دھمک سنائی دی۔ میں نے کمرے کے دروازے کی ایک جھری سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بھارتی ملٹری پولیس کے آدمی تھے۔ ان میں ایک عہدے کے لحاظ سے صوبیدار تھا اور دوسرا حوالدار۔ شکل سے دونوں ہی فوجی سے زیادہ فلمی بدمعاش لگ رہے تھے، ایسے بدمعاش جنہوں نے فوجی وردیاں پہن لی ہوں۔

''کیا بات ہے آفیسر؟'' رام پرشاد نے پوچھا۔

''یہاں تم نے ایک مفرور جنگی قیدی کو پناہ دے رکھی ہے۔'' صوبیدار نے غصے سے جواب دیا۔

''میرے گھر میں جنگی قیدی؟'' رام پرشاد نے حیرت سے کہا۔ ''تم شاید مجھے جانتے نہیں ہو آفیسر! میری پہنچ بہت اوپر تک ہے۔''

''ہمارا وقت ضائع مت کرو بڈھے۔'' صوبیدار نے درشت لہجے میں کہا۔ ''ہمیں اس مکان کی تلاشی لینا ہے۔''

کانتا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا پھر میں نے جھک کر پنڈلی سے بندھا ہوا تیز دھار خنجر نکال لیا۔

''ہمارا راستہ چھوڑو بڈھے۔'' صوبیدار نے اس مرتبہ انتہائی درشت لہجے میں کہا۔ ''تمہاری پہنچ بہت اوپر تک ہے تو ہم ابھی تمہیں اوپر بھی پہنچا سکتے ہیں۔''

''بغیر سرچ وارنٹ کے میں تلاشی نہیں لینے دوں گا۔'' رام پرشاد کا لہجہ فیصلہ کن تھا۔

اچانک فائر کا دھماکا ہوا، اس کے ساتھ ہی رام پرشاد کی کرب ناک چیخ سنائی دی۔ کانتا نے بھی چیخ مارنا چاہی لیکن میں نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا اور دروازے کی کنڈی آہستگی سے کھول دی۔ میں نے کانتا کو بیڈ پر لیٹنے کا اشارہ کیا اور خود دیوار سے چپک کر کھڑا ہو گیا۔

ان لوگوں نے ٹھوکر مار کر کمرے کا دروازہ کھولا تو کانتا کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ پہلے صوبیدار اندر داخل ہوا، اس کے پیچھے حوالدار تھا۔ میں نے صوبیدار کی پشت پر پوری قوت سے خنجر کا وار کیا۔ اس کے منہ سے ایک کرب ناک چیخ نکلی۔ میری لات حوالدار کے پیٹ پر پڑی۔ وہ بھی پیٹ پکڑ کر دہرا ہو گیا۔ میں نے بہت پھرتی سے خنجر صوبیدار کی پشت سے نکالا اور وہی خنجر حوالدار کی پشت میں گھونپ دیا۔

وہ خنجر اتنا تیز دھار اور مہلک تھا کہ حوالدار کی گردن سے آر پار ہو گیا۔

صوبیدار ابھی تک پڑا سسک رہا تھا۔ میں جھپٹ کر باہر نکلا اور رام پرشاد جی کے پاس پہنچا۔ ریوالور کی گولی ان کے پیٹ میں لگی تھی اور خون تیزی سے بہہ رہا تھا۔

''خرم... بیٹا... تم... کانتا کو... لے کر... نکل جاؤ... میرے... علاوہ... اس دنیا میں اس کا کوئی بھی نہیں ہے... میرے بیٹے برسوں پہلے امریکا جا بسے ہیں... دونوں... بیٹیوں نے بھی شادی... کے بعد... لوٹ کر ہماری... خبر نہ لی... وہ لوگ پھر یہاں آئیں گے... اور اس مرتبہ... زیادہ... تعداد میں آئیں گے... تم... کانتا کو لے کر... نکل جاؤ... اور مجھ سے... وعدہ کرو... کہ... اسے بھی... کوئی... تکلیف نہیں... ہونے دو گے۔''

''ماسٹر جی! آپ کیسی باتیں کرتے ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''آپ کا زخم معمولی ہے۔ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ابھی آپ کو اسپتال لے جاؤں گا۔''

''ہاں پتا جی! ہم آپ کو اسپتال لے جائیں گے... آپ... مجھے... یوں... چھوڑ کر... نہیں جا سکتے۔'' کانتا بری طرح رونے لگی۔

''میرے پاس وقت... کم ہے... بیٹا!'' ماسٹر جی نے کہا۔ ''میری... الماری کی تجوری میں... کچھ رقم... اور گہنے ہیں... وہ میں نے تیرے ہی لیے رکھے تھے۔ تو وہ نکال لے اور... خرم کے... ساتھ نکل جا۔''

کانتا دوڑ کر پانی لے آئی اور ماسٹر جی کا سر اپنے زانو پر رکھ کر انہیں پانی پلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے ایک گھونٹ بہت مشکل سے پیا اور بولے۔ ''خرم بیٹا! دیر مت کرو... فوراً... یہاں سے نکل جاؤ... فائر... کے دھماکے... کی آواز دور تک گئی... ہو گی... ان کے دوسرے... ساتھی بھی ادھر آ رہے ہوں گے... کانتا بیٹا! تم لوگ... درما جی کے گھر کی طرف سے باہر نکلنا... ان لوگوں کی گاڑیاں... میں نے... مسجد... کے پاس... دیکھی تھیں... شاید... ہمارے... پڑوسیوں... نے رات... خرم کو... یہاں آتے دیکھ لیا ہے... انہی لوگوں... نے فوجیوں... کو بتایا ہے... تم...''

بولتے بولتے ماسٹر جی کا سانس اکھڑنے لگا۔

''پتا جی!'' کانتا چیخ کر بولی۔ ''پانی... پی لیں۔''

اس نے پانی کا کٹورا ماسٹر جی کے منہ سے لگایا لیکن پانی ان کے حلق میں جانے کے بجائے ان کے چہرے سے ہوتا ہوا گردن کی طرف چلا گیا۔ پھر انہوں نے ہچکی لی اور ان کا سر ایک طرف ڈھلک گیا۔

''پتا جی!'' کانتا پاگلوں کی طرح چیخی۔ ''مجھے چھوڑ کر مت جائیں پتا جی!''

''صبر کرو کانتا۔'' میں نے کہا۔

''تم کیوں آئے تھے یہاں؟'' کانتا نے ہذیانی انداز میں مجھ سے پوچھا۔

''میں بہت شرمندہ ہوں کانتا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''واقعی یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ مجھے یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ تم چاچا عبدالرحمٰن کے گھر چلی جاؤ۔ میں ابھی یہاں سے نکل رہا ہوں۔''

میں نے کہا اور پھرتی سے کمرے میں گھس گیا۔ کمرا گویا خون کا تالاب بن گیا تھا۔ ہٹے کٹے انسانوں کو میں نے بکرے کی طرح ذبح کر دیا تھا۔

میں فرش پر پہنے والے خون سے بچتا ہوا کمرے میں گیا۔ سب سے پہلے میں نے صوبیدار کے ریوالور پر قبضہ کیا۔

ریوالور ہاتھ میں آتے ہی مجھے ایسا لگا جیسے میں اب تک ادھورا تھا۔ صوبیدار کے سینے پر بندھی ہوئی کٹ میں ریوالور کی بہت سی فاضل گولیاں تھیں۔ میں نے وہ اس کی جیب سے نکلنے والے رومال میں باندھ لیں۔ ان دونوں کے ہاتھوں میں گھڑیاں بھی تھیں۔ میں نے وہ دونوں گھڑیاں بھی اتار لیں۔ دونوں کی جیبوں سے مجموعی طور پر ڈھائی سو روپے بھی نکلے۔

اس کے بعد میں نے اپنا جائزہ لیا۔ میرے کُرتے پر بھی خون کے داغ تھے۔ یہ داغ اس وقت پڑے تھے جب میں نے صوبیدار کی پشت سے خنجر نکالا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس کے جسم سے خون بھی ابل پڑا تھا۔ مزید چھینٹے اس وقت پڑے جب میں نے حوالدار کی گردن میں خنجر پیوست کیا۔

میرا پاجامہ البتہ بے داغ تھا۔ کُرتہ دھونے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے کپڑوں کی الماری کھولی تو اس میں ماسٹر جی کے کئی جوڑے رکھے ہوئے تھے۔ میں نے انہی میں سے ایک کُرتہ پاجامہ نکالا اور اسے بہت عجلت میں تبدیل کر لیا۔ اپنے اتارے ہوئے کپڑے میں نے ایک بنڈل بنا کر پرانے اخبار میں لپیٹ لیے۔

پھر باہر آ کر میں نے اچھی طرح منہ ہاتھ دھویا اور کمرے میں جا کر اپنے کپڑوں کا تھیلا اور اتارے ہوئے کپڑوں کا بنڈل اٹھا لیا اور کانتا سے بولا۔ ''میرے ساتھ چلو کانتا! یہ وحشی درندے تمہارے ساتھ بہت برا سلوک کریں گے۔ میری ہی وجہ سے تمہارے گھر پر آفت آئی ہے۔ میں تمہیں اس خطرے میں نہیں چھوڑ سکتا۔''

کانتا نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بس

ویران آنکھوں سے اپنے باپ کی لاش کو دیکھتی رہی۔

''ٹھیک ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اگر تم نہیں چلنا چاہتیں تو مت جاؤ۔''

میں نے باہر کی طرف قدم بڑھائے تو وہ وحشت زدہ انداز میں بولی۔ ''ٹھہرو، میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔''

''گھر میں موجود ساری نقدی اور زیورات لے لو۔'' میں نے کہا۔

''تجوری خالی ہے۔'' اس نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''چھ مہینے پہلے میری ایک بہن آئی تھی۔ اس کے سسرال والے پیسوں کا مطالبہ کر رہے تھے۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ پتاجی کو صدمہ پہنچے۔ وہ تو یہی سمجھ رہے تھے کہ میری دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھروں میں خوش ہیں۔ میں نے پتاجی کو بتائے بغیر سارے گہنے اور نقد رقم اپنی بہن کو دے دی۔''

''اچھا چھوڑو، اپنے کپڑوں کے چند جوڑے تو لے لو۔''

وہ خاموشی سے اٹھی اور ایک بیگ میں اپنے کپڑے لے کر واپس آ گئی۔ پھر ہم دونوں وہاں سے نکل گئے۔

ہم گلیوں گلیوں سے ہوتے ہوئے قصبے کے دوسرے سرے پر نکلے اور تیزی سے مین روڈ کی طرف بڑھ گئے۔

میرا ارادہ تھا کہ کانتا کو اس کے کسی رشتے دار یا کسی بہن کے گھر چھوڑ کر نکل جاؤں گا۔ یہاں تو میری ہی جان کے لالے پڑے ہوئے تھے۔ میں بھلا کانتا کی حفاظت کب تک اور کہاں تک کر سکتا تھا؟

میں نے احتیاطاً سر پر ایک اونی ٹوپی بھی پہن لی تھی۔

''لاری اڈا یہاں سے کافی دور ہے۔'' کانتا نے کہا۔ ''ہمیں کافی پیدل چلنا پڑے گا۔''

''لاری اڈا؟'' میں نے چونک کر کہا۔

''اس طرف تو جانا بھی خطرے سے خالی نہیں ہے۔''

''پھر کیا کرو گے؟ اسی طرح پیدل، الٰہ آباد جاؤ گے؟ اس میں خطرہ ہے۔ ہم راستے میں کہیں نہ کہیں پکڑے جائیں گے۔''

''یہاں کوئی ٹیکسی وغیرہ نہیں ملتی؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے چونک کر مجھے دیکھا، پھر بولی ..... ''یہ الٰہ آباد کا ایک قصبہ ہے۔ یہاں تانگے چلتے ہیں۔ ٹیکسیاں تو الٰہ آباد، دلی اور بمبئی جیسے شہروں میں چلتی ہیں۔'' پھر وہ چونک کر بولی۔ ''ایک آئیڈیا ہے۔ میں کوئی گاڑی روک کر لفٹ لیتی ہوں۔ میں کہوں گی کہ میرے پتی دل کے مریض ہیں۔ میں انہیں علاج کے لیے الٰہ آباد لے جا رہی ہوں، تم ذرا بیماری کا ناٹک کرو۔''

''تم کیا کہو گی، تمہارے کون بیمار ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

اپنا جملہ یاد کر کے اس کا چہرہ شرم سے گلنار ہو گیا۔ وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''فالتو باتیں مت کرو۔ میں کوئی گاڑی روکنے کی کوشش کرتی ہوں۔''

وہ اس وقت عام سی ساڑی میں ملبوس تھی لیکن اس کا قیامت خیز حسن اچھے لباس کا محتاج نہیں تھا۔

مجھے دور سے ایک گاڑی آتی دکھائی دی۔ میں جلدی سے سڑک کے کنارے بیٹھ گیا۔ کانتا نے کچھ آگے بڑھ کر اس گاڑی کو رکنے کا اشارہ کیا۔ وہ گاڑی رکے بغیر آگے بڑھ گئی، پھر اس کے بریک چرچرائے اور وہ ریورس گیئر میں واپس آنے لگی۔

میں نے دیکھا، اس گاڑی میں سوٹ میں ملبوس ایک شخص سوار تھا۔ گاڑی بھی عام گاڑیوں سے مختلف تھی۔ میں نے اب تک پورے بھارت میں ہر طرف فیئٹ ہی دیکھی تھی۔ اِکا دُکا دوسری گاڑیاں بھی نظر آ جاتی تھیں۔

''کیا بات ہے؟'' اس شخص نے پوچھا۔

''میرے پتی بہت بیمار ہیں، وہ دل کے مریض ہیں۔ آج ہی انہیں انجائنا کا اٹیک ہوا ہے۔ میں انہیں لے کر الٰہ آباد جا رہی ہوں۔ آپ پلیز میری ہیلپ کریں۔''

ڈرائیور نے میری طرف دیکھا۔ میں ان سے کچھ فاصلے پر بیٹھا ہوا کراہ رہا تھا۔

اچانک میری نظر اس شخص کے چہرے پر پڑی تو میرے پیروں تلے زمین نکل گئی۔ وہ جنگی قیدیوں کا کیمپ کمانڈنٹ تھا اور مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا۔ میرے حلیے میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ بس سر پر اونی ٹوپی تھی۔

اس نے غور سے مجھے دیکھا، پھر دروازہ کھول کر ایک دم نیچے اتر آیا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور بھی تھا۔ اس نے اچانک مجھ پر فائر کر دیا۔ میں عین وقت پر قلابازی کھا کر پیچھے کی طرف چلا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میں نے اپنا ریوالور نکال لیا اور اندازے سے اس پر گولی چلا دی۔

میں فوری طور پر اس کی پیش قدمی روکنا چاہتا تھا اور اسے احساس دلانا چاہتا تھا کہ میں بھی غیر مسلح نہیں ہوں۔

میری چلائی ہوئی گولی اس کے سینے میں پیوست ہو گئی۔ وہ چند لمحے آگے پیچھے ڈولا پھر اوندھے منہ گر پڑا۔

اس سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کے برابر تھا ورنہ اب تک وہاں ایک مجمع لگ گیا ہوتا۔

میں نے اس کی لاش گھسیٹ کر سڑک کے کنارے اُگی ہوئی خودرو جھاڑیوں میں ڈالی۔ اس کا ریوالور اٹھا کر جیب میں ڈالا اور کانتا سے کہا۔ ''جلدی کرو، گاڑی میں بیٹھو۔''

پھر میں گولی کی سی رفتار سے روانہ ہوگیا۔

''گاڑی آہستہ چلاؤ۔ اگر راستے میں پولیس یا آرمی کی کوئی گاڑی مل گئی تو وہ شبہے میں روک لیں گے۔''

میں نے گاڑی کی رفتار کچھ کم کردی۔ دو تین منٹ بعد ہمیں سڑک کی بائیں جانب کچھ فاصلے پر کئی بسیں کھڑی نظر آئیں۔ وہاں اردگرد کچھ دکانیں بھی تھیں اور خوانچے والے بھی۔ کانتا نے بتایا کہ یہی لاری اڈا ہے۔ ہم وہاں رکے بغیر سیدھے نکل گئے۔

''یہ گاڑی بھی ہمارے لیے خطرناک ہے کانتا!'' میں نے کہا۔ ''اس گاڑی کو بہت سے لوگ پہچانتے ہوں گے۔''

''ابھی تو اسی میں چلتے ہیں۔'' کانتا نے کہا۔ ''الٰہ آباد پہنچ کر اس گاڑی کو کہیں چھوڑ دیں گے۔''

سڑک کا ایک موڑ گھومتے ہی مجھے فوجیوں کی ایک چوکی دکھائی دی۔

ان لوگوں نے بھی گاڑی کو دیکھ لیا تھا۔ میں ایک دم گاڑی واپس گھماتا تو وہ میری طرف سے شبہے میں مبتلا ہو جاتے۔ ممکن ہے وہ میرا پیچھا بھی کرتے۔

ایک بیریئر لگا کر راستہ مسدود کردیا گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ باہر صرف دو ہی سنتری تھے۔ میں نے فیصلہ کرلیا کہ اب آر یا پار والی بات ہے۔ ان لوگوں نے مجھے پکڑنے کی کوشش کی تو میں ان دونوں سنتریوں کو ہلاک کر کے آگے نکل جاؤں گا، پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

میں نے گاڑی بیریئر کے پاس روک دی اور اپنا ریوالور نکال کر گود میں ڈال لیا۔ اسے میں سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں استعمال کرسکتا تھا۔

یہ دیکھ کر میری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ گاڑی دیکھ کر سڑک کی دونوں جانب کھڑے ہوئے سنتریوں نے مجھے زوردار انداز میں سیلیوٹ کیا اور بیریئر فوراً ہٹا دیا گیا۔

میں نے سر کے اشارے سے ان کے سلام کا جواب دیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔

''یہ..... یہ کیا ہوا.... خرم.....؟'' کانتا نے حیرت سے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن بول نہ پائی۔

''یہ سب اس گاڑی کا کمال ہے۔'' میں نے ہنس کر کہا اور گاڑی سڑک کے کنارے روک دی۔

میں گاڑی کا نمبر دیکھ کر اپنے شبہے کی تصدیق کرنا چاہتا تھا۔ میرا شبہ درست نکلا۔ اس پر آرمی کا مخصوص نمبر موجود تھا۔ ہمارے فوجی افسروں کی سرکاری گاڑیوں پر بھی مخصوص قسم کے نمبر ہوتے ہیں۔

میں دوبارہ گاڑی میں بیٹھا تو کانتا نے پوچھا۔ ''کیا دیکھ رہے تھے خرم؟''

میں گاڑی کا نمبر دیکھ رہا تھا۔ ''گاڑی پر فوج کا مخصوص نمبر ہے۔ اس نمبر سے وہ لوگ دھوکا کھا گئے لیکن یہ سلسلہ زیادہ دیر تک جاری نہیں رہ سکتا۔''

''ایک تو تم لوگ اپنی بات چیت میں فارسی بہت بولتے ہو۔'' کانتا نے کہا۔

''فارسی؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''میں تو انتہائی سلیس اردو میں گفتگو کررہا ہوں۔''

''اب یہی دیکھو، اس جملے میں تم نے کتنے فارسی کے لفظ بولے ہیں۔ انتہائی، سلیس، گفتگو، کیا یہ فارسی نہیں ہے؟''

''لیکن ہم تو اسے اردو ہی سمجھتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''اب اس بحث کو چھوڑو اور مجھے یہ بتاؤ کہ میں تمہیں کہاں چھوڑوں؟''

''کیا مطلب؟'' کانتا نے حیرت سے کہا۔

''مطلب یہ کہ یہاں..... اس ملک میں تمہارا کوئی عزیز، رشتے دار تو ہوگا؟ کوئی اور نہ سہی تمہاری بہنیں تو موجود ہیں۔''

''تم مجھ سے پیچھا چھڑانا چاہتے ہو؟'' اس نے افسردگی سے کہا۔

''بات پیچھا چھڑانے کی نہیں ہے کانتا!'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔ ''میری زندگی تو خود خطرے میں گھری ہوئی ہے۔ نہ جانے کب اور کہاں میری زندگی کا چراغ گل ہو جائے۔ ایسے میں تمہاری حفاظت کیسے کرسکتا ہوں میں؟''

''اس ملک میں میرا کوئی رشتے دار نہیں ہے۔'' کانتا نے سنجیدگی سے کہا۔ ''دو بہنیں ہیں لیکن وہ اپنے سسرال والوں کے ہاتھوں اتنی مجبور ہیں کہ مجھے اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتیں۔ تم ایسا کرو کہ مجھے کسی کنیا آشرم میں چھوڑ دو۔ الٰہ آباد میں ایسے آشرم موجود ہیں۔''

''کنیا آشرم؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''وہاں لاوارث اور بیوہ عورتیں رہتی ہیں۔ رہتی کیا ہیں، بس اپنی زندگی کے دن پورے کرتی ہیں۔'' پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ''مسلمان اپنی بات کے دھنی ہوتے ہیں لیکن میرا خیال غلط تھا۔''

''میری کس بات سے تمہیں اندازہ ہوا کہ مسلمان ایسے نہیں ہوتے؟'' میں نے پوچھا۔

''پتاجی نے مرتے وقت تم سے وچن لیا تھا کہ تم میری رکھشا کرو گے اور تم نے ان سے کہا تھا کہ آپ کانتا کی فکر مت کریں۔ تمہیں یہ بات یاد ہے یا یہ بھی بھول گئے؟''

''مجھے سب کچھ یاد ہے کانتا!'' میں نے طویل سانس لے کر کہا۔ ''لیکن تم میری مجبوریوں کو سمجھو۔''

''تمہاری کیا مجبوری ہے؟ یہی نا کہ فوجی اور پولیس والے تمہارے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ تو ٹھیک ہے لگے رہیں۔ مجھے ساتھ رکھنے میں تمہارا نقصان ہی کیا ہے؟''

میں جواب میں اس سے کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ مجھے آرمی کی ایک اور چیک پوسٹ نظر آئی۔ وہاں دو جوان سڑک کے دائیں بائیں کھڑے ہوئے تھے اور ان کا ایک افسر کچھ فاصلے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا۔ پہلے کی طرح یہاں بھی سڑک پر ایک بیریئر لگا ہوا تھا۔

میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اپنا ریوالور نکال کر گود میں رکھ لیا۔

گاڑی دیکھ کر کرسی پر بیٹھا ہوا افسر بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

میں مزید بوکھلا گیا کہ اس نے شاید محسوس کرلیا ہے کہ گاڑی میں ان کے افسر کے بجائے کوئی اور ہے۔

اس نے اچانک بلند آواز میں کہا۔ ''اٹینشن۔'' یہ کہہ کر اس نے مجھے سیلیوٹ کیا۔ دونوں سنتری بھی لمحے بھر کو ''اٹینشن'' ہوگئے پھر ان میں سے ایک نے جلدی سے سڑک پر لگا ہوا بیریئر ہٹا دیا اور میں سر ہلاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اچانک میری نظر ایک مائل اسٹون پر پڑی۔ الٰہ آباد تین کلومیٹر۔

میں نے کانتا سے کہا۔ ''ہم الٰہ آباد تو پہنچ گئے۔ یہ شاید آخری ناکا تھا۔ اب الٰہ آباد میں ہمیں یہ گاڑی چھوڑنا ہوگی۔''

اب سڑک پر ٹریفک نہ ہونے کا سبب بھی میں سمجھ گیا۔ اس جنگی کیمپ کے علاقے سے لے کر الٰہ آباد تک اتنے فوجی ناکے تھے کہ لوگوں نے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ لوگ عام آدمی کے ساتھ بدسلوکی، بدتمیزی کرتے ہوں گے۔ وہ پاک آرمی تو تھی نہیں جسے لوگ سر آنکھوں پر بٹھاتے ہیں۔ وہ بھارتی فوج تھی جو اپنے ظلم و تشدد اور بدفعلی کی وجہ سے بدنام تھی۔

الٰہ آباد پہنچ کر ایک بڑی عمارت کے سامنے مجھے بہت سی گاڑیاں دکھائی دیں۔ میں نے بھی گاڑی انہی گاڑیوں کے ساتھ پارک کردی اور رومال سے حتی الامکان ہر اس جگہ کو صاف کردیا جہاں میری انگلیوں کے نشانات ملنے کی توقع تھی۔ پھر میں نے اپنا سامان سمیٹا اور ہم گاڑی سے باہر آگئے۔

''ایک تو تمہارا یہ تھیلا اتنا گندہ ہے کہ.....''

''مجبوری ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اب میں اپنے سامان کی گٹھڑی تو نہیں بنا سکتا۔''

''تم یہاں کے بازار سے کوئی چھوٹا موٹا سوٹ کیس تو خرید سکتے ہو۔''

''میں ابھی اس قسم کی کوئی عیاشی نہیں کرسکتا۔''

''تم نہ کرو۔ میں کروں گی۔ میرے پاس بھی دو ڈھائی ہزار روپے ہیں۔''

''دو ڈھائی ہزار؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''یہ میری بچت ہے۔ کئی ماہ میں جا کر یہ پیسے جمع ہوئے ہیں۔ چلو اب بازار کی طرف چلو۔'' کانتا نے کہا۔

وہ تھیلا واقعی بہت بدنما تھا لیکن میں اسے مجبوراً اٹھائے ہوئے تھا۔

کانتا نے بازار جا کر چند منٹ میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس، اپنے لیے ایک چپل اور میرے لیے ایک نہرو ٹوپی اور واسکٹ خریدلی۔ ایک دکان پر رک کر اس نے سینڈور کی ایک ڈبیا بھی خریدی۔

وہیں ایک ریسٹورنٹ کے فیملی کیبن میں بیٹھ کر ہم نے نہ صرف چائے پی بلکہ میں نے اپنا سارا سامان اس سوٹ کیس میں منتقل کردیا۔ کانتا نے مجھ سے واسکٹ اور نہرو کیپ پہننے کو کہا۔

میں نے دونوں چیزیں پہن لیں۔ اس نے ڈبیا کھول کر ایک چٹکی میں سیندور نکالا اور میری پیشانی پر لگا دیا۔

''یہ کیا کررہی ہو؟'' میں بوکھلا گیا۔

''اب ذرا آئینے میں اپنی صورت دیکھو۔'' کانتا ہنس کر بولی۔ ''بالکل کوئی ہندو بنیا لگ رہے ہو۔''

میں ہاتھ دھونے کے بہانے واش بیسن تک گیا۔ وہاں ایک آئینہ بھی لگا ہوا تھا۔

اس میں اپنی شکل دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ٹوپی، واسکٹ اور تلک سے میری شخصیت میں حیرت انگیز تبدیلی آئی تھی۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ میں کیمپ سے بھاگا ہوا جنگی قیدی ہوں۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی مجھے روک کر باقاعدہ مجھ سے تفتیش کرتا۔

''ہم الٰہ آباد میں ٹھہرنے کے بجائے کہیں اور جائیں گے۔'' میں نے کانتا سے کہا۔ ''کیمپ کمانڈنٹ کی موت کا اب تک علم ہو چکا ہوگا۔ جلد ہی فوجی اس کی گاڑی بھی تلاش کر

لیں گے۔ اس کے ساتھ ہی وہ ہمیں الٰہ آباد میں تلاش کریں گے۔"

"تو پھر کانپور چلتے ہیں۔" کانتا نے کہا۔ "وہاں پتاجی کے ایک بہت اچھے دوست رہتے ہیں۔ ہم ان سے....."

"نہیں کانتا!" میں نے کہا۔ "میں اس وقت کسی پر بھروسا نہیں کرسکتا۔" اچانک مجھے خیال آیا کہ مجھے رحمٰن صاحب نے بھی تو ایک صاحب کا پتا دیا تھا۔ ہم فوری طور پر ان کے گھر میں پناہ لے سکتے تھے۔ وہ قابلِ اعتبار آدمی ہوں گے، جب ہی تو رحمٰن صاحب نے ان پر بھروسا کیا تھا۔

میں نے ایک سائیکل رکشا لیا اور پتا پوچھتا ہوا بدرالدین صاحب کے گھر جا پہنچا۔ میں نے انہیں رحمٰن صاحب کا رقعہ دیا تو انہوں نے بہت والہانہ انداز میں میرا استقبال کیا اور مجھے گھر میں لے گئے۔

"خرم صاحب! رحمٰن صاحب نے تو یہ لکھا ہے کہ میں خرم کو آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ آپ کے ساتھ یہ لڑکی کون ہے؟"

میں نے مختصراً انہیں کانتا کے بارے میں بتایا۔ کانتا اس وقت ان کی بیگم اور بیٹیوں کے ساتھ تھی۔

"بھئی، جب تک تمہارا دل چاہے تم یہاں رہو۔" بدرالدین صاحب نے کہا۔ "میں دولت مند تو نہیں ہوں لیکن میرا دل جذباتِ ایمانی سے مالا مال ہے۔ ایک مجاہد کی مدد کر کے مجھے دلی خوشی ہوگی۔"

ہم لوگ تقریباً دس دن وہاں رہے۔ پھر اچانک ہمیں وہاں سے بھی بھاگنا پڑا۔

ماسٹر جی کے کسی جاننے والے نے کانتا کو الٰہ آباد میں دیکھ لیا۔ وہ کٹر ہندو تھا اور جانتا تھا کہ ایک مسلے کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

اس نے کانتا کا تعاقب کرنے کی کوشش کی لیکن کانتا اسے غچا دے کر گھر تک پہنچ گئی۔

اس نے مجھے یہ واقعہ بتایا تو میرے ذہن میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔

میں نے اسی وقت بدرالدین صاحب سے کہا۔ "اب ہمارے لیے خطرہ پیدا ہوگیا ہے اس لیے ہم یہاں سے جانا چاہتے ہیں۔" میں نے انہیں بھی اس آدمی کے بارے میں بتا دیا جس نے کانتا کا پیچھا کیا تھا۔

"میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے آپ کے خاندان پر کوئی مصیبت آئے۔" میں نے کہا۔

انہوں نے میرے بے انتہا اصرار پر مجھے جانے کی اجازت دے دی اور بولے۔ "تم یہاں سے شاہ جہاں پور چلے جاؤ۔ وہاں سے نیپال کی طرف نکل جانا۔ اس بارڈر پر بھارتی اتنی سختی نہیں کرتے۔ ہاں، تم حلیہ وہی بنا لو جو تم نے یہاں آتے وقت بنایا تھا۔"

میں نے کُرتہ پاجامہ اور واسکٹ پہن کر سر پر نہرو ٹوپی اوڑھی اور ماتھے پر تلک لگا کر جانے کے لیے تیار ہوگیا۔

چلتے ہوئے انہوں نے زبردستی میری جیب میں دو سو روپے ڈال دیے کہ تم بس یا ٹرین کے بجائے ٹیکسی میں سفر کرو گے تو زیادہ محفوظ رہو گے۔

ہم وہاں سے شاہ جہاں پور پہنچے۔ وہاں کانتا کی ایک دوست رہتی تھی۔ کانتا نے اس کے توسط سے کرائے پر معمولی سا ایک مکان حاصل کرلیا۔ اس نے اپنی دوست کو یہی بتایا تھا کہ میرے پتی بیمار ہیں، میں ان کا علاج کرانے یہاں آئی ہوں۔

کسی نے مجھ پر توجہ بھی نہ دی۔ ہم نے اس مکان میں ایک مہینا گزار دیا۔

ایک دن کانتا نے کہا۔ "خرم! کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ میں بھی تمہارے ساتھ پاکستان چلوں؟"

"ہوسکتا ہے لیکن....."

"لیکن کیا؟" اس نے پوچھا۔

"وہ طریقہ یہ ہے کہ میں تم سے شادی کرلوں۔" میں نے کہا۔ "لیکن میں تم سے شادی بھی تو نہیں کرسکتا۔"

"کیوں؟" کانتا نے پوچھا۔ "کیا میں اتنی بُری ہوں؟ تم کسی اور کو چاہتے ہو؟"

"تم بہت خوب صورت ہو بلکہ سُندر ہو کانتا! میں نے تو پہلے ہی دن تمہیں پسند کرلیا تھا لیکن....."

"کیا لیکن لیکن کی رٹ لگا رکھی ہے؟" کانتا جھنجلا کر بولی۔

"میں مسلمان ہوں اور....."

"میں بھی مسلمان ہوجاؤں گی۔" کانتا نے کہا۔ "میں تمہارے مذہب سے اسی روز متاثر ہوگئی تھی جب تم نے صرف پتاجی کے کہنے پر مجھے سہارا دیا تھا۔ پھر ہم اتنے عرصے سے ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ تم نے آج تک بھی مجھ پر میلی نظر نہیں ڈالی۔"

"تم اتنی اچھی اور خوب صورت ہو کانتا کہ تمہیں دیکھ کر نظریں بھی پاک ہوجاتی ہیں۔"

"تو پھر مجھے بھی مسلمان کرلو خرم!" وہ اچانک میرے

سینے سے آلگی۔ "میں دل سے تمہارے مذہب کو پسند کرنے لگی ہوں۔"

میری زندگی میں پہلا موقع تھا جب کوئی حسین اور جوان لڑکی میرے اتنے قریب آئی تھی۔ میرا دل بے قابو ہوا جارہا تھا۔ میں نے آہستگی سے اسے خود سے علیحدہ کردیا اور کہا۔ "اب تم مزید میرے ایمان کا امتحان نہ لو۔"

پھر کانتا کی ضد پر میں اسے مقامی مسجد کے ایک مولوی صاحب کے پاس لے گیا۔ انہوں نے کلمہ پڑھا کر کانتا کو مسلمان کیا اور انہوں نے ہی اس کا نام مریم تجویز کیا۔

پھر مجھ سے ضبط نہ ہوسکا اور میں نے دوسرے ہی دن کانتا سے نکاح کرلیا۔

پھر ایک مہینا تو یوں گزر گیا جیسے اک پل۔ میں پورے مہینے رنگ اور روشنیوں کی بارش میں نہاتا رہا۔

ایک مہینے بعد ہمیں ہوش آیا کہ ہمیں یہاں سے نکلنا بھی ہے۔

میں نے وہاں سے نکلنے کے لیے بھاگ دوڑ شروع کر دی۔

مشرقی پاکستان سے بڑی تعداد میں مہاجرین نیپال کے راستے بھارت میں آرہے تھے۔ بھارت سرکار نے وہ بارڈر بھی سیل کردیا تھا۔

انہی دنوں ایک رکشے والے سے میری ملاقات ہوئی۔ اس نے باتوں ہی باتوں میں ایک سردار جی کا پتا بتایا جو لوگوں کو غیر قانونی طور پر بھارت سے پاکستان اور پاکستان سے بھارت بھیجتے تھے۔ ان کا پورا نیٹ ورک تھا۔

میں اس دن بہت خوش تھا۔ میں نے رکشا والے سے سردار جی کا پتا لے لیا۔ ممکن ہے اس میں رکشا والے کا بھی کچھ کمیشن ہو۔ سردار جی فی آدمی دو ہزار روپے لیتے تھے۔ دو ہزار کی رقم اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی لیکن کانتا نے بتایا کہ ہمارے پاس چار ہزار روپے ہوجائیں گے۔

دوسرے دن میں سردار جی سے معاملہ طے کرنے ان کے ٹھکانے پر پہنچ گیا۔

انہوں نے کہا۔ "آج سے چار دن بعد میں کچھ بندوں کو پاکستان بھیجوں گا۔ تم تین دن بعد مجھ سے ملو۔"

میں نے سردار جی سے پنجابی میں بات چیت کی تو وہ اتنے خوش ہوئے کہ مجھے ایک ہزار روپے کا ڈسکاؤنٹ دے دیا۔

پیسے میں ساتھ لے کر گیا تھا۔ میں نے انہیں پیسے دینا چاہے تو انہوں نے انکار کردیا اور بولے۔ "میں پیسے اس وقت لیتا ہوں جب بندے کو پاکستان کے لیے گاڑی میں سوار کرا دیتا ہوں۔"

میں گھر لوٹا تو عجیب سی ایک ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور ہمارا مختصر سا سامان بکھرا ہوا تھا۔

مریم کی دوست نے بتایا کہ کچھ فوجی یہاں آئے تھے۔ وہ کانتا کو اٹھا کر لے گئے ہیں۔

میرا سر گھومنے لگا۔ مریم تو بہت نازک سی لڑکی تھی، وہ بھارتی درندوں کا تشدد کیسے برداشت کرتی۔

تھوڑی دیر بعد مریم آگئی۔ اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا اور رخساروں پر انگلیوں کے نشانات ثبت تھے۔

"کیا بات ہے مریم! تم کہاں گئی تھیں؟"

"یہاں سے بھاگ جاؤ خرم!" مریم سرگوشی میں بولی۔ "ان لوگوں کو اب تک یہی شبہ ہے کہ دونوں فوجیوں اور پتاجی کو مارنے کے بعد تم مجھے اغوا کر کے لائے ہو۔ بھاگ جاؤ خرم! میری فکر مت کرو۔ میں خود پاکستان پہنچ جاؤں گی۔"

اچانک گھر میں دو آدمی داخل ہوئے۔ وہ اپنے حلیوں سے ملٹری انٹیلی جنس کے لوگ لگ رہے تھے۔

"بس کر اوئے!" ان میں سے ایک نے کہا۔ "اب شرافت سے ہمارے ساتھ چل۔" اس نے اپنا ریوالور لہراتے ہوئے کہا۔

میں نے یوں ظاہر کیا جیسے میں بہت سہم گیا ہوں۔

ان کے نزدیک پہنچ کر میں نے اچانک ان میں سے ایک کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا۔ میں اس دوران میں اپنا خنجر بھی نکال چکا تھا۔ اس آدمی کے سنبھلنے سے پہلے ہی میرے خنجر کے ایک وار نے جہنم رسید کردیا۔ دوسرے آدمی نے بھاگنے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے بھی ٹھکانے لگا دیا۔

"تم پیچھے والی دیوار پھاند کر میری دوست لکشمی کے گھر میں چلے جاؤ۔ وہاں سے عقبی دروازے کے ذریعے باہر نکل جانا۔"

"اور تم؟"

"میری فکر مت کرو۔ میں بھی جلد ہی پاکستان آجاؤں گی۔" پھر وہ چیخی۔

"ہیلپ..... ہیلپ۔"

میں سمجھ گیا کہ وہ بھارتی انٹیلی جنس کو دھوکا دے رہی ہے۔ میں دیوار پھاند کر وہاں سے نکل آیا۔ پھر مجھے معلوم نہیں

کہ مریم کا کیا حشر ہوا۔ میں نے کچھ دن تو اسے تلاش کیا پھر تھک ہار کر سردار جی کے ذریعے پاکستان آ گیا۔

یہاں آ کر میں نے دوبارہ آرمی میں شمولیت اختیار کر لی۔ بعد میں میں نے اپنے کئی دوستوں کو بھارت بھیجا لیکن مریم کا کوئی سراغ نہ ملا۔ وہ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اب تو صرف اس کی یادیں رہ گئی تھیں جو رگِ رواں کی طرح مجھے اپنے ساتھ ساتھ اڑائے پھرتی تھیں۔

☆☆☆

ان واقعات کو چالیس..... برس بیت گئے ہیں۔ میں آرمی سے بریگیڈیئر کے عہدے سے ریٹائر ہوا تھا۔ میرے دو بیٹے فوج میں ہیں۔ بڑا بیٹا میجر ہے اور چھوٹا ابھی کچا لیفٹین ہے۔ میں اسے کچا لیفٹین کہتا ہوں تو بے اختیار مجھے کیپٹن وقار یاد آ جاتا ہے۔

اس کے بعد مجھے کیپٹن وقار کی کوئی خبر نہیں ملی۔ نہ جانے وہ زندہ بھی تھا یا کسی بھارتی جیل میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔

احمد یار البتہ فوجیوں کے چنگل سے ایک مرتبہ پھر فرار ہو کر پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

فرار کے چار سال بعد اس سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ مجھے اسی نے تلاش کیا تھا۔

میں ان دنوں کھاریاں میں تھا اور میجر ہو چکا تھا۔ اچانک ایک حوالدار میرے کمرے میں آیا اور مجھے زوردار سیلوٹ کیا۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ وہ احمد یار تھا۔ ان چار برسوں میں وہ ذرا بھی نہیں بدلا تھا۔

میں بے اختیار اپنی کرسی سے اٹھا اور اس سے بغل گیر ہو گیا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ لمبا تڑنگا حوالدار رو رہا ہے۔

میں نے اسے خود سے علیحدہ کیا اور کہا۔ ”یار! تم اتنے لمبے چوڑے مرد ہو کر عورتوں کی طرح آنسو بہا رہے ہو؟“

”یہ تو خوشی کے آنسو ہیں سر!“ اس نے جواب دیا۔ پھر ہنس کر بولا۔ ”خود آپ کیا کر رہے ہیں؟“

اس کے کہنے پر مجھے احساس ہوا کہ میں بھی آنسو بہا رہا ہوں۔

ہم دونوں نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔

پھر احمد یار مجھ سے وقتاً فوقتاً ملتا رہا۔ وہ کیپٹن وقار کو بھی تلاش کر رہا تھا لیکن اسے ناکامی ہوئی۔

اس نے جی ایچ کیو جا کر بھی کیپٹن وقار کے بارے میں معلومات کیں لیکن اسے کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وقار وہاں سے فرار ہو کر پاکستان پہنچا ہو اور آرمی والوں کو اطلاع ہی نہ دی ہو لیکن وقار جیسے افسر سے ایسی امید نہیں تھی۔ اگر اسے فوجی ملازمت چھوڑنا ہی ہوتی تو وہ باقاعدہ طور پر ملازمت چھوڑتا۔ اس نے ایسا نہیں کیا تھا۔ اس لیے میرا خیال تھا کہ وہ اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہے یا پھر بھارت کی کسی جیل میں ہے۔

☆☆☆

پاکستان آنے کے بعد میں..... کیپٹن ہوا تو اباجی نے میری شادی ثمینہ سے کرا دی۔ میں اس شادی پر راضی نہیں تھا۔ مجھے ابھی امید تھی کہ مریم اگر زندہ ہے تو وہ مجھ تک ضرور پہنچے گی یا پھر اس کی طرف سے کوئی پیغام پہنچے گا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ پانچ سال کے طویل انتظار کے بعد بالآخر میں نے ثمینہ سے شادی کر لی۔ اسے بھی معلوم تھا کہ میں نے بھارت میں شادی کی تھی۔ میں نے اسے مریم کے بارے میں بتایا کہ اس نے میری خاطر کیسی کیسی قربانیاں دیں۔ ثمینہ کا چہرہ تو پُرکشش ہے ہی اس کا دل بھی بہت خوب صورت اور کشادہ ہے۔

مریم کو یاد کر کے وہ بھی میرے ساتھ ساتھ افسردہ ہو جاتی ہے۔

ایک دن میں نے یونہی چھیڑنے کو اس سے پوچھا۔

”ثمینہ! فرض کرو اگر مریم یہاں آ جائے تو.....؟“

”تو کیا؟“ ثمینہ نے ہنس کر کہا۔ ”وہ آپ کی قانونی بیوی ہے۔ میں اسے گلے لگا لوں گی۔“

”تم واقعی یہ بات سچے دل سے کہہ رہی ہو؟“

”کبھی آزما لیجیے گا۔“ ثمینہ نے پُرعزم لہجے میں کہا۔ ”میں احسان فراموش نہیں ہوں کہ اپنی محسن کو قبول نہ کروں۔ اس نے آپ کی جان بچائی ہے تو وہ آپ کے ساتھ ساتھ میری محسن بھی تو ہوئی۔“

☆☆☆

اس دن شدید گرمی اور حبس تھا۔ میں لان میں بیٹھا تھا۔ اچانک آسمان سیاہ ہو گیا۔ مریم بھاگی ہوئی میرے پاس آئی اور بولی۔ ”پاپا! ابھی ابھی ٹی وی پر خبر آئی ہے کہ شدید آندھی کے ساتھ موسلا دھار بارش ہونے کا امکان ہے۔“

”ارے بیٹا! یہ ٹی وی والے بھی بے پر کی اڑاتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”بلکہ ٹی وی کیا محکمۂ موسمیات والے ہی غلط بتاتے ہیں۔ اگر انہوں نے آج آندھی کی پیش گوئی کی ہے تو یا تو وہ آئے گی ہی نہیں یا پھر ایک دو دن بعد آئے گی۔“

اچانک بارش ہونے لگی۔ میں لان سے اٹھ کر برآمدے تک پہنچتے پہنچتے اچھا خاصا بھیگ گیا۔

میں نے اندر جا کر کپڑے تبدیل کیے اور ایک مرتبہ پھر برآمدے میں آ بیٹھا۔ مریم ملازموں کے بچوں کے ساتھ بارش میں نہا رہی تھی۔ وہ کالج میں پہنچ گئی تھی لیکن اس کی حرکتیں آج بھی بچوں والی تھیں۔ پھر ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آنے لگے اور بارش کا زور ٹوٹ گیا۔

میرے ملازم کریم بخش نے آ کر بتایا کہ کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔

”تم نے نام نہیں پوچھا؟“ میں نے کہا۔

”میں نے پوچھا تھا صاب لیکن انہوں نے کہا کہ میں تمہارے صاب کا دوست ہوں۔ ان کے ساتھ ان کی فیملی بھی ہے سر۔“

”فیملی؟“ میں نے الجھ کر کہا۔

”جی ہاں، ان کی بیگم اور بیٹا بھی ان کے ساتھ ہیں۔“

”آپ سوالات ہی کیے جائیں گے یا مہمانوں کو بارش میں بھیگنے دیں گے؟“ ثمینہ نے کہا۔ ”کریم بخش! تم ان لوگوں کو ڈرائنگ روم میں بٹھاؤ اور ان کے لیے کچھ چائے پانی کا بندوبست کرو۔“ ثمینہ نے حکم دیا۔ ”میں صاحب کے ساتھ ابھی آتی ہوں۔“

میں ثمینہ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں داخل ہوا تو سفید بالوں والے ایک بوڑھے کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کی صحت قابلِ رشک تھی۔ چہرے پر داڑھی بھی تھی۔ مجھے یاد نہیں آ رہا تھا کہ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟

اس کے ساتھ اس کا بیٹا بھی تھا۔ اس کی عمر بھی پینتیس سے زیادہ ہی ہو گی۔ اس نے مجھے بہت ادب سے سلام کیا۔ اس کے ساتھ جو عورت تھی وہ البتہ چادر میں تھی۔ اس کا چہرہ بھی چادر میں چھپا ہوا تھا۔

”جی فرمایئے؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”بریگیڈیئر صاحب!“ اس نے ہنس کر کہا۔ ”لگتا ہے آپ مجھے پہچانے نہیں؟ آپ کیسے فوجی ہیں بریگیڈیئر صاحب!“ ان صاحب نے کہا۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ فوجیوں کا حافظہ بہت زبردست ہوتا ہے۔ وہ خاص طور پر اپنے دوستوں اور دشمنوں کو کبھی نہیں بھولتے۔“

”میں واقعی آپ کو نہیں پہچانا۔“ میں نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

مجھے ان کی آواز البتہ کچھ جانی پہچانی لگ رہی تھی۔

”ابے تو بریگیڈیئر ہو گیا۔“ ان صاحب نے اچانک بے تکلفی سے کہا تو میرے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ ”لیکن تیرا ذہن ابھی تک کچا ہے، کچے لیفٹین!“

”وقار سر!“ میں نے خوشی سے لبریز لہجے میں کہا اور آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گیا۔ ”آپ کیسے ہیں سر! میں نے اور احمد یار نے تو آپ کو بہت تلاش کیا لیکن آپ کی کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

”ملتی بھی کیسے کچے!“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”میں پاکستان میں تھا ہی نہیں۔“

”آپ پاکستان میں نہیں تھے؟“ میں نے حیرت سے کہا۔ ”پھر آپ کہاں تھے؟“

”میں بھارت میں تھا۔“ کیپٹن وقار کا یہ انکشاف سن کر مجھے شدید حیرت اور صدمہ ہوا لیکن میں نے اس کا اظہار نہیں کیا۔

”کیمپ سے فرار ہونے کے بعد آپ کہاں پہنچے تھے سر؟“

”میں کسی نہ کسی طرح الٰہ آباد پہنچنے میں کامیاب ہو گیا تھا لیکن بھارتی انٹیلی جنس کی نظر میں آ گیا تھا۔ الٰہ آباد پہنچ کر میں نے انہیں ڈاج دیا کہ میں شاہ جہاں پور کی طرف فرار ہو گیا ہوں لیکن میں دوبارہ الٰہ آباد آ گیا۔ وہاں ایک مسلمان گھرانے نے مجھے پناہ دی۔ بھارت میں آج بھی بہت مسلمان ہیں لیکن اب ان میں وہ جذبہ نہیں ہے جو اس وقت تھا۔ میں نے بھارتی خفیہ ایجنسی کو ڈاج تو دے دیا تھا لیکن وہ الٰہ آباد میں بھی کتوں کی طرح ہم لوگوں کی بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ میرے ساتھ ساتھ بھارتی فوجیوں کو تمہاری اور احمد یار کی بھی تلاش تھی۔ میرے میزبان نے مجھ سے درخواست کی کہ جب تک خطرہ ٹل نہ جائے، میں آپ کو باہر نہیں نکلنے دوں گا۔ اس فراخ دل خاندان نے نہ صرف مجھے پناہ دی بلکہ اپنی بیٹی بھی دے دی۔ چونکہ میں نے وہاں شادی کر لی تھی۔ یہ شادی بھی بہت ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی۔ فخرالدین صاحب کی بیٹی کی شادی ہونے والی تھی۔ انہوں نے مجھے مجبور کیا کہ تم شادی تک تو رک ہی جاؤ۔ انہوں نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ میں راضی ہو گیا۔

”برات والے دن فخرالدین صاحب بہت خوش تھے۔ برات امروہہ سے آئی تھی۔ عین نکاح کے وقت دولہا کے باپ اور خود دولہا نے ایسی شرائط پیش کیں جو فخرالدین صاحب کے لیے قابلِ قبول نہیں تھیں۔ بات اس حد تک بڑھی کہ لڑکے کے باپ نے برات واپس لے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ فخرالدین صاحب اس کی خوشامد کر رہے تھے، اس کے سامنے گڑگڑا رہے تھے۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا۔

”میں نے درشت لہجے میں دولہا کے باپ سے کہا۔

''بڑے میاں! تم شادی کرنے آئے ہو یا اپنے بیٹے کا سودا کرنے؟''

''تم کون ہو؟'' دولہا کا باپ چیخ کر بولا۔

''تم اپنا یہ تام جھام اٹھاؤ اور یہاں سے ابھی نکل جاؤ ورنہ میں تمہیں اور تمہارے بیٹے کو اتنا ماروں گا کہ اس کی شکل بھی نہیں پہچانی جائے گی۔''

لڑکے کا باپ بپھر کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''چل شکور! ایسے لوگوں میں ہمیں رشتہ نہیں کرنا۔''

''برات اسی وقت واپس چلی گئی۔ فخرالدین صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

میں نے ان سے کہا۔ ''چچا جان! یہ شادی ہو گی اور ضرور ہو گی۔ اگر آپ کو منظور ہو تو۔''

''لیکن کس کے ساتھ؟'' فخرالدین صاحب نے حیرت سے کہا۔

''میرے ساتھ!'' میں نے کہا۔ یوں میری شادی ہو گئی۔

''پھر جنگی قیدیوں کی واپسی ہوئی لیکن پاکستان اور بھارت کے آمدورفت کے راستے بند ہی رہے۔ اسی دوران میں مجھے انگلینڈ جانے کا موقع مل گیا۔ میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لندن پہنچ گیا۔''

''سر! آپ لندن کے بجائے پاکستان آسکتے تھے؟'' میں نے کہا۔

''میں بالکل ایسا ہی کرتا۔'' وقار نے کہا۔ ''لیکن لندن میں مجھے اطلاع ملی کہ میرے تایا اور ان کے بیٹوں نے زمینوں پر قبضہ کر لیا ہے اور مجھے مردہ سمجھ لیا گیا ہے۔ میں نے انہیں خط لکھ کر بتایا کہ میں ابھی زندہ ہوں۔ اس کا جواب آیا کہ زندہ ہو تو ثابت کرو۔ تم تو ہمارے لیے اسی دن مر گئے تھے جب تم نے بزدلوں کی طرح ہتھیار ڈالے تھے۔

''میں اپنے ان تایا کا لاڈلا تھا۔ وہ مجھے اپنے بیٹوں پر ترجیح دیتے تھے۔ ان کے اس رویے سے مجھے گہرا صدمہ پہنچا اور میں نے بھی پاکستان آنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے لندن میں ایک چھوٹا سا اسٹور کھول لیا جو آج وہاں کا بہت بڑا ڈپارٹمنٹل اسٹور ہے۔ میں نے ایک سال بعد اپنی بیویوں کو بھی وہیں بلا لیا۔''

''بیویوں؟'' میں نے حیرت سے کہا۔

''تیرا حافظہ تو واقعی جواب دے گیا ہے کچے!'' وقار نے کہا۔ ''میں نے تجھے بتایا تھا کہ میری بیوی بھی ہے اور ایک سال کا ایک بیٹا بھی۔''

''اب دونوں بیویاں میرے ساتھ رہتی ہیں۔ ماشاء اللہ میرے چار بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ چاروں بیٹے مل کر کاروبار سنبھالتے ہیں اور میں سارا وقت اپنی بیویوں کے ساتھ گزارتا ہوں۔''

''یہ آپ کی کون سی بیگم ہیں؟'' میں نے پوچھا۔ ''نمبر ایک یا نمبر دو؟''

''نمبر ایک۔'' وقار نے سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن میری نہیں، یہ تمہاری بیوی ہے مریم۔''

اسی وقت بادل زور سے گرجا اور بجلی کا کڑاکا سنائی دیا۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ بجلی مجھ پر گری ہو۔

مریم نے اپنی چادر چہرے سے ہٹا دی تھی۔ وہ مریم ہی تھی۔ وہی بولتی ہوئی آنکھیں، وہی گھنے بال جنہیں وقت کی گرد نے سفید کر دیا تھا۔

''کہہ دو کہ تم مریم کو بھی نہیں پہچانتے؟''

''میں... میں مریم کو کیسے بھول سکتا ہوں؟'' میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

ثمینہ آگے بڑھی اور مریم سے لپٹ گئی۔ ''مریم باجی! آپ اتنے عرصے کہاں رہیں؟ یہ تو آپ کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر مایوس ہو چکے تھے۔''

''اور یہ تمہارا بیٹا علی ہے۔'' وقار نے اس شخص کی طرف اشارہ کیا جو ان کے ساتھ بیٹھا تھا۔ مجھے ایسا لگا جیسے میری عمر پچیس سال کم ہو گئی ہو۔ وہ ہو بہو میری جوانی کی تصویر تھا۔ جب میں میجر تھا تو ایسا ہی تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر بے اختیار مجھ سے لپٹ گیا۔ ''ابو! امی نے آپ کی اتنی تعریفیں کی تھیں کہ میں نے بغیر دیکھے آپ کو اپنا آئیڈیل مان لیا تھا۔'' وہ بری طرح آنسو بہا رہا تھا۔

میں نے محبت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور پوچھا۔ ''بیٹا! تم کیا کر رہے ہو آج کل؟''

''ابو! میں الیکٹرانک انجینئر ہوں اور آج کل امریکا میں ہوں۔'' علی نے جواب دیا۔

''میں پنڈ دادن خان کی ماں نہیں ہوں۔'' مریم نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''ورنہ علی بھی آرمی میں افسر ہوتا۔''

اس پر وقار اور ثمینہ نے ایک ساتھ قہقہہ لگایا۔ مریم بھی ہنسنے لگی اور میں بھی مسکرا دیا۔

اسی وقت میری بیٹی مریم کمرے میں داخل ہوئی اور بولی۔ ''پاپا! آپ لوگ کیوں ہنس رہے ہیں؟ کیا کسی نے کوئی جوک سنایا ہے؟''

''مریم بیٹا! ادھر آؤ، میں تمہیں ان لوگوں سے

ملواؤں۔''

مریم کا نام سن کر میری بیوی مریم چونک گئی۔

''اس کا نام بھی مریم ہے؟'' اس نے حیرت سے کہا۔

''ہاں مریم باجی!'' ثمینہ نے کہا۔ ''آپ کی یاد میں انہوں نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھ دیا۔''

مریم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ شاید یہ احساسِ تشکر کے آنسو تھے۔ میں نے اپنی بیٹی سے ان لوگوں کا تعارف کرایا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔ ''واؤ! اب تو میری دو دو ماما ہو گئیں اور ایک بھائی بھی مل گیا۔ شاہد بھائی اور ارشد بھائی تو مجھے ہر وقت ڈانٹتے ہی رہتے ہیں۔ علی بھائی! آپ تو مجھے نہیں ڈانٹیں گے نا؟''

''نہیں گڑیا! بہنوں کو کون ڈانٹتا ہے؟'' علی نے کہا۔

''آپ لوگ باتیں ہی کرتے رہیں گے یا مہمانوں کو کچھ کھلائیں پلائیں گے بھی؟'' مریم نے کہا۔

''مہمان کون ہے بیٹا؟'' وقار نے کہا۔ ''یہ تو تمہاری ماما ہیں اور یہ بھائی۔ ہم تمہارے انکل ہیں۔''

''آیئے مریم باجی! میں آپ کو آپ کا کمرا دکھا دوں۔'' ثمینہ نے کہا۔ ''مریم بیٹا! بھائی کو ارشد کے کمرے میں لے جاؤ۔ ان کے لیے بھی کل کسی وقت نیا کمرا سیٹ کرا دوں گی۔''

ان کے جانے کے بعد میں نے وقار سے پوچھا۔ ''سر! مریم آپ کو کہاں مل گئی؟''

''مریم شاہ جہاں پور میں رہ رہی تھی اور وہاں کسی اسکول میں پڑھا رہی تھی۔ اس نے پاکستان آنے والے مختلف لوگوں کے ذریعے تمہارے بارے میں معلوم کرنا چاہا لیکن تمہاری کوئی خبر نہ ملی۔ اس نے اپنے طور پر بھی جی ایچ کیو کو کئی خط لکھے لیکن وہاں سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔ وہ بے چاری یہی سمجھتی رہی کہ تم اس دنیا میں موجود ہی نہیں ہو۔ پھر اس نے اپنی توجہ کا مرکز اپنے بیٹے کو بنا لیا۔ اسے بہترین تعلیم دلوائی۔ انجینئرنگ کرنے کے بعد علی کو امریکا میں بہت بہترین ملازمت مل گئی۔ وہاں پہنچ کر اس نے مریم کو بھی بلا لیا۔

''گزشتہ مہینے میں لندن سے انڈیا آیا تھا۔ انہی دنوں مریم بھی انڈیا آئی ہوئی تھی۔ وہ ایک دن یونہی الٰہ آباد آ گئی۔ اس نے بتایا کہ میں نے خرم کے ساتھ کچھ دن الٰہ آباد میں اس فیملی کے ساتھ قیام کیا تھا۔ جانتے ہو وہ فیملی کون تھی؟ وہ میری سسرال تھی۔ وہ میری بیوی فہمیدہ کے تایا تھے۔ جب انہوں نے تمہارا تذکرہ کیا تو میں نے مریم سے ملاقات کی۔ میں نے اس سے وعدہ کیا کہ میں کل ہی پاکستان جاؤں گا اور خرم کو تلاش کر لوں گا۔ تم نہ جانے کن لوگوں کو خط بھیجتی رہی ہو؟''

مریم نے کہا۔ ''پھر میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گی۔ اس بہانے میں ان کا ملک بھی دیکھ لوں گی۔''

''آپ لوگ کیا بھارتی پاسپورٹ پر آئے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''میرے پاس برٹش پاسپورٹ ہے اور مریم کے پاس امریکن؟'' وقار نے کہا۔

''آپ کے پہلے احسان کا قرض ہی ابھی باقی ہے سر جو آپ نے مجھے کیمپ سے فرار کرا کے کیا تھا۔ اب یہ آپ نے دوسرا احسان کر دیا۔''

''فکر مت کرو کچے!'' وقار نے مسکرا کر کہا۔ ''میں سارے احسانات کا بدلہ اکٹھا وصول کروں گا۔'' پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ''یار! مجھ بوڑھے کو بھی کہیں لیٹنے بیٹھنے کا ٹھکانا دے دو۔''

میں نے کریم بخش کو بلایا اور کہا۔ ''صاحب کے لیے شاہد کا کمرا کھول دو۔''

اس رات کھانے پر سبھی بہت خوش تھے۔ میری بیٹی نے یہ اطلاع شاہد اور ارشد کو بھی دے دی تھی۔ وہ بھی اپنی بڑی اماں اور بڑے بھائی سے ملنے کو بے تاب تھے۔

ثمینہ نے بہت فراخ دلی کا مظاہرہ کیا تھا۔ مجھے اس کی توقع ہرگز نہیں تھی۔ مجھے دیکھا تو اس وقت لگا جب میں رات کو مریم کے کمرے میں جانے لگا۔

ثمینہ نے کہا۔ ''اب آپ اسی کے بیڈروم میں سوئیں گے؟''

''کیوں؟ تمہیں کوئی اعتراض ہے؟ وہ میری بیوی ہے۔'' یہ کہہ کر میں ہنستا ہوا چلا گیا۔

''نہیں تو۔'' ثمینہ نے آہستگی سے کہا۔

میں کمرے میں پہنچا تو مریم مجھ سے لپٹ گئی اور اتنا روئی کہ رو رو کر نڈھال ہو گئی۔

''مجھے امید نہیں تھی کہ میں اب کبھی تمہیں دیکھ سکوں گی۔'' اس نے سسکتے ہوئے کہا۔ ''اللہ وقار بھائی کو ہمیشہ خوش رکھے کہ انہوں نے ہمیں پھر ملا دیا۔''

''ہماری زندگی میں سے چالیس سال نکل گئے تو کیا ہوا۔ ہم اس کہانی کو وہیں سے شروع کریں گے جہاں پر ختم ہوئی تھی۔'' میں نے کہا۔

ہم دونوں رات بھر جاگتے رہے اور ماضی کے قصے دہراتے رہے۔

مریم نے بتایا کہ پولیس والوں نے مجھے پکڑ لیا تھا لیکن میں نے یہ کہہ کر جان چھڑائی کہ خرم مجھے اغوا کر کے لایا تھا۔

دوسری صبح ثمینہ کا منہ کچھ پھولا ہوا تھا، اسے صرف میں محسوس کر سکتا تھا۔

ناشتے کے بعد وقار نے کہا۔ ''اچھا کچے لیفٹین! اب میرا کام تو ختم ہو گیا۔ میں آج یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''کہاں؟'' میں نے پوچھا۔

''بھئی میری بیویاں میرے بغیر وہاں پریشان ہوں گی۔''

''انکل! پریشان تو وہ ہو ہی رہی ہیں۔'' مریم نے کہا۔

''دو چار دن اور سہی۔'' اس کی بات پر سب ہنسنے لگے۔ ثمینہ بھی ہنسی لیکن میں جانتا تھا کہ اس کی ہنسی زبردستی کی ہنسی ہے۔

''چل بیٹا! تیرے کہنے سے میں دو دن اور رک جاتا ہوں۔'' وقار نے کہا۔

شام کو موسم کے تیور پھر خطرناک تھے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ آج ضرور آندھی آئے گی اور طوفانی بارش ہو گی۔

میں اس وقت اپنے بیڈ روم میں ہی تھا۔ میں نے ثمینہ سے کہا۔ ''ثمینہ! تم تو کہتی تھیں کہ تم کھلے دل سے مریم کو قبول کر لو گی پھر اب کیا ہو گیا؟''

''اس وقت مجھے یقین تھا کہ مریم کہیں مر کھپ چکی ہے لیکن وہ تو تمہارے دل میں زندہ تھی۔ تم نے اپنی بیٹی کا نام مریم رکھا لیکن میں نے کوئی اعتراض نہ کیا۔''

''اب تم کیا چاہتی ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اب میں کیا چاہ سکتی ہوں؟'' ثمینہ نے کہا۔ ''کاش! یہ کم بخت مریم اس وقت مر کھپ گئی ہوتی تو.....''

''ثمینہ!'' میں نے چیخ کر کہا۔ ''بند کرو اپنی بکواس۔''

اسی وقت مجھے ایسا لگا جیسے کھڑکی کے پاس سے کوئی بھاگتا ہوا گیا ہو۔ مجھے اس کی صرف ایک جھلک نظر آئی تھی۔ وہ مریم تھی۔ میری بیوی مریم!

میں دل ہی دل میں نادم ہو رہا تھا کہ اب میں اسے کس منہ سے مناؤں گا؟ ثمینہ نے تو اپنی اصلیت دکھا دی تھی۔ مریم بھی کیا سوچ رہی ہو گی۔

میں نے سوچا آج رات میں اسے سمجھاؤں گا تو وہ سمجھ جائے گی۔ وہ ثمینہ کی طرح اجڈ نہیں تھی۔

میں ابھی یہی سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے گاڑی کا انجن اسٹارٹ ہونے کی آواز سنائی دی۔

''مریم اس طوفانی بارش میں کہاں گئی ہے؟'' میں نے ثمینہ سے پوچھا۔

''کون سی مریم؟'' ثمینہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''آپ کی بیوی یا بیٹی؟''

میں اسے کوئی سخت جواب دینے والا تھا کہ کریم بخش دستک دے کر اندر آ گیا اور بولا۔ ''صاب جی! وہ آپ کے مہمان چلے گئے۔''

''مہمان چلے گئے؟'' میں نے حیرت سے کہا۔ ''کیا وقار صاحب چلے گئے؟''

''جی صاب! ان کے ساتھ بیگم صاب اور علی صاحب بھی چلے گئے۔''

''کہاں؟'' میں نے چیخ کر پوچھا۔

''یہ تو مجھے معلوم نہیں صاب جی! بیگم صاب یہ خط آپ کو دے گئی ہیں۔''

میں نے جھپٹ کر خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ خط انگلش میں تھا کیونکہ مریم کو اردو نہیں آتی تھی۔ اس نے لکھا تھا۔

''جان سے پیارے خرم! ہمیشہ خوش رہو۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں دوبارہ تمہاری زندگی میں آ کر تم پر اور تمہاری بیوی پر بوجھ بن جاؤں گی۔ حق تو اس نے میرا چھینا ہے۔ میں بھی اپنا حق جتا سکتی تھی لیکن میں تمہاری ہنستی بستی زندگی کو برباد نہیں کرنا چاہتی اس لیے تمہارے راستے سے ہمیشہ کے لیے ہٹ رہی ہوں۔ سمجھ لینا کہ مریم دوبارہ ملی ہی نہیں، سمجھ لینا کہ وہ اسی وقت کہیں مر کھپ گئی تھی۔ تمہاری بیوی کی آرزو تو یہی تھی نا! مجھے تلاش کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میں تمہیں کبھی نہیں ملوں گی۔ اگر مل بھی گئی تو پہچاننے سے انکار کر دوں گی۔ تمہارا یہ احسان کیا کم ہے کہ تم نے مجھے اسلام جیسے سچے مذہب کی ترغیب دی۔ ایک بیٹے کی صورت میں اپنی نشانی دی۔ میرے لیے یہ دو سہارے بہت کافی ہیں۔

ہمیشہ کے لیے خدا حافظ۔

مریم جو کبھی تمہاری تھی۔''

خط پڑھ کر میرے ذہن میں آندھیاں سی چلنے لگیں۔ پھر اتنی شدید آندھی آئی کہ سب کچھ تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ اس سے کہیں زیادہ شدید آندھی میرے اندر آئی تھی۔

میں بزدل تھا کہ مریم کو چھوڑ کر بھاگ آیا۔ مجھ میں اخلاقی جرأت بھی نہیں تھی کہ میں ثمینہ کے ساتھ شادی سے انکار کرتا۔ میں تو ہوا کے دوش پر بہتی ہوئی ایسی ریت ہوں جو ہمیشہ ہواؤں کے رحم و کرم پر ہوتی ہے۔ میں ریگِ رواں ہوں..... وہ ریگِ رواں جس کا کوئی ایک مسکن نہیں ہوتا۔